قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد 26 ❖ شمارہ 05 ❖ جون 2016ء

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبۂ اشتہارات

نیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد عثمان خان 0333-2168391

رانا محمد جمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور فراز علی نازش 0300-4214400

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63' فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ' کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

قارئین کرام!

السلام علیکم!

اس ماہ بھی ایک کہانی سن لیں۔ کہانی کچھ یوں ہے۔

سال 2015 پہلا دوست : تمہارے علاقے میں لائٹ کب آئے گی؟

دوسرا دوست : جب تمہارے علاقے کی جائے گی۔

سال 2020 پہلا دوست : سنا ہے آج لائٹ آئے گی؟

دوسرا دوست : نہیں یار آج حیدرآباد میں آئے گی، کل جیکب آباد پرسوں سکھر میں۔

سال 2022 پہلا دوست : یہ بتاؤ لائٹ کب آئے گی؟

دوسرا دوست : دماغ مت چاٹو، یہ سب کہانی قصے کی باتیں ہیں، چلو سو جاؤ۔

سال 2025 پہلا دوست : یار لائٹ.....

دوسرا دوست : (غرا کر) خبردار پھر اگر گالی بکی۔

اس کہانی کے تناظر میں اپنے اردگرد دیکھیں تو ایسا لگے گا کہ آنے والے وقت میں یہ کہانی حقیقت بن جائے گی کیونکہ بجلی کا خرچ بڑھتا جا رہا ہے اور پیداوار گھٹتی جا رہی ہے۔ اس مسئلے پر غور کرنے کی کسی کو فرصت ہی نہیں اس موقع پر حماد حسن کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

وطن کی پاک مٹی کو کیا اتنا خراب ہم نے
جہاں بوتے ہیں اب گاجر وہاں آلو نکلتے ہیں
ہماری رشوت خوری، جھوٹ اور غیبت کی برکت سے
جنہیں ہم چنتے ہیں لیڈر وہی ڈاکو نکلتے ہیں

معراج رسول

مصنفہ

ابھی وہ آٹھ سال کی تھی کہ اس نے قرآن ختم کرلیا۔ اب اسے یہ شوق چرایا کہ اس نے جو علم حاصل کیا ہے اسے عام کرنا چاہیے۔ اس کے لیے اس نے برآمدے کا انتخاب کیا اور دو طرف چادر گھیری، فرش پر دری بچھائی اور محلے کے بچوں کو جمع کیا۔ سب کو قطار میں بٹھا کر قرآن کے اسباق دینے لگی۔ یہ ایک احسن قدم تھا، گھر والوں نے بھی تعرض نہیں کیا، محلے والے بھی خوش ہوگئے۔ وہ اتنی سی تھی مگر جب سبق دینے لگتی تو ایسا لگتا جیسے بزرگی کے اوج پر ہے۔ اس کی نگہداشت میں بچے قرآن شریف پڑھنے لگے۔ کسی نے ایک پارہ ختم کیا، کسی نے دو کہ اس کا دل بھر گیا اور وہ "برآمدہ اسکول" بند ہوگیا کیونکہ وہ بچوں کی کند ذہنی سے اکتا گئی تھی تنگ آگئی تھی۔ پھر اسے ایک نیا شوق سوجھا۔ والد اور والدہ کی باتوں سے اس نے ایک نیا لفظ سیکھا تھا۔ وہ لفظ تھا "پلاٹ"۔ اس نے مطلب پوچھا پھر کہنے لگی کہ میرے دماغ میں تو سیکڑوں پلاٹ ہیں۔ میں بھی کہانیاں لکھوں گی۔ اس بات کا خوب مذاق اڑا مگر وہ ڈھیٹ بنی رہی۔ 1936ء میں پرستان تھیٹر کمپنی لکھنو آئی۔ اس کے والد نے اسے عائشہ اور ہاجرہ کو اپنے ایک قریبی دوست کے ساتھ لکھنو بھیجا تاکہ بچوں کی تفریح ہوجائے۔ وہیں شوکت تھانوی سے ملاقات ہوگئی۔ ان دنوں شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل" کا بڑا چرچا تھا۔ گھر میں والدین سے سن چکی تھی کہ وہ بہت بڑے مصنف ہیں۔ اس نے پہلی ملاقات میں ہی ان سے کہہ دیا کہ میرے دماغ میں بھی بہت سے پلاٹ ہیں، میں بھی کہانیاں لکھوں گی۔ شوکت تھانوی دوسروں کی طرح ہنسے نہیں بلکہ سراہا اور کہا ہاں ہاں ضرور لکھو۔ 1937ء میں والد کا انتقال ہوگیا اور تب یہ راز کھلا کہ معقول تنخواہ پر حاتم طائی جیسی زندگی گزارنے والے نے سات بچوں کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے۔ زندگی ابتلا سے بھر گئی۔ ماں ساتوں بچوں کے ساتھ لکھنو منتقل ہوگئی کہ اب وہاں رہا کیا تھا۔ رہنے کے لیے اسی جگہ کو منتخب کیا تھا جہاں والد کے پیر نانا کا مزار تھا۔ مزار پر روز گھی کے چراغ جلتے تھے۔ شہر کے مختلف حصوں سے عورتیں آکر گلگلوں سے طاق بھرا کرتی تھیں۔ ایک رات وہ سب فاقے سے تھے کیونکہ ماموں کا منی آرڈر نہیں آیا تھا۔ سب سے چھوٹا بھائی توصیف جو چھ سال کا تھا وہ بھوک سے بے تاب ہوکر گلگلے اٹھالایا۔ ماں نے یہ دیکھا تو کٹ کر رہ گئی۔ اس نے ننھے سے بچے کو سمجھایا بیٹے یہ غربا اور مساکین کا حق ہے، کسی کا حق غصب کروگے تو خدا تمہارا حق چھین لے گا۔ پتا نہیں بچے کو یہ گہری بات سمجھ آئی یا نہیں لیکن اس نے بھوک پر مساکین کے حق کو ترجیح دے دی اور وہ گلگلے وہیں رکھ آیا پھر بھوک سے کروٹ بدلتے بدلتے سوگیا۔ ایسے ہی مسائل بھرے ایام کا سامنا تھا اور کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ ایک ماموں تھے جنہوں نے بہن کی خاطر قربانیوں کی فصیل کھڑی کردی تھی۔ بہن بھانجے بھانجیوں کی خاطر پردیس کی نوکری قبول کرلی تھی۔ وقت گزرتا جارہا تھا کہ اسے پرانے شوق نے آگھیرا۔ اسے یاد تھا کہ اس کے دماغ میں بہت سارے پلاٹ ہیں۔ بس انہیں کاغذ پر اتارنے کی دیر ہے۔ اسی خام خیالی نے اسے کہانی لکھنے پر اکسایا اور وہ قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں کئی صفحات پر مشتمل کہانی تیار کرلی اور پھر اسے ایک معروف پرچے میں بھیج دی۔ یہ 1942ء کی بات ہے۔ اس وقت لڑکیوں کو تعلیم دینا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ایسے وقت میں اس نے کہانی لکھ کر بھیجی تھی۔ کہانی تو نہ چھپی مگر مدیر نے حوصلہ افزائی کے لیے اس کے نام پر ایک پرچہ بھیج دیا۔ رسالے کے آنے کی اسے اتنی خوشی ہوئی کہ وہ سب کچھ بھول گئی۔ نہ کھیلنا کودنا یاد رہا نہ کھانا پینا۔ ایک ایک کو جاکر وہ فخریہ رسالہ دکھانے لگی کہ دیکھو میری اتنی اہمیت ہے۔ اس نے لفافے پر لگی نام کی چٹ اتاری اور سینت کر اسے بکس میں رکھ دیا پھر اس نے کاغذ قلم سنبھال کر ایک اور مضمون لکھا۔ اس بار اس نے پلاٹ نسبتاً بہتر منتخب کیا تھا اس لیے ایک پرچے میں چھپ گیا تو اسے حوصلہ مل گیا اور وہ تواتر سے "خیام" اور "عالمگیر" جیسے معروف رسالے میں چھپنے لگی۔ 1945ء میں لکھنو ریڈیو اسٹیشن سے سید احتشام حسین جیسے ادب دوست کا ایک مضمون نشر ہوا جس میں اس کی کہانی "ننھ" کی بڑی تعریف تھی۔ پھر تقسیم کا ہنگامہ شروع ہوگیا اور وہ پاکستان آگئی۔ 1950ء میں اس کی شادی ظہیر بابر سے ہوگئی اسی سال اسے انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور کا سیکریٹری منتخب کرلیا گیا۔ اب وہ بڑی مصنفہ میں شمار ہونے لگی تھی اس مصنفہ کو ہم سب خدیجہ مستور کے نام سے جانتے ہیں۔

☆ اعجاز حسین سٹھار کی آمد نور پور تھل سے۔ ”کاشف زبیر کی بے وقت موت پر سب غم زدہ دکھائی دیے۔ گو سانحہ بہت بڑا ہے لیکن صبر کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ ”ذرہ بنا آفتاب“ رنگیلا کی خود اعتمادی، محنت اور لگن کی داستان ہے اس نے رزق حلال کے لیے معمولی کام اور معاوضے سے جی نہ چرایا اور آخر درخشاں ستارہ بن گیا۔ یہ سب قابلِ تقلید وفخر ہے یہ سلسلہ کافی دلچسپ جارہا ہے۔ انور فرہاد مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ”مئی کی شخصیات“ میں فاطمہ بھٹو، مصباح الحق، ضمیر جعفری، مصطفیٰ قریشی، عمر اکمل اور رانی کا احوال معلومات افزا اور دلچسپ ہے جب یہ سلسلہ اختتام پذیر ہو جائے گا تو کافی تشنگی محسوس ہوگی۔ ”سراب“ جن صاحب سے لکھوایا جارہا ہے ایک تجسس ضرور ہے لیکن تحریر پہچاننے سے قاصر ہیں البتہ یہ داستان اختتام کی جانب بڑھ رہی ہے اور آنے والی اقساط کامیابی اور بھرپور دلچسپی سے واقعات کو دامن میں سمیٹ کر منزل کی جانب گامزن ہیں ہم سابقہ دلچسپی اور شوق سے اس سلسلے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور شہباز کو تمام مصیبتوں، پریشانیوں اور آزمائشوں سے سرخرو ہو کر نکلتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ جب ایک نارمل انسان کی طرح اپنی فطری زندگی میں داخل ہوں گے اس لمحے کو ذہن میں قید کرنے کے لیے آنکھیں ترس رہی ہیں اور زندگی رہی تو انشاءاللہ یہ مرحلہ بھی طے کرلیں گے۔ سچ بیانیوں میں ”معصوم مجرم“ میں معصوم لوگوں کو لوٹنے اور انہیں بے وقوف بنانے کے نئے گر متعارف ہوئے ہیں۔ زمانے میں انسان کے نازک اور حساس جذبات سے کیسے کھیلا جاتا ہے اور غلط جگہ پر صلاحیتیں ضائع کرنے والا بھی ایک انسان ہوتا ہے یہاں تو شکر ہے رشید کو جلد عقل آگئی ورنہ مارا جاتا۔ ”بددعا“ میں ارسلان کا پورا گھر بگڑا ہوا تھا۔ صوفیہ کو دولت کی چکاچوند نے ایسا اپنے نرغے میں لیا کہ ہوش حواس گنوا بیٹھی لیکن سسرال میں سب ہوس کے مارے تھے رشتوں کے احترام والی کوئی بات نہ تھی ارسلان لے پالک ہونے کے باوجود قدرے اچھے کردار کا مالک تھا لیکن زندگی کم تھی جس کی سزا صوفیہ نے عمر تمام بھگتنی ہے بھی معمولی لغزش عذاب زندگی بن جاتا ہے نوید کی موت کا بہت دکھ ہوا۔ ”آدھا سچ“ نے حیرت اور صدمے سے آنکھیں کھول دی ہیں۔ خود غرضی یا مجبوری میں انسان کتنا گر جاتا ہے کہ اپنے تباہ ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ ”فیس بک والی“ ایک وقت میں اسمگلر، ڈاکو اور محبت کی دیوی ہے جب وہ اس چنگل سے نکل آئے گی تب پوجنے لائق بن جائے گی۔ ”امانت“ قربانیوں کی کہانی ہے۔ شائستہ ایک ذمہ دار، شوہر پرست اور حالات کا ساتھ دینے والی عورت تھی جب کہ شائلہ معصوم اور بے ضرر لڑکی تھی اور عاطف نے بھی کسی موقع پر شکایت کا موقع نہ دیا۔ وعدہ کیا اور نبھایا، زندگی میں کتنے اتار چڑھاؤ آتے ہیں ہر کام میں اللہ کی مصلحت چھپی ہوتی ہے جو صبر و شکر کرتا ہے آخر فلاح پاتا ہے۔ صفحہ نمبر 197 پر ”جامع مسجد“ کے عنوان سے مسجد قبا کے بارے میں لکھا ہے تو ایک غلطی کی تصحیح کردوں۔ مسجد قبا وہ ہے جس میں دو نفل پڑھنے کا ثواب عمرہ کے برابر ہے۔ مسجد قبا سے شمال میں مسجد نبوی کی طرف چلیں تو راستے میں مسجد جمعہ ایک کلومیٹر کے فاصلے پر آتی ہے۔ مسجد قبا الگ ہے، مسجد جمعہ الگ ہے جو تقریباً بند رہتی ہے۔ شاید نماز کے اوقات میں کھلتی ہو کیونکہ میں خود کئی بار زیارت کے لیے گیا تو دروازہ بند ملا۔ تحیۃ المسجد کے نفل سیڑھیوں پر ادا کیے۔“

☆ محمد خواجہ نے کراچی سے لکھا ہے۔ ”سرگزشت مئی 2016ء کا شمارہ ہر ماہ کی طرح بہت معلوماتی سچ بیانیاں اور آپ بیتیاں پر مشتمل ہے۔ سرورق خوش رنگ۔ دوشیزہ کے سر پر گوٹہ کناری والا دوپٹا آنکھیں بہت روشن اور خوب صورت۔ کاشف زبیر ایک عظیم لکھاری رضائے الٰہی سے بچھڑ گئے، بہت افسوس ہوا دعا ہے مغفرت کردی۔ معلوم نہیں یہ خلا جو وہ چھوڑ گئے ہیں کیسے پُر ہوگا۔ معراج رسول نے ایک چھوٹی سی کہانی میں اپنے ملک کے موجودہ دورِ حکمرانی کی بالکل صحیح عکاسی کردی۔ کرپشن ہی کرپشن، تباہی، مہنگائی نے پوری قوم کو

مفلوج کر دیا ہے۔ دہشت گردی اور بے روزگاری نے نوجوان نسل کو بالکل تباہ کر کے جرائم کی طرف راغب کر دیا ہے۔ شرفا منہ چھپائے پھرتے ہیں۔ ہر چار افراد میں ایک فرد ڈپریشن کا شکار ہے۔ جن کے گھر چند لڑکیاں ہیں وہ موت سے پہلے مر چکے ہیں۔ ہمارا ملک اس برتن کی طرح ہو گیا ہے جس کا پیندہ ہی نہیں ہے۔ جتنا بھی پانی ڈالو کہاں بھرے گا۔ ہر گہری رات کے بعد ایک سویرا ضرور طلوع ہوتا ہے۔ ''سراب'' زبردست جارہی ہے۔ انتہائی چابک دستی سے لکھی جارہی ہے۔ ''تاریخ عالم'' بے حد معلوماتی اور ریکارڈ میں رکھنے کے لائق ہے۔ ''چاند ستارے سیارے'' بے حد تحقیقاتی تحریر، عقل حیران ہے قدرت کی کارسازی پر۔ ''معصوم مجرمہ'' آدمی مجبور ہو کر کیا کر بیٹھتا ہے لیکن تائب ہو جانا بڑی عظمت ہے۔ ''السناک'' ایک ہوائی حادثہ کی بڑی اچھوتی داستان، انسان جان بچانے کی کتنی کوشش کرتا ہے، عزم اور ہمت سے کامیابی مل ہی جاتی ہے۔ شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رکھی ہے۔ ''فیس بک والی'' کہانی کو بہت دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی مگر کچھ غلط بیانی نظر آتی ہے۔ امانت، بددعا، جزائے خیر اور نصیحت بہت عمدہ بہت نصیحت آمیز اور اثر انگیز، حیرت انگیز واقعات، ایک سے بڑھ کر ایک۔ ایک شکایت ہے کہ شکاریات کو شامل نہیں کر رہے ہیں۔ بے حساب لوگوں کو پسند ہے۔''

☆ طاہر نقاش کا ای میل ابوظہبی سے۔ ''میرا نام طاہر نقاش ہے اور میں ابوظہبی میں ہوتا ہوں۔ عرصہ 10 سال سے سرگزشت کا باقاعدہ قاری ہوں۔ کبھی خط لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ میرا اور سرگزشت کا تعلق میرے اسکول دور میں ہی استوار ہو گیا تھا اور اسکول سے کالج پھر یونیورسٹی اور آج جب کہ میں عملی زندگی میں بھی قدم رکھ چکا ہوں اس دوران بہت سے نئے دوست آئے اور پرانے چلے گئے مگر جو تعلق نہیں ٹوٹا تو وہ سرگزشت ڈائجسٹ سے اور یہ صرف اور صرف ''سراب'' کی وجہ سے ہوا جس نے مجھے سرگزشت کا باقاعدہ قاری بنایا۔ گزشتہ دنوں کاشف زبیر صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر سخت صدمہ پہنچا اور سچ بات تو یہ ہے کہ میری خود غرضی کی انتہا دیکھئے مجھے سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ سراب کا کیا بنے گا۔ بہر حال موت برحق ہے مگر آپ نے کہانی کو جاری رکھنے کی جو کوشش فرمائی وہ قابلِ تعریف ہے مگر سچ بات کہوں پہلی بار میرا دل نہیں چاہا کہ سراب کو پڑھوں اب بھی پورا شمارہ پڑھ لیا مگر سراب نہیں پڑھی۔ اچھا ہوتا اگر آپ اس کو ادھورا ہی چھوڑ دیتے ہم کاشف صاحب کے ساتھ ساتھ یہ صدمہ بھی برداشت کر لیتے۔ شاید میری باتیں ناگوار ہوں مگر پھر بھی درخواست کروں گا کہ میری ای میل کو شمارے میں جگہ مل جائے تو بہت مشکور ہوں گا۔ سمجھوں گا میرے دس سال رائیگاں نہیں گئے (کہانی پڑھنے کے لیے ہوتی ہے جب تک آپ پڑھیں گے نہیں تو اندازہ کیسے ہوگا کہ کہانی کیسی ہے۔ ہمارے ہاں کے بہت سے اہم رائٹرز انتقال کر گئے۔ ان کی چھوڑی ہوئی کہانی کو انجام تک پہنچانا ادارہ کی ذمے داری ہوتی ہے کہ لوگ ڈائجسٹ کہانیاں پڑھنے کے لیے خریدتے ہیں۔ یہ قابلِ قدر جذبہ ہے کہ آپ کہانی نہیں مصنف کو پسند کرتے ہیں)''

☆ اویس شیخ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھا ہے۔ ''اس بار سرورق بہت دلکش تھا۔ اداریہ میں لفظی بُنت کیا کمال تھی۔ ہماری دھرتی پاکستان کے ''سوکالڈ'' نمائندوں کا کتنی خوب صورتی سے نقشہ کھینچا۔ دعا تھی کاش ان میں ایک معراج رسول بھی ہوتا اور آخر میں خوب صورت سا شعر لکھ کے اداریہ مزید جاندار ہو گیا۔ زندگی کے آخری ایام میں خود کو ''جاہلِ مطلق'' کہنا بڑے حوصلے کی بات تھی مگر ان کی زندگی کس قدر الجھنوں کا شکار رہی۔ ''معبر خیال'' کی صدارت اس بار جونانی صاحب کے نام ہوئی۔ دل بہت خوش ہوا۔ سدرہ بہن ماشاء اللہ بہت کمال کا لکھ رہی ہیں۔ خالد بھائی صرف پاکستان اور اسرائیل کا تقابلی جائزہ نہ لیں۔ چین بھی درحقیقت ہمارے ساتھ ہی آزاد ہوا تھا۔ بس دو سال بعد وہ دونوں ملک کس کس بلندیوں اور انتہاؤں کو پہنچ گئے اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہماری کشتی ابھی تک کالا باغ ڈیم کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے۔ رانا شاہد طاہر گلزار اور ملک جاوید اپنے بہترین تبصروں کے ساتھ حاضر تھے۔ فردوس صاحبہ! میرا رومانس بھی سرگزشت کے ساتھ اسی طرح کا ہے۔ ''احوالِ نظر'' میں شاعر کی زندگی دشوار گزار اور مصائب والم سے بھری نظر آئی۔ مزید ستم یہ بھی تھا کہ وہی فرسودہ اور جاہلانہ رویوں نے انہیں ان کی موت کے بعد بھی نہ بخشا۔ شاعری کا تو کوئی جواب ہی نہ تھا۔ پارچہ جات، محرم سے مجرم تک کی نکتہ دانی بہت زبردست کاوش تھی۔ سرگزشت میں سچ بیانیوں کے بعد سفرناموں کا تڑکا مجھے طمانیت دیتا ہے۔ ندیم اقبال خوب لکھ رہے ہیں۔ سلمٰی اعوان صاحبہ تو قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ ''احتجاج'' جس کا تک نیم ''دھرنا'' بھی ہے، سنا ہے پیارا پاکستان ایک بار پھر اس کی آغوش میں آنے کو ہے۔ بہت مزے کی تحریر تھی۔ شیراز صاحب خوابوں کی دنیا میں لے گئے لیکن حقیقت کی تو اپنی ہی دنیا ہے۔ ''تاریخ عالم'' سرگزشت کی تاریخ میں ایک اور باب رقم کرے گی، انشاء اللہ۔ ''ستاروں سیاروں'' نے سحر میں جکڑ لیا۔ بھرپور معلوماتی ہے۔ ''معنی کی شخصیات'' میں فاطمہ بھٹو اور یوسف رضی کا تذکرہ پسند آیا۔ السناک حادثے کی کتھا کتنی افسوسناک تھی۔ وہ کتنی لاچاری اور بے بسی کا عالم ہوگا جب ایک انسان کی جان آپ کے سامنے نکل رہی ہو اور آپ کچھ نہ کر سکتے ہوں۔ سچ بیانیوں میں ''معصوم مجرمہ'' پڑھی تو پتا نہیں کتنے لمحات اس ''ننھی معصومہ'' کے ٹرانس میں گزر گئے۔ بھوک کی کوکھ سے کیسے کیسے جرائم جنم لیتے ہیں اور کیسی کیسی صورتوں میں پڑھ کے دل دہل گیا۔ ''بددعا'' پڑھی۔ جب دل ٹوٹتا یا کوئی دل توڑتا ہے تو زندگی ایسے عنوانوں کا موضوع بن جاتی ہے۔ ''آدھا سچ'' سے مجھے

شدید اختلاف ہے آپ ایسی اسٹوریز کیوں چھاپتے ہیں۔ ''فیس بک والی'' کا عنوان ''یہ پری چہرہ لوگ'' ہونا چاہیے تھا۔ صاحب کردار سلمان بھائی آپ کی ہمت اور دلیری کو سلام۔ ''امانت'' عجیب داستان تھی۔ دوسروں کی خوشیوں کے لیے اپنی جان ہارنا کسی کسی کو آتا ہے۔ بہت بیوٹی فل اسٹوری تھی۔ یقیناً یہ ہماری اسلامی تعلیمات ہیں اور ہماری اخلاقیات کی پہچان بھی۔ ''نصیحت'' عبرت انگیز کہانی تھی۔ یہ اکیلے نعمان کی نہیں بلکہ لاکھوں گھرانوں کی کہانیاں ہیں۔ ''ہمت مرداں'' پڑھی۔ ہر انسان کو اپنے اپنے حصے کی انفرٹ کرنا پڑتی ہے تب جا کر اسے کچھ حاصل ہوتا ہے۔ بھٹی صاحب کے انداز تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف خوب صورت انداز تحریر میں ملکہ رکھتے ہیں بلکہ اعلیٰ سوچ اور کھلے دل کے مالک بھی ہیں۔ ''جزائے خیر'' کا نتیجہ ہمیشہ خیر کی صورت میں ہی نکلتا ہے۔ انسان دولت ضرور حاصل کرے مگر اس میں حریص کا عنصر غالب نہیں آنا چاہیے۔ ''انجام'' محبت کی ایک اور ناکام اور عبرتناک داستان تھی۔ قتل در قتل کے بعد بھی نہ خدا ملا، نہ ہی وصال صنم والی صورت حال تھی۔ ایسی خطاؤں کو کیا نام دیا جائے؟''

☆ بشریٰ افضل کی تشریف آوری بہاولپور سے۔ ''اس بار شاہکار ٹائٹل بنایا ہے۔ انکل معراج رسول کی حقیقت پر مبنی باتیں پڑھیں بالکل ہمارے معاشرے کی صحیح عکاسی کی ہے۔ ''جاہلِ مطلق'' یک صفحی سرگزشت میں معلومات کے خزانے میں اضافہ ہوا۔ ''معبر خیال'' میں داخل ہوئے۔ عمران جونانی کو کرسیٔ صدارت پر براجمان پایا۔ بڑے خوش نظر آرہے ہیں۔ محفل کی کمان ہاتھ میں لے کر مختصر اور جامع تبصرہ تھا۔ مبارکاں۔ رانا محمد شاہد کا تبصرہ اچھا تھا اگر ہم ایک ماہ غائب ہوئے تو کسی نے یاد نہیں کیا۔ ''معبر خیال'' کے باسی اسدرہ بانو آپ بھی ہمیں بھول گئیں۔ آپ کا تبصرہ اچھا تھا۔ ناصر حسین رند آپ کا تبصرہ پسند آیا۔ ''جزائے خیر'' حق حلال کی کمائی میں برکت ہے ایمانداری میں برکت ہے انسان تنگ تو ہوتا ہے مگر اجر تو ضرور ملتا ہے۔ وحید کو اس کی ایمانداری کا کتنا خوب صورت خدا نے انعام عطا کیا۔ چاچا عباس کی دعاؤں میں بڑا اثر تھا کہ خدا نے سن لی اور ایمانداری کا صلہ دیا۔ ''ہمت مرداں'' واقعی اگر انسان محنت دل سے کرے تو خدا بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ وحید کی کوشش اور کاوش خدا کی مدد نے اسے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ ہمت مرداں مدد خدا محاورے ایسے ہی تو نہیں بن گئے۔''

☆ سدرہ بانو نا گوری کی آمد کراچی سے۔ ''مئی کے سرورق پر من موہنی سی دوشیزہ بہت دلکش لگی۔ اداریے میں عام آدمی کی کہانی اچھی بھی لگی اور سچی بھی۔ ہائے بے چارہ عام آدمی ذلت، غربت، نفرت، مہنگائی، ظلم ہر ستم سہتا ہے پھر بھی چپ رہتا ہے۔ نہ جانے کب ان وڈیروں، لٹیروں کو ان پر رحم آئے گا۔ ''احوالِ نظر'' میں ساجد امجد نے ظہور نظر کا تذکرہ خوب کیا۔ ساری زندگی اپنوں سے دور بھاگنے والے اس شاعر نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ایک دن وہ اپنی خوب صورت شاعری کی بدولت دلوں میں گھر کر جائے گا۔ ''ملکۂ رنج'' سلمٰی اعوان پچھلے ماہ کی محفل لوٹ لینے کے بعد اس ماہ دوبارہ آئیں اور اس وقت ہمارا دل لوٹ کر لے گئیں۔ ویلڈن سلمٰی اعوان ویلڈن، اتنی اچھی تحریر کے بعد ہم آپ کو ستی اعوان نہیں سلمٰی اے ون کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ کہانی کے ساتھ ساتھ سفرنامہ اس کے علاوہ ایک مخصوص علاقہ کے مخصوص لوگوں کے رسم و رواج، شادی بیاہ کی رسمیں، رہن سہن کے طور اطوار، طریقہ سلیقہ گویا کہانی کیا لکھی ایک قوم کی تاریخ لکھ دی۔ اس کے ساتھ موسموں کی شدتیں، جذبات کی حرارت، محبتوں کی گرمی چاہتوں کی حدت ساتھ ساتھ لفظوں کی بناوٹ اور جملوں کی روانی خاص طور پر وہ جملہ ''تاجور فرادی نکلا، مجھے چھوڑ کر فرار ہو گیا۔'' اور اگلے پیرائے میں اس فرار کی تفصیل آنکھوں کو تادیر برسنے پر مجبور کر دیا۔ کیا بات ہے جی ہمیں تو لگتا ہے کہ آپ کوئی بہت بڑی مصنفہ ہیں جواب ہمارے تعارف میں آگئی ہیں (اس میں شک نہیں سلمٰی اعوان منجھی ہوئی مصنفہ ہیں) اکثریت ایسے جملوں کی تھی جو کئی کئی بار پڑھے پھر بھی لطف دوبالا ہوا، خوش رہیے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں تارڑ صاحب کے قہقہوں اور ندیم اقبال کی دلچسپ یادوں میں اتنا مگن ہوئے کہ وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہو سکا اور ''جاری ہے'' کے الفاظ نے حقیقت کی دنیا میں واپس لا پٹخا۔ ''علاج'' میں ڈیبی نے جان کو زندگی کی طرف لانے کا طریقہ خوب نکالا۔ شلٹر ہوم میں بلتے اپنے ادھورے وجود کے ساتھ زندگی سے جدوجہد کرتے معصوموں نے رلا دیا نم آنکھوں کے ساتھ خدا کا شکر ادا کیا جس نے ہمیں مکمل انسان بنایا ہے۔ ''خواب'' پڑھ کر حیران ہوئے عجب عالم ہے کہ خواب میں کیا گیا اشارہ انسان کی زندگی بدل ڈالتا ہے اور نادان سا بے بس انسان کچھ کر بھی نہیں پاتا۔ ''معصوم مجرمہ'' اس کہانی کی کیا ہی بات ہے، ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے۔ لگتا ہے کہ اس قسم کی کہانیوں کے ذریعے فراڈ کے نت نئے طریقے سکھائے جا رہے ہیں۔ ''جزائے خیر'' یہ ہے۔ وہ کہانی جو اس آپادھاپی کے وقت میں نیکی کی طرف راغب کرتی ہے۔ واقعی نیکی کا صلہ نیکی ہے مگر ہم اس پر یقین ذرا کم رکھتے ہیں خدا ہمیں ہدایت دے۔ ''آدھا سچ'' میں ظالم، سفاک، خود غرض، لالچی، بدنیت، موقع پرست اور نام نہاد آزاد میڈیا کا برہنہ روپ دکھایا گیا ہے۔ آج اس معاشرے میں آدھی سے زیادہ خرابیاں اس مادر پدر میڈیا کی وجہ سے ہیں۔ طاہرہ آپا! آپ آرمی خاندان سے ہو یہ پڑھ کر آپ سے محبت اور بڑھ گئی مگر یہ آپ نے کیا لکھ دیا کہ عورت خدا کی گناہ گار ہے اس نے آدم سے کہا تھا مجھے مانگو؟ ناصر رند! اچھا لگا کہ آپ نے نانا

پا فنکر کا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور رنگیلا کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا اس کو پڑھ کر شعر یاد آ گیا، انہوں نے کہا تھا آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہم عصرو۔ یقین کیجیے ہمیں تو آپ پر رشک آنے لگا ہے کہ آپ نے رنگیلا کو لائیو پرفارمنس کرتے دیکھا تھا یقیناً آپ کو نہیں معلوم ہوگا کہ آنے والا وقت رنگیلا کا ہوگا۔"

☆ فہیم احمد عباسی نے سانگھی بنو عاقل سے لکھا ہے۔ "پہلی مرتبہ خط لکھ رہا ہوں۔ آہ ایک عہد تھا جو تمام ہوا۔ ایک روشن ستارہ تھا جو ڈوب گیا مگر وہ ستارہ اپنی روشنی الفاظ کی شکل میں جاسوسی، سرگزشت، سسپنس کے صفحات پر بکھیر گیا۔ آہ محترم کاشف زبیر صاحب آپ بھی چلے گئے۔ "سراب" کی جو پچھلی قسط تھی اس میں ایک دو جگہ کے علاوہ کہیں شک بھی نہ ہوا کہ یہ قسط کسی اور نے لکھی ہے، ویلڈن اتنی لمبی چوڑی کہانی پر اپنی گرفت بنانا آسان کام نہیں اور سراب کو اتنی جلدی میں ختم کرنے کی وجہ کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں جیسا کہانی کو شروع کیا جاتا ہے اسے ایک دن اختتام پذیر بھی ہونا ہے مگر خدارا جلدی جلدی میں کہانی کے ساتھ ظلم نہ کیجیے گا۔ اداریہ میں معراج صاحب کے شعر نے پھڑکا کے رکھ دیا۔ خطوط کی محفل میں عمران صاحب اور آپا طاہرہ کے خطوط نے متاثر کیا۔ سچ بیانیوں میں "معصوم مجرمہ" پڑھ کر رشید کے کردار پر بہت غصہ آیا۔ مجبوریاں کس انسان کے ساتھ نہیں مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان خود اور اپنے جگر گوشوں کو جرائم کی راہ پر لے جائے جس کا اختتام اکثر تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ بہر حال رشید اس معاملے میں خوش نصیب رہا۔ کبیر بھائی کی سچ بیانی پڑھ کر کانپ گیا۔ یاالٰہی کیا ہم لوگ اب بھی اپنے آپ کو مسلمان اور اشرف المخلوقات کہلانے کے لائق بچے ہیں۔ ہمارے اسلام میں تو یہ کہا گیا ہے کہ جس نے ایک انسان کی جان بچائی گویا اس نے پوری انسانیت کی جان بچائی۔ محترمہ صائمہ اقبال بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ آدھے صفحے میں کسی مشہور شخصیت کا مکمل تعارف کرانا آسان نہیں۔"

☆ انور عباس شاہ کا مکتوب دریا خان بھکر سے۔ "میرے خیال میں اس ماہ کی بہترین کہانی معصوم مجرمہ تھی۔ "شمشال سے ٹورنٹو" کا دوسرا حصہ بھی بے حد شاندار تھا۔ اس کا پہلا حصہ ہی ہمارے دل میں اتر گیا ایک تو اس کی بے حد دلچسپی دوسرا اس تحریر کے آغاز ہی میں ہمارے شہر دریا خان کا ذکر تھا اس مضمون کے اوپر ڈیرہ، دریا خان کے درمیان کشتیوں سے بنے پرانے پل کی تصویر دیکھ کر پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ بہت بہت شکریہ ندیم اقبال صاحب۔ (اس بار تارڑ صاحب اور مصنف کی شمشال میں کھنچی تصویر ہے) "مٹی کی شخصیات" کا مضمون بھی اپنی مثال آپ تھا اس میں شامل مشہور شخصیات کے بارے میں مختصر تحریر اور معلومات ہمیں بہت بھلی لگیں ویسے ایک بات بتا دوں اس مضمون میں کافی مشہور شخصیات شامل ہونے سے رہ گئی ہیں جیسے مالا بیگم، نسیم بیگم، مسعود رانا، بشیر احمد، ایس بی جون، منیر حسین، فردوسی بیگم، سائیں اختر حسین، علن فقیر، روبینہ بدر وغیرہ صائمہ اقبال سے اپیل ہے کہ اس طرف بھی توجہ فرمائیں۔ نیز جنوری 2014ء کے شمارے میں آپ سے میں نے اپیل کی تھی کہ لوک فنکارہ ریشماں ہم سے جدا ہو گئی ہیں۔ ان پر کوئی مضمون لکھ دیں۔ قلم نگری کی داستان "ذرہ بنا آفتاب" رنگیلا کے بارے میں کسی فلمی سچویشن کی طرح ایک پُر اثر تحریر تھی جسے بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ سرگزشت انہی جیسی تحریروں کی تو پہچان ہے۔ برائے مہربانی یہ سلسلہ ٹوٹنا نہیں چاہیے۔"

☆ نجمی رحمان نے برٹ لیٹ یو ایس اے سے لکھا ہے۔ "آپ کا اداریہ دردمندی سے لکھا ہوا اچھا ہے مگر کون سنے گا فغان درویش۔ وطن عزیز میں جو کچھ ہو رہا ہے ہم باہر والوں پر زیادہ انگلیاں اٹھتی ہیں۔ خود کو پاکستانی کہلانا جرم بنتا جا رہا ہے۔ میں نے یہاں کی کئی ریاستیں دیکھی ہیں۔ کینیڈا کی سیر بھی کی۔ انگلینڈ بھی دو دفعہ گھوم پھر لیا۔ لندن کی بہت جگہ دیکھنے والی ہے۔ مادام تساؤ کے مومی عجائب گھر میں سب سے اچھا مجسمہ محمد علی باکسر کا لگا اس کے بعد پرنس ڈیانا کا اور سب سے زیادہ رش شاہ رخ خان کے مجسمے پر تھا۔ یہ آج سے دس سال پہلے کی بات ہے۔ برمنگھم بالکل پاکستان کا گاؤں لگتا ہے۔ یعنی تھوڑی ٹوٹ پھوٹ سڑکوں پر، کاغذ گرد و غبار بکھرا ہوا۔ پورے لندن میں چھوٹے چھوٹے گھر تنگ سڑکیں ہر وقت برستی بارش البتہ مانچسٹر بالکل امریکا کی طرح خوب کھلا کھلا، بڑی سڑکیں بڑے بڑے گھر وہاں دو ماہ رہی۔ پتا چلا انگلینڈ کا سب سے بڑا خوب صورت مال یہاں ہے اور سب سے بڑی جھیل کی سیر کی۔ تو اب ہوٹل میں بے شمار قسم کے کھانے کھائے خیر یہ تو بر سبیل تذکرہ ہے۔ کہنا یہ ہے کہ میرے پاکستان سے اچھا خوب صورت ملک دنیا میں نہیں۔ یہ ایسا باغ ہے جس کا پھل تو سب کھانے کو بے تاب مگر اس کی دیکھ بھال صحیح کرنے کو کوئی تیار نہیں۔ پاکستان کی صنعتوں کا جواب نہیں، کپڑا بہترین سلائی لاجواب کڑھائی خوب صورت۔ خود انڈیا والے بھی تعریف کرتے ہیں۔ یہاں چھوٹی سے بڑی چیز چائنا کی پسند کی جاتی ہے۔ جب کہ پاکستان میں کئی گنا اچھی چیزیں بنتی ہیں۔ اگر کرسی نشیں وطن کے مخلص ہوں تو ان چیزوں کے بدلے بہت زرمبادلہ وطن میں آسکتا ہے مگر جیسی انہوں نے وطن میں لوٹ مار مچائی ہوئی ہے اس سے ملک کی ساکھ کو بہت نقصان ہو رہا ہے اور اگر اچھا مخلص دیانتدار رہنما برسر اقتدار آجائے تو اسے زیادہ دیر ٹکنے نہیں دیا جاتا۔ یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل ہوا ہے، بے شمار قیمتی جانوں کی قربانی دی ہے۔ اب اس میں News پڑھنے والیاں بغیر دوپٹے بغیر بازو کی شرٹ پہن کر باقاعدہ بیوٹی پارلر سے سج کر آتی ہیں۔ کیا ٹی وی پر کوئی بھی انہیں بتانے والا

نہیں کہ ذرائع ابلاغ میں آپ پاک وطن کی نمائندہ ہیں۔ یہ فیشن گھروں تک رکھو۔ وزیروں کے دورے ختم نہیں، قومی خزانہ خالی ہو جاتا ہے۔ سوات، گلگت، مری، ایبٹ آباد، آزاد کشمیر، بھوربن ان علاقوں کو سنوارا جائے تو سوئٹزرلینڈ کو مات کریں۔ ہم لوگ اپنے قائداعظم کو کیا جواب دیں گے جو ایک نحیف نزار جسم کے ساتھ کھڑا ہوا تھا تو ہر سچا مسلمان ان کے ساتھ تھا۔ ناصر حسین رند کا تبصرہ اچھا ہے۔ مرد اگر ماں کا فرمانبردار ہو تو ماماز بوائے بیوی کا تابعدار ہو تو زن مرید۔ بھائی اسی لیے قرآن الحکیم میں ماں اور بیوی کا الگ مقام بتایا گیا ہے۔ دونوں رشتوں میں توازن ضروری ہے۔ دراصل شادی سے پہلے لڑکا لڑکی کو تھوڑی نئی زندگی کی تعلیم دینے کی ضرورت ہے تاکہ گھروں میں امن چین رہے۔ آفاقی صاحب کے بعد نواب صاحب بھی ان کے نقشِ قدم پر روانہ ہو گئے۔ سچ تو یہ اچھے لوگ انعام کے طور پر دیے جاتے ہیں دنیا کی رونق میں اضافہ کرنے کے لیے وہ ادیب ہوں، شاعر یا فنکار۔ ہمارے جذبات کی ترجمانی کرنے والے ڈراما قلم کے ایکٹر اور مصنفین سزا کے طور پر چھین لیے جاتے ہیں۔ سدرہ بانو ناگوری اور طاہرہ گلزار، بشریٰ افضل کے تبصرے دلچسپ ہوتے ہیں۔ اس دفعہ کا سرگزشت خوب صورت پھولوں کا گلدستہ ہے۔ سبھی تحریریں زبردست ہیں اور سچ بیانیاں خوب تر۔ (آپ خط ای میل کر دیا کریں تاکہ وقت پر پہنچ جائے)۔"

☆ ذیشان ریاض فیصل آباد کا خط۔ "مئی کا شمارہ ملا۔ سرگزشت کی کہانیاں عام کہانیوں سے ہٹ کر ہوتی ہیں۔ اس لیے ان میں دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ "شعر خیال" میں نامی گرامی حضرات جمع رہتے ہیں۔ کاشف زبیر کی موت کا سن کر افسوس ہوا۔ اللہ جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ میرے تایا جی 22 مارچ کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی مغفرت کے لیے بھی دعا کیجیے گا۔ آگے بڑھے تو احوال نظر میں ظہور نظر کا تعارف ہوا موت تو ایک بھیانک حقیقت ہے۔ ملکہ رنج میں ملکہ تاجور کو پڑھا۔ ان کی شادی کی رسمیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم بھی گلگت پہنچے ہوئے ہیں۔ الفاظ کا چناؤ بہت عمدہ ہے۔ شمالی علاقہ جات کے اپنے رسم و رواج ہیں۔ وادیوں کے اپنے الگ نام، اپنی الگ شناخت قائم ہے۔ ہمیں فخر ہے اپنے علاقے کی ثقافت پر۔ "معصوم مجرمہ" میں واقعی ایسا لگا کہ ایسے مجرم کو سخت سزا ملنی چاہیے جس نے بچی کے ہاتھ میں قلم کی بجائے جرم پکڑا دیا۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔"

☆ فلک شیر ملک نے شاہ گڑھ رحیم یار خان سے لکھا ہے۔ "مئی کا شمارہ پڑھا۔ آدھا حصہ معلوماتی اور باقی واقعاتی لحاظ سے بھرپور تھا۔ سرورق سچ بیانی، "معصوم مجرمہ" کے عین مطابق تھا۔ عبدالماجد دریا آبادی کو جاہل مطلق تو نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ مردِ کامل کے درجے پر تھے۔ اداریے میں ہر دفعہ معراج رسول بڑی زبردست کہانی سناتے ہیں۔ پچھلے ماہ انہوں نے حکمرانوں کی شاہ خرچیوں پر بات کی تھی۔ "شعر خیال" میں جھانکا تو حیرانی ہوئی کیونکہ بیس خطوط میں کسی نے بھی السلام علیکم کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ کیا سلام کرنا منع ہے یا اختصار خط؟ (ہر خط میں سلام ہوتا ہے لیکن اگر مکمل خط شامل کیا جائے تو پھر کہانیاں کم ہو جائیں گی)۔ عمران جونانی کا شاندار تبصرہ تھا۔ طاہرہ گلزار اور ملک جاوید محمد کے تبصروں میں بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ بہن نگہت فرزانہ مبارک ہو آپ کی پہلی تحریر ہی سلیکٹ ہو گئی۔ آپ نے تو تحریروں کی لائن لگا دی۔ دو مختصری کتھائیں میں نے بھی بھیج رکھی ہیں۔ نہ جانے رزلٹ کیا نکلے۔ یسی فردوس احمد! آپ پورا مہینا سرگزشت کا انتظار کرتے کرتے تھک جاتی ہوں گی۔ نسخہ حاضر ہے۔ پھر آپ بور نہیں ہوں گی۔ اٹھائیس کو سرگزشت لیں پانچ سات دن پڑھیں پھر پانچ تاریخ کو جاسوسی پڑھیں اور پندرہ کو سسپنس آ جاتا ہے وہ پڑھیں پھر پچیس کو ماہنامہ پاکیزہ لے لیں۔ مطالعہ کرتے کرتے پھر اگلا سرگزشت پہنچ جائے گا۔ ظہور نظر پر شاندار مضمون تھا اور خوشی کی بات یہ رہی کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا۔ "شمشال سے ٹورنٹو" سفرنامہ پڑھا اور اس کے بعد "ملکہ رنج" پڑھ کر یوں لگا جیسے ایک اچھا سا کھانا کھا کر اوپر سے خالص دودھ کی چائے پی ہو۔ ان خوب صورت تحاریر نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ علاج، خواب، تاریخ عالم، چاند ستارے، مئی کی شخصیات معلومات کا ذخیرہ تھے۔ "ذرہ بنا آفتاب" رنگیلا مرحوم ایک عظیم اداکار اور "بتا اے دنیا والے یہ کیسی تیری بستی ہے" گانے والا اس بستی میں چلا گیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ انور فرہاد کو اللہ عزوجل صحت کاملہ سے نوازے۔ "المناک" اور "سراب" پڑھ کر کاشف زبیر کی یادوں کے دریچے کھل گئے۔ آہ! کاشف زبیر نظروں سے اوجھل ہوئے ہو مگر دل میں ہمیشہ موجود رہو گے۔ ہمارے ساتھ ہونے والے روزمرہ کے حالات و واقعات پر وہ یوں لکھتے تھے جیسے قارئین کی دھڑکنوں کو سنتے اور سمجھتے ہوں۔ "سراب" کو آخری شکل دینے والا رائٹر شاید...... ہے، لکھنے کی رفتار سے ہی پتا چلتا ہے کیونکہ ان کا انداز تحریر ان ناولوں سے ملتا جلتا ہے۔ واللہ بالصواب۔ امید ہے "سراب" جلد اپنی منزل پر پہنچنے والی ہے۔ اس دفعہ تمام سچ بیانیاں، سبق آموز اور سسپنس سے بھرپور تھیں۔ "معصوم مجرمہ" ایک زبردست اسٹوری تھی۔ بچوں کے ذہن خالی سلیٹ کی طرح ہوتے ہیں جو لکھ دیا جائے وہاں نقش ہو جاتا ہے۔ ایس پی سلطان کی انسانیت کو سلام۔ کہتے ہیں کہ انسانیت کا رشتہ ایک بڑا خزانہ ہے اسے لباس میں نہیں، انسان میں تلاش کرو۔"

☆ سعید احمد چاند کراچی سے رقمطراز ہیں۔ "مئی 2016ء کا شمارہ ملا۔ معراج رسول صاحب کا اداریہ پڑھا جو حالات کی مناسبت سے بالکل ٹھیک ہے۔ جاہل مطلق میں عبدالماجد دریا آبادی کا حال پڑھا۔ ان کا نام تو بچپن سے پڑھتے آ رہے ہیں مگر تفصیل اب پر

جاکر معلوم ہوئی۔ جن اصحاب کے طویل تبصرے اچھے لگے ان کے نام یہ ہیں۔ عمران جونانی، طاہرہ گلزار، ناصر حسین رند، ملک جاوید خان سرکانی، عبدالجبار رومی انصاری۔ باقی تبصرے بھی جاندار تھے۔ کہانیوں میں ''ظہورِ نظر'' ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی، سلمیٰ اعوان کی ''ملکہ رنج''، ندیم اقبال کا ''شمشال سے ٹورنٹو''، انور فرہاد کا ''ذرہ بنا آفتاب'' پڑھا۔ انسان اگر حوصلہ کرے تو کیا نہیں ہوسکتا۔ صائمہ اقبال کی ''مٹی کی شخصیات''، ''سراب'' کا اب اختتام قریب ہے۔ رشید احمد کی ''معصوم مجرمہ''، جمیل حیات کی ''بددعا''، محمد کبیر عباس کی ''آدھا سچ''، مشائستہ کی ''امانت''، اکبر بخاری کی ''فیس بک والی''، حسن رزاقی کی ''نصیحت''، وحید ریاست بھٹی کی ''ہمت مرداں''، ناظم بخاری کی ''جزائے خیر''، مشبانہ کا ''انجام''۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی اگر وہ خود پڑھیں تو اپنی خیریت سے مطلع کریں۔''

☆ سید مسرت حسین رضوی کا نامہ شوق کراچی سے۔ ''یوں تو میں سرگزشت ڈائجسٹ کا پرانا قاری ہوں مگر لکھا کبھی نہیں البتہ علمی آزمائش میں دو تین مرتبہ شریک ہوا ہوں لیکن اس دفعہ بیگم کے توجہ دلانے پر خیال آیا تو ''عمیر خیال'' میں پہلی مرتبہ حاضر ہوا ہوں شاید آپ کو پسند نہ آئے۔ بہر حال حاضر ہوں۔ آپ نے چھوٹی سی کہانی سنائی خیال اچھا ہے رہنما تو اپنے آپ کو عوام میں مقبول بنانے کے لیے بہت بھاگ دوڑ کرتا ہے اور ظاہر ہے پیسا بھی خرچ کرتا ہے مگر کس لیے صرف اور صرف کرسی حاصل کرنے کے لیے اور جب کرسی مل جاتی ہے تو پھر تو کون اور میں کون سب وعدے بھی جو کیے ہوتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں۔ جب اعتراض کیا کسی نے تو جواب کیا ملتا ہے، یہ سب جانتے ہیں کہ جب اتنی بھاگ دوڑ کی جاتی ہے تو پیسا خرچ ہوتا ہے اب اس لگائے ہوئے پیسے کو وصول بھی چار گنا کرکے کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تحریر کردہ احوال نظر ایک شاعر کا زندگی نامہ پڑھی کسی حد تک ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک اَن پڑھ بھی شعر کہنے لگتا ہے وہ اس لیے کہ جب دل پر چوٹ لگتی ہے تو آہ نکلتی ہے تو شعروں کا نزول شروع ہو جاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ شعروشاعری سے پیٹ نہیں بھرتا سلسلے وار کہانی ''سراب'' کے مصنف کاشف زبیر کے انتقال سے ایک بہترین کہانی سے ہاتھ دھونے پڑ رہے ہیں۔ کاشف زبیر کے انتقال پر بے حد افسوس ہوا اور ان کی ہمت اور جذبے کی داد دینی بھی ضروری ہے کہ معذوری کے باوجود باہمت جوان تھے۔ بے وقت کی موت پر دکھ بہت ہوا۔ ''علمی آزمائش'' ایک اچھی کاوش ہے۔ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ سچی کہانیوں کا سلسلہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ بعض کہانیوں کو پڑھنے کے بعد دکھ افسوس بھی ہوتا ہے اور دنیا میں موجود برے بھلے انسانوں کی پہچان بھی ہوتی ہے۔ نفرتوں اور محبتوں کی انتہا اور عروج و زوال کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور رونے کو بھی دل چاہتا ہے اور واقعی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ''معصوم مجرمہ'' کہانی موجودہ وقت کی سچی حقیقت ہے جو کئی دفعہ لوگوں کے ساتھ پیش آچکی ہے۔ رشید احمد قابلِ تعریف ہیں کہ حقیقت لکھ دی۔ جمیل حیات کی سچ بیانی نے متاثر کیا۔ کئی واقعات ہو چکے ہیں دولت کی چمک لڑکیوں کو تباہ کردیتی ہے۔ بددعا کسی کی بھی لگتی ضرور ہے۔ آدھا سچ، فیس بک والی، امانت، نصیحت، ہمت مرداں، جزائے خیر، انجام پسند آئیں۔ مزاحیہ اداکار رنگیلا کی زندگی کے واقعات کافی دلچسپ تھے۔''

☆ صائمہ نور نے ملتان سے لکھا ہے۔ ''ماہ مئی 2016ء کا سرگزشت تھوڑا لیٹ ملا۔ سرورق دیدہ زیب تھا۔ معراج رسول صاحب نے اداریہ میں چھوٹی سی کہانی لکھ کر بہت بڑی بات کہہ دی۔ واقعی یہ سچ ہے کہ عوام کو سیاستدان، علماء علم، تاجر حضرات اپنے مفاد کے لیے عوام کو استعمال کرتے ہیں۔ عوام کاٹھ کے اُلو کا کردار نبھائے جارہی ہے۔ ''جاہلِ مطلق'' عبدالماجد دریا آبادی کے بارے میں جان کر حیران رہ گئے۔ ''عمیر خیال'' کی محفل پُر رونق تھی۔ عمران جونانی صدارت کی کرسی پر براجمان مسکرا رہے تھے۔ ان کا خط شاندار تھا۔ محمد اشفاق، سلیم رشید، انجم فاروق ساحلی، آپی سدرہ بانو ناگوری، خالد محمود، محمد خلیل چودھری، رانا محمد شاہد، طاہرہ گلزار، ناصر حسین رند، ملک جاوید محمد خان سرکانی، پیارے عبدالجبار رومی انصاری، صوبی شاہ، محمد احمد رضا، فرزانہ نگہت، اعجاز حسین سُتھار، نہمی فردوس احمد، سعید احمد چاند، اولیس شیخ، محمد عباس کے تبصرے محفل کی رونق بڑھا رہے تھے۔ ہم نے اپنا تبصرہ بڑی عینک لگا کر دیکھا جو نہ ملا اور تاخیری لیٹرلسٹ میں بھی نام نہیں تھا (خط لیٹ ملا)۔ پرویز بلگرامی صاحب کی والدہ اور اطہر علی کے والد کے انتقال پر ملال ہے۔ ان کی مغفرت کی دعا کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ ''ملکہ رنج'' زبردست تحریر تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' جنت نظیر ارض وطن کے حسن کے بیان کا دوسرا حصہ خوب رہا۔ ''احتجاج'' زبردست رپورٹ تھی۔ جدید دور میں بھی آئے روز احتجاج ہورہے ہیں۔ کہانیوں میں ''فیس بک والی'' پڑھی۔ اکبر بخاری نے خوب صورت پیرائے میں روداد بیان کی۔ ایسے بہت سے واقعات ہوتے ہیں۔ سلیمان کو اسی وقت محتاط ہو جانا چاہیے تھا جب منزل کی بات ہوئی۔ ڈرائیور بھی بھی منزل پوچھے اور کرایہ طے کیے بغیر روانہ نہیں ہوتا۔ سلیمان سے غلطی ہوئی اور سزا کے طور پر گردہ نکلوا بیٹھے۔ معصوم مجرمہ، بددعا، نصیحت، ہمت مرداں، امانت، آدھا سچ، انجام، جزائے خیر اعلیٰ تحریریں تھیں۔ ذرہ بنا آفتاب، مٹی کی شخصیات، چاند ستارے، علاج، خواب، المناک، تاریخ عالم اعلیٰ تحریریں تھیں۔''

☆ مسلم رشید لکھتے ہیں۔ ”آپ کی تحریر ایک صفحہ میں موجودہ ملکی حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ واقعی کسی نے ملک کی کشتی کو صحیح سمت نہیں ڈالا بلکہ قائداعظم کے بعد جو سربراہ آیا اس ملکی کشتی میں سوراخ کرنے والا ہی آیا۔ پاکستان کو دولخت کر دیا گیا۔ ملک میں ہر قسم کا نظام آزمایا گیا۔ خدا اس ملک کو سلامت رکھے، آمین۔ ”جاہل مطلق“ محترم عبدالماجد دریا آبادی کے بارے میں مضمون پڑھ کر معلوم ہوا کہ آج ہم جن لوگوں کی تحریریں پڑھتے ہیں ان حضرات وخواتین نے کن کن دشواریوں کا سامنا کیا اور ہم جیسے لوگوں کو خوب صورت اسلامی، معاشرتی، تاریخی تنقیدی تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی جیسی صاحب ذوق اور معاشرتی برائیوں اور بیماری کو اجاگر کرنے والے صاحب علم وتحریر لکھنے والے عدالتوں میں بلائے گئے۔ ان کے مضامین پر پابندی لگائی گئی لیکن آج ان کی کتابوں سے لوگ پیسا کما رہے ہیں۔ ان پر فلم بنائی جا رہی ہے۔ فلمسٹار رنگیلا مرحوم کے بارے میں قسط وار تحریر اچھی ہے۔ ہر فنکار نے محنت سے مقام بنایا ہے۔ ہم لہری، سلطان راہی، مصطفیٰ قریشی، محمد علی، ندیم وغیرہ کے بارے میں دیکھتے ہیں تو وہ بھی آغاز میں مشکلات سے گزرے اور آج ان لوگوں کا نام پاکستانی فلم انڈسٹری میں احترام سے لیا جاتا ہے۔ ہر عروج کے بعد زوال ہوتا ہے اور اسی طرح رنگیلا مرحوم بھی زوال کی طرف گامزن ہو گئے تھے۔ انہوں نے کبڑا عاشق فلم بنائی اور بے انتہا سرمایہ کاری کی تھی لیکن فلم کامیاب نہ ہو سکی۔ اسی طرح وحید مراد جب زوال کی طرف گئے تو ”ہیرو“ بنائی لیکن ساتھی فنکاروں نے ان کے ساتھ وفا نہیں کی اور وہ سلور جوبلی پروگرام میں یہ کہتے نظر آئے تھے کہ لوگ غلط کہتے ہیں کہ معروف اداکاراؤں نے ان کے ساتھ کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ سلطان راہی صاحب کو میں نے ابتدائی دنوں میں ایک پرانی کار کو دھکے لگا کر اسٹوڈیو جاتے دیکھا اور ان کے دوست کے ہمراہ باری اسٹوڈیو میں ملاقات بھی ہوئی تھی وہ ”ڈان کالج“ میری زیر تعلیم تھے اور اس کالج کے پرنسپل ایک روحانی اور جانی پہچانی ہستی جن کا سالانہ عرس میانی صاحب میں ہر سال ہوتا ہے۔ جناب واصف علی واصف۔ اسی طرح ندیم جب مغربی پاکستان میں فلم میں کام مانگنے لگے تو ان کی ناک پر تنقید کی گئی اور جب مشرقی پاکستان کی چکوری ہٹ ہوئی تو وہ تمام پروڈیوسران کے پیچھے بھاگنے لگے۔ نیلو کو شباب کیرانوی صاحب نے فلموں کے لیے غیر موزوں قرار دیا لیکن جب نیلو سات لاکھ کے ایک گانے کی وجہ سے ہٹ ہوئی تو وہ فنکارہ مانی گئی۔ غرض ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن کا مرحوم آفاقی صاحب نے بہت اچھے طریقے سے آپ کے رسالے میں تحریر کیا۔ محمد علی، زیبا کو کمال کے عروج کے زمانے میں وہ حیثیت حاصل نہ تھی جو کمال کو کافی عرصہ حاصل رہی اور وہ واقعی خوب صورت ہیرو تھے۔ ان کی توبہ، زمانہ کیا کہے گا، آشیانہ، شریک حیات وغیرہ گھریلو فلمیں تھیں لیکن ہر عروج کو زوال ہے اور ان کا زوال ذاتی فلموں کے بعد شروع ہو گیا۔ احوالِ ظفر پڑھنے پر موصوف کی تعلیم واجبی نظر آئی لیکن ان کے بارے میں تبصرہ جن حضرات نے کیا ان میں جناب شہرت بخاری مرحوم کا ذکر پڑھ کر اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے دن یاد آ گئے۔ وہ اردو (ایڈوانس) پڑھاتے تھے اور ہم لوگ تمام پیریڈ لکھتے رہتے تھے۔ بہت خوب صورت گفتگو کرتے تھے۔ اللہ ان کو جنت الفردوس عطا کرے، (آمین)۔ تمام بڑے لوگوں کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگتا ہے، ان کی تعلیم واجبی ہوتی تھی لیکن خدا نے ان میں تخلیقی صفات دی ہوئی تھیں۔ ”خواب“ بھی ایک معلوماتی مضمون ہے۔ واقعی بعض دفعہ انسان خواب سے آنے والے دنوں کے واقعات سے آگاہی پا لیتا ہے اور نبی وپیغمبروں، ولیوں کے خواب عام انسان سے مختلف ہوتے ہیں۔ ”تاریخ عالم“ ایک معلوماتی مضمون ہے اور اس دفعہ مسلمانوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی حکمتوں کو یورپ، ایشیا، افریقا وغیرہ میں پھیلایا لیکن غلط پالیسیوں اور غلط حکمرانوں کی وجہ سے مسلمان اندلس، ہسپانیہ، بغداد، ہندوستان وغیرہ سے اپنی حکمرانی کو ختم کروا بیٹھے۔ مغلوں کا دور اور ان کا زوال تاریخ میں ایک عبرت ناک نظر آتا ہے۔ مسلمانوں نے ہر قسم کے علوم میں آگاہی حاصل کی اور غیر مسلموں نے ان سے فائدہ اٹھایا اور ہم لوگ عیش وعشرت میں پڑ کر تباہ ہو گئے۔ ہر جگہ ہمیں لارنس آف عریبیا نظر آتا ہے۔ غرض مسلمانوں کی پستی ان کی بداعمالی کی وجہ سے ہے۔ ہماری اپنی تاریخ مسخ ہو چکی ہے اور علامہ اقبال کے اشعار ہماری آج کی تنزلی کی نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔ مسلمان ممالک میں تباہی ہو رہی ہے۔ صائمہ اقبال کا شخصیات مگی بہت خوب ہے اور ہر ماہ ہمیں بعض مشہور شخصیات سے آشنائی ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ اشعار کا سلسلہ اور ایک شخصیت کا سوالنامہ اور چھوٹے چھوٹے واقعات اور مختلف واقعات کے ترجمے اور دیگر مضامین اس رسالے کی شان ہیں۔ آپ سے عرض ہے کہ فلموں کے سلسلے میں جس فنکار کو تحریر میں لایا جائے اس کی فلموں کی تصاویر شامل کیا کریں اس سے رسالہ میں رونق آ جاتی ہے (ہم تصویر کی جگہ لفظی تصویر دیتے ہیں تاکہ پڑھنے والے مطمئن ہو جائیں)۔ اُمید ہے آیندہ یہ سلسلہ جاری فرمائیں گے۔“

☆ فرہاد علی نے کوٹ عبدالمالک سے لکھا ہے۔ ”اس ماہ شریر بچی کی وجہ سے سرورق اچھا لگا۔ زمین کی گردش کی رفتار پڑھ کر حیران ہو گیا ہوں کیا آوارہ سیارچے یا مدار ستارہ اتنی تیز رفتاری سے گردش کرتی زمین میں دھنس سکتا ہے۔ کاشف زبیر کی وفات کا بہت دکھ ہوا۔ پتا نہیں ایسا مصنف پھر نصیب ہوگا کہ نہیں۔ ”سراب“ اب اچھی جا رہی ہے۔ اللہ معراج رسول اور ادارہ جاسوسی پبلی کیشنز کے تمام اسٹاف کو صحت اور لمبی عمر دے۔“

☆ نہی فردوس احمد کی گل افشانی گوجرانوالہ سے۔ ”پچھلے دنوں محترم نواب محی الدین اور کاشف زبیر کے گزر جانے کی اندوہناک خبریں یکے بعد دیگرے سننے کو ملیں۔ دل و دماغ صدمے سے بوجھل ہو گئے ہیں۔“

☆ نامعلوم شخص کا خط نامعلوم مقام سے، جنھوں نے خط کمپوز کرتے وقت نام دینا گوارہ نہیں کیا۔ ”پچھلے دس سال سے سرگزشت کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ آخری بار غالباً 2012ء میں ”عکسِ خیال“ میں لکھنے کی جسارت کی تھی۔ قریباً ایک سال سے کچھ تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے اس مطالعہ کا تسلسل ٹوٹا ہوا تھا لیکن یہ سوچ کر کہ بعد میں اکٹھا پڑھوں گا ہر ماہ رسالہ خرید لاتا تھا۔ اپریل کے آخر میں اپنا فائنل ریسرچ پروجیکٹ جمع کروانے اور بی ایس آنرز جیولوجی کی ڈگری وصول کرنے کے بعد جب شمارے پڑھنا شروع کیے تو قلمی الف لیلیٰ کو نہ پا کر سرگزشت نامکمل سا لگا۔ اللہ پاک آفاقی صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، (آمین)۔ مجھے ان کے لکھنے کا انداز بے حد پسند تھا۔ اپریل کے شمارے میں ”سراب“ کے نیچے خالی جگہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے، (آمین)۔ جہاں تک سراب کے نئے مصنف کا سوال ہے تو اس انداز میں ایکشن کو بیان ایک ہی مصنف کر سکتا ہے ان کی تحاریر غالباً 2012ء تک جاسوسی کے آخری صفحات پر کبھی کبھی نظر آتی تھیں لیکن پھر کبھی ان کا نام نہیں دیکھا۔ بہر حال ادارے سے درخواست ہے کہ ”سراب“ کے اختتام کے بعد ایسی ہی ایکشن سے بھرپور کہانی شامل کی جائے۔“

☆ عبدالجبار رومی انصاری لکھتے ہیں۔ ”معصوم مجرمہ“ میں اس کے ابو نے توبہ کر لی جس نے معصوم راحیلہ کو بھی جیب تراشی پر لگا دیا تھا ورنہ وہ بھی جانے برائی میں کہاں جا پہنچتی۔ رشید احمد کی آپ بیتی اچھی لگی جو بہت سوں کے لیے باعثِ عبرت ہے۔ خوب صورت ناگن، فیس بک والی ثناشا نے سلمان سے اپنی محبت تو جتائی لیکن پیسے سے مجبور ہو کر گردہ بھی نکال لیا اور اپنی محبت ہی سے 75 لاکھ بھی اسے دے دیئے ورنہ گردہ تو گیا ہی تھا۔ ملنا بھی کچھ نہیں تھا۔ میں آپ کی محرومی کا ازالہ چاہتی ہوں اور اپنا پہلا بچہ بھی آپ کو دوں گی اور پھر شائلہ نے اپنا فرض پورا کیا لیکن بچہ دے کر خود اگلے جہان سدھار گئی۔ شاید وہ بھی جانتی تھی میں کسی کی امانت کے لیے زندہ ہوں۔ شائستہ کراچی کی اسٹوری بیسٹ رہی۔ جزاک اللہ خیر، نیت اچھی ہو تو اس کا پھل ضرور ملتا ہے کہیں قدم ڈگمگا بھی جائیں تو اوپر والا سنبھال لیتا ہے وحید اور نازیہ نے حلال روزی پر اکتفا کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بانہیں بھی پکڑ لیں۔ ناظم بخاری کی ”جزائے خیر“ اچھی رہی۔ ”سراب“ لکھنے والے تو منزل پا گئے اب باقی ماندہ بھی عنقریب پوری ہونے والی ہے۔ دیکھیں شہباز، ہارن سے کیسے دو ہاتھ کرتا ہے۔ ”تاریخ عالم“ میں 1300ء سے 1707ء تک کے حالات و واقعات اختصار کے ساتھ جامع معلومات دے گئے۔ ہر زمانے کے حالات نہایت دلچسپی کے حامل رہے۔ جس میں ہر گزرتے دور میں انسانی تمدن کے نئے نئے رنگ دیکھنے کو ملے۔ خواب ہوتے ہی دلچسپ ہیں کہیں تو سوتے میں لبوں پر مسکراہٹ جاری ہوتی ہے اور کہیں ڈراؤنی کیفیت میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھتے ہیں۔ بہر حال سچے خواب سچے ہی ہوتے ہیں جن سے لوگوں نے بڑے بڑے فائدے بھی اٹھائے ہیں۔ ”چاند ستارے سیارے“ بہت اہم اور دلچسپ تحریر ہے۔ خدا کی قدرت میں ایسی ایسی نشانیاں پا کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور سوچ بھی ختم ہو جاتی ہے ایسی لامتناہی وسعتیں جو خدا ہی بہتر جانتا ہے اس کی کائنات کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ چاند میری زمین پھول میرا وطن۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ نے تو اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے۔ جنگلی گلاب، قراقرم اور راکاپوشی کی چوٹیاں، ہنزہ کی شام، گلگت کا قلعہ، جھرنوں کی مترنم آوازیں، شمشال دریا کی لطف اندوزی اور سیاح کے لبوں پر پردیسی سے نہ اکھیاں ملانا...... ایسے میں ان دیکھا ہر منظر ہی آنکھوں میں گھوم جاتا ہے اور سفرنامے کا لطف ہی دوبالا ہو جاتا ہے۔ شمالی علاقہ جات کے پس منظر میں ملک رنج نے بھی بہت محظوظ کیا ملک کی گفتگو نے واقعی سحر میں جکڑ لیا۔ سعید خان عرف رنگیلا ذرے سے آفتاب بن گیا سچ کہتے ہیں جن میں ٹیلنٹ ہوتا ہے وہ ضرور ستاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ ”مئی کی شخصیات“ میں فاطمہ بھٹو، علی ظفر، رمزی یوسف نے بہت متاثر کیا۔ ”عکسِ خیال“ سے عمران جونانی کا خلوص نامہ مبارک باد کا مستحق ٹھہرا۔ محمد اشفاق اور سلیم رشید کی رنگ طرازی اچھی لگی۔ سدرہ بانو، محمد خلیل چودھری نے بھی بھرپور تبصرہ نگاری کی ویلڈن۔ رانا محمد شاہد کافی عرصے بعد نظر آئے کیسے ہیں جناب؟ طاہرہ گلزار کی بھرپور آمد سب پر سبقت لے جاتی ہے۔ ناصر حسین رند کے ڈائیلاگ نے ہنسا دیا۔ مطلب نانا کے ڈائیلاگ نے۔ صوبی شاہ آیندہ بھی لکھتی رہیں۔ محمد احمد رضا انصاری اور فرزانہ نگہت کا مختصر پیام بھی اچھا لگا۔ بیت بازی میں جاوید افسر، مہوش صدیقی اور نصرت شاہین کے شعر پسند آئے۔“

لیٹ کمرز: آصف علی، سونیا شاہ، ناصر علی، ملک سرفراز (لاہور)۔ سہیل شاہ (جیکب آباد)۔ واصف علی سید (ملتان)۔ نیاز حسن شاہ (سرگودھا)۔ ابرار مصطفیٰ (کھلابٹ ٹاؤن)۔ قمر ہاشمی (شجاع آباد)۔ اصغر شاہ (گمر ہوپر، گلگت)۔ آغا عباس (کوئٹہ)۔ نعیم اللہ (پشاور)۔ رضوانہ انصاری (حیدرآباد)۔ خاقان خان (العین، یو اے ای)۔

حکیم الشعراء

ڈاکٹر ساجد امجد

کچھ لوگ اندھی آنکھوں سے خواب دیکھتے ہیں گویا زہر کے پیالوں میں زیست ڈھونڈتے ہیں۔ وہ بھی زہر کو قند سمجھتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کی زندگی عجب انداز سے گزر رہی تھی۔ انتہا درجے کی سادگی نے اسے وہ مقام دیا ہی نہیں جس کا وہ متقاضی تھا۔ اردو ادب میں اس نے کئی اضافے کیے۔ اردو کی بے لوث خدمت کی پھر بھی زندگی کی زہرناکی اسے چین لینے نہ دیتی تھی۔

• اردو ادب کے ایک مظلوم شاعر کا زندگی نامہ

صوفی سید رحیم نے زندہ اولاد کی آرزو میں یکے بعد دیگرے چار شادیاں کر ڈالیں۔ لوگ اس آرزو میں شادی پر شادی کرتے رہتے ہیں کہ کسی بیوی سے تو اولاد ہوگی۔ صوفی صاحب کو یہ محرومی بھی نہیں ہوئی۔ ہر بیوی نے انہیں اولاد سے نوازا لیکن ہر تحفہ موت کے ہاتھوں نے چھین لیا۔ وہ ایک شادی سے دوسری شادی تک پہنچتے رہے کہ شاید کسی عورت سے ان کی کوئی اولاد زندہ بچ جائے۔ ایک دو نہیں اکیس اولادیں ہوئیں لیکن ہر بچہ پیدائش کے فوراً بعد ہی فوت ہوگیا۔ حتیٰ کہ چوتھی بیوی سے بھی ایک بیٹی پیدا ہوئی لیکن وہ بھی پیدائش کے چند دنوں بعد ہی وفات پاگئی۔ اب صوفی صاحب کو یقین ہوگیا کہ ان کی قسمت میں اولاد کا سکھ نہیں ہے۔ انہوں نے تہیہ کرلیا کہ اب وہ مزید کوئی شادی نہیں کریں گے۔ بڑھاپا کب کا عمر کی دہلیز پر دستک دے چکا تھا۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ خدا کی قدرت کا انتظار کیا جائے۔ اللہ نے انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنے دیا۔ ان کی چوتھی بیوی صوفیہ نے انہیں ایک مرتبہ پھر خوش خبری سنادی کہ وہ اُمید سے ہیں۔ انہوں نے یہ خبر سنی ضرور لیکن اس طرح جیسے کوئی بادل دیکھ کر خوش ضرور ہوتا ہے لیکن اسے یہ یقین نہیں ہوتا کہ بارش بھی ہوگی۔ اولادیں تو پہلے بھی ہوئی تھیں لیکن زندہ کون بچا تھا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس روز وہ مسجد گئے تو گڑگڑا کر دعا ضرور کی کہ اے اللہ! یہ بچہ میرے بڑھاپے کا سہارا ہوگا تو اسے ضرور زندہ رکھ۔

وہ مسجد سے گھر لوٹے تو اطمینان کا سایہ قدموں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ انہیں یقین سا ہو رہا تھا کہ اس مرتبہ ان کی دعا ضرور سنی جائے گی۔

”صوفی صاحب، میں تو اللہ سے یہ دعا کر رہی ہوں کہ اللہ نے جو بیٹی مجھ سے چھینی تھی وہی مجھے لوٹا دے۔“ ان کی بیوی نے ان سے کہا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو صوفیہ بیگم۔“

”مجھے بیٹیاں بہت پسند ہیں۔ اللہ نے ایک بیٹی دی تھی اسے چھین لیا۔ اب پھر خوش خبری ہے دعا کریں کہ اس مرتبہ بھی مجھے بیٹی ملے۔“

"نیک بخت! بیٹی ہو یا بیٹا سب اللہ کی دین ہے۔ بس یہ دعا کر کہ اللہ جو دے اسے زندہ بھی رکھے۔"

"وہ تو ہے لیکن اگر بیٹا ہوا تو بھی میں اسے بیٹی ہی سمجھوں گی۔"

"تم جو بھی سمجھ لینا تم پر کوئی پابندی تھوڑی ہے۔"

میاں بیوی کے درمیان یہ باتیں تقریباً روز ہی ہوتی تھیں اور ہلکے پھلکے مذاق کے بعد ختم ہو جاتی تھیں۔ صوفی رحیم علی کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ بیٹی ہوتی ہے یا بیٹا۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ اولاد ہو اور زندہ ہو۔

دن گزرتے گئے اور بالآخر پیدائش کا دن آ گیا۔ صوفی صاحب یہ لمحات کئی مرتبہ دیکھ چکے تھے۔ لیکن یہ خوشی ہمیشہ صدمے میں ڈھل گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ زیادہ پُرامید نہیں تھے۔ ان کی بیوی کی بس ایک تمنا تھی کہ پیدائش کے بعد انہیں بیٹی ہونے کی خوشخبری سنائی جائے۔

"مبارک ہو صوفی صاحب، اللہ نے بیٹا دیا ہے۔" خاندان کی ایک عورت نے خوشخبری سنائی۔

"وہ جو بھی دے اس کی مرضی۔ بس اللہ اس بچے کو زندگی دے۔" صوفی صاحب نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا اور انتظار کرنے لگے کہ کب انہیں اندر بلایا جائے اور وہ اپنے لخت جگر کو دیکھیں۔

وہ اندر آ گئے۔ گھر کی عورتوں نے بچے کو ان کی گود میں ڈال دیا۔ انہوں نے بچے کے کان میں اذان دی اور دوبارہ ماں کے پہلو میں لٹا دیا۔

"آپ نے کوئی نام سوچا ہے؟"

"ہم نے تو اس کا نام سید احمد حسین سوچ رکھا تھا۔"

"آپ نے جو سوچا ہے وہی ہوگا مگر میرے لیے تو یہ بیٹا نہیں بیٹی ہے۔ میں تو اسے بیٹی بنا کر رکھوں گی۔ اور اپنا شوق پورا کروں گی۔"

"بندی خدا کی اللہ نے تمہیں بیٹا دیا ہے تم اسے بیٹی بناؤ گی۔"

"میری تو یہ بیٹی ہے۔ اس کے کانوں میں سونے کی بالیاں ڈالوں گی۔ ننھا سا لہنگا پہناؤں گی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل لگاؤں گی تو یہ کتنا اچھا لگے گا۔"

"دیوانی ہو گئی ہو۔ اچھے خاصے بچے کو تماشا بناؤ گی۔ خیر جو تمہاری مرضی۔" صوفی رحیم مسکراتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ انہیں مسجد جا کر دو نفل شکرانے کے پڑھنے تھے۔

صوفی صاحب مسجد سے آتے جاتے ایک نظر بچے پر ڈال لیا کرتے تھے۔ انہیں دھڑکا سا لگا رہتا تھا کہ ایک روز یہ بچہ انہیں داغ مفارقت دے جائے گا۔

بچے کی صحت قابلِ رشک تھی۔ یہ امید بندھ گئی کہ خدا نے ان کی سن لی ہے۔ یہ بچہ زندہ سلامت رہے گا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ موت ٹلی نہیں صرف راستہ بدل لیا ہے۔ ابھی بہ مشکل ایک ماہ گزرا تھا کہ ایک رات صوفی رحیم علی پر فالج کا حملہ ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ وفات پا گئے۔

اکیس اولادیں وفات پا گئی تھیں۔ ایک بیٹا زندہ بچا تھا تو موت نے خود ان کی زندگی چھین لی۔

صوفی رحیم کا سایہ کیا اٹھا۔ دھوپ نے گھر دیکھ لیا۔ رشتہ داروں نے تسلی ضرور دی لیکن کون کس کا سہارا بنتا ہے؟ تعلیم و تربیت کا تمام بار والدہ پر آن پڑا۔ صوفی صاحب کوئی صاحب ثروت آدمی نہیں تھے۔ تھوڑی بہت جائیداد تھی اسے بیچ بیچ کر گزارا کرنے لگیں۔

سید احمد حسین سے پہلے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جو چند دنوں بعد وفات پا گئی تھی۔ والدہ اس کی یاد میں تڑپا کرتی تھیں۔ انہوں نے احمد حسین کی پیدائش کے وقت ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اسے لڑکی بنا کر رکھیں گی۔ اس وقت تو بات مذاق میں ٹل گئی تھی لیکن جب کہنے سننے کو شوہر نہیں رہا تو انہیں کون روکتا۔ احمد حسین چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو انہوں نے اپنا شوق پورا کیا۔ پہلے تو بڑے ارمانوں سے اس کے کان چھدوائے سونے کی بالیاں ڈال دیں۔ آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر مسی لگائی۔ کچھ دن اور گزرے بال بڑھے تو بالوں میں چوٹی ڈالنے لگیں۔ وہ معصوم بچہ، اسے کیا خبر کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔ وہ بڑے مزے سے سولہ سنگھار کر کے، نین مٹکاتا، لہنگا لہراتا پھرتا۔ لڑکیوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے ادائیں بھی لڑکیوں والی آ گئیں۔ محلے کی عورتوں کے لیے تو وہ کھلونا بن کر رہ گیا۔ خاندان کے بزرگ ٹوکتے تھے لیکن صوفیہ بیگم کسی کی سننے کو تیار نہیں تھیں۔

احمد حسین کی عمر بڑھتی جا رہی تھی اب خود والدہ کو بھی یہ فکر ہونے لگی تھی کہ انہوں نے اس کا جو حال بنا دیا ہے۔ اس حالت میں وہ اسکول کیسے جائے گا۔ دو چار ہمدرد خواتین بھی جب بیٹھتیں تو یہی تذکرہ نکل آتا۔

"بہن، احمد حسین کو تم نے لڑکی بنا کر رکھ دیا ہے کیا یہ مدرسے بھی اسی حلیے میں جائے گا۔"

"ابھی بہت دن ہیں، جب مدرسے جائے گا تو دیکھا

جائے گا۔"

"دن کتنے بھی ہوں چٹکی بجاتے گزرتے ہیں جلدی کچھ سوچو۔ تم نے تو اچھے بھلے لڑکے کو لڑکی بنا کر رکھ دیا ہے کیوں اس کی زندگی خراب کر رہی ہو۔"

"اے لو! میں کیا اس کی دشمن ہوں۔ میں کیوں اس کی زندگی خراب کروں گی۔"

"میرا بچہ خوب پڑھے گا۔ اسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بناؤں گی۔ عزت و وقار کے ساتھ زندگی گزارے گا۔"

"اسی لیے تو ہم کہہ رہے ہیں کہ اللہ نے اسے لڑکا بنایا ہے تو لڑکا ہی رہنے دو۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ میں اسے کل سے لڑکے والے کپڑے پہناؤں گی۔"

دوسرے دن انہوں نے احمد حسین کے لیے کرتے پاجامے کا بندوبست کیا۔ کانوں میں پڑی بالیاں اتار دیں۔ لڑکوں کی طرح اس کے بال بنوائے۔

وہ لڑکوں کے کپڑے پہن کر ماں کے سامنے آیا تو ماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ تو اسے لڑکی کے روپ میں دیکھنے کی عادی تھیں اب ایک لڑکا ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا یہ روپ انہیں قطعی اچھا نہیں لگا۔ خود احمد حسین کا یہ حال تھا کہ وہ لڑکیوں والے کپڑے پہننے کی ضد کر رہا تھا۔ ماں نے گھبرا کر پھر اسے وہی کپڑے پہنا دیے۔

"میں احمد حسین کو گھر پر پڑھاؤں گی۔ قرآن ختم ہونے تک تو یہ میری آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔"

احمد حسین نے پھر وہی کپڑے پہن لیے اور ان کے پاس سپارہ لے کر بیٹھ گیا۔

اب اس کے پاس دو طرح کے کپڑے تھے گھر سے باہر جاتا لڑکوں کے ساتھ کھیلتا تو لڑکوں کے کپڑے پہن لیتا۔ ماں کے پاس قرآن پڑھنے بیٹھتا تو زنانہ کپڑے پہن لیتا۔ کانوں میں سونے کی بالیاں ڈال لیتا۔

وہ جوں جوں بڑا ہوتا جا رہا تھا اسے زنانہ کپڑوں سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ نو دس سال کی عمر ہو گئی تھی۔ اب اسے خود یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ لڑکی نہیں لڑکا ہے اور پھر ایک دن اس نے لڑکیوں والے کپڑے پہننے سے انکار کر دیا۔ ماں کے لیے اس کا انکار غیر متوقع نہیں تھا۔ ان کی ممتا کو ٹھیس ضرور لگی لیکن انہوں نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ انہیں یقین کرنا پڑا کہ احمد حسین لڑکی نہیں لڑکا ہے۔ وہ اپنا شوق پورا کر چکیں اب احمد حسین کو مکمل مرد بننا ہے۔ اب اس کی عمر بھی ایسی ہو گئی ہے کہ اسے مدرسے جانا چاہیے۔

وہ اسکول جانے لگا لیکن اس کی والدہ اس کی تعلیم پر جتنی توجہ دے رہی تھیں وہ تعلیم کی طرف سے اتنا ہی غافل اور بےزار تھا۔ اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلتا اور سارا دن اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہتا۔ یہ گھومنا ہی اس کی شرارت تھی۔ یہی سیر و تفریح تھی۔ اس کی شرارتوں کی شکایت والدہ تک بھی پہنچی۔ محبت اپنی جگہ لیکن تعلیم کے معاملے میں وہ بہت سخت تھیں۔ انہوں نے ذرا سی بھی رعایت سے کام نہیں لیا کبھی پھول کی چھڑی سے نہیں پیٹا تھا اب ڈنڈا اٹھا لیا۔ وہ اس سختی سے کچھ دن کے لیے سنبھل گیا لیکن شرارتوں نے اسے پھر اسکول کی دیوار کے نیچے بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی والدہ نے مجبور ہو کر اسے مدرسہ نظامیہ میں داخل کرا دیا۔ جہاں نسبتاً زیادہ سختی تھی۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی بچہ وہاں سے راہِ فرار اختیار کرے۔ سزائیں بھی ایسی سخت تھیں کہ کوئی بچہ ایک مرتبہ غائب ہونے کے بعد دوبارہ ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

اسے داخل کراتے وقت مجبوری یہ تھی کہ والدہ میں اخراجات برداشت کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ جبکہ مدرسے کے ہاسٹل میں رہنے اور خوراک وغیرہ کے لیے اچھی خاصی رقم درکار تھی۔ انہیں معلوم ہوا کہ غریب طلبہ کو سرکار حیدرآباد کی طرف سے وظیفہ دیا جاتا ہے۔ انہوں نے بھی درخواست دے دی۔ وہ یتیم بھی تھا، غریب بھی۔ درخواست منظور ہو گئی۔ وہ مدرسہ نظامیہ کے وظیفہ خواروں میں شامل ہو گیا۔ روزانہ دال چاول کھاتے اور ہفتہ وار گوشت کی ایک ایک بوٹی پر لڑتے ہوئے فارسی، عربی میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔

حیدرآباد دکن کا ماحول اس وقت علم و ادب کے چرچوں سے گونج رہا تھا۔ جہاں خدا پرستی، دینداری اور انسان دوستی مقصدِ حیات سمجھی جاتی تھی۔ وہ اس ماحول سے اثر لیے بغیر نہ رہ سکتا۔ مدرسے کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ اس کا ایک مشاعرے میں جانا ہو گیا۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ شاعر کیا ہوتا ہے۔ اس کے دوسرے ساتھی تو تفریح سمجھ کر مشاعرے میں بیٹھے ہوئے تھے لیکن وہ دل ہی دل میں خود کو شاعر سمجھنے لگا۔ میں بھی اسی طرح شعر کہوں گا۔ لوگ میرے کلام پر بھی واہ واہ کہیں گے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ شاعری کی کیسے جاتی ہے اسے معلوم نہ تھا۔ وہ مشاعرے سے واپس آ کر دیر تک جاگتا رہا تھا۔ وہ درسی کتابوں میں

اشعار پڑھ چکا تھا۔ لیکن شعر پڑھنا اور بات ہے، شعر کہنا دوسری بات۔ شعر کہے کیسے جاتے ہیں؟ مرزا محبوب علی اسے فارسی پڑھاتے تھے۔ وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔

"مولوی صاحب، یہ جو ہم کتابوں میں اشعار پڑھتے ہیں یا مشاعروں میں سنتے ہیں یہ کس طرح کہے جاتے ہیں۔ میں اگر چاہوں تو کس طرح کہوں۔"

"میاں صاحبزادے یہ تم کس چکر میں پڑ گئے۔ شاعر بنتے نہیں پیدا ہوتے ہیں۔"

"پھر بھی یہ کیسے معلوم ہو کہ فلاں آدمی شاعر پیدا ہوا ہے۔ شعر کہے گا تو معلوم ہوگا ناں۔ سوال یہی ہے کہ کوئی شاعر شعر کہے گا کیسے۔"

"یہ قدرت خود سکھاتی ہے۔"

"پھر بھی کوئی طریقہ تو ہوگا۔"

"طریقہ یہی ہے کہ آدمی کثرت سے شعرا کے دواوین کا مطالعہ کرے۔ شعر کہنے کا ڈھنگ خود بخود آجائے گا۔"

احمد حسین نے اس وقت یہی سمجھا کہ مرزا صاحب یا تو شاعری کے بارے میں کچھ جانتے نہیں ہیں یا بتانا نہیں چاہتے۔ البتہ ایک بات انہوں نے کام کی بتادی کہ شعرا کے دواوین کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس دن کے بعد سے وہ شعرا کے دواوین جمع کرنے میں مشغول ہوگیا۔

ان دنوں ناسخ کا رنگ، شاعری، علمیت اور کمال فن کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ ہر راستہ ناسخ کی لفظی صناعی اور مضمون آفرینی کی طرف سے جاتا تھا۔ لکھنو کی طرح حیدرآباد میں بھی ناسخ کے شاگرد موجود تھے۔ جو ناسخ کی طرزِ شاعری میں شعر کہہ رہے تھے۔ احمد حسین نے بھی کوشش کر کے ناسخ کا دیوان حاصل کرلیا۔ درسی کتابوں کے مطالعہ کے بعد جتنا وقت گزرتا ناسخ کے اشعار پر غور کرنے میں گزار دیتا۔ ناسخ کے دیوان نے شوق کو ابھارا اور وہ شعر کہنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے اچانک شعر ہوگیا۔

نہیں غم گرچہ دشمن ہوگیا ہے آسماں اپنا
مگر یارب نہ ہوا مہرباں وہ مہرباں اپنا

اس نے اس شعر پر خوب اچھی طرح غور کیا۔ بار بار پڑھا۔ اور اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ یہ ہر لحاظ سے مکمل شعر ہے۔ وہ چاہے تو ایسے ہی اور بھی شعر کہہ سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ناسخ کی مشکل پسندی نے اسے اس نتیجے پر بھی پہنچا دیا کہ اچھی شاعری کرنے کے لیے "فارسی" کا جاننا ضروری ہے۔

اس کے نصاب میں گلستان سعدی موجود تھی لیکن کوئی ایسی دوسری کتاب نہیں تھی جو اس کی رہنمائی کرے۔ ایک مرتبہ وہ پھر مرزا محبوب بیگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔ انہوں نے ایک دوسرے استاد کے پاس بھیج دیا جس سے وہ فارسی کی اعلیٰ کتابیں پڑھنے لگا۔

شاعری کا شوق آہستہ آہستہ پروان چڑھ رہا تھا۔ اس وقت کی محبوب صنف "غزل" تھی۔ اس نے بھی غزل کو ذریعہ اظہار بنایا اور اپنے شوق کی تکمیل میں مشغول ہوگیا۔ اس کی غزلوں میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ غزلیں روایت کا تسلسل معلوم ہوتی تھیں۔ البتہ تصوف کی چاشنی، روزمرہ کی زبان اور سادگی قابلِ توجہ ضرور تھی۔

شہ رگ کے قریں وہ رہتا تھا کس طرح گلا کٹ سکتا تھا
نازک سی رگِ گردن نے میری شمشیر کے ٹکڑے کرڈالے

بھر گیا تیری محبت سے میرا دل اتنا
جائے باقی نہیں اب غیر کے کینے کے لیے

آفت ہے آئے دن طلب ملک و مال میں
راحت ہے دوجہاں کی ترک سوال میں

وہ ساتھ ہیں ہر دم نظر آتے نہیں پھر بھی
اللہ مری آنکھوں میں پردہ تو نہیں ہے

جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ شعر کہہ سکتا ہے اچھی خاصی غزلیں جمع ہوگئیں تو مشاعروں میں شرکت کا شوق بھی ہوا لیکن اس وقت کے مشاعرے "تنقید گاہ" تھے۔ ایک ایک لفظ پکڑا جاتا تھا۔ کوئی خامی ہوتی تو برسرِ مشاعرہ اس کا اعلان ہوتا۔ شعرا اپنے اساتذہ کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے۔ یہ بھی ایک عیب سمجھا جاتا تھا کہ کوئی شاعر اپنے کلام پر اصلاح لیے بغیر مشاعرہ گاہ میں چلا آیا ہو۔ اس سے بھی ایک دو مشاعروں کے بعد کثرت سے یہ سوال پوچھا گیا۔

صاحبزادے کس کے شاگرد ہو؟

یہاں یہ حال کہ کسی کو استاد بنانے کا خیال تک نہیں آیا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائیں کہ کس صاحب علم کو استاد بنایا جائے۔

مقامی شعراء میں حبیب کنتوری نامور استاد تھے۔ سینکڑوں شاگرد ان سے کسب فیض کر رہے تھے۔ وہ بھی ان کی خدمت میں پہنچ گیا۔ استاد نے بھی شاگرد کے تیور دیکھے،

کلام کو جانچا، پرکھا اور شاگردی میں قبول کرلیا۔

اس وقت تک اسے اتنی مشق ہوگئی تھی کہ اس نے ایک نظم "دنیا اور انسان" بہ شکل مسدس لکھ کر استاد کی خدمت میں پیش کی۔

ایک مسافر کسی جنگل سے چلا جاتا تھا
ناگہاں راہ میں اک شیر ژیاں کو دیکھا
چڑھ گیا شجر پر وہیں وہ خوف زدہ
شیر نے دیکھا کہ ہاتھوں سے شکار آکے گیا

اس کے ساتھ ہی اپنے لیے "امجد" تخلص تجویز کیا۔

اب وہ احمد حسین نہیں، امجد حیدر آبادی تھا۔

دنیائے شعر میں ابھی کئی معرکے سر کرنے تھے۔ میدانِ تعلیم میں بھی ابھی کئی مرحلے باقی تھے کہ ماں کی ممتا کو ایک اور راہ سوجھی۔ امجد کی عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں ہوگئی تھی۔ سردست کوئی ملازمت بھی نہیں تھی۔ لیکن یہ شوق ہوا کہ امجد کی دلہن گھر میں لائی جائے۔ شاید مشاعروں میں شرکت اور راتوں کو غائب رہنا اس کا سبب بنا ہو۔ ماں نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈالنے کی ٹھان لی۔

"احمد حسین، تجھے یاد ہے میں بچپن میں تجھے لڑکی بنائے رکھتی تھی۔"

"آپ بھی کمال کرتی تھیں اور میں بھی اتنا چھوٹا تھا کہ آپ کی باتوں میں آجاتا تھا۔"

"تجھے معلوم ہے میں یہ کیوں کرتی تھی۔ اس لیے کہ گھر میں ایک لڑکی دیکھنا چاہتی تھی۔"

"وہ تو اچھا ہوا کہ آپ کا یہ شوق جلد ہی ختم ہوگیا۔ ورنہ میں ابھی تک لڑکی بنا رہتا۔"

"کیا اب تو میرا شوق پورا نہیں کرے گا۔ گھر میں ایک نازک سی خوبصورت سی لڑکی ہو۔ کیا تو یہ نہیں چاہے گا۔"

"نہیں امی، اب یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ گھر میں لہنگا پہن کر گھومتا ہوا اچھا لگوں گا ؟ اس وقت کی بات اور تھی مگر اب نہیں۔"

"ارے پگلے، میں تجھ سے کب کہہ رہی ہوں لڑکی بننے کو۔" ماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ابھی تو کہہ رہی تھیں آپ۔"

"میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ گھر میں ایک لڑکی ہو، وہ تیری دلہن بھی تو ہوسکتی ہے۔"

"میری دلہن! وہ کہاں سے آگئی ہماری باتوں کے بیچ۔"

"دیکھ احمد حسین! میری زندگی کا اب کیا بھروسا۔ تیری شادی کردوں، تیری دلہن لے آؤں۔ تیرے بچے کھلاؤں۔ بس یہی میرا ارمان ہے۔"

"امی ابھی میری تعلیم مکمل نہیں ہوئی۔ مجھے منشی فاضل کرنا ہے۔ اچھی سی ملازمت تلاش کرنی ہے۔ اس کے بعد شادی کرتا ہوا اچھا لگوں گا۔"

"تیرے پاس شادی کرنے کے لیے وقت ہے۔ ماں کی بات مان کر شادی نہیں کرسکتا۔" ماں نے بظاہر ناراض ہوکر اس کی طرف سے منہ پھیرلیا۔

کئی روز تک گھر میں تناؤ کی کیفیت رہی۔ ماں بیٹے کے درمیان بات چیت برائے نام رہ گئی۔ بالآخر امجد کو ماں کی بات ماننی پڑی۔ اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی ماں نے دریا میں جال ڈال دیے۔ تلاش بسیار کے بعد انہوں نے امجد کے لیے ایک لڑکی تلاش کرلی۔

اب حیدرآباد شہر میں اس کا نام بھی ہوگیا تھا۔ تعلیم اتنی تھی کہ اچھی ملازمت کی امید کی جاسکتی تھی۔ اس کا رشتہ گیا تو انکار نہ ہوسکا۔ ماں کا ارمان پورا ہوا۔ امجد کی دلہن گھر میں آگئی۔

اس نے تعلیمی سفر جاری رکھا۔ گھر سے دس میل دور ایک جگہ "مولا کا پہاڑ" تھی۔ وہاں ایک عالم بے بدل آغا شوستری تعلیم دیا کرتے تھے۔ وہ ان سے پڑھنے کے لیے جانے لگا۔

تعلیم ابھی جاری تھی۔ شادی کو دو سال ہوگئے تھے۔ والدہ سے کسی بات پر ان بن ہوگئی۔ ایسا خفا ہوا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حیدرآباد شہر سے نکل گیا۔ نہ کوئی منزل نہ کسی خاص جگہ جانے کا ارادہ۔ بس گھر سے دور بہت دور جانا تھا۔ گاڑی پکڑی بنگلور پہنچ گیا۔ یہاں کی خوبصورتی نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ لیکن شہر اجنبی تھا۔ کوئی واقف کار بھی نہیں تھا۔ کس کے پاس جاتا۔ ایک باغ میں جاکر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ کہاں جائے۔ پھر یہی سوجھی کہ رات اس باغ میں گزاری جائے۔ صبح اٹھ کر شہر کی طرف نکلا جائے اور ملازمت تلاش کی جائے۔ اس باغ کی ٹھنڈی ہوا نے بہت جلد اسے نیند کی آغوش میں بھیج دیا۔ ایسی نیند آئی کہ صبح بھی قدرے دیر سے آنکھ کھلی۔ بے اختیار یہ رباعی ہونٹوں پر آگئی۔

فاضل پھر پھر کے سر پھرایا میں نے
اپنی کوشش سے کچھ نہ پایا میں نے

طوفان میں ہے کشتی اُمید مری
لے تو ہی سنبھال ہاتھ اٹھایا میں نے

ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس گھر سے لایا تھا۔ اسی کو تکیہ بنا کر سو گیا تھا۔ یہی اٹیچی کیس سر کے نیچے سے نکالا اور اس ارادے سے باغ سے باہر نکلا کہ کسی سستے ہوٹل کا پتا پوچھ کر وہاں یہ اٹیچی کیس رکھے گا اور ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوگا۔ ابھی وہ باغ سے باہر آیا ہی تھا کہ ایک عمارت پر نظر پڑی۔ دیکھنے میں یہ کوئی اسکول معلوم ہوتا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا۔ ایک مرتبہ پھر اپنی رباعی کے آخری دو مصرعے ذہن میں گونجے

طوفان میں ہے کشتی اُمید مری
لے تو ہی سنبھال ہاتھ اٹھایا میں نے

سنبھالنے والے نے سنبھال لیا۔ امجد نے ایک عیسائی راہب کو اس عمارت سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس سے کچھ معلوم کرنے کے لیے کھڑا رہا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ پوچھتا، عمارت سے باہر آنے والا شخص اس کے قریب آ کر رک گیا اور پہلا سوال اس نے کر ڈالا۔

''ہیلو! ینگ بوائے یہاں کیوں کھڑے ہو؟''

''جب آدمی ڈوبنے لگتا ہے تو بڑی حسرت سے کنارے کی طرف دیکھتا ہے۔''

''ینگ بوائے تم تو شاعر معلوم ہوتا ہے۔''

''شاعر بھی ہوں۔ امجد حیدر آبادی نام ہے۔ لیکن فی الحال تو بیروزگار ہوں اور ملازمت کی تلاش میں ہوں۔''

''یہ سامان بھی تمہارے ساتھ ہے۔ گھر سے بھاگ کر آئے ہو؟''

''ہاں یہی سمجھ لو۔''

''تم بنگلور کا رہنے والا ہے۔''

''نہیں، میں حیدر آباد دکن سے آیا ہوں۔''

''حیدر آباد دکن سے۔ بہت دن پہلے کا بات ہے۔ میں وہاں ایک مشنری اسکول میں پڑھاتا تھا۔ تم اس وقت چھوٹا ہوگا۔ میں تمہاری عمر کا تھا اور اسی طرح گھر سے بھاگ کر آیا تھا۔ حیدر آباد کے ایک آدمی نے ہمارا مدد کیا تھا۔ اب ہم تمہارا مدد کرے گا۔ تم یہ بتاؤ تمہارا تعلیم کتنا ہے۔''

''اردو، عربی، فارسی میں خوب مہارت رکھتا ہوں، منشی اور منشی فاضل کر چکا ہوں۔''

''بس کام بن گیا۔ تم بالکل صحیح جگہ آیا ہے۔'' اس پادری نے کہا۔ ''اس مشن اسکول میں پڑھانے کا نوکری کرے گا۔''

''ضرور کروں گا لیکن فی الحال تو رہنے کے لیے مجھے ایک کمرا چاہیے ہوگا۔''

''اسی لیے تو میں نے اس اسکول کی پیشکش کی۔ یہاں رہنے کا انتظام بھی ہے۔''

''آپ لوگ عیسائی ہیں اور میں مسلمان، آپ کے لوگوں کو اعتراض ہوگا۔''

''بہت جلد ہم تمہیں بھی عیسائی کرلیں گے۔''

''ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں مسلمان کرلوں۔''

دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ پادری اسے لے کر عمارت کے اندر چلا گیا۔

''فی الحال تم میرے کمرے میں رہو۔ میں کوشش کر کے تمہیں کمرا دلا دوں گا۔''

''مجھے کس خوشی میں کمرا مل جائے گا۔''

''تم اگر مشن اسکول میں پڑھانے لگو تو رہائش کا بندوبست خود بخود ہو جائے گا۔''

''آپ لوگ ایک مسلمان کو اسکول میں ملازمت دے دیں گے؟''

''میں کوشش کروں گا۔ اسکول میں فارسی، عربی کے استاد کی جگہ خالی ہے۔''

اس پادری نے کوشش کی اور اسے مشن اسکول میں ملازمت مل گئی۔ اسے ایک مرتبہ پھر اپنی رباعی کے آخری دو مصرعے یاد آ گئے۔

طوفان میں ہے کشتی اُمید مری
لے تو ہی سنبھال ہاتھ اٹھایا میں نے

قربان جاؤں اپنے مالک کے۔ کس سہولت سے رہنے کا ٹھکانہ بھی فراہم کر دیا اور ملازمت بھی دے دی۔ شہر بھی ایسا ملا کہ ہر طرف مناظر قدرت بکھرے ہوئے ہیں۔

اسکول میں پڑھاتے ہوئے چند ہی روز گزرے تھے کہ عیسائی مبلغین نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس کی مذہبی معلومات کچھ کم نہیں تھیں۔ وہ دبنے والا نہیں تھا۔ اس بات کا بھی قائل تھا کہ خدا نے اسے یہاں بھیجا تھا تو اس میں کوئی مصلحت ضرور پوشیدہ ہے۔ خدا کو کوئی کام لینا ہوگا۔ اگر یہ عیسائی مجھے اکیلا مسلمان سمجھ کر دبانا چاہتے ہیں تو یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ مذہبی بحثوں کا دروازہ کھل گیا۔ رات دن مذہبی بحثیں ہونے لگیں۔ ان مبلغین نے طلبہ کو بھی اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔ وہ کلاس میں جاتا تو مناظرے کی سی کیفیت

پیدا ہو جاتی۔

یہاں کے قیام نے اس پر یہ بھی ظاہر کر دیا کہ یہ مبلغ شہر میں گھوم کر اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ بعض سادہ لوح مسلمان ان کے جھانسے میں آ بھی رہے ہیں۔ اس نے ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ عیسائی مبلغ کے ساتھ شہر کے دورے پر نکل جاتا۔ وہ عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتا۔ امجد دوسری طرف مجمع لگائے اسلام کی باتیں سمجھاتا۔ پورا شہر مناظرہ گاہ بن گیا۔

عیسائیوں کے پاس اس کی باتوں کا توڑ تو تھا نہیں۔ اسے تقریر سے بھی نہیں روک سکتے تھے۔ انہوں نے اس کے گرد سازشوں کا جال بچھانا شروع کر دیا۔ یہ مشہور کر دیا کہ وہ بھی دراصل عیسائی ہے۔ مسلمان کا روپ دھا کر مسلمانوں کو ورغلا رہا ہے اور ان کا ایمان کمزور کرنے کے لیے ایسی روایات بیان کر رہا ہے۔ جو آہستہ آہستہ مسلمانوں کو عیسائیت سے قریب کر دیں گے۔ یہ پروپیگنڈہ اس تیزی سے پھیلایا گیا کہ اس کے گرد بھیڑ چھٹ گئی۔ اس پر جملے کسے جانے لگے۔ اسکول میں بھی ایسی فضا تیار کر دی گئی کہ اس کا ٹکنا مشکل ہو گیا۔ یہ سازشیں اس حد تک بڑھیں کہ اس نے ملازمت ترک کر دی اور ایک پارسی ڈاکٹر کو فارسی پڑھنے پر مامور ہو گیا۔

یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔ لیکن اس کے خلاف سازشیں یہاں بھی کام کر رہی تھیں۔ کچھ لوگوں نے اس پارسی ڈاکٹر کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ اسے باور کرانے کی کوشش کی کہ امجد حیدر آبادی جنہیں آپ نے معلم سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ معلم یا صاحب علم نہیں بلکہ تھیٹر کے ایکٹر ہیں۔ وہ اپنی کامیاب اداکاری سے آپ کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ ڈاکٹر کچھ دنوں تو یہ باتیں سنتے رہے۔ پھر ایک دن اس سے پوچھ ہی لیا۔ ”لوگ آپ کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کر رہے ہیں۔“

”کیسی باتیں؟“

”یہی کہ آپ صاحب علم نہیں تھیٹر کے ایکٹر ہیں۔“

”آپ کا کیا خیال ہے آپ کے نزدیک میں کیا ہوں۔“

مجھے تو لوگوں کی باتوں پر یقین نہیں لیکن یہ بھی سوچتا ہوں کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ اگر آپ مجھے اپنی تعلیمی اسناد دکھا دیں تو میں ان لوگوں کو قائل کر سکتا ہوں۔“

”آپ میری اسناد طلب کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے۔ اگر مجھے اسناد ہی دکھانی ہیں تو کسی اور کو دکھاؤں گا، آپ کو نہیں۔ آپ کے دل میں شک آ گیا ہے اس لیے آپ مجھ سے تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ میں معذرت چاہتا ہوں آپ کو نہیں پڑھا سکتا۔“

ڈاکٹر انہیں روکتا رہ گیا لیکن وہ وہاں سے چلے آئے۔

غیرت نے ملازمت چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ اب سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس نے اپنی اسناد اٹھائیں اور ناظم تعلیمات کے پاس پہنچ گیا۔ اسناد پاس تھیں، خطابت میں بے مثال تھے۔ اپنا دفاع اس انداز سے کیا کہ ناظم کے دل پر اس کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اس نے اسی دن سٹی ہائی اسکول بنگلور میں پندرہ روپے ماہوار پر اس کا تقرر کر دیا۔

اس نے اسکول پہنچتے ہی اس انداز سے تعلیم کا آغاز کیا کہ ہر طرف دھوم مچ گئی۔ اس کا لیکچر سننے کے لیے پرنسپل کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو جاتا۔ ایک روز انسپکٹر تعلیمات اسکول کے معائنے کے لیے آیا تو اس سے بھی امجد کی ملاقات کرائی گئی۔ پرنسپل نے اس کا تعارف اس انداز سے کرایا کہ انسپکٹر بھی اس کا لیکچر سننے کا شائق ہو گیا۔ وہ خاص طور پر اس کی کلاس میں بیٹھا اور لیکچر سنتا رہا۔ اس کی قابلیت سے اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت پرنسپل کے آفس میں بلوایا اور اس کی تنخواہ بڑھانے کی سفارش محکمے کو بھجوا دی۔ اسے شاعری سے بھی شغف تھا۔ جب معلوم ہوا کہ امجد صاحب شاعر بھی ہیں تو فرمائش کر کے کلام سنتا رہا۔

”امجد صاحب شعر تو میں بھی کہتا ہوں۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”تو پھر کچھ سنائیے۔ یہ تو بڑی گستاخی ہوگی کہ میں نے آپ سے فرمائش ہی نہیں کی۔“

”اس سے بڑی گستاخی اور کیا ہوگی کہ میں آپ کے بعد پڑھوں۔“

”آپ کو میرے بعد ہی پڑھنا چاہیے ضرور کچھ سنائیے۔“

”ایک شرط پر کہ آپ میرے شعروں پر اصلاح دینے کی ہامی بھریں اور آئندہ سے مجھے فارسی پڑھائیں گے۔“

”میں اپنے آپ کو ہرگز اس قابل نہیں سمجھتا۔ لیکن چونکہ آپ سے کلام سننا ہے لہٰذا آپ کی دونوں شرطیں منظور ہیں۔“

انسپکٹر نے اپنے اشعار سنائے۔ اشعار ایسے تھے کہ اصلاح کی گنجائش قدم قدم پر تھی۔ امجد نے کئی مصرعے بدل دیے۔ کئی دوسری خامیوں کی طرف توجہ دلائی۔

اب امجد انسپکٹر کی کوٹھی پر باقاعدگی سے جانے لگا جہاں اس کی شاندار ضیافت ہوتی۔ شاعری کا دور چلتا۔ دوسرے احباب بھی آجاتے۔ قدر دانی کا ایسا ماحول اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

پرنسپل بھی اس سے فارسی کے اسباق پڑھنے لگا اور یوں انسپکٹر اور پرنسپل دونوں اس کے شاگرد ہوگئے۔ دونوں کی مہربانیاں ہوئیں تو امجد محکمۂ تعلیم کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ ہر وہ سہولت میسر آئی جو ممکن تھی۔

رہنے کو اسکول کا پُر فضا مکان، پڑھنے کو اسکول کا کتب خانہ، خدمت کے لیے طلبہ، قدر دانوں کی ضیافتیں، دوستوں کی محفلیں غرض تمام آرام اور عیش میسر تھا۔ یہ بڑی شاعرانہ فضا تھی۔ امجد نے اس ماحول کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور پوری طرح شاعری کی طرف متوجہ ہوگیا۔ کچھ دنوں رنگین غزلوں سے جی بہلاتا رہا پھر اچانک اس کے قلم سے ''رباعیات'' سرزد ہونے لگیں۔ اردو میں رباعیات ناپید نہیں تھیں لیکن بہت کم شاعر تھے جو اس مشکل صنف سخن کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

رباعی اس صنف سخن کا نام ہے، جس میں مخصوص وزن کے چار مصرعوں میں ایک خیال ادا کیا جاتا ہے۔ گویا رباعی اردو کی وہ مختصر ترین صنف سخن ہے، جس میں مقررہ اوزان، وحدت خیال اور تسلسل بیانی کی پابندی ازبس ضروری ہے۔ رباعی میں وزن کی تخصیص کے ساتھ ساتھ قوافی کی ترتیب کا بھی مخصوص نظام ہے اردو فارسی کے تمام علمائے فن اس پر متفق ہیں کہ رباعی کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر تیسرے مصرعے میں بھی قافیہ آجائے تو عجیب نہیں بلکہ قدما کے نزدیک مستحسن ہے۔

رباعی میں تسلسل بیانی اور خیال کے تدریجی ارتقاء کے خوبصورت اظہار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ رباعی کے چاروں مصرعے زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم مربوط ہوں۔ الفاظ و ترکیب کا انتخاب، موضوع کی مطابقت سے ایسا برمحل ہو کہ اس سے بہتر کا تصور ہی نہیں ہوسکے۔ پہلے مصرع میں مناسب الفاظ کے ساتھ خیال کو روشناس کرایا جائے۔ دوسرے اور تیسرے مصرع میں اس کے خط و خال کچھ اور نمایاں کیے جائیں اور چوتھے مصرعے میں مکمل خیال کو ایسی برجستگی اور شدت کے ساتھ سامنے لایا جائے کہ سننے والا مسخر ہو کر رہ جائے۔ گویا ان چاروں مصرعوں میں ڈرامائی کیفیت ہوتی ہے۔ پہلے مصرع سے بات شروع ہو کر افقی یا ارتقائی کی ترقی کرتی ہوئی آخری مصرع پر بھرپور تاثر کے ساتھ مکمل ہوتی ہے۔ اس لیے چار مصرعوں پر مشتمل یہ صنف مشکل ترین صنف ہے۔

رباعی کے تاریخی ارتقا سے پتا چلتا ہے کہ فارسی رباعی کو ابتداء میں صوفیا نے اپنایا پھر مفکرین و مصلحین اس طرف رجوع ہوئے اور بعد ازاں رباعی فارسی کے عام شعراء کو اظہار خیال کا ذریعہ بن گئی۔ اردو کی دوسری اصناف سخن کی طرح رباعی بھی فارسی سے اردو میں آئی۔ اردو نظم کے تاریخی مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اردو شاعری کے بالکل ابتدائی دور میں بھی رباعیات کہی جاتی تھیں۔ چنانچہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کے کلیات میں متعدد رباعیات موجود ہیں۔ امجد بھی اسی سرزمین دکن کا فرزند تھا۔ اسے بھی ہاتف غیبی نے آواز دی کہ ''رباعی'' کی طرف مائل ہوجا۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ غزل کہنے والے بے شمار ہیں۔ اس بھیڑ میں نام کا چمکنا ذرا دشوار ہے۔ اس نے بھی یہ محسوس کیا کہ رباعی سے اس کی طبیعت کو خاص مناسبت ہے۔ اس نے نہایت غور و خوض کے بعد فارسی رباعی گو شعراء کا مطالعہ شروع کردیا۔ خصوصیت سے سرمد اور ابوسعید ابوالخیر کی رباعیاں اس کے زیر مطالعہ رہیں۔ ان کے مطالعہ سے وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ رباعی کے موضوعات حقائق و معارف، عبادت الٰہی، اخلاق و فلسفہ اور تصوف و عرفان تک خصوصیت سے محدود ہوتے ہیں۔ اس نے اپنی طبیعت کو ٹٹولا تو اس میں بھی یہ باتیں خاص طور پر نظر آئیں۔ اس نے خود کو صوفی، قانع، متوکل اور خدا ترس پایا اور قائل ہوگیا کہ اگر وہ غزلوں کی بجائے رباعی کو اپنالے تو زیادہ کامیابی مل سکتی ہے۔ اس نے ایک ہی رات میں کئی رباعیاں کہہ ڈالیں۔

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں
پھر بھی اثر دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز
کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

......

سانچے میں اجل کے ہر گھڑی ڈھلتی ہے
ہر وقت یہ شمع زندگی جلتی ہے

آتی جاتی ہے سانس اندر باہر
یا عمر کے حلق پر چھری چلتی ہے

......

سوتا ہوں تو چپکے سے جگا دیتا ہے
جب جاگ اٹھتا ہوں پھر سلا دیتا ہے
ہنستے کو رلا دیتا ہے چٹکی لے کر
روتا ہوں پھر ہنس کے ہنسا دیتا ہے

......

انسان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
نادان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
لاحول ولا قوۃ الا باللہ
شیطان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں

وہ رات بھر آنکھوں کو جاگنے کی تلقین کرتا رہا اور رباعیاں کہتا رہا۔ صبح ہوئی تو ذہن بوجھل تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ لیکن ایک انکشاف تھا جس سے وہ ہوکر گزرا تھا۔ رباعی کی صنف سے اس کی طبیعت کو ایک خاص نسبت ہے۔ اس نے ماضی پر نظر ڈالی۔ اسے الطاف حسین حالی یاد آئے۔ اکبر کا خیال آیا۔ فانی یاد آئے۔ انیس و دبیر کا خیال آیا جنہوں نے رباعی کو کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ مرا شمار بھی انہی رباعی گو شعراء میں ہونے والا ہے۔ یہ خیال ہی اس کی سرمستی میں اضافہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہوا اور اسکول پہنچ گیا۔ اسکول سے آنے کے بعد کچھ دیر آرام کیا اور پھر دوستوں کی محفل نے اسے آواز دے لی۔ آج وہ خالی ہاتھ نہیں تھا۔ اس کے خزانے میں کئی انمول ہیروں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے ان کی چمک سے دوستوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنا شروع کر دیا۔

دوست ان جواہر پاروں کو سن رہے تھے اور سر دھن رہے تھے۔ بنگلور جیسے شہر میں یہ رباعیاں بالکل نئی چیز تھیں۔ بہت سے تو یہ گمان کر رہے تھے کہ کوئی قدیم بیاض اس کے ہاتھ لگ گئی ہے جو ایک ہی رات میں اس نے ایسی بے مثال رباعیاں کہہ ڈالیں لیکن زبان کی صفائی، جدید لب ولہجہ، نئے موضوعات صاف بتا رہے تھے کہ یہ امجد کی اپنی تخلیق ہیں۔ دوست کچھ بھی سوچ رہے ہوں۔ امجد تو یہ سوچ رہا تھا کہ ان کی رباعیات کا اصل امتحان تو اس وقت ہوگا جب یہ رباعیات پہنچیں گی۔ ان کے قدر دان بنگلور میں نہیں حیدر آباد میں ہیں۔ تاریخ ادب میں ان کا مقام کیا ہے یہ تو وہی اہل نظر طے کریں گے۔

بنگلور میں نہایت شان سے دو سال گزار دیے تھے۔ ہر عیش یہاں میسر تھی لیکن ماں کی یاد نے ایسا بے قرار کیا کہ سب کچھ چھوڑ کر سامان سفر باندھ لیا۔

وہ حیدر آباد واپس پہنچا تو وہی پہلے کا نس مکھ جوان تھا۔ لمبا قد۔ چھریرا بدن، گندمی رنگت، داڑھی صاف، سفید شیروانی، ترکی ٹوپی، پیروں میں سلیم شاہی جوتے لیکن ظاہری حلیے کے مقابلے میں باطنی طور پر بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اپنے استاد حبیب کنتوری سے ملا تو وہ اس کی رباعیات سن کر دنگ رہ گئے۔ اور اس مشورے کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا کہ آیندہ کے لیے "رباعیات" کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالو۔ یہ تمہاری انفرادیت کو نمایاں کرے گی۔ استاد کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس نے کئی اور رباعیات کہیں اور حیدر آباد میں ہونے والے ایک مشاعرے میں پہنچ گیا۔

ضائع فرما نہ سرفروشی کو مری
مٹی میں ملا نہ گرم جوشی کو مری
آیا ہوں کفن پہن کر اے رب غفور
دھبا نہ لگے سپید پوشی کو مری

سامعین تک اس رباعی کے پہنچنے کی دیر تھی کہ مشاعرے میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ایسا اچھوتا مضمون اور اس شدت کے ساتھ لوگوں نے پہلی مرتبہ سنا تھا۔ لوگ رباعیات کہتے ضرور تھے لیکن رباعیات کو مشاعرے میں پڑھنے کا دستور کم کم تھا۔ امجد برسر مشاعرہ ایک کے بعد دوسری رباعی پڑھ رہا تھا۔ پڑھنے کا انداز بھی ایسا تھا جیسے وہ رباعی کے لیے اور رباعی اس کے لیے بنی ہوں۔ اس عالم سرمستی میں وہ اس رباعی تک پہنچا۔

ہیں مست شہود تو بھی میں بھی
ہیں مدعی شمود تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں
ممکن نہیں دو دو وجود تو بھی میں بھی

مشاعرے کی گرمی دلوں کو جلانے لگی۔ مشاعرہ ختم ہوا تو ہر زبان پر نوجوان امجد کا نام جاری تھا۔ اساتذہ سخن اس بات پر متفق تھے کہ اس وقت امجد سے بڑا رباعی گو حیدر آباد میں نہیں۔ اگر وہ اسی طرح اس راہ پر گامزن رہا تو اردو زبان میں فارسی رباعی گو شعرا کی یادیں تازہ کر دے گا۔

اس دوران منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کر لیا اور ملازمت کا طلب گار رہا۔ شاعری نے ایسی شہرت بخشی تھی کہ ملازمت کے حصول میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ نہایت سادہ

زندگی گزارتا تھا۔ ضروریات ایسی تھیں نہیں کہ کسی اعلیٰ درجے کی ملازمت کی تلاش ہوتی۔ حیدرآباد کے مشہور ادارے مدرسہ دارالعلوم میں بیس روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی تھی اس پر تکیہ کرلیا۔ کچھ سہارا مشاعروں کی آمدنی سے ہوجاتا تھا۔

اس قلیل آمدنی میں ایسی برکت ہوئی کہ اپنا ایک مکان خرید لیا۔ وہ جس بدحالی میں زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے بعد یہ مکان کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ ابھی اس نعمت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک مہینا گزرا تھا کہ سب کچھ تلپٹ ہوگیا۔

اس کا مکان موسیٰ ندی کے کنارے سے محض ساٹھ گز کی دوری پر تھا۔ ایک شاعر کے لیے ندی کے کنارے آباد ہونا اور گھر کے سامنے کھڑے ہوکر ندی کے نظاروں سے لطف اندوز ہونا نعمت سے کم نہیں تھا لیکن یہ نظارے موت کے اشارے بن جائیں گے یہ معلوم نہیں تھا۔ شام سے ہی شور مچ گیا تھا کہ ندی میں طغیانی آرہی ہے۔ نظارہ کرنے وہ بھی گیا تھا۔ پانی کناروں سے ٹکراتا ہوا اچھل رہا تھا۔ وہاں کھڑے ہوئے لوگوں کی باتوں سے اندیشہ ظاہر ہو رہا تھا کہ پانی ابھی اور بڑھے گا اور ممکن ہے کہ کنارے توڑ کر باہر نکل جائے۔ لوگ ایک دوسرے کو مشورے دے رہے تھے کہ قریب کے مکان والوں کو نقل مکانی کرلینی چاہیے۔ بہت سے لوگ گھروں کو مقفل کر کے جا بھی چکے تھے لیکن امجد نے اس خطرے کو اہمیت نہیں دی۔ ریاست کی طرف سے کوئی بھی اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ لہٰذا وہ مطمئن تھا۔ سب کی سنی اور گھر واپس چلا آیا۔ گھر پہنچا تو والدہ نے بھی یہی مشورہ دیا کہ کسی محفوظ مقام پر پناہ لی جائے۔ اس نے والدہ کی بات کو بھی اہمیت نہیں دی۔ اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔ ندی کی طرف سے آنے والے پانی کا شور دل دہلا رہا تھا۔ رہ رہ کر زبان سے نکلتا تھا۔ ”یا اللہ خیر“ امجد نے یہ سوچ کر پاؤں پلنگ سے نیچے رکھے کہ باہر نکل کر حالات کا جائزہ لے لیکن پاؤں لٹکاتے ہی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

”ارے یہ کیا پانی تو ہمارے صحن تک آگیا ہے۔“ اس نے بیوی کو پکارا۔

”احمد حسین اب بھی کہتی ہوں یہاں سے نکلو۔“ ماں کی آواز آئی۔

”ہاں اماں، اب تو نکلنا ہی پڑے گا۔ معلوم ہوتا کہ ندی نے کنارے توڑ دیئے ہیں۔“ اس نے کہا اور پانی

میں چلتا ہوا اس کمرے تک پہنچا جہاں وہ لکھنے پڑھنے کا سامان رکھتا تھا۔ اس وقت صرف اتنا ہی ہوسکتا تھا کہ وہ رجسٹرڈ اٹھالے جس پر وہ اپنی رباعیاں لکھتا رہتا تھا۔ اس نے رجسٹرڈ بغل میں دبایا اور باہر آیا۔ اس کی بیوی دودھ پیتی بچی کو سینے سے لگائے کھڑی تھی۔

"سوچ کیا رہی ہو۔ جلدی نکلو۔ پانی گھٹنوں تک آگیا ہے۔"

گھر کا سارا سامان اسی طرح چھوڑا۔ والدہ، بیوی اور بچی کو ساتھ لے کر محفوظ جائے پناہ کی طرف نکلا۔ باہر بھی قیامت کا سماں تھا۔ جس کا جس طرف منہ اٹھ رہا تھا بھاگے جارہا تھا۔ قریب ہی ایک مستحکم عمارت تھی اس کے دیوان خانے میں رہنے کو جگہ ملی۔

پانی تھا کہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ غصے میں بھری ہوئی موجیں دیواروں سے آکر ٹکرا رہی تھیں۔ یقین ہوتا جارہا تھا کہ یہ دیواریں بھی بیٹھ جائیں گی۔ اچانک اس نے اپنی بغل کو ٹٹولا۔

"تم نے دیکھا تھا، میری بغل میں دو رجسٹرڈ تھے یا ایک؟" اس نے گھبرا کر بیوی سے پوچھا۔

"ہم جب گھر سے چلے تھے تو اندھیرا تھا۔ میں تو یہ بھی دیکھ نہیں پائی کہ آپ کی بغل میں کیا ہے۔"

"میری عمر بھر کی کمائی۔" وہ زور سے چیخا۔ "میری رباعیوں اور غزلوں کے دو رجسٹرڈ تھے۔ میں ایک اٹھا لایا دوسرا وہیں رہ گیا۔" وہ باہر کی طرف بھاگا۔ "ابھی ہم گھر سے زیادہ دور نہیں ہیں تم یہیں ٹھہرو میں دوسرا رجسٹرڈ لے کر آتا ہوں۔"

بیوی نے پیچھے سے کرتہ پکڑلیا۔ "جان سے زیادہ کوئی چیز قیمتی نہیں ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہے ایسے میں کہاں جاؤ گے اور کیا ملے گا۔"

"جان تو ایک دن جانی ہے۔ میرا کلام تو محفوظ رہ جائے گا۔"

وہ بیوی سے کرتہ چھڑا کر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ پانی کے ایک زبردست ریلے نے دیواروں میں بڑے سوراخ کردیے۔

"جلدی نکلو۔ دیواریں گریں گی تو چھت بھی منہدم ہوجائے گی۔"

وہ باہر کی طرف بھاگے۔ پیچھے مڑ کر اپنے گھر کی طرف دیکھا لیکن پلٹ کر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ پانی کا بہاؤ رستہ روکے کھڑا تھا۔ اسی میں عافیت دیکھی کہ آگے کی طرف جایا جائے۔ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ اس عمارت کی چھت تھی جو منہدم ہوگئی تھی۔ شکر بھیجا کہ جلدی نکل آئے۔ پانی کے ریلے کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ خوش قسمتی سے ایک چبوترہ نظر آیا۔ جو اس وقت سطح آب سے قدرے بلند تھا۔ وہ کسی مکان کی چھت کی طرح اس پر چڑھ گئے۔ یہ دعا سہارا بنی ہوئی تھی کہ یا اللہ پانی اس چبوترے تک نہ آئے۔ چند گھنٹوں تک حفاظت نے حصار کھینچے رکھا لیکن رات کے پچھلے پہر جبوترے پر پانی کی سانسوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"پانی چبوترے تک آگیا ہے۔ چبوترے کی دوسری جانب اتر کر کسی محفوظ مقام کی تلاش میں چلا جائے۔"

ابھی وہ چبوترے سے اترے ہی تھے کہ سیل رواں نے اپنی زد میں لے لیا۔ اب پاؤں زمین پر نہیں تھے۔ پانی جدھر بہائے لیے جارہا تھا۔ بہتے جارہے تھے۔ اچانک کسی مکان کی فصیل نظر آئی۔ جس پر پڑا چھپرا ابھی تک سلامت تھا۔ اسی سہارے کو غنیمت جانا۔ ایک مرتبہ پھر بغل میں دبے رجسٹرڈ کو دیکھا۔ کچھ بھیگ گیا تھا، کچھ سلامت تھا۔ بیوی، بچی اور والدہ کو کھینچ کر وہیں لے آیا۔ رات وہیں کاٹی صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو اُمید بندھی کہ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نظر تو آئے گا۔ شاید کسی کی نظر پڑے تو کوئی بچانے بھی آجائے۔ یہ اُمید زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ مکان کی فصیل ڈگمگائی، اس کے ساتھ ہی چھپر بھی ڈگمگایا اور یہ چاروں جانیں پانی میں گر گئیں اور الگ الگ بہنے لگیں۔ امجد کا ہاتھ درخت کی ایک ٹہنی پر پڑا۔ اس نے مضبوطی سے اسے پکڑ لیا۔ بیوی، بچی اور ماں کو بہتے ہوئے دیکھتے رہے۔ بچی کو دادی نے اپنی پیٹھ سے باندھ لیا تھا لہٰذا وہ پانی سے قدرے اونچی تھی۔ امجد درخت سے لٹکے اپنے کنبے کو خود سے دور جاتا دیکھ رہا تھا۔ لیکن ان کے کسی کام نہیں آسکتا تھا۔ درخت چھوڑتا تو خود بھی ڈوبتا۔ تیرنا جانتا نہیں تھا کہ کوشش بھی کرسکتا۔ اچانک ایک بڑی لہر آئی۔ پہلے بیوی ڈوبی، پھر والدہ۔ اس کی بیٹی پانی میں ایسی غائب ہوئی کہ دوبارہ نہ ابھر سکی۔ اس سانحہ جاں کا یہ اثر ہوا کہ درخت کی شاخ ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ موجیں اسے بھی اپنے راستے پر لے چلیں۔ بہتے بہتے وہ وکٹوریہ زنانہ اسپتال کے قریب پہنچ گیا۔ بیمار عورتوں نے ہمت کرکے اسے پانی سے نکالا۔ کنارے پر پہنچ کر اس نے اپنی بغل کو ٹٹولا۔ ایک رجسٹرڈ تو وہ گھر ہی چھوڑ آیا تھا۔ دوسرا پانی

کی نذر ہوگیا۔ مگر اب وہ اس کا ماتم کیا کرتا۔ اس کا تو خاندان ہی موسیٰ ندی کی نظر ہوگیا تھا۔

اسے پانی سے نکالا گیا تو اس کی حالت بہت خراب تھی وہ تقریباً نیم بے ہوش تھا۔ بہت جلد معلوم ہوگیا کہ پانی سے نکالا جانے والا شخص کوئی معمولی آدمی نہیں مشہور شاعر امجد حیدر آبادی ہے۔ ابھی کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا بیت گئی، اس کے خاندان پر کیا گزر گئی۔

یہ معلوم ہوتے ہی کہ امجد حیدر آبادی کو ڈوبتے ہوئے بچالیا گیا ہے، بہت سے لوگ اس سے ملنے کے لیے اسپتال پہنچنے لگے۔ انہی لوگوں میں اس کا ایک شاگرد صابر حسینی بھی تھا جو اپنی والدہ کے ساتھ اس سے ملنے آیا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ امجد کا مکان اور تمام اثاثہ طغیانی کی نذر ہوگیا ہے تو وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔

یہ صدمہ ایسا تھا کہ کوئی اور ہوتا تو زندہ قبر میں پہنچ جاتا لیکن امجد کی قوت ایمانی نے اسے زندہ رکھا۔ اس کے باوجود مہینوں وہ اس صدمے سے باہر نہ نکل سکا۔ جب کچھ ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو اسے اپنے کلام کا خیال آیا۔ دونوں رجسٹر ڈ سیلاب میں بہہ چکے تھے۔ اس نے اپنے حافظہ کو مدد گار بنایا۔ اس کا حافظہ بہت قوی تھا۔ جتنا کلام یاد آتا گیا ایک رجسٹر ڈ پر منتقل کرتا گیا۔ جو کلام رسائل میں شائع ہوچکے تھے وہ فراہم کیا۔ ایک ایک دوست کے پاس گیا۔ ان میں سے بہت سوں نے اس کی رباعیات اپنے پاس محفوظ کررکھی تھیں۔ ان سب کو جمع کیا۔ اس کے باوجود کتنا کلام ضائع ہوگیا کچھ خبر نہیں۔ صابر حسینی اور ان کے والد نے انہیں رہنے سہنے، کھانے پینے غرض تمام جھگڑوں سے بچائے رکھا۔

کسی کے چلے جانے سے زندگی کا سفر رک نہیں جاتا۔ اس کے کانوں میں ماں کے الفاظ گونجتے رہتے تھے۔ جو انہوں نے بہو اور پوتی کے ڈوبتے وقت کہے تھے۔ ”بیٹا میرے دونوں چاند ڈوب گئے۔“

اس کی آنکھوں میں وہ منظر ڈوبتا ابھرتا رہتا تھا۔ جب اس کی والدہ یہ الفاظ کہنے کے بعد خود بھی اس کی نظروں کے سامنے ڈوب گئی تھیں۔ وہ انہیں بچا نہیں سکا تھا۔ اس کے باوجود زندگی تو گزارنی تھی۔ کب تک محتاجوں کی طرح کسی کے سہارے سے زندگی گزارتا رہتا۔ اس نے ماتم کی پوشاک ایک طرف رکھی اور مدرسہ دارالعلوم پڑھانے کے لیے جانے لگا۔ یہاں ایک استاد مولوی سید نادر الدین تھے جو منطق پڑھاتے تھے۔ امجد نے وقت گزاری اور اپنی قابلیت میں اضافے کے لیے ”منطق“ کے اسباق پڑھنے شروع کردیے۔ یہ قربت اتنی بڑھی کہ کبھی کبھی وہ ان کے گھر بھی جانے لگا۔ اس قربت نے مولوی صاحب پر اس کی قابلیت اور شرافت کے جوہر ظاہر کیے۔ مولوی صاحب اس کے حالات سے بھی واقف تھے۔ اور چاہتے تھے کہ کسی طرح وہ موجودہ زندگی سے باہر نکل آئے۔ ان کی ایک صاحبزادی تھی جن کی عمر نکلے جارہی تھی اور ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی حالانکہ خوبصورت بھی تھیں اور خوب سیرت بھی۔ امجد بھی نوجوان تھا۔ بمشکل تیئس کا ہوا ہوگا۔ صاحبزادی کی عمر بھی اتنی ہی ہوگی۔ ان کی خوبصورتی پر جمال النساء نام خوب ہی جچتا تھا۔ مولوی نادر الدین نے یہی بہتر سمجھا کہ جمال النساء سے امجد کی شادی کرادی جائے۔ امجد بھی اپنے صدموں کو بھول کر نئی زندگی شروع کرسکے گا اور ان کے کاندھوں سے جمال النساء کا بوجھ بھی اتر جائے گا۔ سوال یہ تھا کہ امجد کو اس رشتے کے لیے آمادہ کیسے کیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے چند دوستوں کی مدد لی اور دوستوں کو بھی امجد کو آمادہ کرنے کے لیے اچھی خاصی محنت کرنا پڑی۔ کچھ تو وہ اپنی کم آمدنی سے ڈرتا تھا، کچھ مشاغل شب و روز سے۔ بہر حال جب دوستوں کا اصرار بہت بڑھا تو اس نے خود مولوی نادر سے بات کرنا مناسب سمجھا۔

”مولوی صاحب، میری تنخواہ صرف بیس روپے ماہوار ہے، اس میں سے بہت کچھ دوستوں کی خاطر داری پر صرف ہوجاتا ہے۔“

”مجھے سب معلوم ہے، مجھے بتا کیوں رہے ہو۔“

”آپ کو میرے مشاغل کا بھی علم ہے۔ رات دن فکر شعر میں محو رہتا ہوں۔ اکثر راتیں مشاعروں میں گزر جاتی ہیں۔“

”آپ کے یہ مشاغل ہی تو مجھے عزیز ہیں۔“

”آپ کو عزیز ہیں لیکن ایسا نہ ہو کہ آپ کی صاحبزادی کو یہ سب ناقابلِ برداشت ہو۔ پچھلے غم بھی کبھی کبھی تازہ ہوجاتے ہیں اور میں اداس ہوجاتا ہوں۔“

”برخوردار میں نے اپنی صاحبزادی کی تربیت اس طرح کی ہے کہ وہ کبھی تمہیں شکایت کا موقع نہیں دے گی۔“

مولوی سید نادر الدین کی تحریک اور اصرار پر امجد نے جمال النساء سے عقد کرلیا۔

ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ مولوی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ان کی بیوہ، چار لڑکیوں اور ایک لڑکے کا بار

بھی ان پر آ پڑا۔ جبکہ تنخواہ صرف بیس روپے ماہوار تھی۔ ان حالات میں بھی اس نے صبر و شکر اور قناعت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ شاعری کی بدولت بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات تھے۔ لیکن اپنے لیے کسی سے کچھ طلب نہیں کیا۔ بلکہ کسی پر ظاہر تک نہیں ہونے دیا کہ انہیں کس چیز کی ضرورت ہے۔ طرز زندگی بھی ایسا تھا کہ کم آمدنی میں بھی فارغ البالی سے گزر ہوتی رہی۔ لباس کے معاملے میں بھی خوراک کی طرح قناعت پسند تھے۔ ان کی نظر میں لباس مقصد نہ تھا بلکہ تن ڈھانکنے کا ذریعہ تھا۔ معمولی لباس پہنتے۔ گھر میں لنگی باندھتے۔ ملاقاتی چاہے عام آدمی ہو یا کوئی صاحب حیثیت ملنے آتا تو اسی حالت میں ملاقات کرتے۔ کسی کی خاطر تبدیلی لباس کو روا نہ رکھتے۔ البتہ گھر سے باہر نکلتے تو سفید یا خاکستری رنگ کی شیروانی اور ترکی کی کلاہ استعمال کرتے۔ ایک سائیکل تھی جو ان کی سواری کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ بیوی بھی ایسی ملی تھی جو ہر حال میں صابرہ تھی۔ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ آیا۔ انہوں نے اپنی اہلیہ کا نام جمال النساء سے بدل کر سلمٰی رکھ لیا تھا۔

جمال النساء (سلمٰی) کے ساتھ ان کی ازدواجی زندگی مثالی نوعیت کی تھی۔ وہ حسین صورت کے ساتھ حسن سیرت سے بھی مالا مال تھیں۔ علمی مباحث اور شوہر کی شاعری سے دلچسپی رکھتی تھیں۔ ان کا علمی ذوق دیکھ کر وہ بھی ان کی ذہنی اور روحانی تربیت میں ہمہ وقت معروف رہنے لگیں۔

امجد ایک صوفی تھے۔ مذہب کا مطالعہ وسیع تھا۔ کچھ حالات نے بھی تصوف کے بہت قریب کر دیا تھا۔ بہ کثرت قرآن اور حدیث سنا کرتے تھے۔ آیات کریمہ کی تلاوت کرتے یا سنتے تو مطالب پر ان کی گہری نظر ہوتی۔ ان مطالب کو سمجھ کر اکثر رقت طاری ہو جاتی۔ قرأت سننے کا شوق تو عشق کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ حافظ صدیق حسن کی قرأت بڑے شوق سے سنتے۔ نماز جمعہ کے بعد حافظ صدیق کو (امام مسجد) لے کر ان کے کمرے میں آ جاتے اور دیر تک قرآن فرمائش کر کے سماعت کرتے۔ آیات و احادیث ہی سے اس نے اپنی رباعیوں کے عنوانات تلاش کیے۔

تم دعا کرو میں قبول کرتا ہوں
ہر دم اس کی عنایت تازہ ہے
اس کی رحمت بغیر اندازہ ہے
جتنا ممکن ہو کھٹکھٹائے جاؤ
یہ دست دعا کا دروازہ ہے

انہوں نے جو فلسفہ ترتیب دیا وہ بھی قرآن و حدیث سے اخذ شدہ تھا۔

کوشش ہے تمام اپنی ستائش کے لیے
کیا کیا کرتے ہیں ایک خواہش کے لیے
ہر ایک نمود پر مٹا جاتا ہے
پتلے مٹی کے ہیں نمائش کے لیے

......

کم ظرف اگر دولت زر پاتا ہے
مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات پر خسیس
تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

ایک روز اس کی بیوی جمال النساء (سلمٰی) خواب سے بیدار ہوئی تو اس کی حالت ہی دوسری تھی۔ چہرے پر ایسا جمال اور نور تھا کہ اس کی طرف آنکھ بھر کے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اچانک اس کے درجات بلند ہو گئے ہیں۔ خواب میں کچھ ایسے مشاہدات ہوئے ہیں جن سے اس کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ اب تک امجد انہیں تصوف کے رموز سے آگاہ کرتے ہیں۔ اب وہ انہیں سمجھا پڑھا رہی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نامعلوم استاد نے تصوف کے وہ تمام رموز سکھا دیے ہیں۔ جو بڑی بڑی کتابوں سے حاصل نہیں ہوتے۔ لوگوں کو جو کچھ ذکر و فکر کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ مراقبوں سے نہیں ملتا۔ انہیں بغیر کسی مشکل و ریاضت کے حاصل ہو رہا تھا۔ عالم مثال اور گلشن ارواح کی سیر کر رہی تھیں۔ دوران گفتگو امجد پر ایسے ایسے نکات ظاہر کر رہی تھیں کہ اس کے لیے حیران کن بھی تھے اور گھر بیٹھے مفت کی تعلیم بھی۔ وہ بیوی کے فرمودات کو نظم کر کے رباعی کی صورت میں ڈھال رہے تھے۔ غالب کو تو غیب سے مضامین خیال میں آتے تھے۔ امجد کا دامن خیال بیوی کے ارشادات سے معمور ہو رہا تھا۔

واجب سے ظہور شکل امکانی ہے
وحدت میں دوئی کا وہم نادانی ہے
دھوکا ہے نظر کا ورنہ عالم ہمہ اوست
گرداب، حباب، موج، سب پانی ہے

......

ذرے ذرے میں ہے خدائی دیکھو
ہر بت میں شان کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم

ہر ایک میں ہے مگر اکائی دیکھو

یہ سب خیالات عطیہ سلمٰی تھے۔اس کے نقادوں نے بالکل ٹھیک کہا "سچ پوچھیے تو شاعر امجد کو حکیم امجد بن جانے کا موقع شاعری کی تاریخ میں حکیم سنائی کے بعد جو ملا تو اس میں ان کی جبلی اور اکتسابی نکات فائقہ کے ساتھ ساتھ بہت کچھ دخل سلمٰی کی رفاقت کا بھی تھا۔"

امجد کی روحانی تڑپ نے ارادہ کیا کہ وہ سفرِ حج اختیار کرے۔اس کی بیوی مرشد سلمٰی کے کانوں میں بھنک پڑی تو وہ بھی چلنے کے لیے اصرار کرنے لگیں۔اسے بیوی کو ساتھ لے جانے پر اعتراض نہیں تھا۔لیکن مسئلہ یہ تھا کہ سلمٰی حاملہ تھیں۔ان کے لیے حج کے لیے صعوبت برداشت کرنا مشکل نظر آرہا تھا۔لیکن سلمٰی کچھ سننے کو تیار نہیں تھی۔

"جس مالک کے حکم کی پیروی کر رہی ہوں وہ ہر مشکل کو آسان بنانے کی قدرت رکھتا ہے۔" بیوی نے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں لیکن آپ انتظار بھی تو کرسکتی ہیں۔"

"پھر آپ بھی اپنا جانا ملتوی کر دیجیے۔میرے ساتھ اگلے سال چلیے۔"

"اگر میں اگلے سال تک زندہ نہ رہا تو۔"

"یہی بات میں اپنے لیے بھی کہہ سکتی ہوں۔کیا میں اگلے سال تک زندہ رہوں گی۔"

"میں تو آپ کی حالت دیکھ کر کہہ رہا تھا۔"

"میری حالت کی پرواہ نہ کریں۔میرا اس سال حج پر جانا بہت ضروری ہے۔شاید پھر یہ اعزاز مجھے نہ مل سکے۔"

انہوں نے شدید اصرار کیا اور امجد کے ساتھ حج پر چلی گئیں۔

حج سے واپسی کے دو ماہ بعد ان کے ہاں ایک بچہ تولد ہوا۔لیکن امجد کی قسمت میں اولاد کا سکھ ہی نہیں تھا۔پیدائش کے چند دن بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا۔امجد کی ایک بیٹی رود موسیٰ کی طغیانی میں ڈوب گئی تھی۔اللہ نے اب بیٹا دیا اسے بھی قبر کا بستر پسند آگیا۔سلمٰی بچے کی جدائی کو برداشت نہ کرسکی اس نے بھی خاموشی سے سفر آخرت کیا۔امجد کی دنیا ایک بار پھر اجڑ گئی۔

اب اس کے پاس سلمٰی کی یادوں کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

مدرسہ دارالعلوم میں ملازمت جاری تھی کہ اسے صدر محاسبی میں منتقل کر دیا گیا۔جہاں بطور کلرک آغاز کیا اور ترقی کرتے ہوئے گزیٹیڈ افسر تک پہنچا۔سادگی اور درویشی کا اب بھی وہی عالم تھا۔

سالار جنگ کی ڈیوڑھی کے پاس ایک قدیم کہنہ، فرسودہ کوٹھری میں زندگی گزار رہے تھے۔دفتر سے آنے کے بعد چولہے پر کھچڑی چڑھا دی جاتی اور خود لنگی باندھے سامنے کے ایک حوض پر نہانے چلے جاتے۔کھچڑی اس عرصے میں تیار ہوجاتی اور مٹی کا ایک لوٹا جو اس کوٹھری میں پڑا رہتا۔اس میں پانی بھر کے لایا جاتا۔کھچڑی نوش جان فرمائی جاتی اور مٹی کے لوٹے سے پانی پی کر چاول نیچے اتارے جاتے۔کچھ دیر فکر شعر میں منہمک رہتے اور پھر دوستوں سے ملاقات کے لیے نکل جاتے۔کبھی کبھی ادارہ ادبیات اردو کی طرف نکل جاتے۔جہاں ڈاکٹر زور (محی الدین قادری زور) اس کے منتظر ہوتے۔وہاں بیٹھ کر واقعات و رباعیات کہتے۔گھوم پھر کر واپس آتے اور اس اندھیری کوٹھری میں یہ کہتے ہوئے ایک شطرنجی پر دراز ہوجاتے۔

گر اسیروں کی یہ اقبال گزر جاتی ہے
بے کسوں کی بھی بہر حال گزر جاتی ہے

جب ملازمت میں ترقی ہوئی اور آمدنی ہونے لگی تو انہوں نے اپنے رہنے کے لیے مکان خرید لیا۔دوستوں کا پھر اصرار ہوا کہ وہ شادی کرلے۔جمال النساء کے بعد کون عورت تھی جو اس کے دل کو بھاتی۔لیکن دوستوں کے اصرار سے ایک مرتبہ پھر مجبور ہوگئے۔

اس کی نفاست پسند طبیعت اس بی بی کے ساتھ زندگی گزارنے پر آمادہ نہ ہوئی اور اسے روزِ اوّل ہی طلاق دے دی۔

اس کے بعد ایک اور خاتون قمر النساء بیگم سے عقد کیا۔یہ اس کی چوتھی شادی تھی جو آخری سانس تک برقرار رہی۔

ایک دو تین چار والد کی کہانی یہاں بھی دہرائی گئی۔اس کے والد نے بھی چار شادیاں کی تھیں۔ان کی بھی کوئی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی۔اسی طرح امجد کی بھی دو اولادیں ہوئیں۔دونوں زندہ نہ رہ پائیں۔چوتھی بیوی سے کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی۔اپنی اس محرومی کا علاج یہ کیا کہ ایک سالی کی لڑکی کو گود لے لیا۔اس کی پرورش کی اور اپنی اولاد کی طرح اس کی شادی بڑے چاؤ سے کی۔

امجد کی دنیا، دنیائے شاعری تھی۔نثر نگاری ان کا میدان نہیں تھا لیکن حج سے واپسی کے بعد نثر کے پھول بکھرے اور سفرنامہ تحریر کیا۔حج کے سفرنامے لکھنے کا اردو میں

عام رواج نہیں تھا لیکن بھرپور تاثر اور کارآمد معلومات کے لحاظ سے بہت کم سفرنامے تشنگانِ علم کی پیاس بجھا سکتے تھے لیکن امجد نے یہاں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ انہوں نے پیش آنے والے واقعات کو اس جذبے کے ساتھ یہاں بیان کیا کہ پڑھنے والے کے دلوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکے اور صرف واقعات بیان نہیں کیے بلکہ فلسفیانہ اور صوفیانہ نتائج اخذ کرکے پڑھنے والوں کو چونکا دیا۔ مکہ اور مدینہ میں حاضری کے وقت ان کی جو کیفیت تھی اس کی بھرپور ترجمانی کی تھی۔ ہر ہر لفظ میں عقیدت اور جوش تھا۔ خانہ کعبہ پر نظر پڑتی ہے تو خیالات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ یہی وہ مکان ہے جس کی طرف تمام عالم کے مسلمان رخ کرکے نماز پڑھتے ہیں،

اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ یہی مکان عبادت کا وہ پہلا گھر ہے جس کو حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے مل کر بنایا تھا۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ یہ وہ مکان ہے جہاں بانیانِ کعبہ (ابراہیم و اسمٰعیل) کی دعا قبول ہوکر رسول آخر الزماں، خاتم النبیین، حامل القرآن مبعوث ہوکر مخلوقِ الٰہی کو آیت الٰہی سناتے، گمراہوں کو راہ حق دکھاتے۔ اَن پڑھوں کو علم و حکمت عملی کی باتیں سکھاتے، ناپاکوں کو پاک کرتے۔

دربار رسالت پر حاضری کے وقت ان پر عجیب کیفیت طاری تھی۔

”سلام کے نام ہی سے دم نکل گیا، تمام جذبات سلب، خیالات کافور، کیفیات ماضی وحال غائب، جسم میں لرزہ، دماغ میں جھنجلاہٹ، پاؤں من من بھر کے ہوگئے۔ نہ بھاگ سکتے ہیں، نہ بڑھ سکتے ہیں۔ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں مگر نظر کچھ نہیں آتا۔ دل دھک دھک کررہا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے کا خیال دل سے بار بار ٹکرا رہا ہے...... تمام اعضا شدت خوف سے تھر تھر کانپنے لگے۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ اب غش کھا کے گرا جاتا ہوں۔ طاقت دیدار رخصت ہورہی ہے۔ نہ دنیا کی خبر نہ مافیا کی

گم ہیں خرد و حواس عنقا کی طرح
دل ہوگیا صاف ان کی کف پا کی طرح

یہ سفرنامہ ایک حاجی کا سفرنامہ نہیں۔ خدا اور رسولؐ سے عقیدت رکھنے اور اپنے گناہوں کے پیشِ نظر ان سے خوف میں مبتلا ہونے والے کا سفرنامہ تھا۔ ایک صوفی کا سفرنامہ جو موجودات مادی وغیر مادی کو دل کی آنکھوں سے دیکھتا۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کا تعین کرتا، عالم حیرت میں غرق ہوتا جاتا ہے۔ ایک فلسفی کا سفرنامہ تھا۔ جو مشاہدہ اور تجربہ کو دلیل کی کسوٹی پر کستا، نیک و بد میں امتیاز کرتا چلا جاتا تھا۔

ان کی شاعری اور قابلیت کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ قدر دانوں نے ان کی قدر بھی خوب کی۔ ملازمت میں بھی ترقی کرتے ہوئے گزیٹڈ گریڈ تک پہنچ گئے۔ زندگی نہایت عسرت وغربت میں بسر کی تھی۔ اب خوشحالی کے دن بھی دیکھے اور اپنا مکان خرید لیا۔ لیکن ذاتی سادگی کا وہی عالم تھا۔ برسوں کی ذاتی سائیکل اب بھی ساتھی بنی ہوئی تھی۔ جسم پر لباس بھی معمولی رہا۔ البتہ عہدے میں ترقی کے بعد بڑے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا معمول بن گیا۔ انہوں نے طبیعت بھی ایسی پائی تھی کہ ہر ذہن وخیال، ہر مکتبۂ فکر کا آدمی ان سے خوش رہتا تھا۔ اگر ایک طرف علامہ سید سلیمان ندوی جیسا عالم دین جب بھی حیدرآباد آتے امجد سے ضرور ملتے اور اس ملاقات کو حاصل سفر قرار دیتے۔ دوسری طرف جوش ملیح آبادی سے باوجود ذہنی بعد دوستانہ مراسم تھے۔ اگر سلیمان ندوی کی موجودگی میں تصوف اور شاعری کی باتیں ہوتیں تو جوش کے ملنے پر شگفتگی اور خوش طبعی کا اظہار ہوتا۔ شاعری کی گرم بازاری بھی زوروں پر تھی۔ دکن کے کسی بھی شہر میں مشاعرہ ہوتا اسے ضرور بلایا جاتا۔

اب اس نے زندگی کے تجربات سے اتنا کچھ حاصل کرلیا تھا کہ انسانی رہنمائی کا حق ادا کرسکتا تھا۔ اس کی حیثیت محتسب کی بھی تھی اور پیامبر کی بھی۔ یہ فرائض وہی ادا کرسکتا ہے جو ماحول پر گہری نظر رکھتا ہو، نیک وبد کا شعور رکھتا ہو، انسانوں کی محبت اس کے دل میں موجود ہو۔ اس نوع کا کلام گہرے تفکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ فارسی شاعری میں ایسے خیالات کی بہتات تھی۔ لیکن اردو (رباعی) کا دامن خالی تھا۔ امجد نے اپنے آخر دور میں اردو شاعری کو رباعیات سے مالا مال کردیا۔

گرمی میں غم لبادہ نازیبا ہے
مستی میں خیال بادہ نازیبا ہے
کافی ہے ضرورت کے مطابق دنیا
جامہ، قد سے زیادہ نازیبا ہے

اس دور میں شاید ہی کوئی قابلِ ذکر شاعر ایسا ہو جس نے رباعی نہ کہی ہو۔ لیکن امجد حیدرآبادی وہ پہلے شاعر ہیں جس نے اس صنف سخن (رباعی) کو خصوصیت سے اپنایا۔ جوش پہلے نظم گو ہیں بعد میں رباعی گو۔ فراق پہلے نظم گو ہیں

بعد میں رباعی گو لیکن امجد اوّل و آخر رباعی گو ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ امجد کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے جوش نے قیام حیدرآباد کے زمانے میں امجد کے اثر سے رباعی کو بھی اپنا لیا۔ اسے بھی امجد کا فیضان ہی کہا جائے کہ اس کی مقبولیت نے جوش جیسا رباعی نگار اردو کو عطا کردیا۔

”جس طرح امجد کی رباعیاں موضوع و مواد کے اعتبار سے سرمد سے مماثل سمجھی جاتی ہیں بالکل اس طرح جوش اپنی رندانہ جسارت، جوش بیانی، نکتہ آفرینی، فنی پختگی کی وجہ سے عمر خیام سے قریب ہوگئے۔ امجد کی رباعیاں مخصوص فکری نہج اور تصوف پسندی کی وجہ سے ایک طبقے کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ امجد کی رباعیوں کو وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی جس کی وہ مستحق تھیں۔“

وہ اپنا شعری سفر کامیابی سے طے کر رہے تھے کہ آنکھوں میں تکلیف محسوس کرنے لگے۔ وہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے کے عادی تھے مگر جب بینائی متاثر ہونے لگی تو انہیں فکر ہونے لگی۔ علاج سے بے رغبتی شاید اب بھی انہیں کسی ڈاکٹر کے پاس نہ جانے دیتی لیکن دوستوں کے بے حد اصرار پر ایک دوست کو لے کر ڈاکٹر کے پاس چلے گئے۔ اس نے معائنہ کرتے ہی آپریشن کا مشورہ دیا۔ لکھنے پڑھنے کا کام متاثر ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ بھی فوراً تیار ہوگئے۔ آپریشن کامیاب رہا۔ تکلیف جاتی رہی اور لکھنے پڑھنے کے قابل ہوگیا۔

اس کے ٹھیک ایک سال بعد فالج کا حملہ ہوا۔ علاج کے بعد ٹھیک تو ہوگئے لیکن زبان میں لکنت آگئی جو تادم مرگ باقی رہی۔

1931ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کی کوششوں سے ”ادارہ ادبیات اردو“ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ جس کا مقصد اردو زبان کے فروغ و اشاعت کے کام کو آگے بڑھانا تھا۔ 1955ء میں جب اس ادارے کا 25 سالہ جشن منانے کا اہتمام کیا گیا تو صاحبان ادب کو امجد حیدرآبادی کی خدمات کا بھی خیال آیا اور یہ طے کیا گیا کہ ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کا ”جشن الماس“ بھی منایا جائے۔ جس میں شریک ہو کر اہل رائے ان کی شاعری پر اظہارِ خیال کریں۔

اس جشن کی نویں تقریب کو جشن الماس قرار دیا گیا۔ یہ جشن 31 جنوری 1955ء کی شام کو 5 بجے سٹی کالج کے ہال میں منایا گیا۔ اس تقریب میں جوش ملیح آبادی، پروفیسر رفیع الدین، معین الدین، قطب النساء ہاشمی اور زینت ساجدہ نے اپنے تاثرات بیان کیے۔ عرش ملسیانی اور دوسرے شعرا نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ سہ نشیں پر امجد ایک کارچوبی مسند پر تشریف فرما ہوئے۔

ڈاکٹر زور نے سپاسنامہ پیش کیا۔ سپاسنامے کا جواب دینے کے لیے ان کا نام پکارا گیا۔ وہ سپاسنامے کا جواب لکھ کر لے آئے تھے لیکن علالت کی وجہ سے پڑھ نہیں سکتے تھے۔ یہ سعادت خواجہ حمید الدین شاہد کے حصے میں آئی۔

میں اپنے قدر دانوں، دوستوں، عزیزوں، محسنوں کا شکر گزار ہوں اور ان کی اس جدت کا معترف ہوں۔ عام دستور کے خلاف میری قبر پر پھول ڈالنے سے پہلے میری زندگی میں ہی پھولوں کے ہار میرے گلے میں ڈال دیے اور میری قبر پر شاندار گنبد بنانے سے پہلے مجھے تو وہ خاک کو عالم پاک تک پہنچا دیا۔ لیکن پھر بھی یہی کہوں گا۔

ممکن نہیں کہ فطرت اصلی بدل سکے
امجد ہزار پاک ہوا پھر بھی خاک ہے

آپ بزرگوں، دوستوں، قدردانوں نے میری حیثیت اور استحقاق سے زیادہ ذرہ نوازی فرما کر مجھ ذرہ بے مقدار کو آفتاب بنا دیا۔ میں پہلے ہی آفتاب ہوں مگر کیسا آفتاب جو لب بام ہے۔ اب ڈوبا کہ جب ڈوبا۔ اب چھپا کہ جب چھپا۔ میں بہت دنوں سے اپنی اس رباعی کا مصداق بن چکا ہوں۔

تو کان کا کچا ہے تو بہرا ہوجا
بد میں ہے اگر آنکھ تو اندھا ہوجا
گالی، غیبت، دروغ گوئی کب تک
امجد کیوں بولتا ہے گونگا ہوجا

کانوں سے کم سنتا ہوں، آپریشن کے بعد آنکھوں سے کم دیکھتا ہوں، لقوے کی وجہ سے زبان سے اچھی طرح بول نہیں سکتا۔

ان اعتبارات سے تو بہت حد تک مر چکا ہوں۔ صرف گزرنا باقی ہے۔ دیکھیے کب وقت آتا ہے۔

میں شروع ہی سے نام و نمود اور شہرت سے دور رہا ہوں۔ پروپیگنڈے سے تو واقف ہی نہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی میرا یہی حال رہے گا۔ یہ تقریب بھی میرے عزیز شاہد صاحب کے بے حد اصرار پر منعقد کیے جانے پر میں نے

صرف یہی کہا تھا

"مجھے اختلاف نہیں، اگر نہ ہو تو اچھا ہے۔"

یہ عجیب بات ہے کہ 1326ھ کی طغیانی میں میرا خاندان جس جگہ غرق ہوا تھا۔ اسی جگہ اور اسی مقام پر میری جوبلی منائی جا رہی ہے۔

قصہ مختصر اپنے محسنوں سے درگاہ باری تعالیٰ میں دعا کرتا ہوں اور جب تک سانس لے رہا ہوں دعا کرتا رہوں گا اور پرانی زندگی ختم ہو کر نئی زندگی ملنے کے بعد بھی یہی کہتا رہوں گا

لو تجھ سے لگائے میرا ملنے والا
اپنے کو بھلائے میرا ملنے والا
مولا مرے ہر دوست کو اپنا کر لے
تجھ سے مل جائے میرا ملنے والا

ضعیف پیری تو خیر اپنی جگہ لیکن زندگی کے آخری برس متعدد امراض کی نذر ہو گئے۔ جشن الماس منعقد ہوئے پانچ چھ برس ہو چکے تھے۔ 25 مارچ 1961ء کو اپنے معتقد کے گھر سکندر آباد گئے۔ ان کا گھر لب سڑک تھا۔ کمرے میں گرمی کی شدت تھی۔ لہٰذا باہر نشست جمی رہی۔ اس کی آنکھ لگ گئی۔ خواب سے بیدار ہوئے تو فرمایا "رات بھر جنت کی ہوا کھاتے رہے اور آرام سے سوتے رہے۔"

ہوا واقعی جنت کی تھی کہ جنت کی راہ دکھا گئی۔ صبح سو کر اٹھے تو تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ اگلے دن یعنی 26 مارچ 1961ء کو ڈاکٹر کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے دوا دے دی۔ دوا نہایت کڑوی تھی لہٰذا پینے سے انکار کر دیا اور ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے پاس چلے گئے۔ اس کی دوا سے بخار تو اتر گیا لیکن پیروں میں ورم ہو گیا۔ حکیم سے رجوع کیا۔ انہوں نے کافور کے تیل کی مالش کی جس سے بخار پھر ہو گیا۔ 29 مارچ کو ایک ڈاکٹر شاہ نواز نے آ کر معائنہ کیا۔ دوا دی جو پلا دی گئی۔

مغرب کے بعد تھوڑا سا دودھ پیا۔ پھر لیٹ گئے۔ کچھ دیر تو آرام سے لیٹے رہے۔ لیکن پھر بے چینی اور بے قراری محسوس کی اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ بیوی قریب ہی بیٹھی تھی۔ اس کیفیت کو دیکھ کر انہوں نے طبیعت دریافت کی۔

"آپ کہیں تو آپ کے کسی دوست کو بلواؤں۔ ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا ہے کوئی بھی آ جائے گا شاید باتوں میں جی بہل جائے یا کسی ڈاکٹر کو بلایا جائے۔"

"جب کسی کو خود کہیں جانا ہوتا ہے تو دوستوں کو نہیں بلایا کرتے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کہاں جانا ہے آپ کو۔"

"میرے کہنے کا مطلب ہے کہ شاید میری ہی طبیعت سنبھل جائے اور میں خود کہیں چلا جاؤں۔"

"کہیں جانے کی ضرورت نہیں اللہ اللہ کر کے بخار اترا ہے۔ اب آرام کریں۔"

"نہ جانے کی قسم نہیں کھاتے لیکن لیٹے جاتے ہیں۔"

امجد نے کہا لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں، رات کے تقریباً گیارہ بج رہے تھے کہ شعر و تصوف کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

امجد کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ صبح کے اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں۔ کئی ادارے اور دفاتر سوگ میں بند ہو گئے۔

صبح نو بجے غسل، میت کو دیدار کے لیے مردانہ حصے میں رکھا گیا۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے میت کو مسجد پہنچا دیا تھا۔ بعد نماز ظہر نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ دن کے تین بجے احاطۂ درگاہ شاہ خاموش میں شرقی صحن کے چبوترے پر راستے کی جنوبی جانب جمال سلطی کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

فاتحہ چہلم کے موقع پر ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے ایک کتبہ ان کے مزار پر نصب کیا گیا۔ جس کے بیرونی رخ پر امجد کی یہ رباعی درج کی گئی

سید احمد حسین امجد ہوں میں
امجد ہوں میں جواب سرمد ہوں میں
گوندھی ہوئی ہے نور سے مٹی میری
خاک قدم پاک محمدؐ ہوں میں

کتبہ کے اندرونی رخ پر پروفیسر اکبر الدین صدیقہ کا تحریر کردہ یہ قطعہ تاریخ وفات درج ہے۔

بندہ پہنچا ہے اپنے مولا کے حضور
اغفرلہ وارحمہ یا رب غفور
تاریخ کی جو کہ فکر ہاتف نے کہا
کہہ دے ہجری میں "آہ امجد مغفور"

1380ھ

ماخذ

حکیم الشعراء...... پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد

اردو رباعی...... ڈاکٹر فرمان فتح پوری

جوار خان

سلمیٰ اعوان

کہتے ہیں عشق عقل کا نہیں دل کا ہم زبان ہوتا ہے۔ گلگت کے اس شہزادے کو بھی عشق نے اس مقام تک پہنچا دیا کہ ایک وسیع سلطنت کا قائم مقام ہوتے ہوئے بھی، جرأت و بہادری میں یکتا کہلاتے ہوئے بھی حسن کے آگے سجدہ ریز ہو گیا۔ اسے نہ سماج کی دیواریں روک سکیں اور نہ ننگی تلواریں وہ حسن کا اسیر بن کر رہا لیکن آخر میں اسے کیا ملا؟ شہزادی کے حصے میں دکھوں کا سمندر کیوں آیا؟

تاریخ کے دریچے سے ایک بے مثال رودادِ عشق

پاتھی گورس نے اگر کرسٹوفر کولمبس کے دل میں دنیا کی حقیقتیں جاننے کی لگن پیدا کی تھی تو میرے بچپن کے وہ دن بھی "گورس" کی کتاب جیسے ہی تھے کہ جس کے ہر صفحے پر گلگت کو دیکھنے اور اس کو جاننے کی ایک تڑپ تھی۔

ہمارے گھر کے بڑے سے دروازے سے نکل کر جب میری مامی اپنے شوہر اور کبھی کبھی میری ماسیاں (خالائیں) اپنے بھائی کے پاس جہاز میں لدلدا کر گلگت جاتیں اور واپس آ کر رابرٹ ریلپے کی طرح ایسی ایسی پُراسرار کہانیاں اور باتیں سناتیں کہ مارے تحیر کے ہم لوگ آنکھیں جھپکنا بھی بھول جاتے۔ جب کہانیاں ختم ہوتیں تب وہ اٹھتیں اسٹور میں پڑے بڑے بڑے بوروں میں سے خشک خوبانیاں اور توت نکال لاتیں پھر ہم بچوں کی ہتھیلیوں پر مٹھی بھر یوں

رکھتیں جیسے دروازے پر کھڑے فقیر کے پھیلے کشکول میں نخرے والی گھر، گھر ہستن آٹا ڈالتی ہے۔

میٹھی ذائقہ دار چھور (خشک خوبانی) کھاتے کھاتے میرا جی چاہتا میں ایک پرندہ بن جاؤں۔ جہاز کے پروں سے لٹک جاؤں اور اس پُراسرار دنیا میں کھو جاؤں۔

لیکن میں کرسٹوفر کولمبس کی طرح بلند ہمت تو تھی مگر مجھے ملکہ آئس بیلا جیسی کسی مہربان ہستی کی مدد حاصل نہ تھی۔

اور وقت دھیرے دھیرے گزرتا گیا۔ آج میں گلگت جا رہی تھی۔ اسی گلگت کی طرف جس کے میں نے خواب دیکھے تھے۔

گلگت قریب آیا۔ ویگن نے جوبلی ہوٹل کے پاس اُتار دیا۔ ہوٹل میں جا کر میں نے ائیرپورٹ فون کیا۔ یہاں بھی مجھے ایک مقامی فیملی کے پاس ٹھہرنا تھا۔ فون پر غلام محی الدین صاحب کو بتایا کہ میں لاہور سے آئی ہوں اور ان کے دوست زین العابدین کی بھتیجی ہوں۔

انہوں نے خوشی سے بھرپور آواز میں کہا کہ فی الفور ائیرپورٹ آجائیے۔

ہوائی اڈے کی دیدہ زیب عمارت کے کوریڈور میں بالائی منزل کی سیڑھیوں کے تیسرے حصے پر ایک ادھیڑ عمر کے سرخ و سفید مرد نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں ذرا بدکی پھر یہ سوچتے ہوئے کہ شاید یہ مقامی معاشرتی آداب میں شامل ہے ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔

اس وقت لوگوں کا ایک جم غفیر شوریدہ سر لہروں کی طرح اندر باہر موجیں مارتا پھر رہا تھا۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ بے چاروں کا بس نہ چلتا تھا کہ جہاز کے پروں سے لٹک جائیں۔

میرے میزبان آخری پرواز کی روانگی کے انتظار میں معروف تھے۔ مجھ سے آدھ گھنٹے کی معذرت کر کے چلے گئے۔

میں دو منزلہ عمارت کے ٹیرس پر جا کھڑی ہوئی۔ یہاں وادی گلگت کا نظارہ ایسا دلکش تھا کہ تیز چبھتی دھوپ بھول گئی۔

جہاز کی روانگی کے بعد غلام محی الدین اندر آئے۔ کرسی پر بیٹھے۔ میرے یوں آنے پر خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت کا اظہار کیا۔ ان کی بیگم ہڈیوں کی ایک ایسی بیماری میں مبتلا تھیں۔ جس نے ان کا نچلا دھڑ بیکار کر دیا تھا۔ پانچ چھ ماہ قبل وہ لاہور کے جنرل اسپتال میں نیورو سرجن ڈاکٹر جبیر کے زیرِ علاج رہیں۔ میں نے ان کی طبیعت کا پوچھا۔

میرے استفسار پر وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر افسردگی سے بولے۔ ”بس آزمائش ہے میری۔“

کشروٹ محلہ یادگار چوک کے پاس ہی ہے۔ پتھروں کے گھر، تنگ تنگ سی گلیاں، جن میں خوبانی اور شہتوت کے درختوں کی چھاؤں باہر سے آنے والوں کو لطیف سی ٹھنڈک کا احساس بخشتی ہیں۔

یہ ایک کشادہ آنگن والا مکان تھا جہاں میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے برآمدے میں وہی معذور عورت چارپائی پر بیٹھی تھی جس کے متعلق تین فرلانگ کے فاصلے میں، میں نے ڈھیر سارا سوچا تھا۔

مسکرا کر انہوں نے خوش آمدید کہا۔ بیمار چہرے پر صحت مند مسکراہٹ شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ یہ ایک دکھ بھری آوردہ ہنسی لگتی تھی۔

میں قریب بیٹھ گئی۔ بجلی بند تھی۔ برآمدے میں مکھیوں کا راج تھا۔ دستی پنکھے سے انہوں نے مجھے ہوا دینے کی کوشش کی۔ میں نے خجل سی ہنسی ہنستے ہوئے پنکھا ان کے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

صاحب خانہ بازار سے لدے پھندے آئے۔ خمیری روٹی اور قیمے کا سالن کھانے کے بعد میں نے رسیلی خوبانیاں کھائیں۔ تربوز کاٹا گیا۔ سب لوگوں کو قاش قاش پکڑائی گئی۔۔۔۔ غلام محی الدین خاصے عیال دار تھے۔ بڑے چھوٹے بچے ملا کر نصف درجن سے اوپر جاتے تھے۔

ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر میں نے بقیہ دن کا پروگرام ترتیب دیا۔ جس میں سرِفہرست چنار باغ کی سیر تھا۔

میں چنار باغ سے جب لوٹی اس وقت گھر کے برقی چراغ جل رہے تھے۔ آنگن صاف ستھرا تھا اور وہاں بستر بچھے ہوئے تھے۔ خاتون خانہ ایک پر بیٹھی شفقت سے مسکراتی تھی۔

”کہاں کہاں کی سیر کی؟“

میں نے ہنس کر ساری روئیداد سنائی انہیں۔

رات کے کھانے اور عشاء کی نماز سے فارغ ہوئی تو محسوس ہوا کہ گھر والی باتوں کے موڈ میں ہیں۔ ان کی آنکھیں کچھ دکھانا اور ہونٹ کچھ سنانا چاہتے ہیں۔

میرے اس سوال پر کہ کچھ گلگت کے بارے میں بتائیے انہوں نے کہا تھا۔ گلگت کی قدیم تاریخ ملکہ جوار خاتون کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے کیونکہ موجودہ گلگت کی زرخیزی، شادابی، تازگی اور آبادکاری اسی کی مرہونِ منت

ہے۔

گلگت کو ڈوگروں کی غلامی سے آزاد کروانے اور اسے پاکستان کا حصہ بنانے کا اعزاز کرنل مرزا حسن خان کے کھاتے میں جاتا ہے کہ جس کے بغیر تحریک آزادی شمالی علاقہ جات بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوسکتی تھی۔ آپ دونوں میں سے کسے پہلے سنیں گی۔

گلگت کی یہ رات بہت خوبصورت تھی۔ ہوا میں خنکی تھی اور ستارے سیاہ آسمان کے سینے پر کسی شوخ حسینہ کی چمکتی آنکھوں کی طرح مسکراتے تھے۔ ماضی کو کریدے بغیر حال تک نہیں پہنچا جاتا۔ میں نے اپنا رخ ان کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"مطلبے آج کی شب ملکہ جوار خاتون کے نام کرتے ہیں۔"

ایسا ہوتا ہے، کبھی کبھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ سالوں قرنوں کی گزری پرچھائیں اپنے پچھاروں سے نکل کر رواں دواں ساعتوں کے سینوں سے آ چمٹتی ہیں۔ وقت کے بہتے ہوئے پانیوں کی گم شدہ لہریں پھر سے مخالف بہاؤ پر بہنا شروع ہو جاتی ہیں۔ تاریخ کے گزرے ہوئے واقعات پرانے جامے اتار کر نئے پہناوے پہن کر سامنے آجاتے ہیں۔

وہ تاروں بھری رات تھی۔ مصر کے آسمان پر بکھری اس رات جیسی جب شاہ عزیز کی ملکہ نے یوسف کے حسن و جمال کا نظارہ خوابوں میں کیا تھا۔ کوہ قراقرم اور ہمالیائی سلسلوں کے دامن میں لپٹی ان وادیوں میں جہاں سناٹا اور اندھیرا وقت کی گود سے لمحہ لمحہ سرک رہا تھا۔ وادی نگر کے شہزادے فردوس نے بھی ایک پری پیکر کا دیدار کیا تھا۔

آنکھیں کھول کر اس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔ پروردگار یہ میں نے کیا دیکھا ہے؟ ایسا چہرہ، ایسا حسن تو میرے آس پاس کہیں نہیں۔ صبح وہ بے کل تھا، مضطرب تھا۔ کوئی ماورائی مخلوق، کوہ قاف کی کوئی پری، اپسرا کیا تھی وہ؟ جسے اس نے رات خواب میں دیکھا تھا۔ وہ سوچتا رہا، الجھتا رہا، دنوں اس گتھی کو سلجھاتا رہا اور پھر یوں ہوا کہ اس نے اس حسین شبیہ کو اپنی آنکھوں سے اپنے دماغ اور دماغ سے دل میں اُتار لیا تھا۔ آنکھیں دل اور دماغ سبھی مطمئن ہو گئے تھے کیونکہ جب اور جس وقت اس کا جی چاہتا وہ تصویر یار دیکھ لیتا۔

بدر کامل تھی وہ۔ رعنائیوں کا ایک تراشیدہ پیکر، حسن و شباب کا ایک لبالب بھرا جام، نام جس کا شہزادی جوار خاتون تھا۔ گلگت کی شہزادی جو دشمنوں کے قبضے کے بعد وادی سے بھاگ نکلی تھی اور ہمسایہ ریاست میں پناہ گزین ہوئی تھی۔

راجا احمد خان نے اپنی ریاست میں اُس کا شاہانہ استقبال کیا۔ شاہی زندگی کے تمام لوازمات مہیا کیے اور اس کے سر پر ملکہ کا تاج سجا دیا۔

یہ راجہ حاتی گلگت کے نامدار خاقان مرزا کی دُلاری بیٹی تھی۔

وہ دلیر تھی، شہ زور تھی، سپاہیانہ طرزِ زندگی کو پسند کرتی تھی۔ روایتی شہزادیوں اور ملکاؤں کی طرح خود کو زیور لتے سے سجانے کی بجائے تلوار کو پہلو سے لٹکاتی تھی۔ نیزہ کمان ہاتھ میں پکڑتی تھی۔

یہ آتی بہاروں کی ایک دل آویز سی شام تھی جب ہواؤں کا دامن بادام اور چیری کے شگوفوں کی خوشبوؤں سے بوجھل تھا۔ جنگلی گھاس اور عناب کے پتوں کی مدہوش کن مہک حواس کو متاثر کر رہی تھی۔ فضا کسی کنواری دوشیزہ کی مانند پاکیزہ تھی۔ پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں پر سورج کی آخری کرنیں اس انداز میں اپنے جلوے دکھاتی تھیں کہ سونے اور چاندی کے دریا بہتے محسوس ہوتے تھے۔

ایسے میں وہ اپنے محل کے بالا خانے کی چھت پر کھڑی تیر اور کمان سے دور جھیل پر اڑتی مرغابیوں کو نشانہ بنا رہی تھی۔ کمان سے زن کی آواز کے ساتھ تیر نکلتا اور فضا کا سینہ چیرتا ہوا مرغابی کے دل میں کہیں پیوست ہو جاتا۔

دفعتاً وہ رک گئی۔ جنگلوں سے آتی اس خوشبو کو اس نے اپنے سینے میں اُتارنا چاہا پر جانے کیوں اس کا دم گھٹنے لگا تھا؟

اس وقت ہوائیں بچھی تھیں اور پچھم اسے ہمیشہ مضطرب رکھتا تھا۔ اس نے پہاڑوں پر جمی نگاہوں کا رخ بدل کر آسمان کی طرف دیکھا اور اس سے ہمکلام ہوئی۔

کہتے ہیں کبھی کبھی تو اپنی آسمانی دنیا سے اتر کر نیچے بہت نیچے کسی کے دل میں آ جاتا ہے اور وہ سب کچھ جان لیتا ہے اور سن لیتا ہے جو وہ جانے کب سے تجھے سناتا ہے اور جسے تیرے کانوں کے بند دروازے ذرا سی درز کھول کر اندر نہیں جانے دیتے۔ کچھ حرج ہے اگر آج چند لمحوں کے لیے تو میرے پاس آ جائے اور یہ جان لے کہ میں اپنے وطن گلگت جانے کی آرزومند ہوں۔

تب بالا خانے کی سیڑھیوں کے آخری سرے پر محل کی

پرانی خادمہ ڈُر سکینہ دیودار کی چھتری دیواروں سے ٹکراتی ظاہر ہوئی تھی۔ اس کی تیز اور پاٹ دار آواز خاموش اور سناٹے میں ڈوبی فضا پر اسی طرح برسی تھی جیسے ہتھوڑا لوہے پر۔

''تمہارا اقبال بلند ہو۔ ابھی ابھی سپدر (راجا کے ملازم) دربار سے آئے ہیں۔ بتاتے ہیں تمہاری راج دھانی گلگت سے وزیر رشو آیا ہے۔ اس کے ساتھ بے شمار نوکر اور خادم ہیں جو سبک رفتار گھوڑوں پر سوار یہاں پہنچے ہیں۔ خوان پوشوں سے ڈھکی سینیوں میں بہت قیمتی تحائف ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر قبل وہ راجا کے پاس پہنچے ہیں اور بس کسی بھی لمحے یہاں آیا چاہتے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کو رکی پھر بولی۔ ''وہ آپ کو لینے آئے ہیں۔ گلگت کی راجدھانی آپ کو سونپنا چاہتے ہیں۔ آپ کو اپنی ملکہ بنانے کے آرزومند ہیں۔ آپ سنتی ہیں نا ملکۂ عالیہ!''

ساعت پر بجتی اس آواز کو اس نے حیرت سے سنا۔

ہاتھ میں پکڑی کمان اک ذرا سا لرزی۔ چھوٹی قامت نے ہلکا سا جھٹکا کھایا تھا۔ اس نے آسمان کو دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''تو پھر تو آج نیچے آ ہی گیا کھلے کانوں اور کھلے دل کے ساتھ میں تیری شکر گزار ہوں''۔

اور جب چوب چراغوں کی روشنی سے محل جگمگا رہا تھا وہ پُرتمکنت چال چلتی دیوانِ عام میں داخل ہوئی تھی۔

لیکن اندر قدم بڑھانے سے پہلے وہ دہلیز پہ رکی تھی اور اس نے ناقدانہ نظریں اندر پھینکی تھیں۔

وزیر رشو اور اس کے معتمد ساتھی کھڑے ہو گئے تھے۔ سر کو تعظیمی جھکاؤ دینے کے بعد جب وہ سیدھے ہوئے تو دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور کچھ کچھ جانا تھا۔

سوا چھ فٹ کا پینتالیس سالہ مرد افگن کا بلا کا زیرک چالاک اور کائیاں تھا۔ کمان جیسے ابروؤں اور گھنی پلکوں کی حفاظت میں سبزی مائل چمک دار شعلوں کی مانند دہکتی آنکھیں جن کی مماثلت کے بارے میں اس کے ذہن نے پل بھی نہیں لگایا تھا اور جان لیا تھا کہ یہ خونخوار چیتے کی آنکھوں سے بہت مشابہ ہیں۔

سپدروں (نوکروں) نے رشو کے اشارے پر خون پوش سینیاں شہزادی کے حضور پیش کیں۔

پھر نہایت عجز و انکساری کے ساتھ مدعا پیش کیا۔

اس وقت گلگت کا تاج و تخت خالی ہے۔ صرف شہزادی جوار خاتون کی ذات شرعاً و رواجاً اس کی جائز وارث ہے۔ حق بحق دار رسید میرا ایمان ہے۔ اس لیے میں حاضر خدمت ہوا ہوں اور خواہش مند ہوں کہ شہزادی عازم گلگت ہوں۔

اس نے شہزادی کے خاوند راجا احمد خان کو بھی پیشکش کی کہ وہ بھی اس کے ہمراہ چلیں اور ایک مشیر کی حیثیت سے شہزادی جوار خاتون کی مدد کریں۔

رشو سیاست کا شاطر کھلاڑی تھا۔ اقتدار کے جس سنگھاسن پر وہ بیٹھا تھا۔ اس کی چند حماقتوں کی وجہ سے وہ ڈولنے لگا تھا۔ گلگت پر نگر کے راجا شاہ کمال کا قبضہ تھا۔ پر یہ قبضہ برائے نام سا تھا۔ راجا شاہ کمال کا بڑا بیٹا شہزادہ فردوس کبھی کبھی گلگت ضرور آتا پر انتظامی معاملات میں دخل نہ دیتا۔ اقتدار کی ساری کنجیاں رشو کی جیب میں تھیں۔ تکبر، نخوت اور ذاتی شخصیت پرستی نے مکڑی کی طرح اس کے گرد جالا بن دیا تھا۔ امراء و وزراء سے سلوک توہین آمیز تھا۔ معاملاتِ عدالت میں جانبداری کارفرما تھی۔ عوام میں ہیجان تھا۔ صورتِ حال کو سدھارنے میں شاہ کمال نے معذوری ظاہر کی تھی اور اب وہ عوام کی خواہشات کے مطابق شہزادی کو لینے آیا تھا۔

وہ شہزادی کی سحرزدہ شخصیت سے متاثر ہوا تھا لیکن اس کی سبز آنکھوں میں جھلکتے جاہ و جلال کے رنگوں سے اتنا وہ ضرور سمجھا تھا کہ اسے وہ کٹھ پتلی نہیں بنا سکے گا۔ پر شطرنج کے ماہر کھلاڑی کی طرح مہروں کے ہیر پھیر سے اس نے بازی کا پانسہ اپنے حق میں پلٹ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس ضمن میں اٹھایا جانے والا پہلا قدم دانشمندی اور تدبر سے پُر تھا۔ شہزادی جوار خاتون کو احمد خان کی زوجیت سے آزاد کروا کے اس نے شہزادی کو حد درجہ ممنون کیا تھا۔

دوسرے ٹھاٹھ باٹ اور شان و شوکت سے شہزادی کا شاہانہ جلوس گلگت کی طرف روانہ کیا۔

دنیور کے قریب شہزادی کا استقبال گلگت کے باسیوں نے حفظِ مراتب کے ساتھ کیا۔ رونو (شاہی خاندان) شین (درباری امراء و وزراء) اور ان کے پیچھے یشکن (عوام)۔ لوگوں نے محبت و خلوص اور جوشِ عقیدت سے شہزادی پر پھولوں اور موتیوں کی بارش کی۔ ڈوم (ناچنے گانے والے) قوم اپنے آلاتِ موسیقی کے ساتھ موجود تھی۔ فضا میں شہنائی کی آوازیں بکھری ہوئی تھیں۔ کہیں کوئی من چلا ستار بجا رہا تھا۔ ڈوم عورتیں رقص اور مرد گیت گا

کر اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔

خوبرو شہزادی چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اتری تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں اتنی پُرتپاک پیشوائی پر گیلی ہو رہی تھیں۔ وہ فرداً فرداً سب کے پاس گئی۔ انکساری سے ان کے احوال دریافت کرتی رہی۔

پھر لوگوں کے ہجوم میں اس کی سواری قلعہ فردوسیہ کے شاہی محلات میں داخل ہوئی۔

محل میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلا کام سجدہ شکر کی ادائیگی تھا۔

وہ نبض شناس تھی اور نظر شناس بھی پر تھوڑا سا دھوکا کھا گئی۔ تاج پوشی کی رسم دو دن بعد تزک و احتشام سے منائی گئی۔ اس وقت جب دربار لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور درباریوں کے چہرے وفور مسرت سے گلنار تھے وہ کھڑی ہوئی اور اس نے کہا۔ ”ان تاریخ ساز لمحوں میں میں اسلام کے جید عالم ابن سماک کی خلیفہ ہارون الرشید سے گفتگو کا حوالہ دوں گی۔ خلیفہ شدید پیاسے تھے۔ دربار میں ہی پانی کا پیالہ طلب کیا۔ عین اسی وقت ابن سماک نے پوچھا ”یہ پانی اگر آپ کو نہ مل سکے تو اس کی کیا قیمت دینا پسند کریں گے“۔

”نصف سلطنت بھی سستی سمجھوں گا“

پانی آیا۔ انہوں نے پیا۔ دوبارہ سوال ہوا۔ ”یہ پانی اگر آپ کے پیٹ سے نکلنا چاہے اور نہ نکلے تب کیا کریں گے؟“ خلیفہ جواب دیتے ہیں ”باقی سلطنت بھی دے دوں گا“۔

ابن سماک نے فرمایا ”تو یہ جان لیجیے امیر المومنین کہ آپ کی ساری سلطنت ایک گھونٹ پانی اور چند قطرے پیشاب کی قیمت کے برابر ہے تو پھر اس پر کیسا تکبر؟“

چونکہ ایک طویل عرصے کی جلا وطنی کے بعد مجھے سلطنت کے حالات کو سمجھنے اور جاننے کے لیے وقت درکار ہے۔ اس لیے وزیر رشو میرے قائم کے طور پر کام کریں گے۔ میں ان سے یہ توقع کروں گی کہ وہ رعایا سے حسن سلوک کریں اور ہمیشہ اپنی عاقبت کو مد نظر رکھتے ہوئے عدل و انصاف کا میزان قائم رکھیں اور اس سلطنت کو اپنے لیے ایک آزمائش جانیں۔

اور اس نے دیکھا تھا وہی چہرے جو تھوڑی دیر قبل مسکرا رہے تھے۔ شاداں و فرحاں تھے۔ وہ یکلخت سناٹوں کی زد میں آ گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی جابر نے ان کی رگوں میں دوڑتا پھرتا سرخ خون کشید کر لیا۔

اس نے سر جھکا لیا تھا۔ کچھ سنے اور پوچھے بغیر وہ بہت کچھ جان گئی تھی۔ پر زبان سے نکلی ہوئی بات اس تیر کی طرح تھی جو کمان سے ایک بار نکلنے کے بعد واپس نہیں آتا۔

باشعور اور بیدار مغز شہزادی حالات سے جلد آگاہ ہوئی۔ اراکین دربار کو تسلی و تشفی دے کر مطمئن کیا اور رشو کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب یہ معمول بنا کہ عوام کی تکلیف اور ان کے خانگی معاملات کا جائزہ لینے کے لیے وہ ریاست کے گشت پر نکل جاتی۔ فنون سپاہ گری میں طاق اور شکار کی بے حد شوقین تھی۔ شکار کا تعاقب پیدل اس تیزی سے کرتی تھی کہ کوئی تیز رفتار مرد بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ وہ دریائے گلگت و ہنزہ کے ساتھ کچی سڑک پر گھوڑا دوڑاتی متم داس کی وادی سے آگے نکل گئی۔ یہاں سے نگر کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ اس وقت دھوپ بہت تیز تھی۔ گھوڑا تھکا ہوا تھا اور خود اس کی زبان پر پیاس سے کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ گھوڑے کو خوبانی کے ایک پیڑ کے نیچے باندھ کر وہ خود کسی چشمے کی تلاش میں پیدل ہی چل پڑی۔ کافی آگے جا کر سرو کے درختوں کی چھاؤں میں اس نے کچھ انسانوں کو سوتے ہوئے پایا۔ ذرا فاصلے پر گھوڑے آرام کرتے تھے۔ پانی کا مشکیزہ اور چند کٹورے بھی وہیں پڑے تھے۔ گھوڑوں کے قد بت ان کی صورتیں اور وہاں موجود چیزیں ان کے حسب نسب کی نشان دہی کرتی تھیں۔ راجا معلوم ہوتے تھے جو شکار کے لیے نکلے ہوئے تھے۔

اس نے پانی پیا اور واپسی کے لیے قدم اٹھائے۔ پر جھٹکا کھا کر یوں رکی جیسے قدموں کو آگے کھائی نظر آ گئی ہو۔ دو ہاتھ کے فاصلے پر ایک نوجوان دونوں بازو رخسار کے نیچے رکھے سوتا تھا۔

یوں لگا جیسے سورج دیوتا اور اس کا رتھ آسمان کے سینے پر دوڑتا دوڑتا اچانک زمین کے اس گوشے پر ٹوٹ کر گر گیا ہو اور اب سویا ہو۔

اس نے چند بار پلکیں جھپکیں اور پھر رخ موڑ لیا۔

وہ برفانی تودے سے ٹوٹے ہوئے اس ٹکڑے کی مانند تھی۔ جو سورج کی کرنوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی پتھر جیسا بنا رہتا ہے۔

لیکن گھوڑے پر جب چھلانگ مار کر بیٹھی تو محسوس ہوا جیسے پتھر ٹوٹ پھوٹ رہا ہے اور برف کا تودہ پگھلنے لگا ہے۔

اس کا جی چاہا تھا وہ اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس کا رخ سپروس کے درختوں کی طرف موڑ دے جہاں کوئی سوتا ہے۔

دنوں وہ بے کلی کا شکار رہی۔ پھر اس نے سورج دیوتا کو اپنی پلکوں کی چھاؤں میں بٹھایا اور خود سلطنت کے کاموں میں جذب ہو گئی۔ کبھی کبھی فرصت کے لمحوں میں اسے وہاں سے اٹھا کر اپنے پاس بٹھا لیتی اور یوں وقت گزرتا گیا۔

پورے ملک کا دورہ کرنے سے شہزادی پر واضح ہو گیا تھا کہ غریب عوام میں وزیر رشو کی بدعنوانیوں اور بے اعتدالیوں سے ہیجان ہے۔

اب مداخلت اور ٹوک جھوک کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رشو آمریت اور مطلق العنانی کے منہ زور اندھے گھوڑے پر سوار تھا۔ جسے روکنا ٹوکنا اسے گوارا نہ تھا۔ عوام میں شہزادی کی بڑھتی ہوئی ہر دل عزیزی بھی اس کے لیے خطرے کا نشان بن رہی تھی۔ اس کی سوچیں اب اس نقطے پر مرکوز ہو رہی تھیں کہ وہ کسی طرح شہزادی کا خاتمہ کر دے۔

یہ خزاں کے دن تھے۔ کسانوں نے چاول، مکئی، کنگنی اور چینا (آلو) کی کٹائی کر لی تھی اور اب سردیوں کے انتظامات میں مصروف تھے۔ جب شہزادی نے بگروٹ جانے کا ارادہ کیا۔ بگروٹ شدید سردی کی زد میں رہنے والا پہاڑی علاقہ ہے۔

اس دورے کے دو اہم مقاصد شہزادی کے پیش نظر تھے۔ ایک باج اور خراج کا معاملہ دوسرے لوگوں کے مسائل کا جاننا۔ کیونکہ بگروٹ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے سال میں صرف ایک فصل پیدا کرتا تھا۔

شہزادی نے بگروٹ کے قلعے سنیکر میں قیام کیا۔

اب رشو نے سوچا بس یہی موزوں وقت ہے۔ اس نے اپنے خیر خواہوں کی ایک جماعت کو اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ فوراً قلعہ سنیکر کے دروازے پر قبضہ کر لے بگروٹ کی جانب روانہ کر دیا۔ ان مسلح لوگوں نے شہزادی کی مہربانیوں اور نیکیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سنیکر میں داخل ہوتے ہی سب کچھ اسے بتا دیا۔ شہزادی نے انہیں انعام و اکرام سے نوازتے ہوئے کہا "رشو کو اطلاع دے دو کہ اس کے حکم کی تعمیل کر دی گئی ہے۔"

وہ اسلحہ جنگ سے لیس ہو کر آیا۔ شہزادی کے روبرو حاضر ہوا۔ اس کا لہجہ درشت تھا۔ آنکھوں میں رعونت اور تکبر کا رنگ تھا۔ شہزادی کو تعظیم دیے بغیر شمشیر پر ہاتھ رکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولا۔ "تم جانتی ہو۔ اچھی طرح سمجھتی ہو۔ والئی یاسین تمہارے دادا کا قاتل ہے۔ نگر کا راجا شاہ کمال تمہارے باپ خاقان مرزا کا مجرم ہے۔ یہ صرف میں ہوں جس نے تمہاری جلاوطنی کو ختم کیا اور تمہیں تخت سونپا۔ میری جوانمردی، دلیری اور شجاعت سے دشمن لرزاں ہیں۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا۔ شہزادی کو اس نے گہری نظروں سے دیکھا اور پھر بولا۔ "تمہاری عمر اس وقت پچیس سال ہے۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ مجھ سے بہتر شوہر تمہیں نہیں مل سکتا یا مجھ سے شادی کرو اور یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ سوچ لو تمہیں زندگی قبول ہے یا موت۔"

شہزادی کا چہرہ غیض و غضب کی آگ سے دہکنے لگا تھا۔ "موت مگر اپنی نہیں تمہاری"۔

اس نے نیزہ رشو کے سینے پر مارا۔ وہ بھی بلا کا شمشیر زن تھا۔ مہارت سے اپنے آپ کو بچا گیا۔ شہزادی نے فن سپہ گری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس خوبی سے وار کیا کہ رشو زمین پر گرا۔ باہر لوگوں کو پتا چل گیا تھا۔ سنیکر کے دلیر اور غیرت مند جوان قلعہ میں داخل ہوئے۔ شہزادی کو انہوں نے منت سماجت سے ہٹایا اور آخری سانسوں پر رشو کو فی الفور موت کے گھاٹ اتار دیا۔

امراء وزراء کا ایک وفد فوری طور پر بگروٹ پہنچا۔ اس سانحہ سے پہلے وادی بلچھار کے لوگوں نے شہزادی کو وہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ اس نے اپنے معتمد وزراء کو ہدایات کے ساتھ گلگت روانہ کیا کہ وہ بلچھار کے دورے سے فارغ ہو کر پہنچتی ہے۔

وہ راکاپوشی اور بلچھار دوبانی کی حسین چوٹیوں کو دیکھنے کی بہت مدت سے خواہش مند تھی۔ اس نے سوچا۔ اب اتنا قریب آ کر یونہی لوٹ جانا ٹھیک نہیں ہے۔

اس نے چوٹیوں کے حسن سے جی بھر کر آنکھوں کو سینکا۔ وادیوں کے لوگوں سے دل کھول کر باتیں کیں۔ ان کے مسائل جانے۔ باج خراج معاف کیا۔ پولو میچ کے کھلاڑیوں کو انعام دیے اور سنیکر کے لیے روانہ ہوئی۔ اس وقت سورج نصف النہار پر تھا۔ اور گھوڑے تازہ دم تھے۔

راستہ بلاشبہ دیکھا بھالا نہ تھا پر جو لوگ ساتھ تھے وہ اتنے ناواقف بھی نہ تھے اور پھر بھی وہ بھٹک گئے۔ پہاڑوں میں ٹھوکریں کھاتے کھاتے ایک ایسی جگہ جا پہنچے جہاں چند لوگ خیمہ زن تھے۔ کائنات کے اس حصے کو چھاتی سفیدی

اور سیاہی کا ملا جلا عکس بڑا پُراسرار اور خوفناک تھا کہ بھوج پتر اور ایش کی جلتی لکڑیوں کے شعلے لپ لپ کرتے آسمان کی طرف بھاگے جاتے تھے یوں جیسے اژدھے پھنکارے مارتے ہوں۔ تین مارخور زمین پر پڑے تھے۔ دو آگ پر بھونے جارہے تھے۔ چکور اور مرغابیوں کا ڈھیر ایک طرف پڑا تھا۔

شہزادی مردانہ لباس میں تھی۔ آگ کے پاس کوئی کھڑا تھا۔ ذرا فاصلے پر تین چار مرد کام کاج میں مصروف نظر آتے تھے۔ غالباً رات کے کھانے کا انتظام ہو رہا تھا۔

سرپٹ بھاگتے گھوڑوں کی آوازوں پر وہ سب اپنی اپنی جگہوں پر انہیں دیکھنے لگے تھے۔ گھوڑے سے کود کر شہزادی کے قدموں نے جب زمین کو چھوا تو نگاہوں کا رخ بھی اس سمت اٹھا جہاں ایک رعنا نوجوان کھڑا تھا۔ دونوں کے چہرے اور چمکتی آنکھیں آگ کی روشنی میں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ دونوں پل بھر کے لیے لڑکھڑائے۔ انہوں نے پلکیں تیزی سے جھپکائیں۔ ان کی آنکھوں میں حیرت اور تعجب کے رنگ تھے۔ پر کمال سلیقے سے انہوں نے اپنے اپنے جذبات پر قابو پالیا تھا۔

علیک سلیک کا تبادلہ ہوا۔ تعارف کروایا گیا۔ لطف کی بات دونوں نے اپنا آپ چھپالیا تھا۔ دونوں شہزادی جوار خاتون اور شہزادہ فردوس کے مصاحب بن کر ایک دوسرے کے سامنے آئے تھے۔ دونوں کے ساتھیوں نے خاموش ہونٹوں کے ساتھ ان کے اس جھوٹ پر سچ کی مہر ثبت کی۔

رات کا کھانا مارخور کے لذیذ گوشت اور قہوے پر مشتمل تھا۔ ایسا ہوا' ایک بار نہیں کئی بار' شہزادہ فردوس کی وارفتگی میں ڈوبی نگاہیں اس نے اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے اپنے جسم میں لطیف سے جھٹکے محسوس کیے تھے۔

دفعتاً اس نے کہا۔ "ایک خاص ذاتی سوال اگر اجازت ہو تو پوچھوں؟ آپ کی کوئی بہن بھی ہے؟"

شہزادی نے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اس کی سبز بلوریں آنکھوں سے تیز وحشیانہ چمک شہزادے کی جانب یوں لپکی تھی جیسے گھپ اندھیرے میں آسمانی بجلی کا لشکارے مارتا کوندا کسی راہ گیر پر گر پڑے۔

"کوئی خاص بات" شہزادی نے تعجب سے پوچھا۔

"خاص بات۔" شہزادے نے اپنے آپ سے کہا تھا۔ "ہاں خاص بات ہی تو ہے۔ وہ جسے سالہا سال سے اپنے سینے میں دفن کیے بیٹھا ہوں۔ آج اس کی جھلک نظر آئی ہے۔ تو کچھ جاننے کی پوزیشن میں نہیں مگر بس ایسے ہی"۔ اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا تھا۔

رات انہوں نے اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ الگ الگ خیموں میں کاٹی۔ پر وہ سوئے نہیں۔ جہاں شہزادہ فردوس اس انوکھے حادثے پر حیران و ششدر تھا۔ وہاں شہزادی جوار خاتون کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری تھا۔

وقت رخصت مصافحہ کرتے ہوئے یکا یک شہزادے فردوس کو احساس ہوا تھا کہ اس کے مضبوط ہاتھوں میں پکڑا دوسرا ہاتھ نرمی اور گرمی کا دلکش امتزاج لیے ہوئے ہے۔ جیسے اس میں کچھ نسوانی پن ہو۔

انہوں نے راستہ سمجھا اور گھوڑوں کو ایڑ لگادی۔

قلعہ سنیکر میں ایک دن قیام کرنے کے بعد شہزادی گلگت کے لیے روانہ ہوگئی۔

اب ملکہ کا اپنی شخصی حکومتی کا دور شروع ہوا۔ اس نے زنانہ لباس مکمل طور پر اُتار پھینکا۔ شاہی لباس زیب تن کیا۔ عمامہ سر پر باندھا۔ طلائی کمر بند باندھ کر اس کے ساتھ شاہی تلوار باندھی اور تخت پر بیٹھی۔

سنجیدہ، ہوشیار، تجربہ کار اور صلاحیت مند افراد کا انتخاب کر کے انہیں مختلف عہدوں پر متمکن کیا۔ رعایا کی فارغ البالی، ملک کی آبادی اور دیگر رفاہ عامہ کے کاموں میں وہ اپنے آباؤ اجداد پر سبقت لے گئی تھی۔ چلاس داستور گریز اور گلگت خاص میں سڑکیں اور نہریں بنوائیں۔ کوہل بالا اور کوہل پائیں (اوپر اور نیچے کی نہریں) داریل اور تانگیر کے لوگوں کی مدد سے نالہ بسین سے نکلوائیں۔ سونی یب (رانی کی نہر) خومر اور جوٹیال کے درمیان سے نکلی۔

یہ شادمانی کا دور تھا۔ امن و آشتی اور عیش و آرام کا زمانہ تھا۔ جامع اصلاحات کے نفاذ نے اسے سنہری ایام کا نام دیا تھا۔ اس کا طرز جہاں بانی منفرد تھا۔

وہ مطمئن تھی' مسرور تھی۔ پر کبھی کبھی مضطرب بھی ہو جاتی تھی۔ اس کی بند پلکوں پر تھرکتی وہ صورت اب اسے زیادہ ستانے لگی تھی۔ رات وہ اس کی ہمراہی میں سنبار باغ میں چکوروں کا شکار کھیلتی رہی تھی۔ صبح دم جب آنکھ کھلی تو شاہی چھپر کٹ پر تھی۔ سارے وجود میں دکھ اور یاس گھل گیا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک بار جب وہ اپنے سالانہ دورے پر داریل، تانگیر اور ہربن کے علاقوں سے ہوتی ہوئی علاقہ گور (موجودہ گوہر آباد چلاس) میں آئی یہ جگہ ایک بلند سطح

مرتفع پر واقع ہے۔ پورا علاقہ نہایت دل کش و خوش منظر اور صحت بخش آب و ہوا کے لیے خصوصی شہرت رکھتا ہے۔ حسن و خوبصورتی سے معمور اس کی راجدھانی کا یہ حصہ اُسے بہت پسند تھا اور وہ اکثر یہاں کچھ دنوں پڑاؤ کرتی۔

اس بار دو باتوں سے وہ متفکر ہوئی۔ بہت ساری زمین محض پانی کی کمی کی وجہ سے غیر آباد تھی۔ یہاں آبادی کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔

اس نے حد نظر نگاہ ڈالی اور اپنے آپ سے کہا۔ ایک نئی کوہل (چھوٹی نہر) یہاں زیادہ خوشحالی لانے کی ذمہ دار بن سکتی ہے۔ اس لیے اس کا بننا بہت ضروری ہے۔

سرکردہ لوگ اس کی طلبی پر حاضر خدمت ہو گئے۔ شفقت اور محبت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"میں جانتی ہوں کسی دور دراز نالہ سے راستے میں حائل پہاڑوں اور چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر ایک نئی کوہل تعمیر کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ لیکن یہ میری خواہش ہے۔ میں اس بنجر اور ویران زمین پر آپ لوگوں کے کھیت کھلیان دیکھنا چاہتی ہوں۔"

لوگ خاموش تھے۔ یہ تو گویا پہاڑ سر پر اٹھانے والی بات تھی۔

"بولیے بتایئے۔ چپ کیوں ہیں؟ آپ میری اس خواہش کو بال ہٹ نہیں کہہ سکتے۔ یہ تریا ہٹ بھی نہیں۔ آپ لوگ میری ایسی خواہشات کے پس منظر میں میرے جذبات سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔"

مجمع پر چھائی خاموشی ٹوٹی تھی۔ ایک شیریں گفتار مرد جس کا نام طاتو جشیرو تھا کھڑا ہوا۔ دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے اس نے کہا۔ "اگر جان کی امان پاؤں تو ملکہ کے حضور خاموشی کا عذر پیش کروں۔"

جواباً شہزادی نے کہا۔ "اجازت ہے۔ بلا خوف و خطر اپنے جذبات کا اظہار کرو۔"

طاتو..... جشیرو بھرے دربار میں یوں گویا ہوا۔ "ہمیں احساس ہے کہ آپ کی ہر سوچ اور ہر خواہش کے پس منظر میں اپنی رعایا کے کسی ایک فرد کو بھی غربت زدہ یا مفلوک الحال دیکھنا گوارا نہیں۔ لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ آپ اپنی مملکت کو نیک سیرت اور حمیدہ خصلت تاجداروں سے محروم بھی رکھنا چاہتی ہیں۔"

شہزادی جیسے حیرتوں سے بھرے پانیوں کی کسی جھیل میں دھڑام سے گر گئی۔ "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔ جو کہنا چاہتے ہو صاف اور واضح الفاظ میں بیان کرو۔"

طاتو جشیرو نے مودبانہ انداز میں بڑا چبھنے والا سوال کر دیا تھا۔ "شہزادی جوار خاتون آپ کے بعد تخت و تاج کا وارث کون ہوگا؟"

اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے بھرے پڑے دربار کا ہر فرد ایک سوالیہ نشان بن کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔ اندر کا اضطراب کرب کی صورت میں پسینا بن کر اس کی پیشانی پر پھوٹ نکلا۔ وہ گم صم سوچوں میں گھری ہوئی تھی۔ جب طاتو جشیرو نے اس سکوت کو توڑا۔

"یہ میری ہی نہیں آپ کی قلمرو کے تمام عورتوں، مردوں، جوانوں، بوڑھوں کی خواہش ہے۔ خود سوچیے نا جس ملک اور عوام کے لیے آپ دن رات ہلکان ہو رہی ہیں۔ آپ کے بعد وہ آپ کے بدخواہوں کے تصرف میں ہوگا۔ اپنی رعایا کو اس عذاب میں مت ڈالیں۔ حضور قدرت کے اصولوں کے خلاف کام نہ کریں اور خاندان طرہ خان کے سلسلے کو ختم کر کے رعایا کو مایوس مت کریں۔"

اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ لیا تھا۔ یہ کیسا امتحان ہے میرے خدا؟ آزمائش کی یہ کیسی گھڑی ہے؟ خوابوں کی اس جنت سے یہ کیسا دیس نکلا ہے؟

ہر فرد منتظر نگاہوں سے اُسے دیکھتا تھا۔ اس نے پیشانی کا پسینا پونچھا اور اپنے آپ سے کہا۔ "میں دو دھاری تلوار کی زد میں ہوں۔ ہاں کہتی ہوں تو اپنا گلا کٹتا ہے۔ نہ کہتی ہوں تو یہ سب مرتے ہیں۔"

تب اس نے ان کی ملتجی نگاہوں کو اپنے دل میں اتارا اور کہا۔ "مملکت گلگت کے بوڑھے مرد اور عورتیں میرے والدین، جوان میرے بہن بھائی اور بچے میری اولاد کی مانند ہیں اگر یہ سب کا فیصلہ ہے تو میں اس کے سامنے سر جھکاتی ہوں اور اس کا کلی اختیار آپ لوگوں کو سونپتی ہوں۔"

بھرے مجمع نے فرط انبساط سے نعرے لگائے۔ ایک دوسرے کو فرط جذبات سے گلے لگایا اور مبارکباد دی۔

پھر پروگرام کی تفصیلات طے پائیں۔ دن اور وقت مقرر ہوا۔ اکابرین سر جوڑ کر بیٹھے کہ کس ملک اور کس خاندان کا شہزادہ موزوں رہے گا۔

والئی یاسین کی طرف رجحان رکھنے والے ایک نمائندے نے اس خاندان کے ساتھ ناطہ جوڑنے کو کہا۔

اس تجویز پر معتبر ترین بزرگ نے قدرے غصے سے

کہا۔ ”کبھی ایسا مت سوچنا۔ والئی یاسین کی اولاد محسن کش ہے۔ وہ عوام کا گوشت کھاتے ہیں۔“

حراموش کے علاقے کے کسی اکابر نے کہا کہ علاقہ اسکردو کے مقپیوں خاندان کا کوئی شہزادہ مناسب رہے گا۔

”ہرگز نہیں بلتیوں کی خوراک زیادہ تر زان ہے۔ ان کی کمر کمزور ہوتی ہے۔ وہ ہماری شجاع اور دلیر شہزادی کے لیے کسی طرح موزوں نہیں۔“

شاہی خاندان ہنزہ بھی رد ہوا۔ پھر اسی بزرگ نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔ میری ناقص رائے کے مطابق نگر کا شہزادہ بہت موزوں رہے گا۔ اس نے دونوں خاندانوں کے درمیان رشتہ داری کا حوالہ دیا۔ ان باتوں کو بھی زیرِ بحث لایا گیا جو شاہی خاندانوں میں وجہِ تنازع بنے۔ اس نے کہا میرے ساتھ طاؤ جشیئرو اور دیگر معزز لوگوں کا ایک وفد جائے گا اور نگر کے راجا شاہ کمال کے حضور اپنی درخواست پیش کرے گا۔

نگر میں وفد کا استقبال شاہانہ انداز میں کیا گیا۔ شاہی محل میں انہیں اتارا گیا۔ اور اگلے دن دربارِ عام میں شاہ کے حضور مدعا پیش ہوا۔

شاہ نے شکوے شکایتوں کا جو دفتر کھولا اُسے وفد کے سربراہ نے ذہانت اور متانت سے سمیٹا۔ دلوں کی کدورت صاف ہوئی تو دونوں شہزادوں کو پیش کیا۔ شاہ فردوس اور شاہ رحیم۔ وفد کی نگاہِ انتخاب شاہ فردوس پر تھی کہ وہ ایک خوش رہ خوش خو اور وجیہہ انسان تھا۔

پر ایک عجیب سی بات ہوئی کہ شاہ فردوس نے کہا وہ شہزادی سے ملے اور اس سے باتیں کیے بغیر شادی نہیں کرے گا۔

وفد لوٹ آیا۔ شہزادی کو صورتِ حال سے مطلع کیا گیا۔ ساری روئداد سننے کے بعد اس نے متانت سے جواب دیا تھا۔ ”کوئی حرج نہیں۔ پیغام بھجوادیں۔“

وہ ایک شام بونجی کے دورے سے لوٹی تھی۔ اُس نے شہ زور گھوڑے کی طنابیں ایک جھٹکے سے کھینچ کر اسے زمین پر ساکت کرتے ہوئے قلعہ فردوسیہ کے باہر غیر معمولی رونق اور گہما گہمی کا سبب جاننا چاہا تھا۔

”شہزادہ فردوس تشریف لائے ہیں اور آج شب آپ سے ملاقات کے متمنی ہیں۔“

اس نے یہ سنا اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا قلعے کے راستوں پر بگولے کی طرح اڑتا شاہی محل میں اس جگہ آ کھڑا ہوا جہاں خدمت گار اس کی پیشوائی کے لیے کھڑے تھے۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ چوب چراغوں کی روشنی سے کمرا منور تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے نیم دراز تھی اور دروازے میں کوئی کھڑا تھا۔

وجاہت اور شجاعت کا پیکر چلتا چلتا عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ دم بخود گنگ اور حیرت زدہ۔

”تو یہ تم ہو“ ساکت لہجہ بالآخر ٹوٹا تھا۔

اس نے آنکھیں کھولیں۔ پلکوں کی چھاؤں میں جو سورج دیوتا ڈیرے ڈالے بیٹھا تھا' وہ اس وقت سامنے تھا۔ اضطراری حالت میں وہ کھڑی ہوگئی۔ اس کی زبان نے بھی بے اختیار کہا تھا۔ ”یہ تم ہو۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے، طویل فراق کی داستانیں سناتے ہوئے۔ جانے کتنی دیر بیت گئی تھی شاید صدیاں۔ تب اس نے آگے بڑھ کر اس کے شانوں پر اپنے ہاتھ رکھے۔ اسے بٹھایا اور خود بھی بیٹھا اور بولا۔ ”تمہیں مجھ پر اپنا آپ ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ میرے اندر برسوں کی جلتی آگ پر تو پھوار پڑتی۔“

وہ مسکرائی یوں جیسے کوئی عقل مند کسی معصوم اور بھولے بھالے بچے کی کسی بات پر مسکراتا ہے۔

چراغ جلتے رہے۔ باہر ہوا شاہ بلوط کے پتوں کے ساتھ مل کر تالیاں بجاتی رہی اور رات کا اولین پہر پہاڑوں کی چوٹیوں سے پھسل کر نیچے وادی میں اترتا آیا۔

شہزادی کی آنکھوں میں چھلکتے سوال تھے۔ یہ سوال اس کے ہونٹوں پر آنے کے لیے مچل رہے تھے۔ شہزادی فردوس نے انہیں سمجھا اور اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی انہیں زبان دے دی۔

یوں محسوس ہوتا تھا وہ جیسے کسی اور دنیا میں کھو گیا ہے۔ اس کی آواز بھی کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ چوب چراغوں پر جمی نظریں خوابوں کی اس جنت میں جھانک رہی تھیں جہاں جھیلوں' آبشاروں اور چشموں کے کنارے اس نے اسے بارہا دیکھا تھا۔ شاید اسی لیے اس کا حقیقی روپ مردانہ صورت میں دیکھ کر گڑبڑا گیا تھا۔

”ہاں۔ وہ مسکرایا۔ شادی سے پہلے تم سے ملنے کی شرط اس لیے تھی کہ تمہارے بارے میں بے شمار باتیں گردش میں ہیں۔ تم نفسانی خواہشات سے کسی حد تک مبرا ہو۔ رعایا کے مجبور کرنے پر ولی عہد کے لیے شادی کر رہی

ہو۔'' وہ رکا پھر بولا۔ ''میں شہزادی جوار خاتون سے یہ جاننے کا آرزومند تھا کہ ولی عہد کے حصول کے بعد مجھ سے کیا سلوک ہوگا؟''

شہزادی ہنسی تھی۔ مدتوں بعد ایسی ہنسی اس کے ہونٹوں پر بچی ہوئی خود ہونٹوں کو اجنبی اجنبی سی محسوس ہوئی تھی۔

آہستگی سے اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔

شہزادہ فردوس نے یہ ہاتھ اٹھایا۔ اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''عورتوں سے کبھی میرے مراسم نہیں رہے۔ میرے لیے یہ ایک طرح شجر ممنوعہ ہی ہے۔ مگر بگروٹ کی اس صبح یقین کرو تمہارے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھامتے ہی مجھے نسوانی تپش کا احساس ملا تھا۔''

پھر وہ اٹھا۔ اس کا چہرہ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ اس کے چمکتے گھنے بالوں کو چوما۔ ''میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ چہرہ جو مدتوں میرے خوابوں، خیالوں اور دل کی دنیا پر اپنا قبضہ جمائے بیٹھا رہا کسی ایسی خاتون کا ہے۔ جو بڑی شہ زورہ جیالی اور بڑی خودسر ہے۔ میں اسے ملکہ بنانے کا متمنی ضرور تھا۔ پر اس کا مشیر بننا مجھے تصور میں بھی گوارا نہ تھا۔''

پر مقدر زورآور ہوتا ہے۔

وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ اس کی آواز میں اس کے خیالوں کی شکستگی کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ ''بس اتنی سی بات یاد رکھنا کہ جس دن مجھے یہ محسوس ہوا کہ تمہاری راجدھانی میں میری حیثیت ایک عضو معطل کی سی ہے اور تم مجھ سے اکتا گئی ہو میں اسی لمحے تمہاری دنیا سے نکل جاؤں گا اور پھر تم لاکھ بھی چیختی رہو میری صورت بھی نہ دیکھ پاؤ گی۔''

اور شہزادی نے حیرت سے پلکیں جھپکیں۔ اس کا ذہن ماؤف سا ہو گیا تھا۔ دروازے کی کنڈی ہلتی تھی اور کمرے میں یوں لگتا تھا جیسے کوئی بگولا اڑتا اڑتا باہر نکل گیا ہو۔

''کہیں یہ بھی تو پتا نہیں۔ خوبصورت اور پُراسرار سا۔''

اس نے بے اختیار اپنے آپ سے کہا۔

پھر بڑی دھوم دھام سے بیاہ ہوا۔ شہزادی فردوس کو راجا کا خطاب دیا گیا۔ سال بعد ولی عہد کی پیدائش ہوئی۔ تو مولود کا نام جی خان (حبیب خاں) تجویز ہوا۔

اب محلاتی سازشوں کا دور شروع ہوا۔ مملکت کے چند دانشمند اور دوراندیش افراد کا انتقال ہونے سے شرپسندوں اور مفاد پرستوں کو کھیل کھیلنے کا موقع ملا کیونکہ شہزادہ فردوس ان کی راہ میں رکاوٹ تھا جو بڑی زبردست اور دھڑے والی شخصیت ہونے کی وجہ سے پوری سلطنت پر چھایا ہوا تھا۔

ایک دن جب وہ اپنے اکابرین کے ساتھ ہنگا شکار کھیلنے (بازوں اور شکروں کی مدد سے شکار کھیلنا) چلاس گیا۔ واپسی پر اس نے دریائے گلگت پر تعمیر شدہ رسیوں کا پل کٹا ہوا دیکھا۔ پل کے دوسری طرف گلگت کے چند معتمد لوگ تھے۔

انہوں نے کہا۔ ''اپنی راجدھانی مگر جاؤ۔ تخت و تاج کا وارث موجود ہے۔ یہاں اب تمہاری ضرورت نہیں۔''

اس نے غیظ و غضب سے بھری ہوئی نظریں ان پر یوں ڈالیں جیسے شاہین عقاب کبوتروں کے غول پر ڈالتا ہے۔

''شہزادہ جی خان مجھے دے جاؤ۔''

جواب ملا۔ ''تھوٹ چھال نش''۔ (یعنی بچہ بکری والوں کا ہوتا ہے) زہرخند ہنسی ہنستے ہوئے وہ واپس مڑا اور مڑتے مڑتے بولا۔ ''مجھے اس دن کی توقع تو تھی پر ملکہ جیسی زیرک خاتون سے یہ امید ہرگز نہ تھی کہ وہ ممولوں کو شہباز سے لڑانے کی ایسی ناقص تربیت کرے گی۔''

اور ملکہ کو جب اس سانحہ کا علم ہوا تو بہت پریشان ہوئی۔ سازش میں شریک لوگوں کو نہ صرف لعن طعن کیا بلکہ انہیں عوام کی عدالت میں پیش کر دیا۔ راجا فردوس کو سندیسہ بھیجا۔ اپنی پوزیشن واضح کی۔ جواب آیا تھا۔

''میں نے کہا تھا مجھے کبھی کوئی ایسا پالتو جانور نہ سمجھنا جو مالک کے اشارے پر دم ہلائے۔ اس کی مرضی پر آنکھیں کھولے اور بند کرے۔ جواری دل کی دنیا کے دروازے تو صرف ایک بار ہی کھلتے ہیں۔ مگر اگر یہ بند ہو جائیں تو میرے جیسا جیالا انہیں دوبارہ کھولنے کی کوشش میں ہی لہولہان ہو جائے گا۔''

اس نے یہ پیغام سنا۔ نگاہیں اٹھائیں۔ اپنے سامنے دیکھا۔ ان آنکھوں میں فولادی جذبوں کی انگڑائیاں تھیں۔

''تمہیں لہولہان دیکھنا میری کب تمنا ہے؟ فردوس خان تم اور میں آسمان کے ان ستاروں کی مانند ہیں جو قریب آنے پر ایک دوسرے سے ٹکرا کر تباہ ہو جاتے ہیں۔ پر دور رہ کر روشنی بکھیرنے اور راستہ دکھانے کا موجب بنتے ہیں۔ چلو مجھے تمہارا یہ فیصلہ منظور ہے۔ کیونکہ تاج پہننے والا بیدار مغز سر کبھی اپنے لیے نہیں جیتا۔''

اور تاریخ گلگت کے اوراق گواہ ہیں کہ صدیاں گزر جانے پر بھی وہ زندہ ہے۔ صفحات میں بھی اور دلوں میں بھی۔

شکاری

زویا اعجاز

وہ جب میدان میں آتا ہے تو تماشائی دم بخود رہ جاتے ہیں۔ پیچ پر کھیلی جانے والی بال اور بننے والا رن تماشائیوں کے جوش و خروش میں اضافہ کرتا ہے۔ بلے کی ہر حرکت دیکھنے والوں کی رگوں میں دوران خون بڑھا دیتا ہے لیکن یہ مقام اسے یوں ہی حاصل نہیں ہوا۔ اس کی جہد مسلسل سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس نے تماشائیوں کا دل جیتنے کے لیے کس قدر کوشش کی ہے۔

نئے کھلاڑیوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے

کرکٹ کے مختصر ترین فارمیٹ ٹی ٹونٹی نے اس کھیل کو ایک نیا حسن اور گلیمر عطا کر کے شائقین کرکٹ کو ایک انوکھی سنسنی سے روشناس کرایا ہے۔ ٹی ٹونٹی کے چھٹے عالمی میلے کا سورج تمام تر ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ تین اپریل کو غروب ہوگیا۔ اس عالمی کپ میں بے شمار برج الٹے اور کئی نئی داستانیں رقم ہوئیں۔ دفاعی چیمپین سری لنکا کے علاوہ جنوبی افریقا اور پاکستانی ٹیم کی کارکردگی انتہائی مایوس کن رہی مذکورہ بالا ٹیمز کا سفر پہلے ہی مرحلے میں رسوا کن انجام کے ساتھ

اختتام پذیر ہوا۔ سیمی فائنلز اور فائنل میں اعصاب شکن مقابلے ہوئے اور بالآخر عالمی حکمرانی کا تاج جزائر غرب الہند کا مقسوم ٹھہرا۔

ٹورنامنٹ کے اکلوتے میزبان اور ٹائٹل کے لیے فیورٹ قرار دی جانے والی بھارتی ٹیم نے سیمی فائنل تک رسائی حاصل کی۔ بلا شبہ مہندر سنگھ دھونی کی قیادت میں بھارت نے لاجواب پیشہ وارانہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا لیکن ان میں ایک کھلاڑی ایسا بھی تھا جو باقی تمام ٹیمز کے لیے ایک ڈراؤنا خواب ثابت ہوتا رہا۔ پاکستان، آسٹریلیا اور جزائر غرب الہند کو اس نے اپنی کارکردگی سے ناکوں چنے چبوا کر اپنے مداحوں کی تعداد میں بے حد و بے حساب اضافہ کیا۔ حیران کن امر یہ ہے کہ بہترین کرکٹ دماغ و انتظامیہ بھی اس بھارتی کھلاڑی کا کوئی توڑ تلاش نہیں کر سکے اور وہ مسلسل دوسری بار ورلڈ ٹی ٹوئنٹی میں ٹورنامنٹ کا بہترین کھلاڑی قرار پایا۔ کرکٹ شائقین اس کے متعلق ملے جلے جذبات رکھتے ہیں دوران کھیل ایک طرف تو اس کا رویہ، چہرے کے تاثرات ہمیشہ مخالف ٹیم اور مداحوں کو ناگوار گزرتے ہیں، جبکہ دوسری جانب اس کا ذمہ دارانہ کھیل سراہا بھی جاتا ہے۔ ایسا تضاد دنیائے کرکٹ میں کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

ویراٹ کوہلی نامی یہ کھلاڑی اپنی شاندار کارکردگی، مستقل مزاجی اور جارحانہ انداز میں کھیلی جانے والی کرکٹ کی بدولت شہرت کی بلندیوں پہ جا پہنچا ہے۔ پانچ فٹ 9 انچ قامت کا داہنے ہاتھ سے کھیلنے والا یہ کھلاڑی کرکٹ کے حلقوں میں "بیڈ بوائے" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ویراٹ نے 5 نومبر 1988ء کو دہلی کے ایک پنجابی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کا تعلق کھتری ذات کے ایک ذیلی قبیلے سے ہے۔ اس کے والد پریم کوہلی ایک فوجداری وکیل تھے جبکہ والدہ سروج کوہلی گھریلو خاتون ہیں۔ تین بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کے باعث وہ گھر بھر کی آنکھوں کا تارا رہا۔ بڑے بھائی وکاش اور بہن بھاونا نے بھی اس کی خوب ناز برداریاں کیں۔ بچپن ہی سے اسے چیکو کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔

پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آ جایا کرتے ہیں۔ ویراٹ کے مستقبل کے عزائم بھی تین سال ہی کی عمر سے آشکار ہونے لگے تھے جب وہ ننھے ہاتھوں میں بلا تھامے اپنے والد سے گیند بازی کے لیے مصر رہتا تھا۔ کوہلی کی پرورش "اتم نگر" میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم "وشال بھارتی پبلک اسکول" میں حاصل کی۔ کرکٹ سے محبت بچپن ہی سے رگ رگ میں بسی تھی۔ جارح مزاجی اور ٹیلنٹ بھی دیدہ بینا خوب دیکھ رہے تھے۔ پریم کوہلی کے قریبی دوستوں اور ہمسایوں کی باہمی رائے یہی تھی کہ ویراٹ اپنا وقت گلی محلے کی کرکٹ میں ضائع کرنے کی بجائے اپنی مخفی صلاحیتوں کو کسی مستند تربیتی ادارے میں نکھارے۔ لہٰذا 1998ء میں تخلیق ہونے والی "ویسٹ دہلی کرکٹ اکیڈمی" میں نو سالہ ویراٹ پہلا مدخل تھا جہاں راجکمار شرما نے اس ناتراشیدہ ہیرے کی تراش خراش کا آغاز کر دیا۔ اسی دورانیہ میں "نوئیڈا" کے نزدیک "سومت ڈوگرا اکیڈمی" میں بھی میچز کھیلتا رہا۔ نویں جماعت میں اس کا داخلہ "پچھم وہار میں "سیویئر کانونٹ" میں ہوا جہاں اسے کرکٹ کی مزید باریکیاں سیکھنے کا موقع ملا۔ کھیل کے علاوہ ویراٹ کا تعلیمی ریکارڈ بھی بہت اچھا تھا۔ اساتذہ کی رائے ہمیشہ اس کے متعلق بہت مثبت رہی۔ اسے ایک "ذہین اور فعال" متعلم گردانا جاتا تھا۔

پریم کوہلی نے بیٹے کے جنون کو منزل تک پہنچانے کے لیے اپنی استطاعت سے بڑھ کر تعاون کیا۔ اسے تربیتی مراکز میں روزانہ خود لے کر جانا اور حوصلہ افزائی کے لیے وہیں موجود رہنا ویراٹ کی خود اعتمادی میں خاطر خواہ اضافہ کرتا رہا اور اس کے لیے کامیابیوں کے نئے در وا ہونے لگے۔ ویراٹ نے دہلی کی پندرہ سال سے کم عمر کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیم میں شامل ہو کر اکتوبر 2002ء میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ 2002-03ء میں ہونے والی "پولی امریگر ٹرافی" میں 34.40 کی ایوریج سے 172 اسکور بنا کر وہ اس ٹورنامنٹ کا بہترین بلے باز تھا۔ اس کی محنت بے ثمر ثابت نہ ہوئی اور اسے اسی ٹورنامنٹ میں اگلے سال ٹیم کا قائد بنا دیا گیا جہاں اس نے 78 کی بہترین اور قابلِ رشک ایوریج سے 5 اننگز میں دو سنچریز اور دو ففٹیز کی مدد سے 390 رنز بنائے۔ 2004ء میں ویراٹ کو دہلی کی سترہ سال سے کم عمر کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیم کے لیے منتخب کر کے "وجے مرچنٹ ٹرافی" میں کھیلنے کا موقع دیا گیا۔ اس کی صلاحیتیں مزید کھل کر سامنے آئیں اور اس کے بلے نے چار میچز میں 117.50 کی ایوریج سے 470 رنز اگلے۔ اس ٹورنامنٹ میں اس نے انفرادی طور پر 251،

اسکور بنائے اور کوئی بھی مخالف باؤلر اسے آوٹ نہ کر سکا۔ 05-2004ء کی وجے مرچنٹ ٹرافی میں دہلی کی ٹیم فاتح رہی۔ ویراٹ کے لیے یہ سال بھی یادگار ثابت ہوا۔ اس نے سات میچز میں 84.11 کی ایوریج اور دو سنچریز کی مدد سے 757 رنز بنا کر اپنی اہلیت مکمل طور پر ثابت کر دی۔ فروری 2006ء میں اسے دہلی کی جانب سے "سرد مزکر کٹ ٹیم" (بھارت کے سب سے بڑے ڈومیسٹک ٹورنامنٹ رانجی ٹرافی کی ایک ٹیم) کے خلاف بطور "اے گریڈ" کھلاڑی منتخب کیا گیا۔ تاہم اسے بیٹنگ کا موقع نہ مل سکا۔

اس کی کامیابیوں کا سفر بڑا و طے کرتا رہا۔ فروری 2006ء میں اسے دورۂ انگلستان کے لیے انیس سال سے کم عمر کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیم میں شامل کیا گیا۔ وہاں اپنی مخالف ٹیم کے ہم عمر کھلاڑیوں پر اس کی برتری مسلمہ تھی۔ اس نے تین ایک روزہ میچز میں 105 کی ایوریج، جبکہ تین ٹیسٹ میچز میں 49 کی ایوریج سے خوب رنز بنائے اور ان دونوں سیریز میں اپنی ٹیم کی فتح میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس دورہ کے اختتام تک بھارتی انڈر 19 ٹیم کا کوچ لال چند راجپوت اس کی صلاحیتوں کا مکمل قائل ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے ایک بیان میں کہا:

"کوہلی نے پیس اور اسپن باؤلرز کے خلاف ایک نایاب تکنیکی مہارت کا مظاہرہ کیا"۔ اسی برس ستمبر میں دورۂ پاکستان میں اس نے ٹیسٹ اور ایک روزہ میچز میں بالترتیب 58 اور 41.66 کی ایوریج سے اپنی کارکردگی کا تسلسل برقرار رکھا۔ اکتوبر میں "وینو مانکڈ ٹرافی" میں دہلی انڈر 19 کی طرف سے کھیلتے ہوئے اس کی بیٹنگ ایوریج 15 جبکہ "وہ کوچ بہار ٹرافی" میں 72.66 رہی اور اسے "وجے ہزارے ٹرافی" میں بھارتی شمالی خطے کی انڈر 19 میں کھیلنے کا موقع دیا گیا۔ وہ دو میچز میں 28 کی ایوریج قائم کر سکا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں اسے فرسٹ کلاس کرکٹ کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس نے اپنا پہلا میچ دہلی کی طرف سے تامل ناڈو کے خلاف نومبر 2006ء میں کھیلا لیکن خاطر خواہ کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر پایا۔ وہ صرف دس رنز ہی بنا پایا تھا۔

کیریئر کے اس موڑ پہ ایسی کارکردگی اس کے لیے لمحۂ فکریہ تھی۔ وہ مزید کامیابیاں سمیٹنے کا خواہاں تھا لیکن گھریلو حالات قدرے ناسازگار ہو چکے تھے۔ دماغی مرض کے باعث پریم کوہلی ایک ماہ سے صاحبِ فراش تھا۔ زندگی ان پہ کبھی زیادہ مہربان نہیں رہی تھی۔ اپنے ابتدائی معاشی حالات کے بارے میں ویراٹ نے ایک بیان میں کہا:

"میں نے زندگی میں بے شمار مصائب کا سامنا کیا۔ والد کے کاروباری حالات بد سے بدترین ہوتے چلے جا رہے تھے۔ کرائے کے گھر میں رہائش پذیر میرے خاندان نے سخت ترین ادوار کا مقابلہ کیا۔ زندگی کی ان سختیوں کے نقوش آج بھی میرے دل و دماغ پہ راسخ ہیں"۔

آفاقی سچائی کے تحت کامیابیاں خراج ضرور وصولتی ہیں۔ قسمت نے ویراٹ سے یہ خراج اس کے والد سے دائمی جدائی کی صورت میں لیا۔ دسمبر 2006ء میں کرناٹک کے خلاف کھیلے جانے والے ایک میچ سے پہلے پریم کوہلی کی روح داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئی لیکن ویراٹ نے اس موقع پر "کرشماتی حوصلہ و صبر" کا مظاہرہ کرتے ہوئے میچ میں شرکت کا فیصلہ کر کے سبھی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اس میچ میں اس نے شاندار 90 رنز بنائے اور آوٹ ہونے کے فوری بعد اپنے والد کے جنازہ میں شرکت کے لیے روانہ ہو گیا۔ دہلی ٹیم کے اس وقت کے قائد متھن منہاس نے میچ کے بعد اپنے بیان میں کہا۔ "ویراٹ کوہلی کا یہ عمل پیشہ ورانہ ذمہ داری اور لگن کی ایک نایاب مثال ہے۔ اس کی اننگز میچ میں انتہائی اہم اور فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ اس کے عزم، ہمت اور مثبت رویے کو ہم تہہ دل سے سلام پیش کرتے ہیں"۔

ویراٹ اپنے اس میچ کی بابت کہتا ہے کہ "میں اپنے دل میں جو تڑپ اور درد لیے یہ میچ کھیلنے آیا تھا۔ اسی نے سب کچھ اس دن تبدیل کر ڈالا۔ میرے ذہن میں اس وقت صرف ایک ہی نقطہ تھا کہ مجھے اپنے والد کا خواب شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے کھیلنا ہے۔ میرے والد میرے لیے ایک مثال تھے۔ ان کی کمی آج بھی ایک ناقابلِ بیان خلا ہے"۔

والد سے محرومی نے اس کی زندگی سے پیشہ ورانہ غیر سنجیدگی کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ اس کی والدہ کا کہنا ہے۔ "اس دن کے بعد ویراٹ میں حیران کن تبدیلی کی افزائش ہوئی۔ وہ راتوں رات ہی سنجیدگی اور ذمہ داری کے کئی مراتب طے کر گیا اور اپنے ہر میچ کے لیے سنجیدہ سے سنجیدہ تر ہوتا چلا گیا۔ ٹیم سے باہر بیٹھنے اور غیر فعال ہونے سے اسے سخت نفرت تھی۔ کرکٹ اس کی سوچ، عمل اور زندگی پر مکمل قابض ہو چکی تھی۔ اب وہ اپنے لیے نہیں، اپنے والد کے خواب کی تکمیل کے لیے کوشاں تھا"۔

اس ٹورنامنٹ میں وہ چھ میچز کھیل کر 36.71 کی

ایوریج سے 257 رنز بنائے۔اپریل 2007ء میں اس نے اپنے ٹی ٹوئنٹی کیریئر کا دھماکے دار آغاز کیا اور بین الصوبائی ٹی ٹوئنٹی چیمپئن شپ کا کامیاب ترین بلے باز رہا۔جولائی اور اگست 2007ء میں سری لنکا میں منعقد شدہ ایک سہ ملکی انڈر 19 ٹورنامنٹ میں سری لنکا اور بنگلہ دیش کی ٹیموں کے خلاف بھی اس کی کارکردگی کا تسلسل اس ٹورنامنٹ کے دوسرے بہترین بلے باز کے اعزاز پر اختتام پذیر ہوا۔

فروری اور مارچ 2008ء میں ہونے والے انڈر 19 عالمی کپ کے لیے بھارتی ٹیم کی قیادت ویراٹ کوہلی کے سپرد کی گئی۔ملائیشیا میں منعقد ہونے والے اس اہم ترین ٹورنامنٹ میں قسمت کی دیوی مکمل طور پہ اس پر مہربان رہی۔اس نے ٹیم کے لیے چوتھے نمبر پر بیٹنگ کرتے ہوئے چھ میچز میں 235 رنز بنائے۔اس عالمی کپ میں جن تین کھلاڑیوں نے سنچری بنائی ان میں ایک کوہلی بھی تھا۔ویسٹ انڈیز کے خلاف 74 گیندوں پہ بنائی جانے والی یہ سنچری اس ٹورنامنٹ کی بہترین اننگز گردانی گئی۔اس میچ میں بھارت کو پچاس رنز کی واضح برتری سے کامیابی ملی اور کوہلی کو مرد میدان قرار دیا گیا۔اس میچ میں ویراٹ کی ٹانگ زخمی ہوئی تاہم اس نے جلد ہی صحتیاب ہو کر انگلستان کے خلاف ہونے والے کوارٹر فائنل میں شرکت کی۔نیوزی لینڈ کے خلاف سیمی فائنل میں اس کی کارکردگی نے بھارتی ٹیم کو فائنل تک رسائی دی۔اس نے نہ صرف ۲۷ رنز کے عوض دو وکٹیں حاصل کیں بلکہ جیت کے ہدف کے تعاقب میں اپنی ٹیم کو 43 قیمتی رنز سے نواز کر یقینی شکست سے بچایا اور مرد میدان قرار پایا۔جنوبی افریقہ کے خلاف ہونے والے فائنل میں بھارت ڈک ورتھ لوئیس فارمولے کے تحت 12 رنز سے کامیابی سمیٹ کر انڈر 19 عالمی حکمران بن گیا۔اس میچ میں بھی اہم مواقع پر ویراٹ کی جانب سے شاطرانہ و ماہرانہ باؤلنگ تبدیلیوں ہی نے جیت میں اہم کردار ادا کیا۔اس وقت بھارتی ٹیم کے کوچ ڈیو واٹمور نے اسے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ایک بیان میں کہا۔"کوہلی ایک جارح مزاج اور بے چین روح ہے۔وہ کسی بھی لمحہ مخالف کے سامنے مغلوب نہیں ہوتا۔بلکہ اپنی قدرتی مہارت بروئے کار لاتے ہوئے کھیل پر غالب ہو جاتا ہے۔"

کوہلی کی محنت اور احساس ذمہ داری نے اسے کرکٹ کے اعلیٰ حکام کی نظروں میں پسندیدگی کی سند عطا کر دی۔2008ء میں انڈین پریمیئر لیگ کی فرنچائز "رائل چیلنجرز بنگلور" نے اسے 30000 امریکی ڈالرز میں خریدا۔جون 2008ء میں ویراٹ اور اس کے دیرینہ انڈر 19 کھلاڑی ساتھیوں پردیپ سنگوان اور تانمے سری واستو کو حکومت کی جانب سے گو اسکر۔بورڈر وظیفہ دیا گیا جس کی رو سے وہ آسٹریلوی کرکٹ بورڈ کی جانب سے برسبین میں منعقدہ چھ ہفتوں کی تکنیکی تربیت حاصل کرتے رہے۔ستمبر 2008ء میں پاکستان میں منعقد ہونے والی آئی سی سی چیمپینز ٹرافی کے لیے ممکنہ بھارتی کھلاڑیوں میں ویراٹ کا نام بھی شامل تھا۔آسٹریلیا میں چار مختلف ممالک کے ابھرتے ہوئے کھلاڑیوں پر مشتمل ایک ٹورنامنٹ کھیلا گیا جس میں بھارت کی جانب سے ویراٹ کی شرکت بلاشبہ یقینی تھی۔اس نے چھ میچز میں ۲۰۶ رنز بنا کر اپنا انتخاب بے داغ ثابت کیا۔

ان تمام تر کامیابیوں کے باوجود اس کی کچھ آرزوئیں تشنہ کام تھیں۔ وہ قومی ٹیم میں شمولیت سے تا حال محروم تھا۔اگست 2008ء میں سری لنکا میں ہونے والی ایک سیریز میں بھارتی سپر سٹار سچن ٹنڈولکر اور وریندر سہواگ کے زخمی ہونے کے باعث کوہلی کو بحیثیت اوپنر بلوایا گیا۔دو مستند بلے بازوں کے متبادل میں ویراٹ جیسے نوآموز کھلاڑی کا انتخاب اور غیر متوقع بلاوا کرکٹ جغادریوں کے لیے انتہائی حیران کن تھا۔انیس سال کی عمر میں بالآخر اس نے سری لنکا کے خلاف بین الاقوامی کرکٹ کا آغاز کیا لیکن صرف بارہ رنز ہی بنا سکا۔اس سیریز کے چوتھے میچ میں اس نے 54 رنز بنائے جو حسب سابق ٹیم کی جیت میں معاون رہے۔بھارتی ٹیم پانچ میچوں کی اس سیریز میں 2-3 سے فاتح رہی۔سری لنکا کی سرزمین پر ایک روزہ سیریز میں یہ پہلی بھارتی فتح تھی۔

ستمبر میں ہونے والی چیمپینز ٹرافی اگلے سال تک ملتوی کر دی گئی اور کوہلی کو زخمی شیکھر دھون کے متبادل کے طور پر آسٹریلیا "اے" ٹیم کے ساتھ ہونے والے غیر سرکاری ٹیسٹ میچز میں اسے بھارتی "اے" ٹیم میں طلب کیا گیا۔دو میچز پر مشتمل اس سیریز میں صرف ایک بار بیٹنگ کرنے کا موقع ملا اور وہ 49 رنز بنانے میں کامیاب رہا۔اکتوبر 2008ء میں آسٹریلوی ٹیم کے خلاف اسے بھارتی بورڈ نے پریذیڈنٹ الیون کی جانب سے چار روزہ میچ کھیلنے کا موقع دیا۔اس نے مچل جانسن، پیٹر سڈل، بریٹ لی، سٹورٹ کلارک اور جیسن کریجزا جیسے نامی گرامی آسٹریلوی

باؤلرز کے سامنے بھرپور مزاحمت کی اور میچ کی دونوں اننگز میں بالترتیب 105 اور 16 (ناٹ آؤٹ) رنز بنائے۔ نومبر 2008ء میں بھارت میں انگلستان سے ہونے والی ایک سیریز میں کوہلی کا نام اوّلین کھلاڑیوں میں شامل کیا گیا تاہم بعد میں ٹنڈولکر اور سہواگ کی واپسی کے باعث اسے نظرانداز کردیا گیا۔ دسمبر 2008ء میں بھارتی کرکٹ بورڈ نے اسے سینٹرل کانٹریکٹ میں چوتھے درجے کی شمولیت عطا کی۔ جس کی رو سے وہ پندرہ لاکھ روپے کی وصولی کا حقدار ٹھہرا۔ اس کے بعد اسے 2009ء میں سری لنکا کے خلاف ہونے والی پانچ ایک روزہ میچز کی سیریز میں بھارتی دستے میں شمولیت کی منظوری نہ مل سکی۔

جولائی، اگست 2009ء میں آسٹریلیا میں ہونے والے چار ملکی ٹورنامنٹ میں ویراٹ کو ایک بار پھر ابھرتے ہوئے بہترین کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیم میں شامل کیا گیا۔ اس نے بحیثیت اوپنر سات میچز کھیلے اور 66.33 کی ایوریج سے 398 رنز بنائے۔ حسب سابق وہ ٹورنامنٹ کا بہترین بلے باز تھا۔ فائنل جیسے اہم ترین میچ میں اس نے جنوبی افریقا کے نوجوان ابھرتے ہوئے کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیم کے خلاف برسبین میں 102 گیندوں کا سامنا کرتے ہوئے 104 رنز بنائے۔ بھارت یہ میچ سترہ رنز سے جیت کر ٹائٹل اپنے نام کرنے میں کامیاب رہا۔ اس ٹورنامنٹ کے اختتام پہ بھارتی قومی سلیکشن کمیٹی کا چیئرمین کرس سری کانت کوہلی کی صلاحیتوں کا مکمل قائل ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے ایک بیان میں کہا۔ "مجھے اعتراف ہے کہ اوپنر کوہلی نے لاجواب کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے کھیلے گئے کچھ شاٹس اس کی قابلیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔"

ویراٹ بذاتِ خود اس ٹورنامنٹ کو اپنے کیریئر کا اہم ترین سنگ میل قرار دیتا ہے۔ لیکن اس وقت بھارتی ٹیم کئی سپر اسٹارز اور نامی گرامی کھلاڑیوں پر مشتمل تھی کوہلی کو اپنا وجود تسلیم کروانے کے لیے ابھی بھی بہت سے امتحانات کا سامنا تھا۔ فی الوقت اسے متبادل کے طور پر ٹیم میں بلوایا جاتا تھا۔ اس کے خوابوں کی تعبیر ہنوز ادھوری تھی۔ وہ بجا طور پہ اپنی انتظامیہ کے لیے ناگزیر بننے کا خواہاں تھا۔ سری لنکا میں ہونے والے سہ ملکی ٹورنامنٹ میں اسے گوتم گمبھیر کے زخمی ہونے کے باعث طلب کیا گیا۔ 2009ء میں ہونے والی آئی سی سی چیمپئنز ٹرافی میں بھی اسے یوواراج سنگھ کی عدم موجودگی کی بدولت ٹیم میں چوتھے نمبر پر بیٹنگ کرنے کا موقع ملا۔ جزائر غرب الہند کے خلاف ایک میچ میں اس نے ناقابلِ شکست 79 رنز بنا کر ٹیم کو فتح دلوائی اور پہلی بار کسی بین الاقوامی میچ میں مردِ میدان ٹھہرا۔ آسٹریلیا کے خلاف کھیلی جانے والی اگلی سیریز میں بھی اسے یوواراج سنگھ اور گمبھیر کی جگہ صرف دو میچز کے لیے گراؤنڈ میں اترنے کا موقع ملا۔ یوواراج کی انگلی ایک بار پھر زخمی ہوگئی اور لامحالہ ویراٹ کو پھر سے ٹیم میں شامل کرلیا گیا کولکتہ میں کھیلے جانے والے اس میچ نے اس کے لیے "کرو یا مرو" جیسی صورتِ حال اختیار کرلی تھی۔ اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے اس نے بھرپور جان لڑادی۔ گوتم گمبھیر کے ساتھ تیسری وکٹ کے لیے 224 رنز کی شراکت قائم کی اور اپنی پہلی سنچری بھی بنائی۔ اس میچ میں اس نے 111 گیندوں کا سامنا کرتے ہوئے 107 رنز بنائے۔ بھارت یہ میچ ہی نہیں بلکہ سیریز جیتنے میں بھی کامیاب رہا۔ مردِ میدان گوتم گمبھیر نے اپنا اعزاز ویراٹ کوہلی کے نام کردیا۔

جنوری 2010ء میں بنگلہ دیش میں ہونے والی سہ ملکی سیریز میں سچن ٹنڈولکر کو آرام کی غرض سے ٹیم میں شامل نہ کیا گیا اور کوہلی کو تمام میچز میں کھیلنے کا ایک نادر موقع ملا جسے اس نے بالکل رائیگاں نہ ہونے دیا۔ پہلے میچ میں سری لنکا کے خلاف صرف 9 رنز بنانے اور ٹیم کی شکست نے اسے بے کل کر دیا تھا۔ اور یہ بے کلی اس کے لیے بہت مثبت نتائج لائی۔ اگلے میچ میں بنگلہ دیش کی جانب سے جیت کے لیے ملنے والے 297 رنز کے ہدف کے جواب میں اکیاون اسکور پر تمن بھارتی کھلاڑی پویلین لوٹ چکے تھے۔ کوہلی نے اپنی ازلی ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے 91 رنز بنا کر ٹیم کو فتح سے ہمکنار کیا۔ سری لنکا کے خلاف کھیلے جانے والے اگلے میچ میں اس نے اے رنز بنا کر ٹیم کو نہ صرف 33 اوورز میں 214 رنز کے ہدف تک پہنچایا بلکہ قیمتی اضافی پوائنٹ بھی دلوایا۔ اس کے بلے میں رنز بنانے کی اشتہا بڑھتی ہی چلی جارہی تھی بنگلہ دیش کے خلاف اس کا اگلا میچ یادگار ثابت ہوا۔ سنچری کی مدد سے ٹیم کی جیت کے علاوہ اب ایک اور اعزاز بھی اس کا منتظر تھا۔ وہ بائیس سال سے کم عمر میں سچن ٹنڈولکر اور سریش رائنا کے بعد دو سنچریاں بنانے والا تیسرا بھارتی کھلاڑی بن چکا تھا۔ فائنل میچ اس کے لیے ایک برا دن تھا جس میں وہ صرف دو رنز بنا سکا اور بھارتی ٹیم یہ میچ چار وکٹوں سے ہار گئی۔ ویراٹ کی مجموعی کارکردگی اب سرخیوں کا مرکز بن چکی تھی۔ بھارتی قائد مہندر سنگھ دھونی نے بھی اس کی خوب مدح

سرائی کی۔اس ٹورنامنٹ میں بھی سب سے زیادہ رنز (275) کوہلی نے ہی بنائے۔

ان کامیابیوں نے منزل کی جانب اس کی راہیں مزید ہموار کردیں۔ پریم کوہلی کا خواب آنکھوں میں سجائے وہ لگن اور دیانتداری سے اپنی ٹیم کے لیے حتی المقدور بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ جون 2010ء میں زمبابوے میں ہونے والی سہ ملکی سیریز میں بیشتر کھلاڑیوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے سریش رائنا کو قائد اور کوہلی کو نائب کی حیثیت دی گئی۔اس ٹورنامنٹ میں اس نے ایک روزہ کرکٹ میں ایک ہزار رنز کا سنگ میل عبور کیا جو کسی بھی بھارتی کھلاڑی کی جانب سے اس اعزاز تک تیز ترین رسائی تھی۔اسی دورہ میں ہرارے کے مقام پر اس نے اپنے بین الاقوامی ٹی ٹوئنٹی کیرئیر کا آغاز کرتے ہوئے ناقابل شکست 26 رنز بنائے۔

تاریخ گواہ ہے کہ اتنی کامیابیوں کے بعد کوئی نہ کوئی آزمائش ہر کھلاڑی کا مقسوم ٹھہرتی ہے۔ویراٹ کے لیے مشکل دور کا آغاز ہو چلا تھا۔ایشیا کپ 2010ء میں مہندر سنگھ دھونی کی قیادت میں اسے تیسرے نمبر پر بیٹنگ کا موقع دیا گیا لیکن اس کی کارکردگی اپنی چمک کھونے لگی تھی۔قسمت اب اس سے خفا نظر آتی تھی۔اس ٹورنامنٹ میں اس نے 16.75 کی ایوریج سے محض 67 رنز بنائے۔بعدازاں سری لنکا میں ہونے والے ایک سہ ملکی ٹورنامنٹ میں اس کی رنز ایوریج مزید تنزلی کا شکار ہوئی۔یہ حالات اس کے لیے انتہائی پریشان کن تھے۔کیرئیر کے اس موڑ پر وہ ایسی بیٹنگ کا قطعی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس خراب تر کارکردگی کے باوجود ٹیم انتظامیہ نے اس کی قابلیت پہ بھروسا کرتے ہوئے اکتوبر میں آسٹریلیا کے خلاف تین میچوں کی ایک سیریز میں اسے شمولیت کی سند عطا کردی۔اس کے عزم نے بالکل گھٹنے نہ ٹیکے اور اپنی مشکلات ومصائب پر غالب ہو کر اپنے کیرئیر کی تیسری سنچری اسکور کی۔بعدازاں ایک بیان میں اس نے تسلیم کیا کہ پچھلی دو سیریز میں ناکامیوں کے باعث وہ بہت دباؤ میں تھا۔2010ء کے اختتام میں ایک گوتم گھمبیر کی قیادت میں نیوزی لینڈ کے خلاف ایک ناتجربہ کار اور نوجوان کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیم ترتیب دی گئی۔اس سیریز میں بھی ویراٹ کے بلے کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔اور بالآخر ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کے بعد ویراٹ نے اپنے مرحوم والد کا خواب حقیقت میں بدل دیا۔اسے بھارتی ٹیم میں مستقل رکنیت حاصل ہوگئی۔

2010 میں 25 ایک روزہ مقابلوں میں تین سنچریوں کی مدد سے 995 رنز بنانے والا یہ کھلاڑی کسی بھی صورت 2011ء کے عالمی کپ میں شرکت کے لیے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

جنوری 2011ء میں جنوبی افریقا کے خلاف بھی وہ اسی تسلسل سے کھیلتا رہا اور نتیجتاً وہ اس بار بھی تمام تر بلے بازوں سے واضح برتر تھا۔اس سیریز میں اس کی کارکردگی نے اسے ایک روزہ عالمی رینکنگ میں دوسرے نمبر پر پہنچا دیا اور عالمی کپ کے لیے منتخب شدہ پندرہ حتمی کھلاڑیوں میں وہ اولین انتخاب ثابت ہوا۔

عالمی کپ میں سریش رائنا اور کوہلی کی ٹیم کے گیارہ کھلاڑیوں میں شمولیت کے لیے کانٹے کا مقابلہ تھا۔بھارتی قائد دھونی نے بھی اشاروں کنایوں میں کوہلی کو رائنا سے برتر قرار دے دیا تھا۔اس نے انتہائی خود اعتمادی سے اپنے پہلے عالمی کپ میں سفر کا آغاز کیا لیکن پہلے چار میچز میں خاطرخواہ کارکردگی کا مظاہرہ نہ کرسکا۔اس کی جبلی جارح مزاجی نے ان مشکلات پر جلد ہی غلبہ پالیا اور ٹیم کی فتوحات میں نمایاں تر کردار ادا کرنے لگا۔فائنل میچ میں دونوں اوپنر کھلاڑیوں کے ابتدا ہی میں آوٹ ہونے کے بعد اس نے قابلِ رشک ذمہ دارانہ کھیل کا مظاہرہ کیا۔گوتم گھمبیر کے ساتھ 83 رنز کی شراکت نے بھارتی ٹیم کو اٹھائیس سال بعد ایک روزہ کرکٹ کا عالمی حکمران بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ویراٹ کے لیے یہ فتح پریم کوہلی کے خواب کی حسین ترین تعبیر تھی۔

ان گرانقدر کامیابیوں کے باوجود وہ ٹیسٹ میچز میں شرکت سے تا حال محروم تھا۔عالمی کپ کے بعد دورۂ ویسٹ انڈیز کے لیے تجربہ کار کھلاڑیوں کی عدم موجودگی میں جن تین کھلاڑیوں کو ٹیسٹ کرکٹ کھیلنے کا اعزاز ملا ان میں ایک ویراٹ بھی تھا۔ایک روزہ سیریز میں کوئی بھی حلیف یا حریف کھلاڑی اس کی بیٹنگ ایوریج تک نہ پہنچ سکا لیکن ٹیسٹ سیریز اس کے لیے انتہائی کڑا امتحان ثابت ہوئی اور اپنی پانچ اننگز میں وہ صرف 76 رنز بنا پایا لیکن اس کی لغت میں شکست تسلیم کرنے کا وجود ہی نہ تھا۔ ناکامیاں اس کے جذبہ اور قابلیت کو مزید مہمیز کیا کرتی تھیں۔ اگلی دو سیریز میں انگلستان اور جزائر غرب الہند کے خلاف اس نے بہترین کارکردگی دکھائی۔ٹیم کو مشکل ترین اہداف کے حصول میں کامیابی دلوا کر کرکٹ حلقوں میں "ماہر تعاقب وشکاری" کے نام سے مقبول ہوگیا۔

شہرت کا نشہ اس روئے زمین پر مہلک ترین گردانا جاتا ہے۔اس نشے کے عادی افراد کے رویے اور عادات و اطوار میں تبدیلیاں ایک ناگزیر فطری عمل ہوتی ہیں۔ویراٹ کوہلی پر بھی یہ نشہ غالب آنے لگا تھا۔اس کی جبلی جارح مزاجی کسی حد تک تکبر کی سرحدیں چھونے لگیں

دسمبر 2011ء میں آسٹریلیا میں وہ شایانِ شان کارکردگی نہ دکھا سکا۔دوسرے ٹیسٹ میچ کے دوران فیلڈنگ کرتے ہوئے شائقین کو نازیبا اشارے کرنے کی پاداش میں اسے میچ فیس کا پچاس فیصد بطور جرمانہ ادا کرنا پڑا۔اس واقعہ کے بعد مشہور سماجی ویب سائٹ ٹوئٹر پر اس نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔"میں اس حقیقت سے منحرف نہیں کہ شائقین کرکٹ کو ترکی بہ ترکی جوابات دینا پیشہ وارانہ اخلاقیات کے منافی ہے لیکن اگر شائقین ضابطہ اخلاق کی دھجیاں اڑاتے ہوئے کھلاڑی کے ذاتی تشخص کو مجروح کریں اور اہلِ خانہ کی بابت رکیک الفاظ استعمال کریں،تو خاموشی کیوں کر ممکن ہے؟میری سماعت ایسے زہریلے الفاظ سے کبھی آشنا نہیں رہی۔"

اس حادثے نے اس کی کارکردگی پر بہت مثبت اثرات مرتب کیے اگلے دو میچز میں اس نے رنز کے انبار لگا دیے اور اس سیریز میں اپنی ٹیم کی طرف سے پہلی سنچری داغی۔یہ سیریز بھارتی ٹیم کے لیے بہت تلخ اور جاہ کن نتائج کی حامل رہی۔مہمان ٹیم کے لیے مسرت و انبساط کا واحد نکتہ ویراٹ کوہلی کی اعلیٰ ترین کارکردگی تھی۔اس سیریز میں کسی اور بھارتی کھلاڑی کی کارکردگی قابلِ ذکر نہ تھی۔بھارتی قومی سلیکشن کمیٹی کے چیئرمین کرس سری کانت نے اپنی سالانہ تجزیاتی رپورٹ میں بیان دیا۔"ویراٹ کے دلیرانہ کھیل کے ہم تہہ دل سے معترف ہیں۔اور اب اس امر میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ وہ مستقبل میں ٹیم کی۔۔قیادت کے لیے بہترین انتخاب ہے۔"

2012ء میں بنگلہ دیش میں ہونے والے ایشیا کپ میں اسے نائب قیادت سونپی گئی اور حسبِ معمول وہ تمام تر مخالف باؤلرز کے لیے ڈراؤنا خواب ثابت ہوا۔پاکستان کے خلاف میچ میں اس کی 183 رنز کی اننگز اور 330 رنز کے ہدف کا حصول کوئی بھی پاکستانی کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

اس کے بعد ویراٹ نے کبھی مڑ کر نہیں دیکھا وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ مزید گھاگ شکاری بنتا جارہا تھا۔اس کے زور بازو نے بھارتی ٹیم کو ناممکن فتوحات دلوائیں۔ہر سیریز اور ٹورنامنٹ اس کی برتری پر ختم ہوتا تھا جس سے اس کی جارح مزاجی بھی بڑھتی چلی گئی۔شائقین کرکٹ اس کی صلاحیتوں کے اعتراف کے باوجود اس کے رویے کو ہمیشہ تنقید کا نشانہ بناتے تھے لیکن کچھ سابق کھلاڑیوں کے لیے اس کا یہ رویہ بہت پسندیدہ رہا۔ویسٹ انڈیز کے مایہ ناز کھلاڑی ویوین رچرڈز نے اپنے ایک بیان میں کہا۔"مجھے ویراٹ کوہلی کا کھیل دیکھنا بہت پسند ہے کیونکہ وہ مجھے ہمیشہ اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوتا ہے۔اس کے جنون اور جارح مزاجی میں مجھے اپنا عکس نظر آتا ہے۔کرکٹ میں تباہی کا دوسرا نام ویراٹ کوہلی ہے یہ لڑکا مجھے اکثر میری ہی یاد دلا کر گم گشتہ ماضی میرے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔"

نیوزی لینڈ کے سابق کپتان مارٹن کرو نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔"کوہلی اپنی ذات میں ایک مکمل عہد ہے۔راہل ڈریوڈ جیسی قابلیت،سہواگ جیسی جرات اور ٹنڈولکر کے کھیل جیسی وسعت سموئے وہ ایک نایاب اور لازوال کھلاڑی ہے۔"

ویراٹ کا سفر اسی تسلسل سے جاری رہا۔اس نے کامیابیوں کی اتنی داستانیں رقم کیں کہ انفرادی طور پر انھیں احاطۂ تحریر میں لانا دشوار ترین امر ہے۔ہر گذرتے سال نے اسے اوج کمال تک پہنچایا ہے۔اگر ایک روزہ کرکٹ کا طائرانہ جائزہ لیا جائے تو 2012ء میں 17 میچز میں 1026 رنز (5 سنچریاں، تین نصف سنچریاں)،2013ء میں 34 میچز کھیل کر 1268 رنز (چار سنچریاں سات نصف سنچریاں)،2014ء میں 21 میچز کے بعد 1054 رنز (چار سنچریاں،5 نصف سنچریاں)،2015ء میں بیس میچز کے بعد 3 2 6 رنز (دو سنچریاں،ایک نصف سنچری) اور رواں سال میں پانچ میچز کے بعد 381 رنز (2 سنچریاں،دو نصف سنچریاں) بنائی ہیں۔بھارتی ٹیم کے متعلق ایک محاورہ اکثر زبان زد عام رہتا ہے کہ وہ گھر کے شیر ہیں جو باہر ڈھیر ہوجاتے ہیں۔لیکن کوہلی کی کارکردگی دنیا کے ہر خطے میں یکساں رہتی ہے۔دسمبر 2014ء میں اسے دھونی کی عدم دستیابی کے باعث آسٹریلیا کے خلاف ٹیسٹ میچ میں قائد بنا دیا گیا اور پہلے ہی میچ میں سنچری کرنے والا چوتھا بھارتی قائد بن گیا۔کارکردگی میں تنزلی آنے سے وہ عام کھلاڑیوں کی مانند کبھی ہراساں نہیں ہوتا بلکہ مزید جوش و جذبے سے طوفانوں کو چیر کر اپنی قابلیت کا لوہا منواتا ہے۔محدود اوورز کی کرکٹ میں ہدف کے تعاقب میں ویراٹ کا

کوئی ثانی نہیں۔ ایک روزہ کرکٹ کی 15 سنچریاں اس نے ہدف کے حصول میں ہی بنائی ہیں۔ مزید دو سنچریاں اسے ٹنڈولکر کے متوازی لا کھڑا کریں گی۔ اس ریکارڈ کی بابت کوہلی کا کہنا ہے۔ "مجھے طوفانوں کا سامنا کر کے اپنی اہلیت ثابت کرنے کا جنون ہے۔"

اسے کرکٹ حلقوں میں سچن ٹنڈولکر کا "جانشین" قرار دیا جا رہا ہے اور یہی توقع کی جا رہی ہے کہ ٹنڈولکر کے ریکارڈز کا کوہ ہمالیہ وہ سر کر لے گا۔ جنوبی افریقی باؤلنگ کوچ ایلن ڈونلڈ نے اس کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ذمہ داری اور نظم و ضبط کا دوسرا نام ویراٹ کوہلی ہے۔ اسے دیکھ کر ہمیشہ مجھے سچن ٹنڈولکر کی یاد آتی ہے۔ اس کا جذبہ قابلِ تحسین ہے۔"

اس کا آئی پی ایل کیریئر بھی اول و آخر کامیابیوں سے مزین ہے۔ رائل چیلنجرز بنگلور کی جانب سے کھیلے جانے والے ابتدائی میچز میں اس کے غیر ملکی ساتھی کرکٹرز نے اسے 22 سال ہی کی عمر میں مستقبل قریب کے بہترین قائد ثابت ہونے کی پیشگوئی کر دی تھی۔

کھیل کے دوران مخالفین کے لیے اس کا غصہ اور جذباتیت اکثر پیشہ وارانہ اخلاقیات کے منافی ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی کوششوں کے باوجود اپنی اس جذباتی کمزوری پر قابو نہیں پا سکا۔ اس کا کہنا ہے۔ "میچ میں ہر لمحہ بڑھتے ہوئے دباؤ اور صورتِ حال کی سنگینی مجھے بے قابو کر دیتی ہے اور میں اپنے جذبات کے سامنے بے بس ہو جاتا ہوں۔"

سابق بھارتی کوچ گیری کرسٹن نے اپنے ایک بیان میں کہا۔ "کوہلی کے ساتھ بطور کوچ کام کرنا ایک انوکھا تجربہ ثابت ہوا۔ مجھے ٹیم میں اس کی آمد کے روزِ اول سے کامل یقین تھا کہ وہ ایک نایاب کھلاڑی ہے اور عنقریب عظمت کی بلندیاں چھوئے گا۔ اس نے بہت قلیل وقت میں اپنا وجود منوایا اور مجھے بے حد فخر ہے کہ اس کی رہنمائی و مشاورت میں میری ذاتی کاوشیں بھی شامل رہی ہیں۔"

ویراٹ کوہلی ریکارڈز کی دوڑ میں فی الوقت تمام تر سابق بھارتی کھلاڑیوں کو بہت پیچھے چھوڑ چکا ہے۔ وہ "رنز بنانے والی ایک مشین" ہے۔ اس نے مسلسل پانچ سال (2010 تا 2014) کسی بھی بھارتی کھلاڑی سے سب سے زیادہ رنز بنائے۔ 2012 میں وہ بہترین عالمی بیٹسمین قرار پایا۔ بحیثیت ٹیسٹ کپتان اپنی پہلی تین اننگز میں تین سنچریاں بنانے والا وہ واحد کھلاڑی ہے۔ علاوہ ازیں 52 گیندوں

میں تیز رفتار سنچری بنانے والا پہلا بھارتی کھلاڑی ہے۔

2012 میں اسے آئی سی سی کی جانب سے بہترین کھلاڑی کے اعزاز سے نوازا گیا۔ محض پچیس سال کی عمر میں اس نے 114 میچز میں 5000 رنز بنانے والا تیز رفتار عالمی کھلاڑی بن کر ویوین رچرڈز جیسے لیجنڈ کے متوازی آ کھڑا ہوا۔ اس موقع پر ویراٹ نے کہا۔

"سر ویوین رچرڈز کے متوازی قرار پانا ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ کوئی بھی لفظ میری خوشی کا احاطہ نہیں کر سکتا لیکن میرا سفر یہیں ختم نہیں ہوا۔ یہ تو ایک آغاز ہے۔ میں نے زندگی کی محض پچیس بہاریں دیکھی ہیں اور ابھی میں نے مزید بہت آگے جانا ہے یہ ریکارڈ میرے سفر کا ایک چھوٹا سا پڑاؤ ہے۔"

وہ سات مختلف مواقع پر قومی اور بین الاقوامی سطح پر بہترین کرکٹر کے ایوارڈز حاصل کر چکا ہے۔ 27 سالہ یہ نوجوان محض اپنے جنون اور محنت کی بنا پر اوج کمال تک پہنچا ہے۔ ان قابل رشک کامیابیوں نے اس کی ذاتی زندگی پر بھی اثرات مرتب کیے ہیں۔ کرکٹ کی دنیا کا شکاری بالی ووڈ ہیروئن کی زلفوں کا اسیر ہو گیا مشہور ہیروئن انوشکا شرما سے ویراٹ کا تعلق ہمیشہ ہی خبروں کی زینت بنتا رہا۔ اس کے میچز میں انوشکا کی موجودگی لازم و ملزوم ہوتی تھی۔ میڈیا رپورٹ کے مطابق یہ دونوں ستارے شادی کے بندھن میں بندھنے کے منتظر تھے لیکن کچھ ناگزیر معاملات اور باہمی چپقلش کی وجہ سے یہ رشتہ پروان نہ چڑھ سکا اور ایک ادھوری داستان بن گیا۔

عقائد و نظریات کے حوالے سے کوہلی قدرے توہم پرست ہے۔ اپنے کیریئر کی ابتدا میں وہ کلائی پر سیاہ دھاگے باندھ کر میچ کھیلنے کو ترجیح دیتا تھا۔ وہ دستانوں کی جوڑی کے انتخاب میں بھی بہت وہمی ہے اور عموماً وہی دستانے استعمال کرتا ہے جس کے استعمال کے بعد اس نے اچھے رنز بنائے ہوں۔ اپنے مذہبی سیاہ دھاگے کے علاوہ پچھلے چار سال سے دائیں بازو پر ایک کڑا اس کے زیر استعمال ہے۔ کرکٹ کے علاوہ اسے فٹبال بہت پسند ہے۔ 2014ء میں اس نے انڈین فٹبال لیگ میں "ایف سی گوا FC Goa" کے مالکانہ حقوق میں شراکت اختیار کر لی اور ایک بیان میں کہا:

"میں بھارت میں فٹبال کے فروغ کا خواہاں ہوں۔ اور اس ضمن میں یہ شراکت میری جانب سے ایک حقیر کوشش ہے جس سے میں بلندی تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ اسے ایک ضمنی کاروبار سمجھیں یا کچھ اور، میرا یہ قدم بہرحال مستقبل کی حکمت عملی ہے میری کرکٹ کو دوام تو حاصل نہ رہے گا۔ میری زندگی سے کرکٹ کا باب ختم ہونے تک میں اپنے لیے کوئی نہ کوئی رستہ کھلا رکھنا چاہتا ہوں۔"

نومبر 2014ء میں ویراٹ اور انجنا ریڈی نے باہمی شراکت سے نوجوان نسل کے لیے ایک twrogn نامی ایک برانڈ متعارف کروایا جس کے تحت مردانہ ملبوسات تیار کیے جانے لگے۔ ایک سال میں یہ برانڈ سابق نامور برانڈز کے مد مقابل آ گیا۔

2015ء میں اس نے 90 کروڑ کی سرمایہ کاری کے ساتھ ملک بھر میں جمنازیم اور فٹنس سینٹرز کی ایک چین کے قیام کے علاوہ "انٹرنیشنل پریمیر ٹینس لیگ" کی فرنچائز "یو اے ای رائلز" کو شراکتی بنیادوں پر خریدا۔

ابتدائی زندگی میں معاشی تلخیوں سے جدوجہد کے بعد اس کی محنت نے دولت کو اس کی بے دام کنیز بنا دیا ہے۔ قومی اور بین الاقوامی اشتہاری کمپنیاں اس سے توثیقی معاہدوں کے لیے بے تاب رہتی ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق کوہلی کے زیر استعمال ایم آر ایف نامی کمپنی کا بلا بھارتی تاریخ کے مہنگے ترین داموں میں فروخت ہوتا ہے۔ برطانوی جریدے Sports Pro کے مطابق ویراٹ عالمی تاریخ میں لوئیس ہیملٹن کے بعد مہنگا ترین کھلاڑی ہے۔ ناموری اور اشتہاری مہم میں رونالڈو، میسی اور یوسین بولٹ جیسے شہرت یافتہ کھلاڑیوں کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے اور فی الوقت وہ گیارہ مختلف برانڈز کا سفیر ہے۔

کرکٹ کا یہ "بیڈ بوائے" انتہائی دردمند دل کا حامل ہے۔ مارچ 2013ء میں اس نے "ویراٹ کوہلی فاؤنڈیشن" VKF کی بنیاد رکھی جس کے تحت نادار بچوں کی مدد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی غرض سے مختلف تقاریب کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اور منتخب شدہ این جی او کے باہمی تعاون سے حاصل شدہ رقوم مستحق بچوں کی تعلیم و تربیت اور طبی سہولیات میں صرف کی جاتی ہیں۔

ویراٹ کوہلی کی حالیہ کارکردگی اور لگن کا تسلسل یونہی جاری رہا تو وہ وقت دور نہیں جب وہ عالمی بلے بازوں کا بے تاج بادشاہ ہوگا۔ اس کے ہم عصر کھلاڑیوں سے اس کا اب کوئی بھی مقابلہ نہیں رہا اور سابق کھلاڑیوں کے قائم کردہ ریکارڈز کا بھی وہ بلا شرکت غیرے مالک ہوگا۔

شکور پٹھان

کراچی کی زرخیز زمین نے ایسے ایسے نگینے جنم دیئے ہیں جن پر ارضِ وطن کو ناز ہے۔ ایسے ہی چند منتخب افراد کا مختصر مختصر تذکرہ جنھوں نے ملک و ملت کا نام اونچا کیا جس پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔ معلومات کے اضافے کی خاطر ان ناموں کو یاد کرلیں تاکہ آنے والی نسل انہیں بھلا نہ سکے۔

خوش ذوق قارئین کی مدارات

میرا تعلق ایک قدامت پسند اور راسخ العقیدہ گھرانے سے ہے۔ میں بذاتِ خود کمزور ایمان رکھنے والا اور دنیا پرست انسان ہوں۔ کوشش یہ رہتی ہے کہ حتیٰ الوسع دینی فرائض ادا کرسکوں اور جہاں تک ممکن ہوسکے حرام اور حلال کی جو حدود شریعت نے متعین کی ہیں ان کی پابندی کروں۔ لیکن اس کے ساتھ جو بھی ہنسنے بولنے اور خوش رہنے کے مشاغل اور مواقع ملتے ہیں ان سے بھی حظ اٹھاتا ہوں اور رب کا شکر ادا کرتا ہوں۔ مجھے زندگی میں بہت زیادہ پیچیدگیاں اور گمبھیرتا پسند

نہیں۔ میں چاہتا ہوں جیسی آسان اور سادہ زندگی میں اپنے لیے چاہتا ہوں ایسی ہی پُرسکون زندگی میرے آس پاس کے لوگ بھی جیئیں۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ایسی زندگی میں دیکھ چکا ہوں اور ایسا وقت میں گزار چکا ہوں۔

گردشِ روزگار مجھے 1975 کے آخر میں دور دیس لے گئی۔ جو شہر میں اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا بالکل ایسا ہی تھا جیسا میں چاہتا تھا اور اب اس کے خواب دیکھتا ہوں۔

میرے شہر کی صبح ریڈیو پر مولانا احتشام الحق تھانوی کے درس، قرآن حکیم اور ہماری زندگی، سے شروع ہوتی تھی۔ اس کے بعد مہدی حسن، ناصر جہاں اور نسیمہ شاہین وغیرہ کی پُرسوز آوازوں میں حمد و نعت سنائی دیتیں۔ اس درس کو اور ان نعتوں کو شیعہ، سنی، وہابی، اہلِ حدیث سب ہی شوق سے سنتے تھے۔

شب عاشور کو مجلس شام غریباں میں جب علامہ رشید ترابی نواسۂ رسول اور اہلِ بیت کی ابتلا کا حال بیان کرتے تو نم ہونے والی آنکھوں میں سنی اور وہابی آنکھیں بھی شامل ہوتی تھیں۔

ریڈیو پر جمعرات کی رات مولانا سلیم الدین شمسی اپنی باٹ دار اور پُراثر آواز میں مثنوی مولانائے روم کی تشریح کرتے تو کوئی یہ سوال نہیں کرتا کہ وہ کس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔

چاہے عید میلاد نبی ہو یا یوم عاشور، میرا پورا شہر اسے حقیقی عقیدت اور احترام سے مناتا۔ میں نے اپنے بچپن میں دوستوں سے مل کر اور محلے والوں سے چندہ لے کر محرم میں سبیلیں لگائی ہیں۔

دوسری طرف دنیا کے ہر مشغلے کے لیے میرے شہر میں کوئی نہ کوئی ذریعہ موجود تھا۔ سیر و تفریح کے لیے کراچی کے خوبصورت ساحل کلفٹن، منوڑا، ہاکس بے، سینڈس پٹ، پیراڈائز پوائنٹ، نیلم پوائنٹ کے علاوہ گاندھی گارڈن، ہل پارک تو تھے ہی، ذہنی تفریح کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت سنیما ہال تھے۔ زیادہ شوقین حضرات کے لیے GoGo, Lido, Taj, Shabana, Roma Metropol, Palace, Grand Excelsior, اور LuxuryBeach جیسے نائٹ کلبس وغیرہ تھے جہاں لوگ اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے جاتے تھے اور شہر بھی پُرسکون رہتا تھا۔

میرے اپنے ملک کے لوگ اسے پاکستان کی اقتصادی شہ رگ کہتے ہیں۔ اسے اکنامک کیپٹل آف....... پاکستان کہتے ہیں...... یہ اس لیے کہ یہ شہر سب کی ضرورتیں پوری کرتا ہے کہ یہ کماؤ پوت ہے لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ شہر محبتوں کا گہوارہ تھا ہم نے اپنی اپنی ضرورتوں کے لیے اسے خون خون کر دیا۔

کھیل کے میدانوں پر اپنے اپنے پرچم لگا کر کسی نے لکڑی کی ٹال کھڑی کر دی۔ کسی نے اینٹوں کا بھٹا بنا لیا۔ کسی نے بھینس کا باڑہ بنا لیا۔ کسی نے مکان کھڑا کر لیا کسی نے دکان کھول لی۔

سنیما ہال ختم کر کے شاپنگ مال اور پلازے تعمیر کیے۔ پارکوں کو منشیات اور عصمت فروشی کے اڈوں میں بدل دیا۔

نوجوانوں کو جب صحتمند اور بے ضرر تفریحات سے روکا گیا اور ان کی شلواروں کو ٹخنوں سے اونچا کر کے نیک بنا دیا گیا تو انہوں نے بھی کھیل کود اور تفریح جیسے لہو و لعب اور لغویات ترک کر کے معاشرے بلکہ دنیا کی اصلاح کا بیڑہ اٹھا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنگ ہر شخص نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا۔

تو وہ سب ایک دوسرے کی اصلاح میں مصروف ہو گئے۔

قیام پاکستان سے قبل یہاں ہندو مسلم، عیسائی، پارسی یہاں تک کہ یہودی بھی شیر و شکر ہو کر رہتے تھے۔ تقسیم کے بعد جب مسلمان یہاں آئے تو کسی نے ان کی راہ میں روڑے نہیں اٹکائے۔ جس نے جیسی محنت اور کوشش کی اس کو وہ حاصل کرنے دیا۔ یہ ہمارے محسن تھے۔ ہم نے ان کے احسان کا صلہ یہ دیا کہ انہیں پاکستانی کی بجائے ان کے مذہب سے جاننے لگے۔ جس قدر ہو سکا انہیں دیوار سے لگایا۔ کسی کا گلا کاٹا، کسی کو زندہ جلایا۔ کسی کا مکان جلایا اور کسی کی بستی ہی اجاڑ دی۔

خوش قسمتی سے یہ واقعات میرے شہر میں نہیں ہوتے تھے۔ یہاں باہمی رواداری اور بھائی چارے کا ماحول تھا۔

آج میری بات کچھ طویل ہو جائے گی لیکن میں کچھ واقعات آپ کے گوش گزار کرنا چاہوں گا کہ میرے شہر کے باسی کیسے تھے۔

میں نے جب ہوش سنبھالا تو ہم اس وقت کراچی کی قدیم ترین بستی لیاری کے علاقے بہار کالونی میں رہتے تھے۔ یہ ایک عسرت زدہ اور غلیظ سی جگہ تھی لیکن یہاں بہت سے پڑھے لکھے اور خاندانی لوگ رہتے تھے جنہیں ہجرت اور

استبداد زمانہ نے یہاں پہنچا دیا تھا۔ خیر بہار کالونی کا ذکر پھر کبھی۔

ہمارے داہنے ہاتھ کے پڑوسی عیسائی تھے۔ ان کا بیٹا وکٹر میرے چچا کا دوست تھا۔ ہر کرسمس پر ان کے ہاں سے کرسمس کیک بھیجا جاتا جو ہم شکریے کے ساتھ قبول کرتے لیکن وہ پلیٹ یا برتن فوراً واپس نہیں کرتے تھے بلکہ کوئی اچھی سی چیز بنا کر اس پلیٹ میں ان کو بھیجی جاتی۔ ہم وہ کیک نہیں کھاتے تھے۔ میں نے عرض کیا نا کہ ہم قدامت پسند اور راسخ العقیدہ وغیرہ وغیرہ تھے۔ ہمیں شبہ ہوتا تھا کہ اس کیک میں الکوحل وغیرہ ملی ہوتی ہے لیکن وکٹر کے خیال سے ہم یہ ظاہر نہیں کرتے تھے۔ بعد میں یہ کیک خاموشی سے کسی خاکروب یا مہتر کو دے دیتے۔

یہیں ایک اور بھی مسیحی گھرانا تھا۔ ان کے دو لڑکے نام تو جانے کیا تھا، ہم انہیں، بگی اور کوڈی کے نام سے جانتے تھے۔ بڑا دن (کرسمس) آتا تو وہ ہمیں سارا دن ساتھ لیے پھرتے اور چاٹ چھولے، قلفی کھلاتے۔ ایک بار وہ ہمیں اپنے گرجے بھی لے گئے جو ایک چھوٹی سی صاف ستھری عمارت میں تھا۔ مجھے یاد ہے وہاں بہت سارے پھول اور گلدستے تھے جو بہار کالونی کے ماحول میں ایک اجنبی شے تھے۔

ہم بھی عید بقر عید پر بگی اور کوڈی کو اسی طرح کھلاتے پلاتے۔

کچھ عرصہ بعد ہم کورنگی آ گئے۔ یہاں ہمارے دوستوں اور پڑوسیوں میں شیعہ سنی سب شامل تھے۔ میرا ایک شیعہ دوست عسکری جو مجھ سے کچھ بڑا تھا اور بہت اچھی فٹبال کھیلتا تھا۔ ہم دونوں ابن صفی کے دیوانے تھے اور اکثر و بیشتر ان کے ناولوں کی باتیں کرتے۔ عسکری ہی نے مجھے نسیم حجازی اور محمد سعید کے ناولوں سے متعارف کرایا۔ عسکری ڈی جے کالج میں پڑھتا تھا اور اسی نے مجھے مولانا مودودی کا معتقد بنایا۔

اسی کورنگی میں ایک اور شیعہ دوست منظور مہدی تھا (جو آگے چل کر کے ڈی اے میں ٹاؤن پلاننگ میں بڑے عہدے پر فائز ہوا)۔ مہدی ہمارے ساتھ ہاکی کھیلتا تھا۔

ایک بار ہم رمضان میں دوسرے محلے سے میچ کھیل کر (جی ہاں ہم ایسے ہی سخت جان تھے) واپس آ رہے تھے کہ اذان کا وقت ہو گیا۔ ہماری افطار کا واحد ذریعہ گلیوں کے نکڑ پر لگے نلکے تھے۔ لڑکے نل کی طرف بڑھے لیکن مہدی کچھ ہٹ کے کھڑا تھا۔ کسی نے اسے روزہ کھولنے کے لیے کہا تو اس نے بتایا کہ اثنا عشری کے مطابق چند منٹ باقی ہیں۔ ہمارے کپتان نے سب لڑکوں سے کہا کہ رک جاؤ، ہم مہدی کے ساتھ روزہ کھولیں گے۔ مہدی نے منع کیا کہ نہیں تم اپنا روزہ مکروہ نہ کرو۔ تقریباً سب نے پانی پیا سوائے مہدی اور کپتان کے۔

گردش روزگار مجھے بحرین لے آئی۔ یہاں کچھ عرصہ یو بی ایل میں کام کرنے کے بعد بحرین ہلٹن میں اکاؤنٹس میں نوکری کرنے لگا۔ یہاں زیادہ تر انڈین کرسچین اور ہندو کام کرتے تھے۔

ایک دن کینٹن میں کھانا کھاتے ہوئے میرے سامنے ایک لڑکا، برونو، نام کا بیٹھا تھا۔ یہاں وہاں کی باتیں کرتے ہوئے پتا چلا کہ وہ کراچی کا ہے۔ پھر والدین کی بات چلی تو کہنے لگا۔ "ارے تو تم راجا چاچا (میرے والد) کے بیٹے ہو۔" وہ میرے والد کے دفتر کے ساتھی مائیکل کا بیٹا تھا۔ مائیکل انکل سے میں صرف ایک دو بار ہی ملا تھا۔ لیکن میرے ابا کو مائیکل کے گھر والے اچھی طرح جانتے تھے۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اچانک پردیس میں کوئی قریبی رشتہ دار مل گیا۔ اب یہ قصہ ذرا غور سے سنیے۔

بحرین کے بعد میں سعودی عرب آ گیا۔ یہاں ایک دن ہمارے کراچی کے ایک پڑوسی سید ارشاد حسین زیدی جو دور کہیں آرام کو کے کسی کیمپ میں کام کرتے تھے، مجھ سے اور میرے روم میٹ خرم جو کراچی میں بھی ہم محلہ تھے، ملنے آئے۔ میں اس وقت کام پر تھا۔ خرم بھائی کی نائٹ شفٹ تھی اور وہ کمرے میں موجود تھے۔ ارشاد بھائی کمرے میں داخل ہی ہوئے تھے کہ انہیں دل کا دورہ پڑا۔ خرم نے انہیں پانی وغیرہ پلایا اور سینے کی مالش کی لیکن ارشاد بھائی کا بلاوا آ گیا تھا اور انہوں نے میرے بستر پر جان دے دی۔

مجھے خبر ملی اور میں دوڑا ہوا کمرے میں پہنچا۔ میں اور خرم شدید صدمے میں تھے۔ بہرحال پولیس اور ایمبولینس وغیرہ آئی اور ارشاد بھائی کے جسد خاکی کو لے گئے۔

ارشاد بھائی سے ہمارا رابطہ فون پر رہتا تھا اور ہمیں ان کی رہائش اور دوستوں کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ اس دن ہم دونوں سارا دن یہاں وہاں سے پتا کر کے شام کو ان کے کیمپ پہنچے جہاں ان کی بیگم کراچی سے آئی ہوئی تھیں۔

آگے کی کہانی بہت طویل ہے کہ کس طرح ان کی اہلیہ کو اور بعد میں ان کی نعش کو کراچی بھجوایا۔

اس کے تقریباً تیس سال بعد یعنی آج سے دو سال قبل میں کراچی گیا جہاں میری بھانجی کی شادی میں ارشاد بھائی کی

بیگم (جنہیں ہم باجی کہتے تھے) سے ملاقات ہوئی۔ ہڈیوں کا ڈھانچا اور کینسر کی مریضہ باجی کو دیکھ کر جی دھک سے رہ گیا۔ مجھے دیکھ کر باجی کی آنکھوں میں عجیب سی روشنی جگمگانے لگی۔ میرا سر اپنی طرف کھینچا اور میری پیشانی پہ بوسہ دیا۔

میں شادی اور مہمانوں میں مشغول تھا۔ اس وقت کچھ زیادہ اثر نہیں لیا۔ لیکن اب جب بھی یاد آتا ہے تو یقین جانیے حلق میں کچھ پھنستا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ان تمام واقعات میں کیا ربط ہے۔ جی ہاں کوئی ربط نہیں۔

میں صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ ایسے تھے میرے شہر کے لوگ اور ایسا تھا میرا شہر۔

آج میں آپ کو ان دنوں کی یادوں میں شامل کرنا چاہتا ہوں جب ہم ایک دوسرے کو اس کے شناختی کارڈ سے نہیں بلکہ اس کی ذات اور اس کے کمال کی وجہ سے جانتے تھے اور ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے اور محبت کرتے تھے۔

آیئے آج ان سے ملتے ہیں جنہیں ہم نے بھلا دیا تھا۔ ان میں سے کچھ ملک سے باہر چلے گئے اور کچھ نے دنیا ہی چھوڑ دی۔

سنتوش رسل

سنتوش، درپن اور سدھیر جیسے نام ہمارے لیے اجنبی نہیں تھے نہ ہمیں یہ پتا تھا کہ یہ ہندوانہ نام ہیں۔

لیکن پہلے پہل جب سنتوش رسل کا نام سنا تو عجیب سا لگا کہ یہ مردانہ نام عورت کا کیسے ہوگیا۔ پھر رسل سے مزید کنفیوژن ہوا کہ یہ کرسچن نام ہے یا ہندو۔

لیکن اس سے زیادہ چونکا دینے والی چیز ان کی کردار نگاری تھی۔ اس سے پہلے خواتین کیریکٹر ایکٹرز میں سلمیٰ ممتاز اور زینت بیگم کا طوطی بولتا تھا لیکن ان کا انداز فلمی اور تھیٹریکل تھا۔ جبکہ سنتوش رسل کی اداکاری حقیقت سے قریب ہوتی تھی۔ ان کا اردو کا تلفظ بالکل صاف اور اہل زبان کا سا تھا۔

وہ ایک پروقار، سلجھی ہوئی اور شائستہ خاتون تھیں۔

انہوں نے ٹیلی وژن پر بھی کام کیا اور کم لوگ جانتے ہوں گے کہ معین اختر کو انہوں نے ہی ٹی وی پر متعارف کرایا تھا۔

سنتوش یہودی النسل تھیں اور شاید انہوں نے بروقت فیصلہ کیا اور امریکا یا کینیڈا چلی گئیں۔

ایس بی جون

کچھ لوگ تمام عمر تگ و دو میں لگے رہتے ہیں اور کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا اور کچھ لوگ بہت کم کچھ کرتے ہیں لیکن اتنا اچھا کرتے ہیں کہ وہی انہیں لازوال شہرت دے دیتا ہے۔

سنی بینجمن جان جو کراچی کے اصل باشندے ہیں ایک نغمے سے ایسے مشہور ہوئے کہ اچھے اچھوں کو ایسی شہرت نہیں ملی۔ کم از کم مجھے تو "تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔" کے علاوہ ایس بی جون کا کوئی گیت یاد نہیں۔ البتہ Christmas eve پر ٹی وی پر ان کے دعائیہ نغمے سننے کو ملتے تھے۔ چند بار انہیں غزلیں گاتے ہوئے بھی دیکھا۔

پرائڈ آف پرفارمنس یافتہ ایس بی جون کراچی میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔

ایکی مینوالا

پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں فلموں میں رقص کے لیے لازم سمجھی جانے والی خوبصورت پارسی رقاصہ اور اداکارہ اپنے

دور کی مقبول ترین ڈانسر تھیں۔ اس کے علاوہ اکثر ہوٹل میٹروپول میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں۔

مادام آزوری

آزوری کی شہرت تقسیم سے بھی پہلے پھیل چکی تھی۔ جرمن ڈاکٹر اور ہندوستانی ماں کی اس بیٹی کا صحیح مذہب کوئی نہیں جانتا لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ یہودی النسل تھیں۔

آزوری بیلے اور کلاسیکل کی ماہر تھیں اور پاکستان میں کلاسیکی رقص کی اوّلین فنکارہ تھیں۔

تارا، نیلما اور گھنشیام

گھنشیام اور ان کی بیٹیاں تارا اور نیلما ایک زمانے میں کراچی کی ہر بڑی ثقافتی تقریب کے لیے لازم وملزوم تھیں۔

مجھے رقص کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے نہ شوق، لیکن

اکثر آرٹس کونسل وغیرہ کی تقریبات میں ان کا نام سنائی دیتا یا پھر پی ٹی وی پر ناہید صدیقی، پروین قاسم کے ساتھ ساتھ بھی تارا گھنشیام کا بھی رقص دکھایا جاتا۔

ایک تو رقص جیسی معیوب حرکت دوسرے ہندو! نہ یک نہ شد دو شد۔ چنانچہ اسّی کی دہائی میں ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ۔

نتیجتاً کلاسیکی رقص جیسے واہیات پروگراموں کی جگہ کپاس کو سنڈیوں سے بچانے کی تراکیب، گھر بیٹھے ریڈیو بنانا اور صابن سازی سیکھنے جیسے مفید اور کارآمد پروگرام نشر ہونے لگے۔

بیرام ڈی آواری

آواری گروپ آف کمپنیز کے اس پارسی مالک نے پاکستان کے لیے 1987ء کے بنکاک ایشین گیمز میں منیر

صادق کے ساتھ اور دوسری مرتبہ اپنی بیگم گوشی کے ساتھ 1982ء میں دہلی میں sailing میں طلائی تمغہ جیتا۔ اس کے علاوہ کینیڈا میں عالمی چیمپین شپ میں سلور میڈل جیتا۔

بیرام ڈی آواری کراچی پارسی انجمن کے چیرمین بھی ہیں۔

والس میتھائس

پاکستان کے لیے کھیلنے والے پہلے غیر مسلم کرکٹر والس میتھائس نے پاکستان کے لیے 21 ٹیسٹ کھیلے۔

اسٹائلش رائٹ ہینڈ بیٹسمین نے سلپ میں فیلڈنگ کو نئے معنی دیے۔

میں نے انہیں نیشنل بینک کی ٹیم سے کھیلتے ہوئے دیکھا ہے۔ انتہائی شریف النفس اور شستہ انسان تھے۔

انٹاؤ ڈی سوزا

پاکستان کے لیے چھ ٹیسٹ کھیلنے والے اس گوانیز کرسچن کو میں نے 1963 کا من ویلتھ الیون کے خلاف، محمد مناف اور فاروق حمید کے ساتھ بالنگ کراتے دیکھا ہے۔

سترہ ٹیسٹ وکٹ لینے والے انٹاؤ کے کارنامے تو بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن مجھے جس طرح عمر قریشی ان کا نام لیا کرتے تھے، اس وجہ سے ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔

پی آئی اے سے ریٹائرمنٹ کے بعد انٹاؤ 1991ء میں کینیڈا چلے گئے۔

اب نجانے پیار محبت، برداشت اور رواداری کا وہ دور لوٹ کے آئے کہ نہ آئے۔

☆☆☆

"پڑھو! اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی ہے، سکھایا انسان کو جو وہ نہ جانتا تھا۔" "العلق"...... الرحمٰن علم، خداوند متعال کی عظیم ترین صفات میں سے ایک اور کتنے ناموں سے یہ صفت سامنے آتی ہے، علیم، خبیر، بصیر، سمیع اور اس صفت کا ایک معمولی سا حصہ انسان کو عطا کیا تو اسے ملائکہ سے برتر بنادیا۔

اللہ نے اپنے آخری نبی کو پہلا حکم بھی یہی دیا کہ "پڑھو" نبی نے حاصل کرنا سب سے اچھا فعل قرار دیا اور بتایا کہ یہ مومن کی گمشدہ میراث ہے اسے جیسے اور جہاں سے چاہے حاصل کرو۔

یہ علم ہی ہے جس نے اسے اشرف المخلوقات کے درجے تک پہنچایا۔ علم، جو ترقی و کمال کی راہ دکھاتا ہے، جو انسان کو قوی اور توانا بناتا ہے۔ قومیں وہی دنیا پر حکومت کر رہی ہیں جو علم و ہنر میں آگے ہیں۔

میرا مطالعہ بہت محدود ہے اور خاص کر ادیان کے تقابل کا علم تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ مجھے اپنے دین و مذہب کا نہیں پتا دوسرے مذاہب کے بارے میں کیا کہوں۔ لیکن ایک چیز جو دیکھی وہ یہ کہ جس قدر زور علم حاصل کرنے پر اللہ کی آخری کتاب میں ہے اور جس قدر تلقین اللہ کے آخری نبی نے علم حاصل کرنے پر دی، مجھے کسی اور مذہب میں، کم از کم میرے جاننے کی حد تک، اس قدر زور نظر نہیں آیا۔

اور ہم سے بڑھ کر خوش قسمت کون ہوگا کہ ہمیں اس ہادی برحق کی رہنمائی نصیب ہوئی جس نے قدم قدم پر ہمیں علم سکھایا۔ جن سے بڑا معلم کوئی نہ گزرا جن کی تلقین ہمارے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے لیکن ہماری بدنصیبی کا ماجرا جو رویہ علم کے حوالے سے ہے، مجھے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں آج ہم کہاں کھڑے ہیں ہم سب جانتے ہیں۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ، فلک دیکھ فضا دیکھ......

آئینہ ایام ایک کھلی کتاب کی مانند ہمارے سامنے ہے۔ جن قوموں نے علم کی حقیقت کو جانا اور اس کی اہمیت کو پہچانا، آج وہ ترقی و کمال کی نئی داستانیں رقم کر رہے ہیں اور ہم اب تک دنیا کو سائنس پر ہمارے احسانات ہی جتا رہے ہیں۔ انہوں نے نئے چاند ستارے بنالیے اور ہم چاند دیکھنے پر ہی جھگڑ رہے ہیں، وہ نئے ستارے تلاش کر رہے ہیں اور ان تک پہنچنے کی سعی کر رہے ہیں اور ہم ستاروں سے فال نکال رہے ہیں، زائچے بنا رہے ہیں۔ دنیا کائنات کی تخلیق کا راز پا رہی ہے اور ہم غسل کے مسائل، نور و بشر، شیعہ سنی، ہاتھ باندھ کر یا کھول کر نماز پڑھنے پر ایک دوسرے کی گردنیں مار رہے ہیں۔

اعداد و شمار میرے پاس نہیں ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ عالم اسلام کے باون، چون ملکوں میں کل ملا کر اتنی یونیورسٹیاں نہیں ہیں جتنی ایک کافر ملک بھارت میں ہیں۔ ہم اور ہمارے ہم مذہب طرح طرح کے الّلوں تلّلوں پر پانی کی طرح پیسا بہا دیں گے لیکن تعلیم پر خرچ کرتے ہوئے ہماری جان نکلتی ہے۔

میرے شہر اور میرے خطے میں بھی پہلے پہل علم کی فکر ہندوؤں، پارسیوں اور کرسچن مشنریوں کو ہی ہوئی۔ پھر کہیں انیسویں صدی کے نصف بعد اللہ کو ہمارے حال پر رحم آیا اور اس نے ایک بطل جلیل کو ہمارے درمیان بھیجا۔ جس نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کی ضرورت کو محسوس کیا اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی جیسا عظیم الشان کام سرانجام دیا اور ہم نے اس کا صلہ یہ دیا کہ ان کی مسلمانی کو ہی خطرے میں ڈال دیا۔ لیکن چراغ اپنی روشنی ضرور پھیلاتا ہے اور چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ سرسید کی دیکھا دیکھی، شیخ عبداللہ نے عورتوں کی تعلیم کا ڈول ڈالا، ادھر پشاور میں اسلامیہ کالج قائم ہوا، وہاں بمبئی میں انجمن اسلام اسکول کی بنیاد پڑی۔ میرے شہر میں ہندوؤں اور پارسیوں نے سائنس اور انجینیئرنگ کالج بنائے تو وہیں ایک مرد مومن نے سندھ میں مسلمانوں کے لیے پہلے جدید تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی۔

میں کوئی داستان گو یا محقق یا تاریخ داں نہیں ہوں۔ میری یہ گزارشات کوئی علمی اور تحقیقی مقالہ نہیں ہیں۔ بہت سی باتیں اور تاریخیں شاید سہواً درست نہ ہوں۔ یہ میرا اظہار تشکر اور خراج تحسین ہے میرے شہر کے محسنوں کے لیے جن کی بدولت آج میرا شہر، میرے ملک کا سب سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں کا شہر کہلاتا ہے۔

کالجوں کا اتوار بازار

پاکستان چوک، اور برنس روڈ کے علاقے، میرے شہر میں شاید کالجوں کی منڈی ہیں۔ پاکستان چوک جہاں نجانے کتنی سڑکیں ملتی ہیں وہیں ایک جانب ایس ایم لاء کالج ہے (جہاں کسی زمانے میں ذوالفقار علی بھٹو نے بھی پڑھایا ہے) اس سے آگے بڑھیں تو ایس ایم سائنس اور آرٹس کالج ہے دوسری سڑک کے کنارے این ای ڈی انجینیئرنگ کالج ہوا کرتا تھا جس کے عقب میں ان تمام کالجوں کا سرخنہ، ڈی جے کالج اپنی شاندار اور خوبصورت عمارت کے ساتھ کھڑا ہے۔

یہ ڈی جے کالج پہلے پہل ٹھٹھائی کمپاؤنڈ کے ایک بنگلے میں قائم کیا گیا۔ 19 نومبر 1878 کو اس کا سنگ بنیاد

وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن نے رکھا۔ تعمیر مکمل ہونے کے بعد 1829 کو گورنر آف بمبئی لارڈ ریے، نے اس کا افتتاح کیا۔
میرے شہر کے ایک متمول اور مخیر تاجر اور سماجی شخصیت دیوان دیارام جیٹھامل (ڈی جے) نے اس کے لیے سب سے بڑا عطیہ دیا اور یہ کالج جو پہلے سندھ آرٹس کالج کے نام سے قائم ہوا تھا، اسے اسی سال دیوان دیارام جیٹھامل جن کا انہی دنوں انتقال ہوا تھا، کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔

ان دنوں سندھ میں کوئی جدید تعلیمی ادارہ نہیں تھا، نزدیک ترین شہر بمبئی تھا جہاں یونیورسٹی اور میڈیکل کالج موجود تھے لیکن سندھ سے بمبئی کا فاصلہ بھی کم اور آسان نہ تھا۔
ڈی جے کالج کی عمارت کا ڈیزائن مشہور ماہر تعمیر جیمز اسٹریچن کے فن کا شاہکار ہے جنہوں نے کراچی کی کئی اور خوبصورت عمارتوں کی ڈیزائننگ کی۔

ڈی جے کالج جہاں خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے وہیں تعلیمی حوالے سے ہمیشہ ایک معتبر نام رہا ہے اور غیر نصابی سرگرمیوں خاص کر طلبہ سیاست میں بھی میرے شہر کے نمایاں ترین کالجز میں سے ایک ہے۔ کچھ عرصہ پہلے امر جلیل کی ایک دستاویزی ویڈیو میں ڈی جے کالج کا حال دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ لیکن سنا ہے کہ اس کے بعد محسن پاکستان، ڈاکٹر قدیر خان جو اسی کالج سے پڑھے ہوئے ہیں، نے کالج کا دورہ کیا اور اس کی مرمت اور تزئین کے لیے اپنا اثر رسوخ استعمال کیا اور سنتے ہیں کہ اچھا کام ہوا ہے۔

ڈاکٹر قدیر خان کے علاوہ، میرے شہر اور ملک کے ایک اور محسن، سرجن ادیب رضوی بھی اسی کالج کے طالبعلم تھے، ان کے علاوہ بنگلہ دیش کے سابق صدر، ضیاالرحمان، جامعہ کراچی کے سابق وائس چانسلر اور منفرد شاعر پیرزادہ قاسم، موسیقار سہیل رعنا عقیل عباس جعفری اور نجانے کتنے ناموروں نے یہاں سے تعلیم پائی۔

☆☆☆

آپ میں سے بہت سوں نے صدر کے بیچوں بیچ ایک پرانی عمارت، جس کی خوبصورتی ہمارے بے حسی کا شکار ہو گئی ہے۔ میں واقع، ایڈولجی ڈنشا ڈسپنسری، ضرور دیکھی ہوگی۔ یہاں تاج کمپنی کی دکان ہوا کرتی تھی۔
جیسے مجھے آپ کو ایڈولجی ڈنشا کے بارے میں کچھ نہیں پتا، ایسے ہی ان کے صاحبزادے، نادر شا ایڈولجی ڈنشا کے بارے میں بھی شاید ہی کوئی جانتا ہو۔
یہ نادر شا ایڈولجی ڈنشا (این ای ڈی) وہ ہیں جن کے مجسمے ایک زمانے میں، میرے شہر کی مرکزی شاہراہوں پر نصب تھے۔ آج بھی ان کا مجسمہ کراچی پارسی انسٹیٹیوٹ میں نصب ہے۔ نادر شا کے بھائی فرموز غیر منقسم ہندوستان کی مشہور کاروباری شخصیت اور قانون داں تھے اور ان کے صاحبزادے، ہوشنگ، نے پاکستان کی معاشی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور نیشنل بینک آف پاکستان کے صدر رہے۔
ڈنشا خاندان کی بے بہا سماجی خدمات ہیں لیکن سب سے بڑا احسان میرے شہر اور میرے ملک پر، این ای ڈی انجینئرنگ کالج کا تحفہ ہے۔
یہ 1922 کی بات ہے۔ سکھر بیراج کی تعمیر زور و شور۔

سے جاری تھی۔ یہاں انجینئروں اور ہنرمندوں کی ضرورت رہتی تھی۔ حکومت نے اس مقصد کے لیے کراچی میں پرنس آف ویلز انجینئرنگ کالج قائم کیا جس میں نصف سے زیادہ عطیہ سیٹھ نادر شا ایڈولجی ڈنشا کا تھا۔ دو سال بعد اس کالج کو میرے شہر کے اس محسن نادر شا ایڈولجی ڈنشا کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ 1977 میں یہ این ای ڈی یونیورسٹی بن گیا۔

ذرا تصور کیجیے کہ آج سے تقریباً ایک صدی قبل اس کالج میں انجینئرنگ سے متعلق ہر ضروری چیز مہیا کی گئی جس میں پاور ہاؤس، بوائلر روم، ہائیڈرالک لیبارٹری، انجن روم اور مشین شاپس وغیرہ شامل تھیں۔ یہاں انجینئرنگ سے متعلق تمام قابلِ ذکر شعبوں یعنی، سول، مکینیکل، الیکٹریکل، الیکٹرونکس، کمپیوٹر، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور ٹیکسٹائل انجینئرنگ کی تعلیم کے علاوہ، تحقیقی کام بھی ہوتے ہیں۔

میرے شہر اور ملک کے کئی انجینئر اور مشہور شخصیات نے یہاں سے کسبِ علم کیا ہے۔ قومی اسمبلی کے سابق اسپیکر، الٰہی بخش سومرو، اردو انگریزی کی 50 سے زیادہ کتابوں کے مصنف، خرم جاہ مراد، ہمدرد یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر نسیم اختر خان، مشہور کھلاڑی سعید انور، گلوکار محمد علی شہکی علی حیدر اور دوسرے کئی مشاہیر اس عظیم شان ادارے سے فارغ التحصیل ہیں جن کے بانیوں کے بارے میں شاید ان مشاہیر کو بھی علم نہ ہو۔

انٹرٹو......

میرے بہت سے دوست حبیب بینک پلازہ کے عقب میں، شاہراہ لیاقت پر دکانوں اور گوداموں کے ساتھ چلتے ہوئے پتھر کی بنی ایک... طویل دیوار کے درمیان واقع ایک بڑے سے پھاٹک کے سامنے سے گزرے ہوں گے جس کی محراب پر لکھا ہوا ہے۔ انٹرٹو......

اکثر لوگ اسے بھی کوئی بڑا سا گودام ہی سمجھتے ہیں۔ یہ عمارت جو سندھ میں مسلمانوں کی جدید تعلیم کا پہلا مرکز ہے، شاہراہ لیاقت کے اس علاقے پر قائم ہے جو کسی زمانے میں قافلہ سرائے کہلاتی تھی جس کے میدان میں وسطی ایشیا سے آنے والے قافلے 1870 تک ٹھہرتے رہے۔

سرسید کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے، سندھ کی اس متمول ترکی النسل فرزند خان بہادر حسن علی آفندی بے مجیدی، صدر سندھ محمڈن ایسوسی ایشن، نے جب علیگڑھ مسلم کالج کی طرز پر اس کی داغ بیل ڈالی تو یہ ان کے لیے اتنا آسان راستہ نہ تھا۔ ہم عصر ہندو اور پارسی حضرات سے تو فلاحی کاموں میں مسابقت کا معاملہ تھا لیکن ان کے سب سے بڑے مخالف وہ تھے جن کے لیے یہ مدرسہ قائم کیا جا رہا تھا یعنی ان کے اپنے مسلمان بھائی بند، جنہوں نے اسے، شیطان کا مدرسہ قرار دیا۔ سندھ مدرسہ کے بانی، خان بہادر حسن علی آفندی جو ایک نامور وکیل بھی تھے، ان کی مخالفت اور توہین کے لیے اے حسن علی وکیل...... تجھے خدا کرے ذلیل، جیسے جملے کسے گئے۔

خان بہادر لیکن اپنے مشن پر ڈٹے رہے۔ ڈی جے کالج کی طرح سندھ مدرسۃ الاسلام کا ڈیزائن بھی جیمز اسٹریچن نے بنایا 14 نومبر 1887 کو لارڈ ڈفرن، وائسرائے ہند نے جب اس مدرسہ کی بنیاد رکھی تو میرے شہر نے ایسا منظر پہلے کبھی نہ دیکھا کہ پورا شہر اس تقریب میں موجود تھا۔ 1889 میں یہ خوبصورت عمارت مکمل ہوئی۔ خان بہادر حسن علی آفندی کے علاوہ، نواب آف جوناگڑھ اور نظام حیدر آباد نے بھی خطیر رقم عطیہ کیں۔ 2012 میں اسے یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا۔

سندھ مدرسے کو جو نہیں جانتا وہ پاکستان اور بانیان پاکستان کو نہیں جانتا۔ بابائے قوم نے اپنی ابتدائی تعلیم یہاں سے حاصل کی۔ قائد نے اپنی وفات کے بعد اپنی جائیداد سے جن تعلیمی اداروں کے لیے وصیت کی تھی اس میں ان کی اولین مادرِ علم سندھ مدرسہ بھی شامل تھا۔

سندھ کے وزیراعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ، بھٹو کے والد، سر شاہنواز بھٹو تو چند ایک نام ہیں لیکن سندھ مدرسہ سے میری دلچسپی کی دو اور وجہیں ہیں۔ پہلی تو یہ کہ میرے بہت پیارے بڑے چچا یہاں پڑھتے تھے دوسری یہ کہ میرے ملک کے کرکٹ کے اولین ہیروز میں سے ایک، لٹل ماسٹر حنیف محمد بھی یہیں پڑھتے تھے۔ سندھ مدرسے کے کرکٹ کوچ ماسٹر عزیز نے حنیف محمد کے علاوہ، محمد مناف، اکرام الٰہی اور مشتاق محمد جیسے کرکٹر میرے ملک کو دیے۔

مجھے یہ اسکول نہ جانے کیوں اپنا اپنا سا لگتا ہے، حالانکہ صرف ایک بار کے علاوہ، جب میرا انٹرمیڈیٹ کے امتحان کا سینٹر یہاں پڑا تھا میں نے اسے اندر سے نہیں دیکھا۔

اب ان سے کیا شکایت جو اسے بھی ایک گودام ہی سمجھتے ہیں۔ دیوان جیٹھا رام دیا مل، سیٹھ نادر شا ایڈولجی ڈنشا اور خان بہادر حسن علی آفندی میں، میرے شہر کے لوگ اور میرا شہر، آپ کے ہمیشہ شکر گزار رہیں گے۔

تاریخِ عالم

منظر امام

یہ عالم رنگ و بُو لفظِ کُن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بِگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرۂ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرۂ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک دلچسپ تحریر کا گیارہواں حصہ

تاریخ کا سفر اپنے اختتامی مرحلوں میں ہے۔ آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ سفر جیسے جیسے آگے بڑھ رہا ہے ویسے ویسے زندگی کے ہر میدان کے بڑے لوگ سامنے آرہے ہیں۔ واقعات تیز رفتار ہوتے جارہے ہیں۔

پچھلی قسط میں ہم نے 1600ء سے لے کر 1699ء تک کے واقعات کو سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود ان ہی سو برسوں میں کچھ اور واقعات و کردار بھی سامنے آئے جیسے ہاروے نے گردشِ خون کا اصل دریافت کیا۔ تیس برسوں تک

طویل جنگ سے جرمنی کی کمر ٹوٹ گئی۔ جاپان کا ''سنتو'' مغرب کی طرف روانہ ہوا۔ تاج محل کی تعمیر ہوئی۔ لیوون ہاک نے بیکٹیریا دریافت کیا۔ آئزک نیوٹن نے Principia تحریر کی۔ انگلستان میں انقلاب برپا ہوا۔

اب خاص خاص واقعات کی تفصیل۔ سب سے پہلے ہاروے کو لیتے ہیں جس نے گردشِ خون کا اصول دریافت کیا۔

ولیم ہاروے

عظیم انگریز طبیعات دان ولیم ہاروے جس نے خون کی گردش اور دل کا فعل بیان کیا۔ انگلستان کے ایک قصبے فوک اسٹون میں 1578ء میں پیدا ہوا۔ (وفات 1667ء میں ہوئی تھی)۔

ہاروے نے ایک طویل، دلچسپ اور کامیاب زندگی گزاری۔ نوجوانی میں اس نے کیمبرج یونیورسٹی کے کائس کالج میں داخلہ لیا۔

1600ء میں وہ طب کی تعلیم کے حصول کے لیے اٹلی میں پیڈرا یونیورسٹی میں داخل ہوا جو اس دور کا بہترین ادارہ مانا جاتا تھا۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ اس دور میں گلیلیو اس یونیورسٹی میں استاد تھا۔ تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ ان دونوں میں ملاقات ہوئی تھی یا نہیں۔

1602ء میں ہاروے نے پیڈرا یونیورسٹی سے طب کی آگاہی حاصل کی۔ پھر وہ انگلستان واپس آگیا۔ جہاں ماہر طبیعات کے طور پر ایک کامیاب اور طویل زندگی گزاری۔

ہاروے نے لندن میں کالج آف فزیشنز میں علم تشریح الابدان پر لیکچر دیے کر مزید برآں وہ ایک بڑے اسپتال میں چیف فزیشن کے طور پر کام کرتا رہا۔

ہاروے کی عظیم کتاب ''حیوانوں میں دل اور خون کی حرکت'' علم عضویات کی تاریخ میں سب سے اہم کتاب مانی جاتی ہے۔

اپنی کتاب میں ہاروے نے واضح طور پر بیان کیا کہ شریانیں خون کو دل سے پرے لے جاتی ہیں جب کہ رگیں اسے واپس دل میں لاتی ہیں۔

اس سے پہلے خون کی گردش کے حوالے سے کئی نظریات اور مفروضے تھے۔

رینے دیکارت

معروف فرانسیسی فلسفی، سائنس داں اور ریاضی داں رینے دیکارت فرانس کے ایک دیہات میں 1596ء میں پیدا ہوا۔ جوانی میں اس نے لافلیچ سے تحصیل علم کیا۔ بیس برس کی عمر میں اس نے قانون کی ڈگری لی۔

اس کا خیال تھا کہ کسی بھی شعبے میں قابلِ اعتبار کی مقدار نہایت قلیل ہے سوائے ریاضیات کے۔

1616ء سے 1628ء تک اس نے طویل سفر کیے۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔ اس لیے آزادی سے طویل سفر کر سکتا تھا۔ یہ سفر اس نے مشاہدات اور تجربات کے لیے کیے تھے۔

1629ء میں اس نے اپنی کتاب ''زمین کے پہاڑ کے قوانین'' لکھی۔ ریکارت نے روشنی کے انعکاس کا قانون پیش کیا۔ 1637ء میں اس کی معروف کتاب ''عقل کی مناسب رہنمائی اور علم کی سچائی'' شائع کروائی۔ اس کا مشہور ترین نظریہ ''میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں'' برسوں تک علمی گفتگو اور مباحث کا موضوع بنا رہا ہے۔ ریکارت کا طبیعی کائنات کا تصور بھی نہایت اثر انگیز تھا۔ اس کا اعتقاد تھا کہ تمام دنیا ماسوائے خدا اور انسانی روح کے میکانکی اصولوں پر رواں ہے۔ ریکارت تاریخ انسان کا اہم ترین فلسفی ہے۔

ان ہی برسوں میں ہندوستان میں شاہ جہاں نے تاج محل تعمیر کروایا تھا۔

آئزک نیوٹن

اس کی پیدائش 1642ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں کچھ جاننے سے پہلے مشہور شاعر الیگزینڈر پوپ کی ایک مختصر نظم سن لیں۔

''فطرت اور فطرت کے قوانین رات کی تاریکی میں پنہاں ہیں۔''

خدا نے کہا۔ ''جب نیوٹن آئے گا تو ہر شے منور ہو جائے گی۔''

عظیم ترین سائنس دانوں میں سب سے متاثر کن شخص آئزک نیوٹن 1642ء میں کرسمس کے روز انگلستان میں ''وولز تھورپ'' کے مقام پر پیدا ہوا۔

بچپن میں باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ وہاں اس نے سائنس اور ریاضیات کے لیے خود کو وقف کر دیا۔

چھبیس سے ستائیس برس کی عمر میں اس نے ان سائنسی نظریات کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں جن نظریات کو دنیا میں انقلاب برپا کرنا کہتے تھے۔

ہر چند کہ کوپرنیکس اور گلیلو نے قدیم علوم کی کئی ایک غلط

فہیاں دور کر دی تھیں اور کائنات کے فہم میں گراں قدر اضافے کیے تھے لیکن تاحال قوانین کا کوئی مجموعہ وضع نہیں کیا جا سکا تھا۔

سائنسی پیش گوئیوں کے لیے کوئی مربوط طریقہ کار نہیں تھا لیکن نیوٹن نے یہ کام کر دکھایا اور جدید سائنس کو اس رخ پر موڑ دیا جہاں یہ آج ہے۔

جان لاک

ان سو برسوں کا ایک اور اہم ترین نام جان لاک ہے۔

معروف انگریز فلسفی جان لاک پہلا مصنف تھا جس نے آئینی جمہوریت کے بنیادی تصورات کو ایک مربوط صورت میں یکجا کیا۔

لاک انگلستان کے شہر رنگٹن میں 1632ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس نے آکسفورڈ سے تعلیم حاصل کی۔ 1658ء میں ایم اے کیا۔

چھتیس برس کی عمر میں وہ رائل سوسائٹی کا رکن منتخب ہو گیا تھا۔ اس کی شہرت انسانی فہم سے متعلق ایک مضمون سے ہوئی جو 1790ء میں شائع ہوا جس میں اس نے انسانی علم کے جواز، ہستیت اور حدود پر تفصیلی بحث کی۔

اس کی یہ کتاب لاک کی بہترین تصانیف اور فلسفہ کے کلاسیکی ادب میں شمار ہوتی ہے۔ لاک کی ایک نہایت اہم تحریر حکومت پر دو مقالے 1689ء میں شائع ہوئی تھی۔

1600ء سے 1699ء تک کے یہ چند اہم واقعات اور کردار تھے جو پچھلی قسط میں نہیں آسکے تھے۔ اب ہم اس سلسلے کو 1700ء سے 1799ء تک لے جاتے ہیں۔

1700ء۔ اس میں ایک بڑا نام سامنے آتا ہے اور وہ ہے پیٹر اعظم کا۔ ایجادات کے حوالے سے فضائی انجن کی ایجاد نے زندگی کی رفتار بہت تیز کر دی تھی۔

پیٹر اعظم

اس کی پیدائش 1672ء میں ہوئی اور انتقال 1725ء میں ہوا تھا۔

پیٹر اعظم کو عمومی طور پر روس کے تمام زاروں میں سے غیر معمولی شخصیت مانا جاتا ہے۔ اس کی ملک کو مغربی دھارے میں شامل کرنے کی پالیسی نے روس کو ایک بڑی طاقت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ پیٹر 1672ء میں ماسکو میں پیدا ہوا تھا۔

اس زمانے میں روس ایک پس ماندہ علاقہ تھا۔ اس لیے روس کو مغربی ممالک کے برابر لانے کے لیے اس نے ایک جعلی نام سے مغربی ممالک کا دورہ کیا اگر وہ بادشاہ کے طور پر جاتا تو کبھی مغربی معاشرت کا اتنے قریب سے مشاہدہ نہیں کر سکتا تھا۔ پیٹر نے ہالینڈ میں "ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی" کے ساتھ بحری جہاز میں بڑھئی کا کام کیا۔

اس نے انگلستان میں رائل نیوی کی گودی میں بھی کچھ عرصہ گزارا۔ پروشیا میں اسلحہ سازی کا مطالعہ کیا۔ اس نے کارخانوں، اسکولوں، عجائب گھروں اور اسلحہ خانوں کا دورہ کیا۔ انگلستان کی مجلس قانون ساز کے ایک اجلاس میں شرکت کی۔ غرض یہ کہ اس نے مغربی ممالک کے مشاہدے سے بہت کچھ سیکھا اور روس واپس آ کر اپنے ملک کو ان ہی خطوط پر چلایا۔

اس نے جولین کیلنڈر کو متعارف کروایا۔ روسی حروف تہجی کو بہتر بنوایا۔ اس کے دور اقتدار میں روس کا پہلا اخبار جاری ہوا۔

وہ واقعی پیٹر اعظم تھا۔ ورنہ کون بادشاہ اپنے ملک اور عوام کے لیے اتنی دردسری مول لیتا ہے۔

اب دیکھیں کہ اسلامی دنیا میں کیا کیا ہوتا رہا۔ عرصہ وہی ہے 1700ء سے 1799ء تک۔

1700 عیسوی۔ ایران کے اہم شیعہ عالم محمد باقر مجلسی کی وفات۔

شیعیت کے ایران کا حکومتی مذہب بن جانے کے بعد محمد باقر مجلسی نے بے شمار کتابوں کی تصنیف و تالیف کی۔ رہنما اصول مرتب کیے۔

1707-12 عیسوی۔ مغل سلطنت اپنے جنوبی اور مشرقی صوبے کھو بیٹھی۔

1718-30 عیسوی۔ سلطان احمد سوم عثمانی سلطنت کو مغربیت سے ہم آہنگ کرنے کے لیے پہنچا۔ اصلاح کرنے کی کوشش کی لیکن بغاوت کی وجہ سے یہ اصلاحات ختم ہو گئیں۔

1722 عیسوی۔ افغان باغی اصفہان پر حملہ کرتے ہیں اور اشرافیہ کا قتل عام کرتے ہیں۔ ان کا نشانہ ایک خاص تمیتی فکر تھا۔

1726 عیسوی۔ نادر شاہ عارضی طور پر ایرانی شیعہ قوت کو بحال کرتا ہے۔

1739 عیسوی۔ نادر شاہ دہلی کو فتح کر لیتا ہے اور ہندوستان میں موجود حکمرانی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ ہندو، سکھ اور افغان (مسلمان) اقتدار کے لیے ایک دوسرے سے جنگ کرتے ہیں۔

نادر شاہ کا ایران میں علماء سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اہم ایرانی مجتہدین ایران کو چھوڑ دیتے ہیں اور عثمانی عراق میں پناہ حاصل کر لیتے ہیں جہاں وہ شاہوں سے آزاد قوت واقتدار کا مرکز قائم کر لیتے ہیں۔

1748 عیسوی۔ نادر شاہ کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ انتشار کا ایک دور شروع ہو جاتا ہے جس کے دوران ایرانی چونکہ اصولی مئوقف پر قائم تھے غلبہ حاصل کر لیتے ہیں اور لوگوں کو قانون اور ڈسپلن کے دھارے میں لے آتے ہیں۔

1762 عیسوی۔ ہندوستان میں صوفی ریفارمر شاہ ولی اللہ وفات پا جاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ وہ صاحب بصیرت صوفی تھے جنہوں نے سب سے پہلے مغربی جدیدیت سے اسلام کو لاحق ہونے والے خطرات کو بھانپ لیا تھا۔

1763 عیسوی۔ برطانوی تاجر ہندوستان میں اپنے غلبے کو وسعت دیتے ہیں۔

1774 عیسوی۔ روسی شہنشاہ عثمانیوں کو مکمل طور پر شکست سے دوچار کر دیتے ہیں۔ عثمانی کریمیا نامی پورا ملک گنوا بیٹھتے ہیں اور زار عثمانی سرزمین پر آرتھوڈوکس عیسائیوں کا محافظ بن جاتا ہے۔

1779 عیسوی۔ آقا محمد خان ایران میں قاچار عہد حکومت کی بنیاد رکھنا شروع کرتا ہے اور صدی کے اختتام تک مضبوط حکومت کو بحال کرنے کا اہل ہو جاتا ہے۔

1789 عیسوی۔ فرانسیسی انقلاب برپا ہوتا ہے۔

1789 (1807) عیسوی۔ سلیم ثالث عثمانی سلطنت میں مغربیت لانے والی فنی اصلاحات کے لیے عملی اقدامات کرتا ہے اور یورپی دارالحکومتوں میں پہلے عثمانی سفارت خانے قائم کرتا ہے۔

1792 عیسوی۔ عسکریت پسند عرب مصلح محمد ابن عبدالوہاب کی وفات۔

انہوں نے مسلمانوں کو نئے مغربی تصورات کے سمجھنے کا اہل بنانے کے لیے اسلامی اداروں کو جدید بنانے کی کوشش کی۔ وہ جدہ میں پیدا ہوئے۔ پہلے اپنے باپ سے شریعت کی تعلیم لی پھر مکہ اور بصرہ میں علم دین حاصل کیا اور صحاح ستہ کا عالم بنے۔ پھر حج کیا اور مدینہ طیبہ میں زیارت کر کے شیخ عبداللہ بن ابراہیم کے مرید ہوئے۔ جو مزارات کی تعظیم کرتے یا مزارات کو آراستہ کرتے، یہ ان کو برا بھلا کہتے۔ اس کے نام کی مناسبت سے فرقہ وہابیہ وجود میں آیا۔ سعودی عرب انہی کا مقلد ہے۔

1793 عیسوی۔ ہندوستان میں پہلی مشنریز کی آمد ہوئی۔

1797 عیسوی۔ ایران پر فتح علی شاہ کی حکومت آتی ہے اور برطانوی و روسی اثر و رسوخ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

1798 سے 1801 عیسوی۔ نپولین مصر پر قبضہ کر لیتا ہے۔

اب برصغیر کی صورت حال دیکھتے ہیں۔ عرصہ وہی ہے 1700 عیسوی سے 1799 عیسوی تک۔

اورنگ زیب کی وفات 1707 کے بعد جلد ہی ہندوستان میں بدامنی اور سلطنت میں انتشار کی علامات ظاہر کرنے لگی تھیں۔ مغل دربار میں راگ و رنگ کی محفلیں، امراء کی عیاشیاں وغیرہ بڑھ گئی تھیں۔ اپنے انجام سے بے خبر لوگ تیزی سے تباہی کی طرف جا رہے تھے۔

نادر شاہ نے محمد شاہ رنگیلے کو ایک خط لکھا جس کو رنگیلے نے پھاڑ کر پھینک دیا۔ نادر شاہ نے دہلی پر چڑھائی کر دی۔ بادشاہ نے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ نادر شاہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ معمولی سا نذرانہ لے کر واپس چلا جائے گا لیکن کسی نے گپ اڑا دی کہ بادشاہ نے اپنے ہاتھوں سے نادر شاہ کو قتل کر دیا ہے۔ دہلی والوں نے نادر شاہ کے فوجیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ نادر شاہ خود اس جھوٹی خبر کی تردید کرنے ہاتھی پر سوار ہو کر بازار میں آ گیا تو لوگوں نے اس پر پتھر پھینکے۔ نادر شاہ نے غصے میں قتل عام کا حکم دے دیا۔ ظہر تک لوگ قتل ہوتے رہے۔ یہ واقعہ 1739ء کا ہے۔

نادر شاہ دہلی سے شاہ جہاں کا بنایا ہوا طلائی تخت طاؤس جو قیمتی پتھروں سے مرصع تھا اور جس کے بنانے پر دو کروڑ صرف ہوئے تھے کوہ نور ہیرا اور کروڑوں کا دوسرا سامان لوٹ کر لے گیا۔

اب ذرا میں ایک مختلف انداز سے برصغیر کو دیکھنے اور جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس سے آپ کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ ہماری تباہی کے اسباب کیا ہیں۔

میں اس زمانے کو سامنے رکھوں گا۔ یعنی 1700 عیسوی سے 1799 عیسوی۔

یہاں کے مشاغل کیا تھے۔ طوائفوں کے مجرے، کبوتر بازی، شراب نوشی، مقبروں اور عظیم الشان محلات کی تعمیر، چمن کی سیر، شطرنج کی محفلیں وغیرہ مگر دوسری طرف کیا ہو رہا تھا۔ ذرا یہ بھی دیکھ لیں۔

1700 عیسوی۔ برلن اکیڈمی قائم ہوئی جو مختلف

موضوعات پر ریسرچ کراتی تھی۔ سینٹ پیٹرس برگ اکیڈمی 1724 عیسوی میں قائم ہوئی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا۔ مغرب میں مفکر، دانش ور اور سائنس داں پیدا ہو رہے تھے۔ ہمارے یہاں پتنگ بازی کے استاد، بٹیروں کو لڑانے کے استاد اور طبلے پر سنگت کے استاد جنم لے رہے تھے۔ ظاہر ہے پھر ایسی سوسائٹی کو تو تباہ ہونا ہی تھا۔

مرہٹوں نے مسلمانوں پر فتح پا کر لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ایسے میں روہیل کھنڈ کے روہیلے پٹھانوں نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ وہ آ کر مسلمانوں کو بچائے۔

1759 عیسوی میں احمد شاہ ابدالی اپنی فوج لے کر دہلی کی طرف بڑھا۔ اس کے مقابلے پر مرہٹوں کی فوج بہت زیادہ تھی۔ 7 جنوری 1760 عیسوی میں یہ معرکہ ہوا۔ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو بہت بری طرح شکست دی۔ اس سے کہا گیا کہ وہ ہندوستان کی حکومت سنبھال لے لیکن اس نے انکار کر دیا۔

اس کا جواب تھا۔ ”مدد کو آنا اور بات ہے اور تخت پر قبضہ جمانا شرافت سے بعید ہے۔“

1773 عیسوی میں احمد شاہ ابدالی کا انتقال ہوا۔

1757 عیسوی میں ایک بڑا واقعہ ہوا۔

پلاسی کے میدان میں نواب سراج الدولہ کی ہندوستانی فوج اور لارڈ کلائیو کی فوج کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔

بنگال کے ایک نواب میر جعفر نے... نواب سراج الدولہ سے غداری کی اور انگریزوں سے جا کر مل گیا۔ نواب سراج الدولہ کو شکست ہوئی اور انگریزوں کے قدم پہلی دفعہ ہندوستان کی سرزمین پر جم گئے۔

اس جنگ کے بعد انگریزوں نے دوسرے صوبوں کا رخ کیا اور فتح حاصل کرتے چلے گئے۔ پھر حیدر علی اور ان کے بیٹے ٹیپو سلطان سے جنگ ہوئی۔ جس میں ٹیپو کے ایک وزیر میر صادق نے غداری کی اور ٹیپو سلطان شہید ہو گئے۔

بنگال پر قبضے اور دکن میں فتوحات کے بعد انگریزوں نے دوسری ریاستوں کی طرف ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ پورا ہندوستان (پاکستان) ان کے تسلط میں آ گیا۔

اب ذرا ایک نظر دوسرے ممالک کے حکمرانوں پر ڈال لیں۔

1715 عیسوی میں فرانس میں لوئس حکمران بنا۔

1774 عیسوی تک دوسرا لوئس فرانس میں حکمران رہا۔

آپ بھی پوچھیے

☆ایک مرد "بے چارہ" کب لگتا ہے؟

O جب وہ گھر میں بیوی سے اور باہر اپنی محبوبہ سے جھوٹ بولے۔

☆کوئی شخص کسی لڑکی کو چھیڑے تو دس آدمی اس کی پٹائی کر دیتے ہیں اگر وہ اسے بہن کہہ دے تو؟

O وہ لڑکی خود اس کی پٹائی کر دیتی ہے۔

☆کیا عورت ہیرا ہے؟

O جی ہاں! بیش قیمت ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی مہلک بھی!

☆ایک اچھی طالبہ میں کیا خصوصیات ہونی چاہئیں؟

O آج کل کے تمام فیشن سے آگاہ ہو۔

☆سگریٹ اور عورت میں کیا فرق ہے؟

O پہلی کلیجا جلاتی ہے اور دوسری دل!

☆عورت کے لیے سب سے اذیت ناک بات کیا ہوتی ہے؟

O کسی دوسری عورت کی تعریف سننا۔

☆زندگی میں محبت کتنی بار کرنی چاہیے؟

O ایک بار فیل ہونے پر تین موقعے تو یونیورسٹی بھی دیتی ہے۔

قیمتی انگلی

ایک عورت ٹرین میں سفر کر رہی تھی۔ کھڑکی بند کرتے ہوئے اس کی انگلی کھڑکی میں آ گئی اور کٹ گئی تو عورت نے ریلوے پر پچاس لاکھ ہرجانے کا دعویٰ کر . . ۔ جج نے عورت سے پوچھا کہ پچاس لاکھ ایک انگلی کے؟ تو عورت نے جواب دیا۔

”میری انگلی اس سے بھی زیادہ قیمتی تھی۔“

جج نے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

عورت نے جواب دیا ”اسی سے تو میں اپنے شوہر کو نچاتی تھی۔“

مرسلہ: غفار احمد، جہلم

1792 عیسوی تک ایک اور لوئس کی حکمرانی ہوگی۔
اسی سال انقلاب فرانس برپا ہوا۔

اسپین میں چارلس دوم 1700 عیسوی تک۔ فلپ پنجم 1700 عیسوی سے 1746 عیسوی تک۔ فرڈیناق 1746 سے 1759 عیسوی تک۔ چارلس سوم 1759 سے 1788 عیسوی تک۔ چارلس چہارم 1788 عیسوی سے آگے تک بادشاہ رہا۔

اب ذرا جرمنی کو دیکھ لیں۔

جوزف اوّل 1705 سے 1711 عیسوی تک۔ چارلس ششم 1711 سے 1740 عیسوی تک۔ ماریا تھریسا 1740 سے 1742 عیسوی تک۔ چارلس ہفتم 1742 سے 1745 عیسوی تک۔ فرانسیس اوّل 1745 سے 1765 عیسوی تک۔ جوزف دوم 1765 سے 1790 عیسوی تک۔ لیوپولڈ دوم 1790 سے 1792 عیسوی تک۔

برطانیہ پر ایک نظر ڈال لیں۔ اس جدول سے آپ کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ جس زمانے میں ہمارے یہاں مغلوں وغیرہ کی حکومت تھی اس زمانے میں دنیا کے دوسرے ملکوں میں کون کون سے حکمران تھے۔

برطانیہ کے حکمران۔

ولیم سوم 1702 عیسوی تک۔ ملکہ این 1702 سے 1714 عیسوی تک۔ جارج اوّل 1714 سے 1727 عیسوی تک۔ جارج دوم 1727 سے 1760 عیسوی تک۔

جارج سوم 1760 سے 1788 عیسوی تک۔ (یہ پاگل ہو گیا تھا۔ چنانچہ پرنس آف ویلز کو ایجنٹ مقرر کیا گیا)۔

پرنس آف ویلز (1788 سے 1820 عیسوی تک)۔

یہ سو سال ختم ہوئے۔ یعنی 1700 سے لے کر 1799 عیسوی تک۔ اس کے بعد کی تاریخ 1800 عیسوی سے شروع ہو کر 1899 عیسوی تک ہوگی۔ یہ دور بھی ہنگامہ خیز رہا لیکن اس سے پہلے 1700 عیسوی میں اور کردار سامنے آئے اور واقعات ہوئے۔ ان کا بھی جائزہ لیں۔

1700 عیسوی میں دخان انجن ایجاد ہوا۔ 1725 عیسوی میں والٹیئر نے انگریزی زبان پر چند مکاتب تحریر کیں۔ فرانس میں تحریکیں برپا ہوئیں۔

انگلستان میں صنعتی انقلاب کا آغاز ہوا۔ اسی دوران جیمز واٹ نے زیادہ بہتر دخانی انجن ایجاد کیا۔ آدم اسمتھ نے "دولت اقوام عالم" تحریر کی۔ امریکی آئین لکھا گیا۔ برقیاتی قوانین وضع کیے۔ انقلاب فرانس کا آغاز ہوا۔

واقعات اور کرداروں کی اس طویل فہرست میں ہم نے چند خاص کرداروں کا انتخاب کیا ہے۔ ان کے ذکر کے بعد سن 1800 عیسوی میں داخل ہوں گے۔

جیسے والٹیئر۔ اس کی پیدائش تو 1694 کی ہے لیکن اس کی وفات 1778 عیسوی میں ہوئی تھی۔ اس کا نام فرانکوئیس میری اوروبیٹ تھا لیکن وہ والٹیئر کے نام سے زیادہ مشہور رہا۔ فرانسیسی مصوری دور کی وہ ایک ممتاز شخصیت ہے۔ ایک شاعر، ڈراما نگار، مضمون نگار، افسانہ نگار، مؤرخ اور فلسفی کی حیثیت سے زیادہ مشہور تھے والٹیئر آزاد فکر کا ایک بڑا مصلح تھا۔ سیاسی شاعری کی پاداش میں والٹیئر کو گرفتار کر کے بیسٹائل جیل میں قید کر دیا گیا۔ جہاں وہ تقریباً سال بھر رہا۔

وہاں اسے اتنی فرصت ضرور ملی کہ وہ اپنی مشہور رزمیہ نظم Henriade لکھ سکے۔

1718 عیسوی میں قید سے رہا ہونے کے بعد اس نے ایک ناٹک Oedipe لکھا۔ جو پیرس میں کھیلا گیا اور اسے شہرت ملتی ہی چلی گئی۔ چوبیس برس تک وہ پورے ملک کی ایک ممتاز ادبی شخصیت تھا۔ انگلستان جا کر اس نے انگریزی بولنی اور پڑھنی سیکھی۔ معروف انگریزوں کی تحریروں کو بہ غور پڑھا۔ ان میں جان لاک، فرانسس بیکن، آئزک نیوٹن اور شیکسپیئر وغیرہ شامل تھے۔

فرانس واپس آ کر اس نے ایک اہم کتاب لکھی۔ جسے عام طور پر انگریزی زبان کے متعلق خطوط کے نام سے جانا جاتا ہے۔

وہ آزادی اظہار کا سب سے بڑا حامی تھا۔ اس حوالے سے اس کا ایک جملہ بہت مشہور ہے۔ وہ جملہ یہ ہے۔ "میں تمہاری رائے سے متفق نہیں ہوں لیکن میں تمہاری آزادی رائے کے حق میں آخری سانس تک جنگ کروں گا۔"

1700 عیسوی کی ایک اور مشہور شخصیت روسو ہے۔

اس کا پورا نام ژاں ژیکوئس روسو تھا۔ پیدائش 1712 کی ہے جب کہ وفات 1778 عیسوی میں ہوئی تھی۔ یہ شخص سوئٹزر لینڈ کے شہر جنیوا میں پیدا ہوا۔ 1750 عیسوی میں اڑتیس برس کی عمر میں روسو کو اچانک شہرت حاصل ہوئی۔ جب ڈلیون کی اکیڈمی نے اس موضوع پر کہ "انسانی معاشرے اور اخلاقیات کے لیے فنونِ لطیفہ اور سائنس سود مند ہے یا نہیں۔" بہترین مضمون کو انعام دینے کا اعلان کیا۔ روسو کے مضمون نے انعام جیتا۔ اس نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ مختلف فنون اور علوم کی پیش رفت انسان کے

لیے مفید نہیں ہے۔ اس مضمون نے اسے مشہور کر دیا۔

اس کے بعد اس کے متعدد مضامین منظر عام پر آئے جیسے عدم مساوات کے آغاز پر تفکر (1755) ایمل (1762) عمرانی معاہدہ (1762) اعترافات (1770) روسو کو موسیقی سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ اس نے دو اوپیرا بھی لکھے تھے۔

روسو اولین جدید مصنفین میں سے ایک تھا جنہوں نے سنجیدگی کے ساتھ نجی ملکیت کے تصور پر تنقید کی۔ لہٰذا اسے جدید اشتراکیت کے بانیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

اس نے ایک الجھی ہوئی زندگی گزاری۔ اس کا انتقال 1778ء میں ارمینو ویلا کے مقام پر ہوا۔ اب اس صدی کی ایک اور اہم شخصیت کو دیکھیں۔ وہ ہے بنجمن فرینکلن۔

فرینکلن کی پیدائش 1706 عیسوی کی ہے جب کہ اس کا انتقال 1790 عیسوی میں ہوا۔

یہ بات حیران کن ہے کہ فرینکلن چار میدانوں میں انتہائی کامیاب رہا۔ ان میں کاروبار، سائنس، ادب اور سیاست ہے۔

اس کی کاروباری زندگی راکھ سے لاکھ تک پہنچنے کی داستانوں جیسی ہے۔ بوسٹن میں اس کا خاندان کسمپرسی کی زندگی گزارتا تھا۔ نوجوانی میں فلاڈلفیا میں مکمل قلاش تھا عمر کی چوتھی دہائی میں فرینکلن اپنے اشاعت گھر، اپنے اخبار اور دیگر کاروباری مشاغل کے بل پر ایک رئیس آدمی بن گیا۔ اس دوران فارغ وقت میں وہ سائنس کا مطالعہ کرتا۔ اس نے چار غیر ملکی زبانیں بھی سیکھ لیں۔

بطور سائنس دان فرینکلن کی وجہ شہرت برقیات اور روشنی کے حوالے سے اس کی تحقیقات ہیں اس نے کئی ایک انتہائی کارآمد ایجادات بھی کیں۔ جن میں فرینکلن کا چولہا، عدسے اور جلتی ہوئی سلاخ۔ جو آج بھی بہت زیادہ استعمال ہوتی ہے۔

اولین ادبی کاوشیں اس نے بطور صحافی کیں۔ اس نے کتاب شائع کی جس میں اس نے ایک تیز طرار فقرہ لکھنے کے غیر معمولی جوہر کا اظہار کیا۔ چند ہی مصنفین ایسے ہوں گے جنہوں نے اس قدر یاد رہ جانے والے معقولات اپنے پیچھے چھوڑے ہوں گے۔

بعد کے سالوں میں اس نے ایک خود نوشت سوانح عمری بھی لکھی۔ یہ دنیا کی معروف کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

سیاست میں فرینکلن ایک منتظم کے طور پر بھی کامیاب رہا۔ وہ کالونیوں کا پوسٹ ماسٹر جنرل تھا۔ اس کے تحت ڈاک کا ادارہ منفعت بخش ہو گیا۔ قانون سازی کی حیثیت سے بھی اس نے کامیابی حاصل کی۔ وہ پنسلوینیا کی مجلس قانون ساز کا ایک سے زائد مرتبہ رکن بنا۔ اس کا ایک پہلو سفارت کار کا بھی تھا۔ وہ امریکی تاریخ کے سنگین دور میں فرانس میں امریکی سفیر کی حیثیت سے بہت مصروف اور کامیاب رہا۔ مزید برآں وہ امریکی اعلان نامہ آزادی کے دستخط کنندوں میں شامل تھا۔

ان تمام شعبوں کے علاوہ فرینکلن کی زندگی کا ایک اور پہلو عوامی، ہمدرد اور منتظم کا بھی ہے۔ مثال کے طور پر وہ فلاڈلفیا کے اولین اسپتال کے بانیوں میں شامل تھا۔ اس نے کالونیوں میں اولین آگ بجھانے والے ادارے کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔

اس نے بلدیاتی پولیس کے محکمے کے قیام کے لیے بھی کامیاب کاوش کی۔ اس نے ایک سرکلر کتب خانہ بھی تشکیل دیا اور اولین سائنسی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ مختصر یہ کہ وہ ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوا۔

اب ایک اور شخصیت جس کا تعلق سائنس یا ادب سے نہیں بلکہ موسیقی سے تھا۔ وہ تھا جوہن سباشین باخ۔ پیدائش 1685 عیسوی میں ہوئی جب کہ اس کا انتقال 1750 عیسوی میں ہوا تھا۔

عظیم موسیقار جوہن سباشین باخ ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے مغربی یورپ میں موجودہ موسیقی کے بھی علاقائی رنگ کامیابی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ شامل کر دیے۔

اس نے اطالوی، فرانسیسی اور جرمن موسیقی کی روایات میں سے بہترین کو باہم یکجا کر کے ایک دوسرے سے باندھ دیا۔ شروع میں تو نظر انداز کیا جاتا رہا لیکن آج اسے تاریخ کے دو یا تین عظیم موسیقاروں میں سے ایک مانا جاتا ہے۔

1685 عیسوی کو باخ جرمنی کے قصبے ایسناچ میں پیدا ہوا۔ وہ اس ماحول میں پیدا ہوا جہاں موسیقی کے چرچے تھے۔ باخ خاندان اس شعبے میں پہلے سے موجود تھا۔

اپنی زندگی میں باخ کی وجہ شہرت آرگن بجانے میں اس کی مہارت تھی۔ وہ ایک زرخیز ذہن کا مالک تھا اس نے تین سو راگ، بے شمار مذہبی گیت اور افتتاحی نغمے ترتیب دیے۔

اس صدی کی ایک اور قد آور شخصیت لیون ہارڈ ایولر ہے۔ اس کا زمانہ 1707 سے 1783 عیسوی کا ہے۔ سوئٹزر لینڈ کا ریاضی داں اور ماہر طبیعات لیون ہارڈ ایولر تاریخ کے انتہائی

ذہین اور زرخیز ذہن لوگوں میں سے ایک ہے۔

ایولر کا ریاضیاتی اور سائنس موضوعات پر کام غیر معمولی ہے۔ اس نے 32 ضخیم کتابیں لکھیں جن میں سے بہت سی ایک سے زائد جلدوں پر مشتمل ہیں جب کہ ریاضیات یا سائنس پر مضامین کی تعداد دیکھوں سے تجاوز کر جاتی ہے۔

جب میں اس قسم کے کسی کام کرنے والے شخص کے بارے میں سنتا یا پڑھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیسے لوگ تھے۔ جو انتھک کام کرتے رہتے۔ شاید انہیں کام کا جنون تھا اور اس لیے ان کا نام تاریخ کے صفحات کی زینت بن چکا ہے۔

جیمز واٹ۔ پیدائش 1736 عیسوی کی ہے۔

اسکاٹ لینڈ کے موجد جیمز واٹ کو عموماً دخانی انجن کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔ وہ صنعتی انقلاب کی ایک اہم شخصیت تھا۔

دراصل جیمز واٹ دخانی انجن بنانے والا پہلا آدمی نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی کچھ لوگ اس قسم کے تجربے کر چکے تھے لیکن واٹ نے نیوکومین کے انجن میں جو اضافے کیے وہ اس درجے اہم تھے کہ واٹ کو بلاشبہ اولین عملی دخانی انجن کا موجد قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس صدی کی ایک اور اہم شخصیت آدم اسمتھ بھی ہے۔ معاشی نظریے میں اہم ترین شخصیت آدم اسمتھ اسکاٹ لینڈ کے قصبے کرکالڈی میں 1723ء میں پیدا ہوا۔ نوجوانی میں وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ 1751 سے 1764 عیسوی تک وہ گلاسکو یونیورسٹی میں فلسفے کا استاد رہا۔ اس دوران میں اس کی پہلی کتاب ”اخلاقی جذبات کا نظریہ“ شائع ہوئی جس نے اسے علما کی صف میں ایک ممتاز مقام دلا دیا۔ تاہم اس کی لازوال شہرت کا انحصار اس کی عظیم تصنیف اقوام عالم کی دولت کی نوعیت اور وجوہات کی تحقیق پر ہے جو 1776 عیسوی میں منظر عام پر آئی۔ فوراً ہی اس نے ماہرین کی توجہ حاصل کرلی۔ باقی تمام عمر اس نے اس سے شہرت اور عزت پائی۔ 1790ء میں کرکالڈی میں انتقال ہوا۔

اب امریکا کے ایک ایسے شخص کا تعارف جس کا تعلق بھی اسی صدی سے ہے۔ وہ ہے جارج واشنگٹن۔ جارج واشنگٹن 1732ء میں ورجینیا میں ”ویکفیلڈ“ میں پیدا ہوا۔ وہ ایک امیر کاشت کار کا بیٹا تھا۔ 1752 سے 1758 عیسوی تک وہ فوج میں رہا اور فرانسیسی اور ریڈ انڈین جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ فوجی تربیت اور اعزاز حاصل کیا امریکا کا صدر بنا۔

اس نے اعلیٰ کارنامے جون 1775 عیسوی سے مارچ 1797 عیسوی کے درمیانی عرصے میں سرانجام دیے۔ پہلے وہ تمام عظمی فوجوں کا سپہ سالار بنا۔ 1793ء کو اس کا دور صدارت دوسری مرتبہ مکمل ہوا۔ دسمبر 1799 عیسوی میں وہ ورجینیا میں ماؤنٹ ورنن میں انتقال کر گیا۔

اس صدی میں اور بھی کئی بڑے کردار سامنے آئے جیسے موزارٹ، جینز، مالتھس وغیرہ۔

لیجیے 1799 عیسوی تک کا سفر ختم ہوا۔ اب تاریخ آگے بڑھتی ہے۔ یعنی 1800 سے لے کر 1899 عیسوی تک۔

صحیح معنوں میں پوری دنیا میں صنعتی ترقی کی رفتار ان ہی سو برسوں میں تیز سے تیز تر ہوئی ہے۔ دنیا پر اپنا تسلط جمانے والے باکمال کردار سامنے آئے۔ اس لیے اب ایک نظر 1800 عیسوی پر ڈال لیں۔

1800 عیسوی۔ رولٹا نے اولین برقیاتی بیٹری ایجاد کی۔

☆ نپولین بونا پارٹ سامنے آیا۔ ☆ انگلستان میں غلاموں کی تجارت پر پابندی لگی۔ ☆ 1810 عیسوی۔ واٹرلو کی جنگ ہوئی۔ ☆ 1820 عیسوی۔ ہندوستان میں برطانوی غلبہ بڑھا۔ ☆ جولیور نے بویاکا کی جنگ جیتی۔ ☆ 1830 عیسوی۔ ریل کی پٹریاں اہمیت اختیار کر گئیں۔ ☆ فراڈے نے برقیاتی مقناطیسی احاطہ دریافت کیا۔ ☆ ٹیلی گراف کی ایجاد ہوئی۔ ☆ 1840 عیسوی۔ ڈاگورن نے فوٹوگرافی ایجاد کی۔ ☆ مورٹن نے بی پی کنٹرول کر دینے والی دوا ایجاد کی۔ ☆ 1850 عیسوی۔ لینوئیر نے دو اسٹروک والا داخلی افروختگی کا انجن بنایا۔ ☆ ڈارون نے انواع کی ابتدا لکھی۔ ☆ 1860 عیسوی۔ گاٹلنگ نے مشین گن ایجاد کی۔ ☆ جیمز کلارک میکس ویل۔ ☆ امریکی خانہ جنگی میں لنکن کی شمولیت۔ ☆ جاپان میں میجی کا احیا ہوا۔ ☆ اوٹو نے چار اسٹروک کا داخلی افروختگی کا انجن بنایا۔ ☆ بیل نے ٹیلی فون ایجاد کیا۔ ☆ 1880 عیسوی میں ایڈیسن نے بلب ایجاد کیا۔ ☆ 1890 عیسوی میں برطانوی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ☆ موٹر کاریں پہلی مرتبہ تجارتی بنیادوں پر فروخت کی گئیں۔ ☆ متحرک فلم کی ایجاد ہوئی۔ ☆ رونٹگن نے ”ایکس رے“ ایجاد کیا۔ ☆ مارکونی نے ریڈیو بنایا۔ ☆ بیکیوریل نے تابکاری کے عمل کی دریافت کی۔

اب آپ اندازہ لگالیں کہ سن 1800 سے 1899 عیسوی تک دنیا نے کیسی کیسی ترقی کی۔ کیسے کیسے لوگ سامنے آتے رہے۔ صنعتی اور میکانکی رفتار کتنی تیز ہوگئی۔

(بقیہ آئندہ ماہ)

انسانی بلی

شیراز حسن

قتل کر کے دیوی دیوتا کی بھینٹ چڑھا دینے کی قبیح رسم صدیوں سے رائج ہے۔ جتنے بھی باطل مذاہب ہیں، سب میں بلی چڑھانے کی یہ رسم جاری و ساری ہے مگر اسلام نے اسے موجب گناہ قرار دیا۔ مہذب معاشرے نے بھی اسے ناپسند کیا مگر......!

انسانی بہیمیت کی لفظی تصویر کشی

انسان بھی کیسی مخلوق ہے۔

ایک دوسرے کا دوست، ایک دوسرے کا دشمن۔ بے انتہا سنگ دل، بلا کا رحم دل، دوسروں کے دکھ میں آنسو بہانے والا اور دوسروں کو دکھ میں مبتلا کرنے والا۔

کسی کا زخم دیکھ کر تڑپ جانے والا اور کسی کو دکھ دے دے کر زخمی کرنے والا۔ کسی کو خون دے کر اس کی جان بچانے والا اور کسی کا خون بہا کر قہقہے لگانے والا۔

کیسی متضاد صورت حال ہے۔ کیسا ہے یہ انسان۔

میرا خیال ہے کہ صرف انسان ہی اپنی خوش حالی، دولت کے حصول، اولاد اور کسی کام میں کامیابی کے لیے کسی دوسرے انسان کی قربانی دیا کرتا ہے۔

آج بھی ایسی کہانیاں سننے میں آتی ہیں کہ فلاں بابا نے

کہا تھا کہ کسی بچے کو قربان کردو تو گھر میں دولت آجائے گی۔
میرا خیال ہے کہ جب سے انسان کے ذہن میں دیوی دیوتاؤں کا تصور پیدا ہوا ہے اس نے انسان کو ان کے حضور بھینٹ چڑھانا شروع کردیا ہے۔
اور بھینٹ چڑھنے والے ہمیشہ مظلوم یا کمزور ہی ہوتے ہیں یا تو غلاموں کو بھینٹ چڑھایا جاتا تھا یا قیدیوں کو۔
اور یہ خون مذہب کے نام پر بہایا جاتا ہے۔ وہ مذاہب جو روایات اور کہانیوں کے ہوا کرتے۔ جن میں ہزار طرح کے دیوی دیوتا اور راکشس ہوا کرتے، جو انسان سے خون مانگتے اور انسان ان کی خوشنودی کے لیے اپنے بچے کی، دوسرے انسان کو بھینٹ چڑھادیتا ہے۔
کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔
والٹر برکاتھ نے تو اپنی کتاب میں یہ انکشاف کیا ہے کہ تقریباً پچاس ہزار برس سے انسانوں کی قربانیاں ہوتی چلی آئی ہیں۔ اور مواقع کچھ بھی ہو سکتے تھے۔ جیسے کسی بادشاہ کی تخت نشینی کے وقت اچھی فصلوں کے لیے۔ جنگوں میں کامیابی کے لیے، کسی نئی عمارت کی تعمیر کے لیے (یہ تو آج بھی ہوتا ہے کہ نئی عمارت تعمیر ہورہی ہو تو بنیاد رکھنے سے پہلے کسی بکرے کو ذبح کرتے ہیں)۔
پہلے انسانوں کو ذبح کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ مشہور دیوار چین کی تعمیر سے پہلے سینکڑوں انسانوں کی قربانیاں دی گئی تھیں۔
زیادہ تر قربانیاں دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ہوا کرتیں (شاید انسان کی فطرت میں خون بہانا شامل تھا۔ اس لیے خدا نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے ذریعے جانوروں کی قربانی سے اس بودی رسم کے دھارے موڑ دیے۔ ورنہ شاید اب تک انسان ہی قربان ہوتے رہتے)۔
غیر متمدن اقوام کا یہ خیال تھا کہ دنیا اور اس میں رہنے والوں کے محافظ دیوتا ہیں۔ لہٰذا وہ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے انسانوں کو مار دیتے۔
کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بادشاہوں کو بھی قربان کردیا جاتا۔
اس قسم کی قربانی کے سلسلے میں ان کا فلسفہ یہ تھا کہ بادشاہ بھی دیوتا کی طرح ہوتے ہیں اور بادشاہوں کو قوی اور تندرست رہنا چاہیے۔
اور اگر بادشاہ جسمانی طور پر کمزور یا بیمار رہنے لگے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے اندر موجود دیوتا کی روح بیمار ہو

گئی ہے۔ اسے تازہ انسانی خون کی ضرورت ہے۔
چونکہ وہ روح خود بادشاہ کے اندر ہوتی تھی۔ اس لیے اس بادشاہ ہی کو قربان کردیا جاتا۔
کمبوڈیا میں آگ اور پانی کے پُراسرار بادشاہ کو قدرتی موت مرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کی شدید بیماری کو دیکھتے ہوئے قبیلے کے بڑے یہ فیصلہ کرتے کہ اب بادشاہ کا صحت یاب ہونا ممکن نہیں ہے اور اس کے اندر موجود دیوتا کی روح کو انسانی قربانی کی ضرورت ہے تاکہ وہ طاقت ور ہو کر کسی دوسرے طاقت ور جسم میں حلول کرجائے اور اسے بادشاہ بنالیا جائے۔
لہٰذا یہ فیصلہ ہوتے ہی بادشاہ کے جسم میں خنجر اتار کر اسے تمام ذمے داریوں سے آزاد کردیا جاتا۔
کانگو کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ مذہبی دنیا کی قدرتی موت سے دنیا تباہ ہو جائے گی۔ لہٰذا اس کی شدید علالت میں اس کا متوقع جانشین مذہبی رہنما کے گھر میں داخل ہو کر اسے رسی کے پھندے سے ہلاک کردیتا اور اس طرح دیوتا کو تقویت مل جاتی۔
حبشہ کے بادشاہ کی پوجا کی جاتی تھی لیکن جب کاہن مناسب سمجھتے بادشاہ کے پاس ایک شخص کو یہ پیغام دے کر بھیجتے کہ دیوتاؤں نے اس کی قربانی کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب اسے مر جانا ہے۔
دیوتاؤں کا پیغام سنانے کے بعد بادشاہ کو قتل کردیا جاتا۔
افریقا کے جنگلی قبائل میں یہ رسم آج بھی رائج ہے کہ بادشاہ ہر روز ایک درخت کے نیچے اپنا دربار لگا کر مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے۔
اگر بیماری یا کسی اور وجہ سے بادشاہ متواتر تین دنوں تک اپنا دربار نہ لگا سکے تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بادشاہ کے اندر موجود دیوتا اس بادشاہ سے اکتا چکے ہیں اور وہ اس کی قربانی چاہتے ہیں۔ لہٰذا کسی درخت کے ساتھ پھندا لگا کر بادشاہ کو لٹکا دیتے ہیں اور جیسے ہی بادشاہ کے بوجھ سے پھندا سخت ہوتا ہے تو تیز استرے سے بادشاہ کی گردن کاٹ دی جاتی ہے۔
اس سے اندازہ لگالیں کہ انسان کتنا بے رحم واقع ہوا ہے۔
فشوڈا کی کہانی سن لیں۔ یہ بھی بہت دلچسپ ہے۔
اگر بادشاہ کی جنسی قوت کم ہو جائے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ دیوتا کو فوری طور پر تازہ خون کی ضرورت ہے تاکہ اس کی بار

آوری برقرار رہ سکے اور قبیلہ آباد ہو۔ ایسی صورت میں بادشاہ کی بیویاں قبیلے کے کاہن کو بادشاہ کی اس کمزوری سے آگاہ کر دیتی ہیں۔ کاہن بادشاہ کو مسئلے کی سنگینی سے آگاہ کرنے کے بعد کہتا ہے کہ وہ اپنے اوپر سفید کپڑا لے کر لیٹ جائے۔ جب بادشاہ ایسا کرتا تو اسے سزائے موت سنا دی جاتی ہے۔

اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ابتدا ہی سے یہ پنڈت، کاہن اور مذہبی پیشوا وغیرہ اتنے طاقت ور رہے ہیں کہ بادشاہ بھی ان کے سامنے بے بس ہوتے تھے۔ ان ہی کے حکم اور اشارے پر انسانوں کو بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔

ایک رواج یہ بھی تھا کہ جب بادشاہ سخت بیمار پڑ جاتا تو اس کے اندر موجود دیوتا کی روح اس سے عظیم قربانی طلب کرتی۔

عظیم قربانی دینے کے بعد بادشاہ صحت یاب ہو جاتا اور یہ عظیم قربانی کیا ہوتی تھی؟

بادشاہ کے کسی قریبی عزیز کا قتل یا تو اس کا کوئی بھائی یا اس کا اپنا بیٹا قربان کر دیئے جاتے۔

یورپ کے ملک سوئیڈن کی ایک روایت کچھ یوں ہے۔

جب سوئیڈن کے بادشاہ آون نے اپنی زندگی بچانے کی خاطر اپنے بیٹوں کی قربانی دی۔ اپنے دوسرے بیٹے کی قربانی کے وقت دیوتاؤں نے اسے بتایا کہ وہ اگر ہر نو سال بعد ایک بیٹے کی قربانی دیتا جائے تو اس کی زندگی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔

لیکن جب اس نے ساتویں بیٹے کی قربانی دی تو چلنے پھرنے سے معذور ہو چکا تھا۔ اسے کرسی پر بٹھا کر لایا جاتا۔ آٹھویں بیٹے کی قربانی کے وقت وہ بستر سے لگ چکا تھا۔ مزید کچھ برس گزارنے کے بعد جب آخری بیٹے کی قربانی کا وقت آیا تو وہ سوکھ کر کانٹا بن چکا تھا۔

(کتنا فرق ہے ہمارے یہاں کی ایک روایت اور ان کی روایت میں۔ بابر بھی ایک عظیم بادشاہ تھا لیکن اس نے اپنی اولاد (ہمایوں) کے لیے اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ جب ہمایوں بیمار تھا تو بابر نے اس کے بستر کے گرد سات بار طواف کیا اور خدا سے دعا کی کہ خدا اسے اٹھا لے اور اس کے بیٹے کو صحت مند کر دے اور پھر ہوا بھی یہی، بابر بیمار ہو گیا اور ہمایوں کو صحت ہو گئی)۔

اور ایک وہ سوئیڈن کے بادشاہ تھے جو اپنی زندگی اور صحت کے لیے اپنی اولادوں کو قربان کیے جا رہے تھے۔

بادشاہوں سے ہٹ کر عام انسان تو بے چارے یوں ہی قربان ہوتے رہتے تھے۔

قدیم جاپان میں کسی عمارت کو دشمن کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے کنواری لڑکیوں کی قربانیاں دی جاتیں۔ اس رسم کو Hi Tobashira کہا جاتا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ اس قبیح رسم کے باوجود بہت سی عمارتیں دشمنوں کے حملوں سے تباہ ہو گئی ہوں گی لیکن عقیدہ تو آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر قائم ہوتا ہے۔

ازٹیک لوگوں نے 1487 میں اپنے اہراموں کی تعمیر کے لیے اسی ہزار قیدیوں کو بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ شاید یہ بات اس لیے کی جاتی ہے کہ فلاں عمارت کی بنیادوں میں میرا یا میرے اجداد کا خون شامل ہے۔

ایک قبیح رسم اور بھی تھی۔

اور وہ یہ تھی کہ بادشاہ دوسری دنیا کے سفر پر اکیلے جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ وہ لوگ بھی جائیں جو اس کی زندگی میں اس کی خدمت کرتے رہے ہیں۔

اور یہ بے موت مرنے والے بے چارے غلام اور کنیزیں ہی ہو سکتے تھے۔

یہ رسم مصر کے فراعین کے یہاں، منگولوں کے یہاں اور چین میں بھی رائج تھی۔

مصر میں جب بادشاہ کی موت ہوتی تو اہرام کے اندر بادشاہ کے تابوت کے ساتھ اس کے غلام اور کنیزیں بھی زندہ دفن کر دی جاتی تھیں۔

کبھی کبھی تو ان غلاموں اور کنیزوں کی تعداد سینکڑوں میں بھی ہوتی تھی۔

ان تنگ و تاریک اہراموں کا تصور کریں جن میں ہوا اور روشنی کا بالکل گزر نہیں ہو سکتا تھا جہاں کے سارے راستے پتھروں کے بڑے بڑے بلاکس رکھ کر بند کر دیئے جاتے۔ ایسے کمروں میں بند لوگوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ وہ بے چارے ان کمروں میں گھٹ گھٹ کر اور تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہوں گے۔

میں چین کا ذکر کر چکا ہوں۔

چین کے حوالے سے کچھ اور سن لیں۔ چین میں انسانوں کی قربانی کچھ اس طرح دی جاتی کہ ان کے جسموں سے بڑے بڑے پتھر باندھ کر انہیں دریا میں ڈبو دیا جاتا تھا۔

یہاں بھی مرحوم آقاؤں کے ساتھ ان کے غلاموں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ یہ رسم خاص طور پر شانگ اور ژرے

کے عہد میں بہت زیادہ ہوگئی تھی۔

کن خاندان کا ایک بادشاہ اپنی موت کے وقت اپنے ستر غلاموں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس سانحے سے متاثر ہوکر ایک شاعر نے "زرد پرندہ" کے عنوان سے ایک لاجواب مرثیہ لکھا۔ اس مرثیے کو چین کی کلاسیکل شاعری میں شمار کیا جاتا ہے۔

جزیرہ فلپائن میں دسمبر کے شروع میں اچھی نسل اور اولادِ نرینہ کے لیے کسی انسان کی قربانی دی جاتی ہے۔ یہ قربانی خوراک اور اولاد کے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔

مظلوم انسان کو جلوس کی شکل میں ہانک کر جنگل میں لے جا کر اس کی پشت ایک درخت سے لگا دی جاتی ہے اور اس کے بازو سر سے اوپر کرنے کے بعد اوپر باندھ دیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی بغلوں میں نیزہ مارا جاتا ہے۔ پھر اس کے جسم کو کمر سے کاٹ دیا جاتا ہے۔ اس طرح اس کا سینہ اور بازو اوپر لٹک جاتے ہیں اور نچلا دھڑ خون میں لت پت زمین پر گر جاتا ہے۔ خون نکل جانے کے بعد اس کے جسم کے دونوں حصوں کو کسی خندق میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دی جاتی ہے۔

ہندوستان میں انسانی قربانی کی تاریخ ہزاروں سال پہلے انڈس ویلی تہذیب سے ہے۔ اس کا پتا ہڑپہ سے ملنے والے ایک مجسمے سے چلا ہے۔

اس مجسمے میں ایک عورت کو قربان کرنے کے لیے لٹایا ہوا ہے۔

ہندوؤں کی مشہور کالی دیوی جو خوف اور تباہی کی علامت ہے۔ اس کو خوش کرنے کے لیے انسانی بھینٹ دی جاتی تھی۔

ہزار پابندیوں کے باوجود کالی دیوی کے چرنوں میں انسانی جانوں کی بھینٹ آج بھی دی جاتی ہے۔ 2006ء میں کالی کے چرنوں میں درجنوں انسانوں کو قربان کردیا گیا تھا۔

اگرچہ ہندوستان میں نظریۂ اہنسا کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ یہ رسم ختم ہوگئی تھی لیکن کالکا پرانا کے مطابق خاص خاص حالات میں انسانی قربانی جائز بھی ہے۔

جیسے شدید قحط یا جنگ کی صورت میں ملک کو خطرہ ہو، اس وقت انسانی قربانی دی جاسکتی ہے۔ راجندر لال مترا نے اپنی ایک کتاب میں اس قسم کی قربانیوں کا ذکر کیا ہے۔

کچھ قربانیاں تو آج بھی دی جاتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ بہت چھپ کر خفیہ طور پر دی جاتی ہیں لیکن ان قربانیوں کے انداز بہت بھیانک ہوتے ہیں۔

برہم پتر (بنگال) کے زرخیز علاقے میں قسمت کی دیویوں کو مہربان کرنے کے لیے قربانی دی جاتی ہے۔ یہ بھینٹ کچھ اس طرح سے ہوتی ہے کہ راستے میں ملنے والے اجنبی کو قتل کرنے کے بعد اس کے بازو اور ٹانگیں کھیت میں دفن کردی جاتی ہیں اور بقیہ جسم کا قیمہ بنا کر مختلف کھیتوں میں بکھیر دیا جاتا ہے۔

یہ لوگ اس حرکت کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے کسی قسم کی پشیمانی وغیرہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

دراوڑوں کی ایک قوم "گونڈے" برہمنوں کے لڑکوں کو اغوا کرکے ان کی قربانی کرتی ہے۔ چاول کی کاشت کے ایام میں لڑکے کو زہریلے تیر سے ہلاک کرنے کے بعد اس کا خون کھیتوں میں چھڑک دیتے ہیں اور گوشت کھا جاتے ہیں۔

چھوٹا ناگپور (بہار، بھارت) کا اوردن قبیلہ اناپورنا نامی دیوی کی پرستش کرتا ہے۔ یہ دیوی ان کی فصلوں کو زرخیز کرتی ہے لیکن اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کے حضور انسانی جانوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

سخت قوانین کے باوجود یہ رسم چوری چھپے آج بھی ادا کی جاتی ہے۔

عام طور پر ان کا شکار غریب اور مظلوم گھروں کے گم شدہ بچے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپریل اور مئی کے مہینوں میں اس قسم کے شکار کے لیے نکلتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان دو مہینوں میں کوئی بھی شخص ان کے علاقوں میں تنہا جانے کی غلطی نہیں کرتا اور گروہ کی صورت میں جانے والے بھی آتشیں اسلحہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

جب کسی انسانی شکاری کو اس کا شکار مل جاتا ہے تو وہ اس کا گلا اور انگشت شہادت کاٹ کر گاؤں کے اس گھر کی طرف دوڑ لگا دیتا ہے جہاں اس دیوی کی پوجا ہو رہی ہوتی ہے۔

یہ اعضا دیوی کی مورتی کے سامنے رکھ دیے جاتے ہیں اور ان کے عقیدے کے مطابق دیوی ان لوگوں کو آشیرباد دیتی ہے اور ان کی فصلیں دگنی ہوجاتی ہیں۔

اب ستی کی رسم کو لے لیں۔

وہ کیا ہے۔ عورت کی قربانی ہی تو ہے اگر شوہر مر گیا ہے تو عورت کے لیے لازم تھا کہ اس کی چتا کے ساتھ جل کر مرا

جائے۔

یہ ایک مقدس فریضہ تھا۔ یعنی وہ بے چاری زندہ رہنا چاہتی ہو، ابھی کم عمر ہی ہو، بہت سے خواب دیکھ رکھے ہوں لیکن اپنے آپ کو قربان کر دینا اس کے لیے لازمی ہو جاتا تھا۔

اور نوّے فیصد واقعات میں اس بے چاری کو اٹھا کر زبردستی آگ میں پھینک دیا جاتا تھا۔

یوں تو ستی کی بہت سختی سے ممانعت کر دی گئی ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان میں اس قسم کے واقعات سننے کو مل جاتے ہیں اور یہ احساس ہو جاتا ہے کہ انسان ابھی دورِ جہالت سے آگے نہیں جاسکا ہے۔

اب ذرا بنگال کا حال بھی سن لیں۔

یہ قصہ مغربی بنگال کا ہے۔ یعنی وہ علاقے جو ہندوستان میں شامل ہیں۔

انیسویں صدی کے برطانوی افسروں کی رپورٹس بتاتی ہیں کہ بنگال میں ایک انداز سے انسانی قربانی ہوتی ہے۔

یہ لوگ زمین کی دیوی "تارنی" کے حضور قربانی پیش کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس قربانی سے بیماری، مصیبت اور بلائیں ان سے دور ہو جاتی ہیں۔

یہ لوگ ہلدی کاشت کیا کرتے اور کہتے کہ انسانی خون کے بغیر ہلدی میں رنگ نہیں آتا۔ ان کی دیوی صرف ایسی قربانی قبول کرتی جو مول خریدی گئی ہو یا پیدا ہوتے ہی اسے قربانی کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہو یا ماں باپ خود اپنا بچہ قربانی کے لیے پیش کر دیں۔

بعض اوقات قربانی کے مظلوم کو بہت عرصہ پہلے سے تیار کیا جاتا۔ معاشرے میں ہر جگہ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور وہ جہاں جاتا اس کی خوب آؤ بھگت کی جاتی۔

بالغ ہونے پر اس کی شادی کر دی جاتی۔ اس کے علاوہ اسے زمین کا ایک ٹکڑا اور اناج کا ذخیرہ بھی دیا جاتا۔

اس مظلوم شخص کو بال کٹوانے کی اجازت نہیں تھی۔

قربانی کی رسم کو دیکھنے کے لیے مردوں اور عورتوں کا مجمع لگ جاتا۔ پورا گاؤں آجاتا۔

قربانی سے قبل کافی دنوں تک سارا گاؤں شراب نوشی کیا کرتا اور مظلوم کو بھی شراب کے نشے میں دھت کر دیا جاتا۔

مظلوم شخص کو قربان گاہ تک مذہبی جوش و جذبے اور عقیدت و احترام کے ساتھ لایا جاتا۔ جلوس کے ہمراہ بے ہنگم موسیقی اور ناچنے گانے والوں کا شور ہوتا۔

اس مظلوم کو قربان گاہ میں ایک کھونٹے کے ساتھ باندھ

مختصر مختصر

☆ میں قرضوں کی وجہ سے بالکل پریشان نہیں ہوتا میں تو قرض خواہوں کی وجہ سے پریشان ہوتا ہوں۔

☆ میں کتاب پر تبصرہ لکھنے میں اتنا مصروف رہا کہ مجھے کتاب پڑھنے کا وقت ہی نہیں مل سکا۔

☆ رشید صاحب، آج آپ کا سر عجیب سا لگ رہا ہے۔ لگ رہا ہے جیسے آپ نے وگ لگائی ہو۔

جی ہاں وگ ہی ہے۔

اچھا......؟ بھئی کمال ہے...... بالکل پتا نہیں چل رہا۔

☆ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف منگنی توڑ دی بلکہ اپنی منگیتر کو تیس مرتبہ کے ہوم وزٹ کا بل بھی بھیج دیا۔

☆ ڈاکٹر صاحب نے حسین مریضہ کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

آپ صحیح خوراک نہیں کھا رہی ہیں آپ آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیں۔

☆ ڈاکٹر صاحب! میں اپنی زیادہ دولت کی وجہ سے پریشان رہتا ہوں۔

آپ باقاعدگی سے میرے پاس آتے رہیں میں آپ کی یہ پریشانی کافی حد تک کم کر دوں گا۔

☆ ڈاکٹر صاحب کیا میرا آپریشن کامیاب رہے گا؟

یہی دیکھنے کے لیے تو آپریشن کر رہا ہوں۔

☆ پروفیسر صاحب نے زیرِ تربیت ڈاکٹر سے پوچھا۔

"اگر کوئی بچہ حلق میں سکہ پھنسا لے تو آپ کیا کریں گے؟"

"سر! میں کسی پولیس والے کو بلواؤں گا، وہ لوگ ہر جگہ سے پیسا نکلوا سکتے ہیں۔"

☆ سنیے...... رات میں نے خواب میں دیکھا کہ آپ نے مجھے نئے کپڑے خریدنے کے لیے دو ہزار روپے دیے ہیں آپ یقیناً خود کو اتنا ہی فراخ دل ثابت کریں گے جتنا میں نے آپ کو خواب میں دیکھا۔

ہاں بیگم...... تم وہ دو ہزار روپے اپنے پاس ہی رکھو جو میں نے تمہیں خواب میں دیے ہیں۔

مرسلہ: راشد خان، ڈی جی خان

دیا جاتا۔ اس کے بعد مظلوم شخص کو تیل گھی اور ہلدی لگائی جاتی اور پھولوں کے ہار پہنائے جاتے۔

اس کے علاوہ سارا دن اسے کھانے کو مصالحے دار چیزیں دی جاتیں۔

لوگ اس کے تھوک کو بطور تبرک حاصل کرنے کے لیے اس پر ٹوٹ پڑتے۔ اس کام میں عورتیں خاص طور پر پیش پیش ہوتیں۔

لوگ اس کھونٹے کے گرد والہانہ طور پر ناچتے اور زمین سے مخاطب ہوتے۔ "اے بھگوان! ہم تیری خدمت میں یہ قربانی پیش کررہے ہیں تو اسے قبول فرما اور ہمیں اچھی صحت، اچھا موسم اور اچھی فصل دے۔"

اس کے بعد مظلوم سے مخاطب ہوتے۔ "ہم نے تجھے قیمتاً خریدا اور تیری خدمت میں کوئی کمی نہیں کی۔ اب ہم رواج کے مطابق تجھے قتل کریں گے اور گناہوں سے پاک ہوجائیں گے۔"

اگلے دن بدمستوں کی محفل دوبارہ جمتی جو دوپہر تک جاری رہتی۔ اس کے بعد قربانی کی تیاری شروع ہوجاتی۔

ایک بار پھر اس کے جسم پر تیل لگایا جاتا۔ ہر کوئی اس کے جسم پر ہاتھ لگا کر تبرک کے طور پر یہ تیل اپنے سر پر لگاتا۔ مظلوم کو گاؤں کے ہر دروازے پر لے جایا جاتا جہاں لوگ اس کے سر سے بال کاٹ کر تبرک اور یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھ لیتے۔

اس کے بعد اس کو افیون کھلا دی جاتی تاکہ وہ غنودگی میں پڑا رہے اور شور نہ کرسکے۔ مظلوم کو قتل کرنے کے بھی کئی طریقے تھے۔

سب سے عام طریقہ گلا گھونٹ کر مارنا تھا۔ درخت کی ایک لمبی اور مضبوط شاخ لے کر اس سے پروہیت اور اس کے چیلے مظلوم کا گلا دبا کر اسے مار ڈالتے۔ پھر کلہاڑی سے اس کے جسم کے ٹکڑے کردیے جاتے اور گوشت تقسیم کردیا جاتا۔

(حوالے کے لیے دیکھیں مائیکل روڈ رلف کی کتاب)

اس مضمون کو لکھنے کا مقصد کسی قسم کی دہشت یا وحشت انگیزی نہیں ہے اور نہ ہی اپنی طرف سے کچھ بڑھا کر بتایا گیا ہے بلکہ یہ تاریخی اور حقیقی واقعات ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اپنی سرشت میں خون بہانا پسند کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہے۔

درندگی اس کے مزاج میں شامل تھی۔

ایسا نہیں کہ یہ بھیانک اور مکروہ رجحان کسی ایک علاقے کے لیے مخصوص ہو۔ بلکہ یہ پوری دنیا میں تھا۔ تبت جیسے ملک میں بھی اس کا رواج تھا۔

میں نے تبت کا خاص طور پر حوالہ اس لیے دیا ہے کہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں بہت ٹھنڈے مزاج کے لوگ ہوتے ہوں گے۔

1950ء میں ایک امریکن ماہر آثار قدیمہ نے ہمالیہ کے دامن میں ایسے تین بچوں کی لاشیں دیکھیں جنہیں کسی دیوی یا دیوتا کے نام پر قتل کیا گیا تھا۔

اب ذرا حالیہ دنوں کی طرف آجائیں۔

2008ء میں لائبیریا کے رہنے والے ایک شخص نے ایک بچے کو قتل کرکے اس کا دل نکال کر کھالیا تھا۔ گرفتار ہونے پر اس نے یہ بیان دیا کہ اس نے خواب میں دولت کی دیوی کو دیکھا تھا جو اس سے کہہ رہی تھی کہ تم اگر ایسا کرو گے تو دولت مند بن جاؤ گے۔

اب ایک روح کو لرزا دینے والا انکشاف بھی پڑھ لیں۔

یہ انکشاف مشہور چینل BBC نے 2005ء میں کیا تھا اور وہ انکشاف یہ تھا کہ افریقا سے ہر سال بہت سے بچوں کو قربان کرنے کے لیے یورپ لایا جاتا ہے اور یورپ میں موجود خفیہ تنظیمیں بچوں کی قربانیاں دیا کرتی ہیں۔ کیا کہتے ہیں آپ؟ کیا انسان مہذب ہوسکا ہے۔ یا آج بھی وہی ہے جو ہزاروں سال پہلے تھا۔

انسانی قربانی کے موضوع پر کئی کتابیں اور ناول بھی لکھے گئے ہیں۔ چند کے نام یہ ہیں۔

"دی لاٹری" 1948ء میں شائع ہونے والی ایک کتاب جو اس موضوع پر تھی اور بہت ممتاز رہی۔ اس کتاب کی اشاعت نے ایک ہنگامہ کھڑا کردیا تھا۔

1973ء میں ایک فلم بنائی گئی تھی جس کا نام تھا "The wicker man" یہ ہولناک فلم بھی اس موضوع پر تھی۔

اس کے علاوہ 1977ء میں شائع ہونے والے روز میری کے شاہکار ناول سن ہارس، مون ہارس میں بھی اس موضوع کا احاطہ کیا گیا تھا۔

دراصل خون، قتل، لاشیں، تباہی، بربادی، درندگی انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ وہ خون بہا کر اور خون دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ اس کی انا کو تسکین ملتی ہے۔

قتل عام کرنے کے بعد ایک طرح کا سکون محسوس کرتا

ہے۔

انسانی تاریخ ایسی داستانوں سے بھری ہوئی ہے جب انسان نے انسان کا بے دریغ خون بہایا۔ لاشوں کے انبار لگا دیے، کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کر دیے۔

کیسے کیسے سفاک لوگ اس دنیا میں آئے اور انسانیت کی لاشوں کے تختے دے کر چلے گئے۔ خون ریزی کی زیادہ تر داستانیں جنگوں سے منسلک ہیں۔

قدرتی آفات کے نتیجے میں اتنے لوگ نہیں مرے ہوں گے جتنے انسانوں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ یوں تو تاریخ نے ایسی بے شمار داستانوں کو محفوظ کر رکھا ہے لیکن ہم ان میں سے چند کے بارے میں بتاتے ہیں۔ جن میں لاکھوں انسانوں کے خون سے ہولیاں کھیلی گئیں۔

ہم نے ان واقعات کو اسی طرح ترتیب دیا ہے کہ ہر واقعے میں ہلاکتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

بہت سے باضمیر لوگ ایسے تھے جنہوں نے اتنی انسانی لاشیں دیکھ کر جنگ سے ہی توبہ کر لی اور اپنی زندگی کے راستے تبدیل کر لیے۔

ان میں ایک مہاراجا اشوک بھی تھا۔ اس نے ایک جنگ کی، جس میں اس نے فتح حاصل کر لی اور دوسری صبح جب اس نے ہر طرف لاشیں ہی لاشیں دیکھیں تو کانپ کر رہ گیا۔

”کیا یہ سب میری وجہ سے مرے ہیں۔ میں اتنے انسانوں کا قاتل ہو گیا ہوں۔“

سوچتے سوچتے وہ ذہنی مریض بن گیا۔ اس نے آئندہ کے لیے جنگ سے توبہ کر لی اور ہندو دھرم کو چھوڑ کر بدھسٹ بن گیا۔

لیکن ایسے کتنے لوگ بدلے ہیں۔ جب کہ اس جنگ میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد صرف ایک لاکھ تھی۔ صرف ایک لاکھ لاشیں دیکھ کر اس کا یہ حال ہو گیا تھا۔

اب آجائیں دنیا کے چند بھیانک واقعات کی طرف۔

غلاموں کی تجارت۔ اس میں پندرہ لاکھ آدمی مرے تھے۔ جی ہاں پورے پندرہ لاکھ۔ یہ گھناؤنی تجارت سولھویں صدی میں شروع ہوئی۔ سترہویں صدی میں یہ اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ بالآخر انیسویں صدی میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

غلاموں کی تجارت یورپ کے بادشاہوں کی خوشنودی پر ہوا کرتی تھی۔ بڑے بڑے بحری جہازوں کے ذریعے اٹلانٹک کے راستے ہوا کرتی تھی۔

اور غلام بے چارے افریقی ہوا کرتے۔ ان کو بحری جہازوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس دیا جاتا۔ یہ بے چارے دم گھٹنے اور بے پناہ تشدد کی وجہ سے مر جایا کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ہر دس میں سے چار غلام اس طرح مر جاتے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ اس تناسب سے کتنے انسانوں کو غلام بنالیا گیا ہوگا۔

غلاموں کی اس تجارت میں 15 لاکھ آدمی مرے تھے۔

چین میں منگ خاندان کے عہد میں 35 لاکھ آدمی مارے گئے تھے۔

قبلائی خان نے یوآن سلطنت کی بنیاد رکھی۔

یہ بنیاد انسانی خون پر رکھی گئی تھی۔ قبلائی خان چنگیز خان کا پوتا تھا۔ اس نے 1260 میں حکومت سنبھالی تھی۔ ایک سو آٹھ برس حکومت کی۔ 1368 میں اس عہد کا خاتمہ ہو گیا تھا لیکن اس عرصے میں سوائے خون بہنے اور کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ ہر طرف انسانی خون، قبلائی خان کی مملکت بہت وسیع و عریض تھی اور ہر طرف خوف اور دہشت کا راج تھا۔

لوشان بغاوت۔

ایک بار پھر چین کی سرزمین خون سے سرخ ہوئی۔

500 سال پہلے یوآن عہد جو اس سے ٹانگ عہد کے کنٹرول میں تھا۔ اس زمانے میں لوشان کے ایک جنرل نے بغاوت کر دی تھی۔

اس بغاوت کو لوشان کی بغاوت کا نام دیا گیا ہے۔ زبردست قسم کی خونریزی ہوئی تھی اور اس میں 36 لاکھ آدمی مارے گئے تھے۔

36 لاکھ کچھ کم تو نہیں ہوتے لیکن کیا کیا جائے۔ جب سر پر خون سوار ہو اور سلطنت پر قبضہ کرنے اور حکومت کرنے کے خواب ہوں تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔

تائے پی کی بغاوت۔

یہ بھی ایک خون ریز بغاوت تھی اور زمین ایک بار پھر چین کی تھی۔ یعنی ہزار سال کے بعد۔ اس بار غیر ملکی طاقتیں بھی اس جنگ میں شریک تھیں۔ جیسے فرانس، برطانیہ اور امریکا کے کچھ حملے تھے۔

یہ زمانہ ہے 1850 کا اور چین میں عہد ہے کوئنگ سلطنت کا۔ اس زمانے میں چین ہر طرف سے مسائل میں جکڑا تھا۔

افیون کی تجارت زوروں پر تھی۔ اس زمانے میں تائے پی کے ایک شخص ہونگ ژی نے خود کو حضرت عیسیٰؑ کا بھائی قرار دے کر حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ ایک طویل کہانی

ہے۔ بہرحال اس بغاوت کے نتیجے میں 40 لاکھ انسان مارے گئے۔

پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ خون بہانے والے کیسے لوگ ہوتے ہیں۔ کس قسم کی ہوس ہوتی ہے۔ فراز کا یہ شعر ان ہی معاملات پر صادق آتا ہے۔

امیر شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلہ مذہب کبھی بہ نام وطن

کبھی مذہب کے نام پر خون بہایا جاتا ہے۔ کبھی وطن کے نام پر اور کبھی زبان و نسل کے نام پر۔ یعنی انسان کا کام یہی رہ گیا ہے کہ وہ خون بہایا کرے۔

پھر سو سال بعد، جی ہاں اس بار پھر چین کی سرزمین۔

یہ مدت ہے 1958ء سے 1961ء تک جب چین پر کمیونزم کا غلبہ ہو رہا تھا یہ بغاوت کسی نظریے کو زبردستی ٹھونسنے پر ہوئی تھی۔

کسان، مزدور تمام لوگ سب کے سب مارے جا رہے تھے۔ اندازہ ہے کہ اس طرح کتنے لوگ مارے گئے ہوں گے؟ 43 لاکھ، پورے ایک شہر کی آبادی ہوتی ہے۔

اس کے بعد چین ایک عظیم طاقت تو بن گیا لیکن کس قیمت پر؟

اس کے بعد آ جائیں روس کے خونی انقلاب کی طرف۔

زبردستی کمیونزم کا نظریہ ٹھونسنے اور نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ خونی عہد 1913ء سے 1953ء تک جاری رہا۔ خاص طور پر کسانوں اور مزدوروں کا بھرکس نکال دیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق اس انقلاب نے 40 لاکھ انسانوں کی جانیں لے لیں تھیں۔

اور اس خون ریزی کا ذمے دار صرف ایک شخص تھا جوزف اسٹالن۔

اس طرح ایک اور آدمی جس کے ہاتھوں پر سب سے زیادہ انسانی خون کے نشانات ہیں وہ ہے چنگیز خان۔

سنگدل موت اور خوف کی علامت۔ وہ 60 لاکھ انسانوں کی اموات کا ذمے دار ہے۔ 60 لاکھ انسان کم نہیں ہوتے۔ چنگیز خان نے ساٹھ لاکھ انسانوں کو مار کر اپنی ہیبت طاری کر دی تھی اور آج تک اس کی مثالیں دی جاتی ہیں۔

اب ایک اور خون ریز حادثے کو دیکھیں۔

یہ ہے پہلی جنگِ عظیم جو 1914ء سے شروع ہو کر 1918ء میں ختم ہوئی۔

یورپی اقوام کے درمیان ہونے والی اس بھیانک جنگ میں 65 لاکھ افراد مارے گئے تھے۔ اندازہ کر لیں 65 لاکھ۔

اس کے بعد ایک قدم اور آگے۔

دوسری جنگِ عظیم جو 1934ء میں شروع ہوئی۔ اس جنگ نے تو انسانی لاشوں کے انبار لگا دیے تھے۔

ایٹم بم اس جنگ کے دوران میں گرائے گئے اور اس جنگ میں 72 لاکھ افراد مارے گئے تھے۔

چرچل سے ایک بار سوال کیا گیا تھا کہ یہ بتائیں کہ تیسری جنگ عظیم کن ہتھیاروں سے ہوگی تو اس کا جواب یہ تھا کہ میں تیسری کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن چوتھی جنگ ڈنڈوں اور پتھروں سے ہوگی۔

کتنی گہری بات کہہ دی تھی۔ یعنی تیسری جنگ کے بعد تہذیب ہی ختم ہو جائے گی نئے سرے سے ابتداء ہوگی۔

اب پندرہویں صدی کے ایک المیے کا حال سن لیں۔

یہ بھی یورپی ممالک کی امریکا میں کالونی بنانے کی مہم اور اس مہم کے دوران میں ان نام نہاد مہذب اقوام نے پورے ایک کروڑ انسانوں کا خون بہایا تھا، ایک کروڑ انسان!!

اب ذرا جائزہ لیں کہ کہانی کہاں سے شروع ہوئی۔

15 لاکھ۔ غلاموں کی تجارت۔

30 لاکھ۔ چین میں منگ کے عہد میں۔

36 لاکھ۔ لوشان کی بغاوت۔

40 لاکھ۔ تائی پی کی بغاوت۔

43 لاکھ۔ چین میں کمیونزم نافذ کرنے کے دوران۔

49 لاکھ۔ روس کا انقلاب۔

60 لاکھ۔ چنگیز خان۔

65 لاکھ۔ پہلی جنگ عظیم۔

72 لاکھ۔ دوسری جنگ عظیم۔

ایک کروڑ۔ امریکا کالونی بنانے کی مہم۔

خود سوچ لیں آئندہ کیا ہونا ہے؟ کیونکہ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اخبارات گواہ ہیں۔

اس مضمون کی تیاری میں جن کتابوں سے مدد لی گئی۔
مائیکل روڈولف کی کتاب "ہسٹری آف کاسل"۔
انسائیکلو پیڈیا۔
ڈاکٹر محمد صدیق ہاشمی کی کتاب "جادو اور مذہب"۔

علیم شاهد

ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی انسان سیکھتا ہے۔ ہمیں تو بطور خاص ہدایت دی گئی ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے چین یعنی دور دیس بھی جانا پڑے تو جاؤ۔ دیگر ممالک کی ترقی کی وجہ کیا ہے، جہد مسلسل ایک معروف قلمکار نے ایک شہر کا حال بیان کیا ہے جس میں آپ کو نظر آجائے گا کہ وہاں والے کس طرح نظم و ضبط، قانون کی پاسداری اور محنت سے لگن رکھنے کی وجہ سے ترقی کے اوج پر پہنچے۔

ایک شہر کا احوال جو سبق آموز بھی ہے

اس مرتبہ ہم امریکا مئی کے مہینے میں آئے۔ ایسٹ بے اریا اور سان فرانسسکو میں ایک دو دن ہی دھوپ میں تیزی دیکھی ورنہ سرد ہوائیں، ہلکی بارش اور ٹھنڈک بالکل دسمبر جنوری جیسی تھی۔ روز اوّل سے ہی جیکٹ اور گرم ٹوپی پہننا پڑی۔ اتوار کی دوپہر میں شکیل اور جہانگیر گاڑی میں بیٹھ کر سان فرانسسکو سٹی میں فشرمینز وہارف گئے۔ یہاں میں پہلے بھی آچکا ہوں لیکن پانچ سال بعد موسم کی خوشگواری، آسمان پر بادل، سرد گیلی ہوائیں ساحل کے کنارے وسیع و

علیم شاہد و بیگم S.F.O Powel

عریض فٹ پاتھ پر دنیا بھر کے سیاحوں کے ہجوم میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ساری دنیا کے لوگ اپنے جدید فیشن کے رنگین لباس میں ملبوس اس لہکتے مہکتے موسم کو انجوائے کرنے آئے ہوئے تھے۔ رش کا یہ عالم کہ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ قدم قدم پر ہوٹل، ریستوران اور اسٹور تھے۔ ہمارے ایک جانب پانی دوسری جانب چوڑے فٹ پاتھ، شاندار بلڈنگیں اور نیچے تحفے تحائف کی دکانیں تھیں۔

فشرمینز وہارف آنے والوں کے لیے فٹ پاتھ پر فش، ٹاکو، فرائیز، پراؤن اور کریب کے درجنوں اسٹال ہیں۔ یہ اسٹال جنوبی امریکا کے لوگوں کے ہیں جو محنت اور کھانے کے ذوق میں ہم ہی جیسے ہوتے ہیں۔ عمدہ تازہ مچھلی، پراؤن، کریب زیتون کے تیل میں سامنے تل کر دیتے ہیں ساتھ میں ٹماٹو کیچپ اور مزیدار چٹنیاں بھی ہوتی ہیں۔

ٹھنڈے ابر آلود موسم میں تحسین فیشن ایبل متمول فیملیاں وہیں فٹ پاتھ پر کھڑے ہوکر گرم گرم تازہ تلی ہوئی مچھلی کھاتے ہیں۔ ٹھنڈی پیپسی پیتے ہیں تو فشرمینز وہارف کی تفریح دوبالا ہوجاتی ہے۔

ریستورانوں میں بھی سی فوڈ ہی کثرت سے ملتا ہے۔ میزیں بھری ہوتی ہیں، تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی۔ ہر شخص ان لمحات کو اپنی نظروں اور کیمروں میں محفوظ کر لینا چاہتا ہے۔ ہم بھی ان میں شامل ہوگئے۔ ہم نے کھڑے ہوکر گرم گرم کریب، پراؤن اور فرائیز، چٹنی اور ٹماٹو کیچپ کے ہمراہ کھائے، پیپسی پی، بڑا ہی مزہ آیا۔ تصویریں بھی اتاریں۔ یہ شہر سان فرانسسکو کا ساحل ہے جو فشرمینز وہارف کہلاتا ہے کیونکہ یہاں مچھلی پکڑنے، جمع کرنے، اسٹور کرنے اور شہر بھیجنے کے بہت بڑے بڑے ادارے ہیں لیکن ساحل پر بنے پیئرز نے، نئی قدیم عمارتوں نے، ساحل کے کنارے بنے چوڑے فٹ پاتھوں نے، سڑک کے دوسری جانب بنی حسین اسکائی اسکریپرز نے، ہائی رائزز عمارتوں نے اس علاقہ کو ایسی عمدہ شاندار تفریح گاہ میں تبدیل کردیا ہے جہاں دنیا بھر کے سیاح اپنی فیملیوں کے ساتھ بہترین فیشن کے لباسوں میں ملبوس چہل قدمی کرتے نظر آتے ہیں۔ فوٹوگرافی کرنا، تازہ مزیدار سی فوڈ، آئس کریم اور پاپ کارن کھانا اور کافی پینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہاں قدم قدم پر فیریز اسٹیشن ہیں جہاں سے فیریز ساسی لوکو کے لیے گولڈن گیٹ کے لیے، الامیڈا کے لیے اور بہت سے دوسرے ساحلی شہروں کے لیے ہمہ وقت دستیاب ہوتی ہیں۔ ان

فیریز کے ذریعے لوگ اپنے گھروں، رشتہ داروں، دوستوں سے ملنے دوسرے شہروں کو بھی جاتے ہیں اور سیاحوں کے لیے یہ سمندری تفریح بھی مہیا کرتی ہیں۔ ہم بھی تفریح کرتے چہل قدمی کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔

یہاں فٹ پاتھ پر سوانگ بھرنے والے، گانے بجانے والے اور مجمع لگانے والے بھی سیاحوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ چوک پر ایک قدآدم مجسمہ نظر آیا جو سورج کی چمک میں اسٹیل کا بنا ہوا لگ رہا تھا۔ سیاح اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ایک نہایت حسین گوری جیسے ہی مجسمے کے قریب سے گزری مجسمہ نے اسے بانہوں میں دبوچ لیا۔ گوری نے چیخ ماری، گزرنے والے اس کی طرف متوجہ ہوگئے اور زور سے تالیاں بجائیں۔ بہروپیے نے گوری کو چھوڑا حاضرین کو ہلکے اشارے سے سلام کیا اور مجسمہ پھر ساکت ہوگیا۔

اب بچے بڑے قریب سے گزر رہے ہیں لیکن مجسمہ چونکہ اسٹیل کا بنا ہوا ہے لہٰذا اس میں حرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم ذرا آگے بڑھے تو ایک مردانہ آواز آئی میں نے مڑ کر دیکھا تو بہروپیے نے ایک قدآور خوب صورت سوٹڈ بوٹڈ سیاح کو اپنی بانہوں میں جکڑا ہوا تھا اور لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ دراصل یہ بہروپیے اپنے فن میں اس قدر ماہر ہیں کہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ وہ ایک زندہ متحرک انسان کے قریب سے گزر رہے ہیں۔

ہم آگے بڑھ گئے۔ یہاں بڑی بڑی داڑھیوں والے بے ہنگم موٹے تازے لوگ پرانے ساز بجا رہے تھے۔ ڈھول، باجے، تاشے سب شکستہ و پرانے تھے۔ گانے بھی یہ پرانے روایتی گا رہے تھے۔ یہ مضحکہ خیز منظر بھی یہاں کے سیاحوں کی دلچسپی کا باعث تھا۔ ہم بھی گھیرے میں شامل ہوگئے۔ لوگ انجوائے کر رہے تھے۔ گانا ختم ہوا۔ لوگوں نے 5-5 اور 10-10 ڈالر کے نوٹ دیے۔ ذرا سی دیر میں اچھی خاصی رقم اس کہنہ طائفے نے اکٹھی کرلی اور ساز کے ذریعے لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔

ہم دیر تک چہل قدمی کرتے رہے۔ موسم سرد ہوتا رہا۔ ہوا میں تیزی آتی گئی لہٰذا واپسی کے لیے پارکنگ سے گاڑی لینا بھی کار دارد تھا۔ ہم سان فرانسسکو کی حسین و جمیل سڑکوں بازاروں کی سیر کرتے ہوئے بے برج سے گزرے۔ ہم پچھلی مرتبہ آئے تھے تو یہ Contilever Bay Bridge تھا لیکن اب کی مرتبہ ہم ایک نہایت

چوڑے خوب صورت سنگین پل پر سے گزر رہے تھے۔ اسی سال پرانا ہزاروں ٹن لوہے کا ڈھانچا بیچ سمندر میں کھڑا تھا۔ پہلے اس پل کا جوڑنا اور بنانا مشکل تھا اب اس کو کھولنا، توڑنا اور مٹانا بھی مشکل ہے۔ بڑی بڑی دیوہیکل کرینیں۔ ہیوی مشینیں پانی میں کھڑی تھیں اور آہستہ آہستہ ایک سال سے پل کے پارٹس اور گارڈرز وغیرہ کھول رہی تھیں۔ ابھی آدھا پل ہی کھل سکا ہے۔ ہم یربابونا آئی لینڈ سے ہوتے ہوئے ایسٹ بے میں داخل ہوئے اور ڈبلن کی راہ لی۔

فشرمینز وہارف ایسی جگہ ہے جہاں چوبیس گھنٹے رونق رہتی ہے اور یہ علاقہ ٹورسٹوں سے بھرا رہتا ہے۔ لوگ یہاں بار بار جاتے ہیں۔ پھر بھی یہاں کے موسم، یہاں کی رونق سے دل نہیں بھرتا۔ میں دوسری مرتبہ ایمبارکوڈیرو، سٹی بینک سے ٹرالی کار پر سوار ہوا یہ کار ریل کا بند ڈبہ ہے جو پٹڑیوں پر یعنی ٹریک پر چلتا ہے۔ اس کا آخری اسٹاپ فشرمینز وہارف ہوتا ہے۔ ٹرالی کار تھوڑی ہی دیر میں ساحل کے کنارے بچھی پٹڑیوں پر سفر کرنے لگی۔ راستے بھر مختلف پیرز آتے رہے۔ کسی پیرز پر گودام تھے کسی پر فیری اسٹیشن تھے۔ کسی پر گنگی قدیم عمارتیں تھیں۔ غرض ساحل کے جس حصے سے یہ ریل چلتی ہے اس کی ایک طرف پانی اور ساحلی عمارتیں ہیں۔ دوسری طرف سان فرانسسکو کی جدید ہائی راز اسکائی اسکریپرز ہیں لہٰذا اس ریل کار کا سفر بھی تفریح ہے۔ مختلف اسٹاپوں پر رکتی ہوئی یہ کار سیدھی فشرمینز وہارف پر ختم ہوتی ہے اور اس کے سفر سے ایمبارکوڈیرو اسٹیشن سے فشرمینز وہارف کے علاقے کی تفریح ہو جاتی ہے۔ جب یہ ٹرالی فشرمین کے علاقے کی گہما گہمی رونق اور بھیڑ کے درمیان سے گزرتی ہے تو منظر بڑا خوب صورت ہوتا ہے۔ میں فشرمین وہارف پر اتر گیا۔ مجھے راستے کا علم تھا، تھوڑی دیر چہل قدمی کی پھر بائیں ہاتھ والی سڑک پر مڑ گیا۔ اس اسٹریٹ پر بہت سی دکانیں ہیں ان کو دیکھتا ہوا ایک فرلانگ گیا تو کیبل کار میں بیٹھنے والوں کی لائن لگی ہوئی تھی میں بھی لائن میں لگ گیا۔ بیس منٹ میں نمبر آیا۔ میں کیبل کار میں سوار تھا اور اندرونِ شہر کی رونق اور روشنیوں سے گزرتا ہوا مرکزی شہر پہنچ گیا۔ برقی زینوں سے نیچے اسٹیشن تک گیا۔ کلپر کارڈ اسکین کیا اور ٹرین میں بیٹھ گیا۔ ایمبارکوڈیرو ویسٹ اوک لینڈ، لیک میرٹ، فروٹ ویل، بے فیر کیمپز وویلی سے ہوتا ہوا ڈبلن پہنچ گیا۔ راحت آئی اور مجھے لے گئی۔

☆......☆

ٹیکسی مجھے یربابونا آئی لینڈ لے گیا۔ یہاں میں پچھلی دفعہ بھی آچکا ہوں۔ ایسٹ بے سے سان فرانسسکو جانے کے لیے جب ہم بے برج پر سفر کرتے ہیں تو برابر سے ایک سڑک نیچے جاتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے ہم پانی میں اُتر رہے ہیں۔ یہ سڑک یربابونا آئی لینڈ میں داخل ہوتی ہے۔ یہ آئی لینڈ ویسٹ اوک لینڈ اور ایمبارکوڈیرو کے درمیان چھوٹا سا سرسبز خوب صورت پہاڑی علاقہ ہے جس کے چاروں طرف پانی ہے اس کے اوپری حصے سے عظیم اوک لینڈ بے برج گزرتا ہے اور نیچے سے دنیا کی سب سے لمبی یربابونا بورنگ ٹنل گزرتی ہے جو سان فرانسسکو کو ایسٹ بے سٹی سے بذریعہ بے ایریا ریپڈ ٹرانسٹ ملاتی ہے۔ شہر نیوی اور گورنمنٹ کے دفاتر اور رہائش کے لیے مخصوص ہے لیکن سمندر کے بیچ میں ہونے کی وجہ سے لوگ یہاں تفریح کے لیے بھی آتے ہیں۔ ماحول انتہائی پُرسکون ہوتا ہے اس لیے یہاں بڑے بڑے پتھروں پر بیٹھ کر تیز ٹھنڈی ہواؤں کے درمیان پانی کا نظارہ کرتے ہیں۔ ہم پہنچے تو نوادرات کی نمائش لگی ہوئی تھی۔ لوگ جو نوادرات لائے تھے، وہ سجے ہوئے تھے نوادرات کے شائقین کی ایک بھیڑ تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ سمندر کا کنارہ تھا۔ نوادرات کے اسٹال تھے۔ لوگ بڑے شوق اور انہماک سے چیزیں دیکھ رہے تھے اور قیمتیں زیادہ ہونے کے باوجود خرید رہے تھے۔ مجھے بھی ایک چھوٹی سی خوب صورت پرفیوم کی خالی، پرانی شیشی پسند آئی لیکن قیمت پاکستانی کرنسی کے مطابق ایک ہزار روپے ہونے کی وجہ سے نہ خریدی۔ اسٹالوں پر پرانے زمانے کی کراکری، مشہور لوگوں کے لباس، پرانا فرنیچر، پرانی جیولری، تانبے پیتل کے برتن، قدیم گھڑیاں، دیواری اور گرینڈ فادر کلاک، میکانیکل چھوٹی مشینیں، ابتدائی دور کی بائی سائیکلیں، مصوروں کے کینوس، تصویروں کے پرانے فریم، بڑے لوگوں کے تحفے تحائف غرض جدید لوگوں کا قدیم خزانہ تقریباً 200 اسٹالوں پر سجا ہوا تھا۔ یربابونا جہاں سویلین آبادی بالکل نہیں ہوتی۔ سمندر کا کنارہ، اوپر سے گزرتا ہوا دنیا کا خوب صورت Bang bridge. خوشگوار موسم کی وجہ سے... انٹیک نمائش شائقین سے بھرا ہوا تھا۔ دور تک گاڑیوں کی پارکنگ تھی۔ ہر مشہور کھانے کے موبائل کچن آئے ہوئے تھے۔ لوگ نمائش کی سیر کر کے کنارے پر آتے اور آئس کریم، کافی، جوس، سافٹ ڈرنک، برگر، ہاٹ ڈاگ، پیزا فش، فرنچ فرائز، ملک شیک، یوگرٹ غرض اپنی مرضی کی کھانے پینے کی چیزیں ان موبائل کچن سے خریدتے جو تازہ اور لائیو تیار کی ہوئی ہوتیں۔ وہ یہ چیزیں

لے کر پانی کے کنارے پتھروں پر بیٹھ کر ٹھنڈی ہواؤں کے درمیان کھا رہے تھے اور اس پکنک کو یادگار بنا رہے تھے جن میں ہم بھی شامل ہو گئے۔ ایک کچن سے تازہ فرائیڈ مچھلی اور سافٹ ڈرنک لی پھر پتھروں پر بیٹھ کر کھانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہی ڈبلن وہی ٹاسا ہار اور وہی گلین وہی سان وسانتے۔

☆......☆

آج اتوار ہے۔ جہانگیر مجھے Sanol اسٹیشن لے گیا۔ یہ فریمونٹ اور یونین سٹی کے درمیان Niles canyon کا پہاڑی علاقہ ہے جو سول کی پہاڑیوں تک جاتا ہے۔ ان علاقوں کی عجیب کیفیت ہے۔ ایک وادی آباد ہوتی ہے، جہاں سڑکیں بازار ہوتے ہیں۔ مرکزی شہر ہوتا ہے لیکن دوسری وادی میں مڑ جاؤ تو صرف میلوں دور تک سرسبز پہاڑیاں، گنجان ویران جنگل کہ سڑک پر سفر کرتے کرتے آدمی اُکتا جائے۔ ہر موڑ پر چڑھائی، ہر اترائی پر جنگل، سرسبز پہاڑیاں، جنگلی پیڑوں کے جھنڈ کے جھنڈ عجیب تضاد ہے۔

Samol اسٹیشن یہاں کی پٹڑیاں یہاں کی ٹرینیں سب سوا سو ڈیڑھ سو سال پرانی ہیں۔ یہ پٹڑیاں اس زمانے میں سانول کی پہاڑیوں کے بیچوں بیچ وادی میں کھائی کے کنارے کنارے ڈالی گئیں جس کے دونوں جانب میل ہا میل تک جنگل ہے، پہاڑیاں ہیں لیکن آبادی نہیں ہے۔ پہلے بھی یہ ٹرین لوگوں کو جنگل اور پہاڑیوں کے درمیان تفریح مہیا کرتی تھی اور اسی پرانے ٹریک پر پرانے انجن اور بوگیاں آج بھی ٹورسٹوں کی تفریح اور دلچسپی کا باعث ہیں۔ ہم کچے بغیر پلیٹ فارم کے اسٹیشن پہنچے اور سوا سو سال پرانے ٹکٹ گھر سے دو ٹکٹ لیے۔ آدھے گھنٹے میں ٹرین بھر گئی۔ چار پرانے خستہ بند کمپارٹمنٹ تھے اور دو بڑے ڈبے کھلے ہوئے تھے۔ ہم کھلے حصے کے تختوں پر بیٹھ گئے مئی کا آخر تھا پھر بھی درجہ حرارت 14 ڈگری تھا اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ٹرین شوقین سیاحوں سے بھری ہوئی تھی۔ فیملیاں اس جنگل کی سیر کو آئی ہوئی تھیں۔ عمدہ نفیس کپڑوں میں ملبوس خوب صورت حسین لوگ، پرانے خستہ ریل کے ڈبوں میں بیٹھ کر خوش ہو رہے تھے۔ یہ ٹرین خصوصی طور پر رات کے لیے مہینے میں ایک مرتبہ روشن کی جاتی ہے اور جگمگ کرتی یہ ٹرین شوقین سیاحوں کو لے کر خطرناک اندھیرے گنجان جنگل کی سیر کراتی ہے۔ اس مزیدار خوشگوار سرد موسم میں ٹرین چلی اور گھنے جنگلوں، پیڑوں اور سرسبز پہاڑیوں کے درمیان سفر کرنے لگی۔ جب درختوں کی شاخیں کمپارٹمنٹ میں گھس کر لوگوں کے چہروں کو تیزی سے چھو کر گزرتیں تو لوگ شور مچانے لگتے۔ ہم بھی کنارے پر بیٹھے تھے۔ ہمیں بھی پیڑوں کی ٹہنیاں تنگ کرتی رہیں لیکن یہ چھیڑ چھاڑ خوشگوار تھی۔ ٹرین چڑھائی پر اترائی پر گھومتی رہی۔ درمیان میں پہاڑیوں سے نکلتے اور گھومتے چشمے نظر آتے رہے۔ دور کنجوں میں جانور بھی نظر آئے اس جنگل میں کاریں نہیں چلتیں صرف ٹرین ہی میں سفر ممکن ہے۔ راستے میں پہاڑوں کے بیچ پلوں کے ذریعے گاڑی گزرتی تھی اور اناؤنسمنٹ میں بتایا جاتا تھا کہ کس سن میں کون سا پل بنایا گیا۔ اس ترقی یافتہ دور میں پرانی ریل گاڑی مسلسل چل رہی ہے اور چلتی رہے گی۔ اس کے پہاڑی جنگلی کچے پلیٹ فارم، پرانے سگنل، پرانے شنٹنگ یارڈ، ریلوے کے پرانے ریٹائرڈ ملازمین، پرانے لباسوں میں ملبوس خوش اخلاقی سے اس سفر کو قائم رکھے ہوئے ہیں جس میں شامل ہو کر آدمی محسوس کرتا ہے کہ میں آج کے دور میں نہیں پچھلی صدی میں سفر کر رہا ہوں۔ امریکیوں کو قدیم طرز زندگی بہت پسند ہے۔ لہٰذا وہ روایتی تفریحات کو قائم رکھتے ہیں لیکن اس خستہ جھولتے ہوئے سفر سے محظوظ ہم بھی ہوئے۔ گاڑی سانول سے چلی نائلز پر آئی اور نائلز سے واپس سانول تک لے آئی۔ یہ دلچسپ سفر دو گھنٹے کا تھا۔ ہم اترے پارکنگ سے گاڑی لی اور یونین سٹی سے ہوتے ہوئے ڈبلن کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆......☆

پچھلے ہفتے مجھے شکیل ماؤنٹ ڈیبلو لے گئے تھے۔ Pleasant hills کا ٹکڑا Alamo park اور والنٹ کریک کی آبادیوں کے درمیان یہ پہاڑ واقع ہے لہٰذا یہ Mount diablo کا علاقہ بھی کہلاتا ہے۔ پلیزنٹ ہلز میں ماؤنٹ ڈابلو کالج اور اسکول بھی واقع ہیں۔ اوپر پیک تک جانے کے لیے چاروں طرف لہراتی اوپر جاتی سڑکیں ہیں۔ جیسے جیسے اوپر جاتے ہیں ایسے موڑ اور مقام آتے ہیں جہاں گہرے سائے اور ٹھنڈی ہوائیں ہوتی ہیں۔ سیف جگہ پر لوگ گاڑیاں کھڑی کرتے ہیں اور گہرائی میں دور تک وادیوں کے سرسبز نظارے کرتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مزید اوپر جاتے ہیں جہاں پارکنگ کی جگہ ملتی ہے۔ سایہ کی جگہ ملتی ہے کنارے پر دیوار ملتی ہے وہاں رک جاتے ہیں۔ دیوار پر بیٹھ کر کچھ کھاتے پیتے ہیں۔ خوشگوار نظارے کرتے ہیں اور اوپر کی طرف آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ہم بھی مختلف جگہوں پر دم لیتے

ہوئے دل بہلاتے ہوئے mount diablo park تک پہنچ گئے۔ یہاں سیاحوں کا اچھا خاصا رش ہے سطح جگہ پر دور تک گاڑیاں کھڑی ہیں اور اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں چاروں طرف بنی ہوئی ہیں۔ چوٹی پر ایک کمرا بنا ہوا ہے جو بند ہے اور کمرے کے باہر چاروں جانب نیچے اترتی گیلریاں بنی ہوئی ہیں۔ تیز ہوائیں ہیں۔ موسم ہلکا ابر آلود ہے اور فیملیاں چہار طرف گیلریوں میں کھڑی ہر سمت کا نظارہ کرنے میں مصروف ہیں۔ گرم موسم میں پیک تک پہنچنے کا بڑا مزہ ہے۔ لوگ اور خاص طور سے خواتین سیڑھیوں پر بیٹھ کر لاجواب قدرتی سینریوں کے درمیان تصویریں کھنچواتی ہیں ہم نے بھی یہاں چند تصویریں لیں۔

چونکہ نیچے موسم گرم تھا لہٰذا اس مزید سرد ہواؤں کے ماحول سے جانے کو طبیعت نہیں چاہ رہی تھی۔ ہم نے کچھ وقت گزارا اور واپسی کی راہ لی۔

☆......☆

وٹمن پیلس ہیورڈ میں فیصل کی دکان ہے۔ اس کمرشل پیلس میں شروع سے ہی ایک بہت بڑا شوروم تھا جہاں کپڑوں اور ان سے متعلق بہت سی چیزیں فروخت ہوتی تھیں لہٰذا یہاں خواتین کی صبح سے شام تک آمدورفت چہل پہل رہتی تھی جس کی وجہ سے فیصل کے سلائی مشین کے شو روم تک اور ٹی وی کے شوروم تک رونق رہتی تھی۔ گزشتہ سال جوائن فیبر کس جیسا کامیاب بارونق اسٹور بھی امریکن اکنامک کرائسز کا شکار ہوا اور بند ہو گیا اور پورے ڈیڑھ سال اس جگہ دوسرا اسٹور وجود میں نہیں آسکا۔ اس کا اثر پورے وٹمن پیلس جو خاص پرانا کمرشل سینٹر ہے پر پڑا۔ علاقہ خاموش اور دکاندار مایوس رہنے لگے۔ فیصل بھی افسردہ رہتا تھا۔ کیونکہ جوائن فیبر کس کے جانے کے بعد درجن بھر شوروم اور چھوٹے ریستوران سنسان اور ویران ہو گئے تھے۔ فون پر مجھ سے فیصل کی بات ہوتی تھی تو میں تسلی دیتا تھا۔ اپنے اندازے اور تجربے کے مطابق اسے سمجھاتا تھا کہ یہ جنرل کرائسس ہے جس سے دوسرے علاقوں کے بیوپاری بھی یقیناً متاثر ہوئے ہوں گے۔ لہٰذا تحمل سے برداشت سے اور کفایت سے وقت کو آگے بڑھاؤ۔ انشاء اللہ جلد بہتری آئے گی تمہارا بزنس ایریا شاندار ہے۔ پرانا ہے۔ تم نے بھی عرصہ بیس سال محنت کی ہے اور اس عرصے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ بہرحال میں اس کی دل جوئی ہی کر سکتا تھا۔ وہ مجھ سے گفتگو کر کے تھوڑا ریلیکس ہو جاتا تھا۔

احتیاطاً میں نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ کوئی دوسری جگہ اگر ملے اور تم تبدیل کر سکو تو ذہن میں رکھنا۔

تقریباً ڈیڑھ سال کی کٹھن صبر آزما انتظار کے بعد ایک نیا بڑا شوروم اس جگہ قائم ہوا اور بہت بڑا اسٹور وجود میں آ گیا۔ گئی ہوئی گہما گہمی تیزی سے پلٹ آئی۔ فیصل کے لیے ہمارے لیے یہ شکر کا مقام تھا۔ فیصل کی کاروباری مصروفیت پلٹنے لگی۔ خوش اور مطمئن رہنے لگا۔ کچھ دن خاموشی رہی۔ بات نہ ہو سکی۔ میں بھی مصروف رہا اور فون نہ کر سکا۔ مہینا بھر خاموشی کے بعد فون آیا۔ میں نے کہا خیر تو ہے۔ کہنے لگا سب ٹھیک ہے۔ میں مصروف تھا پھر بتاؤں گا چند روز بعد آیا بہت خوش تھا کہنے لگا ابو میں نے لیک میرٹ کے قریب اوک لینڈ گرینڈ لیک ڈاؤن ٹاؤن کمرشل ایریا میں Grand sewvec کے نام سے دکان خرید لی ہے۔ اس بلڈنگ کے کونے پر گرینڈ لیک تھیٹر ہے۔ آس پاس بڑے پرانے کامیاب اسٹور، ہوٹل، گراسری شاپ وغیرہ ہیں۔ دکان مین روڈ پر ہے اور چند قدم کے فاصلے پر لیک شور اور لیک میرٹ اور ان کے گارڈنز ہیں جو اچھی تفریح گاہیں ہیں۔ میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ وہ جب چاہتا ہے جس کو چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔

چند ماہ پہلے فیصل تنہائی اور خاموشی محسوس کر رہا تھا اور اب اسے فرصت نہیں ہے۔ جب سے نئی دکان اور اس کی مصروفیت کا مجھے علم ہوا میری طبیعت چاہتی تھی کہ دکان پر جاؤں اور دیکھوں۔ فیصل کا کہنا تھا کہ آپ جلد آنے کی کوشش کریں۔ آپ دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ میں اس سے پیشتر تین مرتبہ امریکا جا چکا ہوں لیکن اتفاق ایسا ہے کہ ہر مرتبہ سردیوں میں گیا۔ لہٰذا اس مرتبہ میں نے گرمیوں میں جانے کا پروگرام بنایا۔ ویزا چونکہ نومبر میں ختم ہو رہا تھا لہٰذا امریکن ایمبیسی میں جواب کراچی سے بھی ویزے دیا کرتی ہے۔ درخواست دی اور ایک ہفتہ بعد مائی کلاچی ایمبیسی میں انٹرویو ہوا اور ویزا باآسانی مل گیا لیکن شناختی کارڈ ایکسپائر ہو چکا تھا لہٰذا وہ بنوایا۔ اب پاسپورٹ کے رینول کی باری آ گئی یہ مرحلہ بھی شکر ہے خدا کا طے ہوا۔ یونیورسل ایکسپریس سے وسیم نے ٹکٹ کا بندوبست کرا دیا لہٰذا باہم مشورے سے ہم 25 اپریل کو ایمریٹس کی شاندار فلائٹ میں سوار ہو گئے، حسب سابق فلائٹ عملہ خوش لباس خوش اخلاق تھے۔ ہم دو گھنٹے بعد دبئی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اتر گئے اب یہ ایئرپورٹ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ ساری دنیا

کی فلائٹ یہاں اترتی ہیں لہٰذا اب یہ دنیا کے مصروف ترین ایئرپورٹس میں شمار ہوتا ہے۔ ابھی انتظامی طور پر یہاں سہولتوں میں وہ مستعدی نہیں پائی جاتی جو دنیا کے دوسرے بڑے مصروف ایئرپورٹس پر ہوتی ہے۔ نجمہ کے گھٹنوں میں تکلیف کی وجہ سے وہیل چیئر لینی پڑتی ہے۔ دبئی ایئرپورٹ والوں نے وہیل چیئر کے مسافروں کو سب سے آخر میں آپریٹ کیا۔ یہ مسافر بھی بس میں بھی ٹرین میں بھی بیلٹ پر گھومتے رہے ٹرانسٹ ٹائم دو گھنٹے گزر گئے۔ جب گیٹ پر پہنچے جہاز اڑ چکا تھا۔ بہت بدنظمی تھی کافی دیر بعد ہمیں ہوٹل اسٹے ملا اور ہوٹل پہنچتے پہنچتے سخت تھکن میں دن کے تین بج گئے۔ ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔ ہوٹل سے تقریباً پانچ بجے ایک شٹل کوسٹر ہمیں دبئی سیر کرانے لے گئی۔ واقعی ایک ایسا خوب صورت شاپنگ ایریا ہے جسے تفریح گاہ کی حیثیت حاصل ہے۔ مختصر مدت کے لیے دبئی آنے والوں کی سیر کے لیے یہ خوب صورت صاف ستھری جگہ ہے یہاں شاپنگ مال ہیں۔ ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہیں۔ بہترین ریستوران ہیں۔ سڑک کے کنارے کنارے چوڑے فٹ پاتھ جن پر سیاحوں کی دلچسپی کے لیے عرب ثقافت اجاگر کی گئی ہے۔ مصر کی ممیاں، فراعین کے مجسمے، جمبو سائز میں چٹانی پتھروں پر تراش کر اصل کی مانند سجائے گئے ہیں۔ لوگ یہاں گھومتے ہیں، شاپنگ کرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، مجسموں کے ساتھ تصویریں کھنچواتے ہیں اور خوشی خوشی لوٹ جاتے ہیں۔

تقریباً سات بجے شٹل ہمیں واپس ہوٹل لے گئی۔ ہوٹل اور ایئرپورٹ کے درمیان جو علاقہ ہم دیکھ پائے اس کی بناوٹ اس کی سج دھج کا معیار کسی طرح یورپ اور امریکا کے شہروں سے کم نہیں تھا اور عرب کلچر کا دامن تھامے ہوئے تھا۔

دوسرے دن صبح 6 بجے ہمیں ایئرلائن کی کوسٹر ایئرپورٹ لے گئی اور ہم سان فرانسسکو کے لیے سوار ہو گئے۔ حسب معمول فلائٹ شاندار تھی لیکن پندرہ گھنٹے کی صبر آزما فلائٹ تھی۔ لوگ بڑے فریش بہت خوش اس فلائٹ میں سوار ہوتے ہیں۔ ہر چہرے پر چمک ہوتی ہے۔ کپڑے زرق برق ہوتے ہیں کیونکہ اگلا اسٹیشن سان فرانسسکو ہے۔ چند گھنٹے کھاتے پیتے فیملیوں کی خوش گپیوں میں گزرتے ہیں بہت سے لوگ دو تین گھنٹے کی نیند پوری کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ٹائیاں ڈھیلی ہونے لگتی ہیں۔ کوٹ پتلون کرتے پاجامے میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ لوگ جوتے اتار دیتے ہیں۔ خواتین کے میک اپ مرجھانے لگتے ہیں چھوٹے بچے رونے لگتے ہیں۔ سیٹ پر مہیا ٹی وی پر لوگ فلمیں دیکھ دیکھ کے اکتانے لگتے ہیں۔ باتھ روم میں لائنیں لگنے لگتی ہیں۔ مقصد وقت گزاری ہوتا ہے۔ میں بھی سیٹ سے اٹھا اور آخر میں دم تک گیا۔ کچھ لوگ ہاتھ پیر ہلا رہے تھے۔ لائٹ ورزش کر رہے تھے۔ میں نے بھی ہاتھ پیر ہلائے تھوڑی دیر بعد باتھ روم کی لائن میں لگ گیا فریش ہو کر آیا تو پتا چلا کہ ایک گھنٹا گزر چکا ہے لیکن آٹھ گھنٹے کا سفر باقی ہے۔ میں نے نجمہ سے کہا تم بھی چہل قدمی کر لو باتھ روم سے فریش ہو کر آجاؤ لیکن وہ تو ایسے بیٹھی تھیں جیسے سیٹ میں جم گئی ہو۔ مجھے اپنے کراچی لاہور کے ریل کے سفر یاد آنے لگے۔ ہر اسٹیشن پر گہما گہمی، مسافروں سے زیادہ ان کے لواحقین کی آمدورفت، سکھر اسٹیشن کی بھاپ اڑاتی دودھ پتی کی چائے، خانپور کی ربڑی، ملتان کے آم اور حلوا سوہن، لاہور پر موجود دوست رشتے دار...... کیا بات ہے اپنے پاکستان کی۔ یہ کلچر یہ مزے دنیا بھر کے اسٹیشنوں یا ایئرپورٹس پر نہیں ملیں گے۔

پھر وہی ہوا اللہ کی مہربانی سے سفر تمام ہوا۔ سان فرانسسکو کے سادہ شان دار ایئرپورٹ پر ہم اتر گئے۔ فیصل راحت عشق سعدیہ بچی شکی ثمرہ اور جہانگیر موجود تھے۔ ہر چیز جوں کی توں تھی۔ یہاں سے گرمی لے کر گئے تھے وہاں سردی تھی ہواؤں میں لپک تھی فضاؤں میں مہک تھی ماحول صاف تھا شفاف تھا اور ہم پانچ سال بعد ایک مرتبہ پھر ڈبلن پہنچ گئے جو اس درمیان خاصا آباد اور بہتر ہو گیا تھا۔ دوسرے دن فیصل صبح اپنے وقت پر اسٹور چلا گیا۔

کسی بھی نئی جگہ پر بغیر گاڑی اور موبائل کے جانا مشکل ہے اور بہت تھکا دینے والا عمل ہے کیونکہ یہاں بڑے سے بڑے بلاک اور کافی چوڑی سڑکیں اور لمبی گلیاں ہوتی ہیں۔ لہٰذا آدمی ذرا چوک جائے تو تھکے بغیر منزل پر نہیں پہنچ سکتا لیکن چونکہ مجھے بارٹ اور بس کا تجربہ تھا لہٰذا میں نے راحت سے کہا کہ تم مجھے ڈبلن بارٹ پر چھوڑ دو میں نئی دکان جو اوک لینڈ میں گرینڈ ایونیو پر ہے خود ہی پہنچ جاؤں گا۔ یہ علاقہ ڈبلن سے تیس میل کے فاصلے پر ہے۔ راحت مجھے بارٹ اسٹیشن چھوڑ گئی۔ پانچ سال بعد بہت سی چیزیں میں بھول چکا تھا لیکن پہلے میں نے مشین سے لیک میرٹ کا ٹکٹ نکالا اور اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا کہ مجھے گرینڈ لیک تھیٹر اوک لینڈ جانا ہے۔ اس نے بڑے اخلاق سے سمجھایا کہ آپ ایسکلیٹر سے اوپر جائیں اور سان فرانسسکو جانے والی ٹرین میں بیٹھیں اور بے فیئر یا فروٹ ویل پر اتر جائیں اور

فوری رچمنڈ جانے والی دوسری ٹرین میں بیٹھ جائیں اور
انیسویں اسٹریٹ اوک لینڈ کے اسٹیشن پر اتر جائیں جو انڈر
گراؤنڈ ہے۔ سیڑھیوں یا برقی زینے سے اوپر آئیں۔ اوپر
بس نمبر 12 میں بیٹھ کر مطلوبہ جگہ پہنچ جائیں۔ میں نے ایسا
ہی کیا میں انیسویں اسٹریٹ اوک لینڈ بارٹ انڈر گراؤنڈ
اسٹیشن سے اوپر آیا تو یہ اوک لینڈ کا مشہور Broad
way تھا۔ یہ اوک لینڈ ڈاؤن ٹاؤن سے شروع ہو
کر انیسویں اور بارہویں اسٹریٹ سے ہوتا ہوا دور تک چلا
گیا ہے۔ آنے جانے کی چوڑی سڑکیں ہیں جن کے
کنارے بڑی بڑی شاندار عمارتیں ہیں۔ چونکہ سان
فرانسسکو سے آتے ہوئے جیسے ہی Bang bridge
سے East bay Area میں داخل ہوتے ہیں پہلا
اور پرانا شہر اوک لینڈ ہی آتا ہے۔ پانی کے بالکل قریب
ہونے کی وجہ سے موسم ٹھنڈا اور خوشگوار رہتا ہے اور تعمیرات
بارہویں اسٹریٹ پر بالکل ایمبارکوڈیرو جیسی ہیں۔

Broad way پر میں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔ میں
بس اسٹاپ پر کھڑا ہوں میرے سامنے پیراماؤنٹ
theatre ہے۔ میرے بائیں طرف اوک لینڈ ٹریبون کی
عالیشان بلڈنگ ہے۔ میرے پیچھے متوازی سڑک مشہور
ٹیلیگراف ایریا ہے۔ 12 نمبر بس آتی ہیں اس میں بیٹھ گیا
ایک ڈالر ٹکٹ باکس میں ڈالا دو تین بلاک کے بعد بس
سیدھے ہاتھ گرینڈ ایونیو پر مڑ گئی۔ یہ بھی اوک لینڈ کی مشہور
سڑک ہے۔ ہم تھوڑی دور چلے تو بس پانی کے کنارے چلنے
لگی یہ Lake merit تھی جو خوب صورتی میں جواب
نہیں رکھتی۔ جھیل کے کنارے گھاس کے تختے ہیں۔ واکنگ
ٹریک ہے بینچیں بچھی ہیں۔ لوگ جھیل میں کشتی رانی کررہے
ہیں، ٹہل رہے ہیں بینچوں پر بیٹھے کھا پی رہے ہیں اور واک
کررہے ہیں۔ میں بس میں بیٹھا یہ خوب صورت نظارہ دیکھتا
ہوا آگے جارہا ہوں۔ تقریباً ایک میل بعد جھیل ختم ہوئی تو
Children farry land آگیا۔ یہ جھیل اور
سڑک کے کنارے بچوں کے لیے پارک بنایا گیا ہے جس
میں جھولے ہیں اور پلے گراؤنڈ ہیں، بچے کھیل رہے ہیں۔
بس آگے بڑھی پھر کمرشل ایریا آگیا۔ آگے بڑھے تو لیک
شور آگئی۔ یہ علاقہ اپنی خوب صورتی میں جواب نہیں رکھتا۔
جھیل کے کنارے گھاس، فٹ پاتھ پھر سڑک اور سڑک کے
کنارے رہائشی بلڈنگیں، موسم یہاں سرد اور خوشگوار رہتا
ہے۔ لوگ اپنی بالکونیوں میں بیٹھ کر جھیل کی خوب صورتی اور
کشتی رانی۔ ٹریک پر واکنگ اور جاگنگ کے شائقین کو
دیکھتے اور محظوظ ہوتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جھیلوں
کے کنارے فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ سڑک بھی اپنے بھرپور
ٹریفک کے ساتھ رواں دواں رہتی ہے اور کسی قسم کی پریشانی
نہیں ہوتی۔ بس لیک شور سے آگے بڑھی پھر پارک آگیا
لوگ بینچوں پر بیٹھے ہیں، کھا پی رہے ہیں، ٹہل رہے ہیں اور
قدرت کی بیش بہا مہربانیوں سے لطف اندوز ہورہے ہیں۔
میں بس میں ہوں لیکن محسوس کررہا ہوں جیسے جھیل کی تفریحی
ٹرین میں سفر کررہا ہوں۔ بس 680 فری وے کے پل کے
نیچے سے گزری تو مجھے Grand lake تھیٹر نظر آگیا۔
یہیں بس اسٹاپ بھی ہے۔ میں اتر گیا اور تھیٹر کے ساتھ
ساتھ فٹ پاتھ پر چلتا ہوا ساتویں اسٹور پر پہنچا تو سنگر کا
الیکٹرک بورڈ نظر آیا۔ Grand vac and
sewing نظر آیا۔ یہ پرانے زمانے کی بلڈنگ ہیں جو
گرینڈ ایونیو کی بڑی سڑک پر واقع ہیں۔ یہ روایتی انداز کی
انگریزوں کے ابتدائی دور کے طرز تعمیر کی نشانیاں ہیں۔ میں
اسٹور میں داخل ہوا۔ فیصل مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور
تعجب بھی کیا کہ گھر سے 30 میل دور پہلی مرتبہ بغیر کسی مدد
کے آپ آگئے۔ اپنے سیلز اور سروس کے اسٹاف سے ملوایا کہ
یہ میرے ڈیڈ ہیں۔ سب مل کر بہت خوش ہوئے۔

یہ ایک انگلش قدیم اور معروف اسٹور ہے۔ فیصل
نے کافی دنوں کی تگ و دو سے اسے حاصل کیا ہے۔ ایسی
جگہیں آسانی سے نہیں ملتیں۔ دکان مین گرینڈ ایونیو پر
ہے۔ آس پاس بڑے بڑے ریسٹوران، بینک، نوادرات
کے اسٹور ہیں۔ برابر میں سامان زیبائش کا کمپلیکس کا بڑا
اسٹور ہے۔ پارلر ہے جہاں وگ لگا کر، ماسک پہنا کر آنے
والوں کے حلیے بدل دیے جاتے ہیں۔ ایسا میک اپ کیا
جاتا ہے کہ شخصیت کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ دوسری
جانب مشہور ڈرائی کلینرز اسٹور ہے۔ یہ دو جھیلوں کے قریب
گہما گہمی کی وادی ہے جس کے دونوں طرف پہاڑیاں اور
ان پر بنی ہوئی خوب صورت بستیاں ہیں۔ دکان کے پیچھے
پہاڑی پر انتہائی شاندار Peed mont کی بستی ہے
جس میں بیشتر یہودی رہتے ہیں۔ انیسویں اسٹریٹ براڈ
وے سے میں 12 نمبر کی بس سے گرینڈ لیک تھیٹر تقریباً روز
ہی جاتا تھا۔ ایک دن میں تھیٹر پر نہیں اترا اس بس کا آخری
اسٹاپ ڈاؤن ٹاؤن برکلے تھا۔ لہٰذا میں تقریباً 30 منٹ
مزید سفر کرتا ہوا برکلے پہنچ گیا۔ یہاں کا قابل فخر ادارہ دنیا کی

اور امریکا کی مشہور برکلے یونیورسٹی ہے اور برکلی بلز قابلِ دید تفریح گاہ ہے۔ جس کا ذکر میں اپنی کتاب میں کر چکا ہوں۔ یہ اوک لینڈ کے شمال مغرب میں سمندر کے کنارے واقع ہے۔ شکیل کے ہمراہ پہلے بھی آچکا ہوں۔ نہایت خوب صورت بارونق تفریحی چوک ہے۔ چاروں طرف بڑے بڑے اسٹور ہیں اور سیاحوں کی آمدورفت ہے تھوڑی دیر گزار کے 12 نمبر میں داخل ہوا اور واپس تھیمز پر اتر گیا۔ راستہ ویسی ڈینشل تھا کچھ پلین تھا کچھ پہاڑی تھا کچھ پرانا تھا کچھ جدید تھا لیکن انتہائی صاف ستھرا، ہرا بھرا اور پُرسکون کہ بس میں سے دیکھتے رہو اور دل لگا رہے۔

ایک مرتبہ میں اوک لینڈ میں بارھویں اسٹریٹ کے اسٹیشن پر اتر گیا۔ یہاں سے 27 نمبر بس پکڑی جو دوسری سڑکوں سے ہوتی ہوئی لیک میرٹ اور شورلیک کے دوسرے کناروں کی سیر کراتی ہوئی گرینڈ لیک تھیمز کے قریب رکی۔ میں اترا اور تھوڑی دور پیدل چلتا ہوا دکان آ گیا۔ دکان کی وجہ سے علاقے کے موسم اور خوب صورتی کی وجہ سے قریب کے علاقوں کو دیکھنے کا شوق ہوا لہٰذا اگلی مرتبہ میں بارھویں اسٹریٹ سے اے سی ٹرانزٹ کے ذریعے دکان سے آگے مشہور ایمری وائل سٹی چلا گیا۔ یہ ایسٹ بے سٹی کا مغربی علاقہ ہے۔ یہ ویسٹ اوک لینڈ اور برکلے کے درمیان پانی کے قریب، بہت ہرا بھرا اور خوب صورت علاقہ ہے۔ اوک لینڈ سے ایمری وائل تک تو سادہ سی پرانی بستیاں ہیں لیکن ایمری وائل ایک نفیس جدید ٹھنڈی بستی ہے آخری اسٹاپ پر بڑی سی بلڈنگوں کے درمیان بس نے اتار دیا۔ یہاں پر پندرہ منٹ بعد شٹل ملتی ہے۔ میں کافی ہاؤس کے ریسٹ روم سے فریش ہو کر آیا۔ کافی لی تو شٹل تیار تھی میں اس میں بیٹھ گیا جس میں میرے جیسے سیلانی بیٹھے تھے۔ کوسٹر انتہائی آرام دہ شاندار ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ ہمیں ایمری وائل کے سارے ڈاؤن ٹاؤن گلیوں، سڑکوں اور اہم بلڈنگوں کی سیر کرائی۔ اتنی صاف سڑکیں، اتنی شفاف گلیاں اتنی چمکدار بلڈنگیں اور اتنے خوب صورت زرق برق سیاح بس آگے بڑھی تو سمندر کا کنارہ آگیا اور بس پانی کے ساتھ ساتھ کئی میل تک گئی پھر کوسٹل گارڈن آ گیا۔ خوشگوار خنک موسم، سمندر کا کنارہ، کنارے پر باغ یہ وہ مناظر ہیں جو زندہ ہیں اور خوابوں کو شرماتے ہیں بس ایک ایک قابلِ دید جگہ پر رکتی رہی لوگ اترتے بھی رہے چڑھتے بھی رہے۔ آہستہ آہستہ وہاں سے نکلی تو دوسرے راستے پر سفر کرنے لگی یہ راستہ

جن

ایک سردار صاحب نے ایک گاڑی کو روکنے کے لیے اشارہ کیا۔ گاڑی رک گئی۔ وہ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد دیکھتے ہیں کہ گاڑی میں ڈرائیور موجود نہیں اور گاڑی خود بخود چل رہی ہے۔ سردار بہت پریشان ہوئے اور ڈر گئے کہ گاڑی کو جن چلا رہا ہے۔

نزدیکی پیٹرول پمپ پر گاڑی رکی اور تھوڑی دیر بعد ایک پسینے سے شرابور شخص گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے لگا تو سردار بولا۔ ”یہاں نہ بیٹھو یہاں جن بیٹھا گاڑی چلا رہا ہے۔“

وہ صاحب غصے سے بولے۔ ”اوئے اخروٹ کے بچے میں 2 کلومیٹر سے دھکا لگا رہا ہوں اور تم کہہ رہے ہو کہ گاڑی جن چلا رہا ہے۔“

لاعلاج

ڈاکٹر مریض کو چیک کرنے کے بعد اس کی بیوی سے۔

”آپ کے شوہر ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ ان کا خیال رکھیں۔ پریشان نہ کریں، لڑائی نہ کریں اور ان کی خدمت کریں۔“

شوہر: ”ڈاکٹر نے کیا کہا؟“

بیوی: ”تم لاعلاج ہو......“

پریشانی

ٹریفک وارڈن نے ایک موٹر سائیکل پر سوار مطالب علموں کو دیکھ کر غصے سے کہا۔ ”اوئے ڈبل سواری پر پابندی ہے اور تم چار، چار سوار ہو۔“

ڈرائیونگ کرنے والا لڑکا پریشانی سے پیچھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اوئے پانچواں کہاں گر گیا......؟“

مرسلہ: کالے خان، پشاور

میرے لیے نیا تھا۔ میک آرتھر پارٹ بھی اوک لینڈ کا اسٹیشن ہے لہٰذا اس علاقے کو دیکھتا ہوا میں میک آرتھر پارٹ اسٹیشن اتر گیا۔ میرے پاس کلپر کارڈ تھا اسے اسکین کرایا پلیٹ فارم پر پہنچا۔ ٹرین میں بیٹھا اگلا اسٹیشن انیسویں اسٹریٹ تھا۔ حسب معمول اترا۔ براڈ وے سے 12 نمبر ٹرانزٹ پکڑی گرینڈ لیک تھیٹر اترا اور پیدل جھومتا ہوا دکان پہنچ گیا۔ فیصل نے پوچھا اتنی دیر کہاں رہے میں نے سفر کی روداد سنائی بہت خوش ہوا کہنے لگا ہمیں بھی تفریح کرادیا کرو۔

☆......☆

آج ہفتہ ہے مئی کا آخر ہے۔ قدرے گرم دن ہے لہٰذا شکی جہانگیر اور میں تفریح کے لیے جارہے ہیں۔ دو ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد جہانگیر ہمیں ساحلی علاقے کی طرف لے گیا۔ یہاں سمندر کے کنارے ہیں۔ ہوائیں ٹھنڈی اور خوشگوار ہیں لیکن سورج میں چمک ہے۔ بس یہی چمک یہاں کے لوگوں کو دیوانہ کردیتی ہے اور لوگ بڑی تعداد میں سن باتھ لینے سمندر کے کنارے بیچوں کو آباد کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

ہم جیسے ہی پیڑوں، درختوں کے جھنڈ سے نکل کر ساحل پر پہنچے ہزاروں کی تعداد میں مرد وخواتین نہار رہے تھے۔ خوش ہورہے تھے۔ کپڑے اتار کر اپنے جسموں کے لیے سورج سے توانائی حاصل کررہے تھے۔ سورج کی روشنی میں ان کے جسم اور ساحل کی ریت چمک رہی تھی۔ بیچ بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ سونے چاندی کے بدن ریت میں لوٹ رہے تھے۔ زبردست رونق تھی۔ گہما گہمی تھی حسن کی ارزانی تھی۔ بے تحاشا عریانی تھی۔ نظارے دل فریب تھے۔ دل سوز تھے اور بے نیاز دیکھنے والے شرما رہے تھے اور دیکھ کر اکتا رہے تھے۔ یہاں باپ بھی تھے، بیٹیاں بھی تھیں مائیں بھی تھیں بیٹے بھی تھے۔

Stenens beach واحد بیچ نہیں ہے۔ امریکا ایسی بے شمار بیچز سے بھرا پڑا ہے اور گرمی کے موسم میں ایسے ساحل سن باتھ کے شوقین دیوانوں سے بھرے رہتے ہیں اگر اسے انسانیت کی تذلیل اور نسوانیت کی توہین کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ایسی جگہ آکر اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ قوم اپنے آپ سے کس قدر بیگانہ ہے کس قدر بے حس ہے۔ گمراہی اس جگہ پہنچ گئی ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ جہاں دنیا بھر کی تعلیمات بے معنی ہوجاتی ہیں جہاں دنیا کی ہر چمک اپنا نور کھودیتی ہے یہ لوگ دنیا کی بہترین

یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہیں، مدبر ہیں، محقق ہیں، دانشور ہیں، تھنکرز ہیں، مفکر ہیں لیکن ہوا میں اڑنے والے یہ لوگ پیدل چلنا بھی بھول گئے ہیں۔ ایسے ماحول میں یہ ہی ممکن تھا کہ یا تو ہم بھی دنیا ومافیہا سے بے خبر ان میں شامل ہوجاتے کیونکہ وہ تو ہمیں اپنے شب وروز میں شامل کرنے کو تیار ہیں لیکن ہمارا دین اس غلاظت کی نشاندہی کرتا ہے اور بچنے کی ترغیب دیتا ہے اور ہمارا معاشرہ بہت سی برائیوں کے باوجود اس گندگی اور بے غیرتی سے محفوظ ہے۔ لہٰذا ہم نے اپنی جان اپنا ایمان بچانے کے لیے وہاں سے راہ فرار اختیار کرنا ہی مناسب سمجھا۔ بیچ کے باہر آئے اور اپنے گھر کی راہ لی۔

یہاں میں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ وہاں کی حکومت نے جو قانون رائج کردیئے ہیں چونکہ ان کے فائدے میں تھے لہٰذا وہاں کے لوگوں نے قبول کرلیے ہیں۔ اس کے بعد قوانین کو رائج کرنے میں پابندی کرانے میں حکومت نے ایسا نظام وضع کیا کہ لوگ اس میں جکڑ کررہ گئے اور کسی کو قانون سے روگردانی کی جرأت نہیں ہے لیکن جن معاملات پر گورنمنٹ اور قانون کی گرفت ڈھیلی ہے اور لوگوں کو من مانی کرنے کی اجازت ہے اس کا نقشہ ساحلوں پر بے حیائی کی صورت میں ہر کوئی دیکھ سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ سرعام سڑکوں بازاروں میں یہ فعل پسندیدہ ہیں۔ سنجیدہ کاروباری حلقوں، تعلیمی اداروں، اسپتالوں، عدالتوں میں یہ حرکتیں معیوب سمجھی جاتی ہیں لیکن جہاں ذرا سی چھوٹ ملتی ہے یہ لوگ نہ مذہب کو خاطر میں لاتے ہیں نہ اخلاق کو نہ کسی کی تنقید کو کیونکہ اس رنگ میں وہ بھی رنگے ہوئے ہیں جن کے سر پر تہذیب کے حوالے سے قوم کی تربیت ہے۔

ہمارے یہاں بدنصیبی ہے کہ نہ قوانین ہیں نہ قوانین پر عملدرآمد پر حکومت سنجیدہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گرفت کمزور ہے لہٰذا بدعنوانی، رشوت اور بہت سی برائیاں معاشرے میں تیزی سے پھیل رہی ہیں لیکن مذہب اخلاقیات اور روایات کو ہمارے معاشرے نے ہزار برائیوں کے باوجود سنبھال رکھا ہے۔ کسی کو جرأت نہیں ہے کہ کلفٹن، سینڈز پٹ یا پیراڈائز پوائنٹ پر کھلے عام دن دہاڑے سن باتھ کا سہارا لے کر بے لباس ہوجائے اگر کوئی غیر ملکی غیر مسلم ایسا مظاہرہ کرنے کی کوشش پبلک پلیس پر کرتا ہو تو اسے قانون کے محافظ نہیں عام شہری عام سیاح نرمی سے نہیں تو سختی سے روک دیں گے۔

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ جنہوں نے اس خوب صورتی کو رزقِ بصارت نہیں بنایا ان کے لیے یہ تحریر ایک تحفے سے کم نہیں، اپنے وطن کے کوہ و دمن سے آپ پیار کرتے ہیں تو انہیں لفظی تحریر کے آئینے میں دیکھیں، لطف اٹھائیں۔

وطن سے محبت کرنے والوں کے لیے مناظر وطن کا تحفہ، تیسرا حصہ

تیز رفتاری سے بہتے پانی اور کائی جمے پتھروں کو پھلانگتے ہوئے گزرنا آسان نہ تھا۔ گویا ہم پل صراط سے گزر رہے تھے۔ یہ خوف بھی تھا کہ ہم ڈھلوان پر ہیں اگر پیر پھسلا تو سنبھلنا مشکل ہے۔ تیز بہاؤ نیچے بہا کر لے جاسکتا ہے۔ لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ میرے آگے بقا تھا۔ وہ جسے ویڈیو کیمرے کے لینس کور کا غم کھائے جارہا تھا۔ شاید اس وقت بھی وہ تصور میں لینس کور کو دیکھ رہا تھا یا کوئی اور بات تھی۔ اس کا پیر پھسلا، چھپاک کی

آواز ابھری اور سب گھبرا اٹھے تیز بہاؤ کا ڈر سب کو دہلا رہا تھا کہ کہیں پانی کا ریلا نیچے نہ دھکیل دے۔ اس خیال سے آگے والے پیچھے مڑے اور پیچھے والے آگے بڑھے مگر وہ جس طرح گرا تھا اتنی ہی تیزی سے کھڑا ہو گیا۔ کپڑے پانی میں تربتر تھے مگر اس کی زبان پر گروان تھی۔ "دو نہیں نہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔"

ہم کاغذ پر پھر سے چل پڑے کیونکہ ہمیں چلنا تھا اور ہم چلتے جا رہے تھے کہ چلنا ہی زندگی ہے۔ اسی کام کے لیے تو ہم یہاں آئے تھے۔

دنیا میں کچھ کام زندہ رہنے کے لیے ہوتے ہیں اور کچھ زندگی سنوارنے کے لیے، چلنا بھی زندگی کے لیے ضروری تھا کاغذ پر چلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ بہت سے لوگ کئی طرح کے مشاغل رکھتے ہیں اور ان مشاغل کو اپنے زندہ رہنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ اداکاری، گلوکاری، پینٹنگ، فوٹوگرافی ایسے بہت سے شوق ہیں جو باعزت ذریعہ معاش بھی ہوتے ہیں مگر مجھے اپنا یہ شوق ذریعہ معاش نہیں لگتا ہے، اسے آوارہ گردی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی پہاڑوں، صحراؤں، برفانی خطوں کو سر کرنے کا شوق اور یہی حال ٹریکنگ کا بھی ہے۔ پیسے اور وقت تو خرچ ہوتے ہی ہیں اور جان بھی خطروں میں جھولتی رہتی ہے۔ اب کولمبس نئی دنیا کی تلاش میں نکلا تھا۔ وہ بھی تو ہندوستان کا نام سن کر سونے کی تلاش میں نکلا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ہند سونے کی چڑیا ہے۔ ایک بار جو پہنچ جائے تو اس کی چودہ پشتیں عیش کرتی ہیں مگر مجھے نہ تو سونے یعنی گولڈ کی تلاش تھی اور نہ آرام دہ بستر پر سونا مل رہا تھا۔ سونا کیا پورا کھانا بھی نہ ملتا تھا۔ یہ ہوتا ہے جنون۔ نہ سمجھنے والے کو کچھ نہیں آتی کہ یہ سب کچھ کیوں کرتے ہیں اور نہ اس کی باقاعدہ کوئی دلیل ہوتی ہے۔ کیا کوئی شخص کسی مالی یا اور کسی قسم کے دنیاوی فائدہ کے بغیر اپنی جان کو داؤ پر لگا دے۔ آج میں چل رہا تھا اور یہی سوچ رہا تھا کہ آوارہ گردی کا جنون بغیر کسی لالچ کے کیا جاتا ہے۔ اتنے میں بقا کو پھر پتھر سے ٹھوکر لگی اور گرتے گرتے بچا۔

ایک پل کراس کیا اور دریا کی بائیں جانب آ گئے۔ یہ پل اب ہمارے لیے خطرناک نہ تھا مگر عام شہری ماحول میں رہ رہے لوگ اس کے درشن کرنے آتے ہیں کہ صدیوں پہلے پل ایسے ہوا کرتے تھے۔

کچھ دور اور چلے اور دائیں جانب ملنگٹی (Malanguti) گلیشیر کا سرمادہ وجود پڑا تھا اور اس کے سامنے ایک کمرا تھا جہاں کچھ شمشالی جمع تھے۔ آس پاس جھاڑیوں میں سرخ گلاب کی بہار تھی۔ گرم چشمہ تھا اور ارد گرد دور دور تک جنگلی پودینہ اور اس کی مہک تھی۔

میں اور قربان قریب قریب تھے۔ آگے پیچھے چل رہے تھے اسی لیے ایک ساتھ ملنگٹی گلیشیر کی دم کے سامنے پہنچے۔ وہیں جہاں کمرا تھا۔ اندر کمرے میں داخل ہوئے تو وہی زیارت کے کمرے والا نقشہ تھا۔ بالکل وہی ماحول اندر کا تھا۔ ایک چولہے میں آگ جل رہی تھی اور قدرت اس پر ایک دیگچا چڑھائے نوڈلز بنا رہا تھا۔ ایک خاص فرق یہ تھا زیارت کے کمرے اور اس کے درمیان کہ زیارت کے کمرے کا دروازہ پہلو میں کھلتا تھا اور کوئی منظر آنکھوں کے سامنے نہ تھا۔ یہاں دروازہ سامنے تھا۔ جب میں دھواں بھرے کمرے میں اپنا بیگ نیچے پھینک کر ڈھیر ہوا تو دروازے کے سامنے گلیشیر کا وجود تھا اور پیچھے دستاغل سر کے برفانی پہاڑ تھے۔ سر سے لے کر نیچے تک جہاں جہاں نظر پڑتی برف ہی برف تھی۔ سات ہزار آٹھ سو میٹر سے بلند چوٹی دھوپ میں اپنی برف کے باعث چمک رہی تھی۔ دستاغل سر ...کو 1960ء میں کسی آسٹریلین نے دوسری جانب سے سر کیا تھا اور پھر کسی کی نظر عنایت اس پر نہ پڑی۔ صرف اس لیے یہ اوجھل رہی کیونکہ شمشال بھی نظروں سے اوجھل اور دور افتادہ علاقہ رہا ہے۔ دستاغل سر حالانکہ راکاپوشی سے بلند ہے۔

قدرت کا بھائی وہاب علی شاہ بھی وہیں آیا ہوا تھا۔ کچھ دوسرے بھی تھے۔ کچھ پورٹر کے طور پر بروڈ پیک سر کرنے جا رہے تھے اور کچھ دوسرے ٹریکس کی جانب روانہ ہو رہے تھے۔ یہ ان کا روزگار تھا مگر وہ سب پُرجوش تھے۔

اتنے میں تارڑ صاحب اور بقا دونوں پہنچ گئے۔ میں آنکھیں بند کیے ایک چبوترے پر لیٹا تھا۔ میرے نیچے گدا تھا جو مجھے آرام دے رہا تھا۔ تارڑ صاحب اور بقا گویا اجنبیت کی چادر اوڑھے ہوئے اندر آئے اور اپنے بوجھ اتار کر میری طرح، کسی اور کونے میں لیٹ گئے۔ میں دستاغل سر کی چوٹی پر نظریں رکھ رہا تھا اور تارڑ صاحب مجھ پر اچٹتی نظر ڈال کر آرام کی غرض سے ایک طرف لیٹ گئے تھے۔ تھکن ہوتی ہی ہے ظالم، ادب و آداب، رشتے ناتے پر بھی مہر لگا دیتی ہے۔ بقا بھی کہیں فٹ ہو گیا۔ وقت گزرا ابھی نہ تھا کہ قدرت نے سب کو نوڈل سوپ کے جام بھر کر دیے اور ہم

انہیں غٹا غٹ پی گئے۔ ایک ایک اور پیالہ پیا اور اپنے طور پرمست ہو گئے۔ آرام کا وقت ختم ہوا، یہ اعلان دبی دبی آواز میں ہوا اور سب پھرتی سے کھڑے ہو گئے۔ بقانے خواہ مخواہ کی انگڑائی لے کر کسلمندی بھگانا چاہی۔ ساتھ ہی ساتھ جماہی لینے کے لیے منہ بھی کھل گیا تھا۔ تبھی کسی کونے سے آواز آئی۔ ''اڑتی ہوئی مکھیوں کی خیر ہو۔''

جملے کی بازگشت ختم ہونے سے پہلے بقا پر زلزلہ کی کیفیت طاری ہونے لگی لیکن تارڑ صاحب کی وجہ سے کچھ بولا نہیں اور سب کے ساتھ باہر نکل آیا۔ چلنے کا عمل پھر سے چل پڑا۔

رہبر کریم ابھی بچہ تھا۔ اتنا بوجھ لیے چار گھنٹے سے زائد لگا تار چلتا آرہا تھا۔ اب تھک گیا تھا اور مجھے اس پر ترس آنے لگا تھا کہ ایسے بچے تو اسکول میں ہونے چاہئیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کئی ٹریک کر چکا تھا۔ ایسے بچے یقینا کچھ پڑھ لیتے مگر ان کے خون میں کسی بند کمرے کی میز کے پیچھے بیٹھ کر نوکری کرنے کے جراثیم نہیں ہوتے۔ وہ کھلی فضا میں پلتے ہیں اور اسی میں جوان ہوتے ہیں۔ اپنے بڑوں اور علاقے کے لوگوں کو ہر وقت پہاڑوں پر چڑھتا دیکھتے ہیں اور وہی ہنر سیکھتے ہیں، وہیں سے اپنا روزگار تلاش کرتے ہیں۔ تارڑ صاحب نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''رہبر کی شادی اس وقت تک نہیں کرتی جب تک وہ کوئی چوٹی سر نہیں کر لیتا۔''

رجب شاہ مسکراتا ہوا تائیدی انداز میں سر ہلاتا رہا۔ وہ عمل پر یقین رکھتے ہیں، محنت کو ترجیح دیتے ہیں ان کی کوئی بات ہمارے جیسی نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب تک کوئی نوکری نہ ملے اس وقت تک شادی نہ کرنا اور وہ عمل کر کے قول کو ثابت کرتے ہیں۔

میں لگا تار چل رہا تھا قدرت نے کہا۔ ''ندیم بھائی! آپ تو آج بہت اچھا چلے ہیں۔''

یہ میرے لیے ایک اعزازی سند تھی کہ میں ان کوہ پیاؤں کے معیار پر پورا اترا تھا۔ اس لیے کہ ٹریکنگ ایک فن ہے۔ ذرا سا قدم ڈگمگایا اور آپ سینکڑوں فٹ کی کھائی میں گرے، تھوڑی سی چلنے میں سستی دکھائی اور آپ دوسروں سے پیچھے رہ گئے۔

شمشال سے قدرت کا ایک کزن کریم آیا تھا۔ اس نے خبر دی کہ ورلڈ کپ کے اہم میچ میں پاکستان نے نیوزی لینڈ کو ہرا دیا ہے۔ کیویز کے دو سو چالیس پر شاہینوں نے ایک وکٹ پر سارا اسکور کر لیا تھا۔ وہ پُرجوش انداز میں بتا رہا تھا۔ سعید انور نے سو مارے ہیں۔

سب ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے۔ قراقرم کی دور افتادہ وادی میں پاکستان کی جیت کا جشن منا رہے تھے۔ شمشالیوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ میں حیران ہو رہا تھا ان چہروں کو دیکھ کر جو پاکستانی قوم کے ساتھ ایک مضبوط زنجیر میں بندھے تھے..... کیا ہم ان کے ساتھ بندھے ہیں؟ ان میں شاید ایک دو ہی گلگت یا اس سے باہر گئے ہوں۔ ہم اس زمین کی خوشبو بھی نہ پہچان سکے اور یہ سرحدوں کے ساتھ، دور دراز کے رہنے والے آج کتنے پُرجوش ہیں۔ تبھی میرے منہ سے نکلا۔ ''شمشال تجھے سلام۔''

تارڑ صاحب گرم چشمے پر نہانے کے لیے بے تاب تھے۔ بقا بھی لنگوٹ کس چکا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''بقا صاحب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔''

وہ بولا۔ ''دیکھ نہیں رہے غسل کی تیاری ہے۔''

''ارے اتنی جلدی، ابھی عید پر تو نہائے تھے۔''

میری بات کی گہرائی وہ سمجھ نہ پایا اور جلدی سے بولا۔ ''نہیں نہیں جمعہ کو بھی نہایا تھا۔''

تارڑ صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ سر جھکا کر ہنسنے لگے۔ ہنستے ہوئے باہر نکل گئے۔ میں ساتھ گیا تھا۔ ہم تینوں چشمے پر پہنچے۔ پانی اتنا گرم نہیں تھا کہ اسے گرم چشمے کے نام سے پکارا جاتا لیکن دیگر چشموں، تالابوں سے گرم تھا۔

انہوں نے غسل کیا اور میں وضو کر کے واپس اسی کچے کمرے میں آکر سجدہ ریز ہو گیا۔ اس لیے کہ ایک وہی تو ہے جو ہمہ وقت ہمیں یاد رکھتا ہے۔ کامیابی پر کامیابی دیتا ہے تو پھر ہم اسے کیسے بھول جائیں۔ قرآن میں آیا ہے نا کہ اذکرونی اذکرکم۔ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میں اسے یاد کرنے کے لیے نماز میں مشغول ہو گیا۔

نماز سے فارغ ہوا تو نظر دروازے کی سمت اٹھ گئی۔ سہانا سماں تھا۔ دلفریب مناظر تھے۔ میں اندر کیسے بیٹھا رہتا اس لیے میں اٹھ آیا۔ پرانی سی دری بچھائی اور دستاغل سر کی چمکتی چوٹی دیکھنے لگا۔ بہت سا جنگلی پودینہ میں توڑ کر لایا تھا، اس کی مہک پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

کافی دیر بعد روانگی کا اشارہ ہوا اور میں اٹھ گیا۔ جب ہم روانہ ہوئے تو سورج سوا نیزے پر تھا۔ سورج کی کرنیں جسم میں پیوست ہو رہی تھیں۔ کچھ آگے بڑھے تو

ایک تیز پانی والی ندی آئی جو گہری نہ تھی۔ سب تیزی سے پار اتر گئے مگر میں آگے بڑھا، کچھ قدم چلا تھا کہ سب ایک ساتھ چلا اٹھے۔ ”ارے ارے......“

ہوا یہ تھا کہ میں چلتے چلتے بیچ میں لڑھک گیا تھا۔ دراصل میرے پیر تلے ایک گول پتھر آ گیا تھا۔

یہ انسانی فطرت ہے۔ کوئی بھی چلتے چلتے پھسل جائے تو سب ہنستے ہیں۔ کئی ایک کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔ کئی ایک سہارا دینے دوڑے تھے مگر میں خود ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ کپڑے کچھ گیلے ہوئے اور ہاتھ پر ہلکی سی موچ آ گئی۔ میں اپنے ساتھ پورا فرسٹ ایڈ کا سامان لایا تھا فوری ضروری دوا لے لی۔ یوں بھی میں کل سے تارڑ صاحب اور بقا کو وٹامن و نمکول کا پاؤڈر گھول کر پلا رہا تھا۔ کیونکہ نمکول نمکیات کی کمی نہیں ہونے دیتا اور آپ کے اعصاب ٹھیک کام کرتے ہیں۔ ورنہ اتنی لمبی ٹریکنگ ہم جیسے شہری لوگوں کو کبھی بھی بے ہوش کر سکتی ہے۔ میں نے ہمیشہ کی طرح دوائیوں کا بڑا اسٹاک اپنے ساتھ رکھا تھا جو کام آ رہا تھا۔

آگے بڑھے تو ایسے کئی خطرناک مقامات آئے کہ میں روڈ کیمپ کے آگے والا ٹریک بھی بھول گیا۔ دانتوں تلے پسینا آ گیا۔

تنگ پگڈنڈیاں تھیں جو گہری کھائیوں میں گرنے والی تھیں۔ ہم چلچلاتی دھوپ میں اس سے گزرتے ہوئے اپنی بداعمالیوں پر دل سے توبہ کرتے رہے تھے اور وہ راستہ ختم نہ ہو رہا تھا بلکہ آہستہ آہستہ بلند ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت کی کیفیت میں کیسے بیان کروں؟ بس یہی مثال دے سکتا ہوں کہ جیسے آپ کو کوئی کسی ہزاروں فٹ بلند عمارت کے کسی ایک یا دو فٹ کے چھجے پر ایک گھنٹے کے لیے کھڑا کر دے تو آپ جیسا محسوس کریں گے بالکل وہی کیفیت تھی میری۔

رہبر کریم کو پہلے ہی آگے بھیج دیا گیا تھا کہ وہ فرمان آباد سے ٹریکٹر ٹرالی لے آئے تاکہ ہم آگے تین گھنٹے کے جان لیوا ٹریک سے نجات پا لیں۔ ہم پانچ گھنٹوں سے زائد کا سفر کر کے اب تھکنے لگے تھے۔ اگر ایک سہولت موجود ہے تو کیوں نہ اس کا فائدہ اٹھا لیا جائے۔

پہلے تو ٹریکٹر کا نام سن کر لگا کہ میں نے غلط سنا ہے۔ پھر میں نے دوبارہ رجب شاہ سے پوچھا۔

”کیا واقعی ٹریکٹر منگوایا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ہاں ٹریکٹر منگوایا ہے۔“

میں یہ سمجھا کہ سب مل کر میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔

میں نے کہا۔ ”جہاں انسانی قدموں کے لیے بھی جگہ نہیں ہے تو کیا ٹریکٹر اڑ کر آئے گا۔“

رجب شاہ بھی مزے لے رہا تھا۔ ”ہاں اڑ کر آیا ہے۔“

مجھے رجب شاہ سے یہ امید نہ تھی کہ ہماری تھکاوٹ کا مذاق اڑائے۔

میں اس کا چہرہ حیرت سے دیکھ رہا تھا اور وہ سنجیدہ تھا۔ بعد میں عقدہ کھلا کہ آرمی والوں نے ہیلی کاپٹر کے ذریعے ٹریکٹر کے پارٹس ایک ایک کر کے گلگت سے لا کر یہاں اتارے اور پھر کسی مستری کو پکڑ کر لائے۔ ٹریکٹر اور ٹرالی کو جوڑا گیا۔

ڈیزل پھو سے اٹھا کر لاتے ہیں یا وہ بھی ہیلی کاپٹر سے آتا ہے، اس کا میں نے معلوم نہ کیا۔ اب وہ ٹریکٹر کاشت کاری اور بوجھ اٹھانے کے کام آتا ہے۔ بعد میں احساس ہوا کہ یہی ایک مشین ہے۔ جس کی آواز شمشال میں گونجتی ہے۔ ہم بھی سوئے ہوتے یا جاگ بھی رہے ہوتے تو کبھی کبھار اس کے انجن کی آواز پورے شمشال میں پھیلتے ہوئے سن لیتے۔

فرمان آباد شمشال کے راستے میں پہلا گاؤں تھا۔ چند مکان اور ساتھ میں کچھ کھیت تھے۔ میرے پاؤں کے تلوؤں میں چھالے پڑ چکے تھے۔ جو اب مجھے باقاعدہ تکلیف دیتے تھے۔ مجھے چلنے میں دشواری ہو رہی تھی اور میں دعا کر رہا تھا کہ ٹریکٹر آ جائے تاکہ اس دشوار ترین سفر سے نجات ملے۔ ٹھوکریں کھاتے کھاتے ہم کے ٹو کی شکل والی ایک چٹان کو عبور کر کے بلندی پر کھڑے ہو گئے تھے۔

سامنے بہت نیچے میلوں دور دور تک ایک وسیع ریگستانی وادی تھی۔ جس میں دھوپ چمک رہی تھی۔ دریا شمشال ایک سائیڈ پر بائیں جانب بہہ رہا تھا اور وادی کا ایک بڑا ریگستانی حصہ پورے منظر میں نمایاں تھا۔ نیچے بہت نیچے اتر کر ہمیں ایک طویل صحرا کو عبور کرنا تھا۔ دور دور تک کوئی ٹریکٹر تھا اور نہ کسی قسم کی کوئی آواز تھی۔ سب نے میری دوربین اپنی آنکھوں سے لگا لگا کر اپنی تسلی کی مگر کسی کو کوئی ٹریکٹر نظر نہ آیا۔ دور کہیں فرمان آباد کے گھر نظر آ رہے تھے۔ ٹریکٹر ٹرالی آنے کی امید تھی اور جب ٹریکٹر نہ آیا تو ہماری تھکاوٹ بڑھ گئی۔ جسم ڈھیلے پڑ گئے۔ ہمارے پاؤں لاغر ہو گئے۔ مایوسی اور اداسی پورے بدن میں اردگرد سے آ کر پھیل گئی تھی۔ پسینے سے شرابور اور گرمی سے نڈھال جسم، ہم اب کسی اور مسافت کے قابل نہ تھے۔ تارڑ صاحب کی بھی کم و

بیش یہی حالت تھی۔ بقا بھی مایوسی سے نچڑا کھڑا تھا۔ اور تو اور شمشالی بھی حوصلہ ہارے کھڑے تھے۔ میں سوچ رہا تھا یااللہ یہ قراقرم کی وادی ہے یا آتش کدہ، جس میں گرمی سے جسم جھلستے ہے۔

میں لنگڑاتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ پھر ہم سب ایک دوسرے سے خفا ہو کر دور دور چلنے لگے۔ گرم ریت میں میرے پاؤں دھنستے اور پاؤں کے چھالوں سے ٹیسیں اٹھنے لگتی تھیں۔ یہ ایک جہنمی راستہ تھا جس پر ہم چل رہے تھے۔

چلتے چلتے بقا میرے پاس بمشکل آیا اور کہنے لگا۔

"تارڑ صاحب تم سے بہت خفا ہیں۔"

میں رک گیا۔ "کیوں۔"

جواب دیا۔ "تم ٹیم سے علیحدہ ہو کر اکیلے چلتے ہو۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ تارڑ صاحب مجھ سے کھنچے کھنچے ہیں۔ میں تو اس خیال میں تھا کہ وہ اپنے سفرناموں میں لکھتے ہیں۔ "میں ٹریک پر اکثر اکیلا ہو جاتا ہوں تاکہ اردگرد کے ماحول میں کھو جاؤں۔" میرا اپنا مزاج بھی ایسا ہی تھا کہ میں خود کو دوسروں سے علیحدہ کر کے اپنے ماحول میں کھو جاؤں تاکہ میں یکسو ہو کر خود کو اس دنیا کی خلوتوں سے آشنا کر سکوں۔

بقا کی بات سن کر پریشان ہوا کہ کپتان ناراض ہو جائے تو سپاہی کی ہمت تو ٹوٹ ہی جاتی ہے۔

تارڑ صاحب اسی دوران پاس سے ہو کر آگے جا چکے تھے۔ میں اپنے چھالوں کی ٹیسوں کو بھول کر کسی نہ کسی طرح ان کے پاس پہنچا۔ وہ سخت غصے میں تھے۔ میں نے وضاحت دی مگر رد کر دی گئی۔ میں نے سوچا کہ ابھی تھکے ہوئے ہیں اور راستہ لمبا ہے۔ شمشال پہنچ کر انہیں منا لوں گا مگر میری تھکاوٹ دگنی ہو گئی تھی۔

آس پاس پتھریلی چٹانیں تھیں۔ ان کے پیچھے دستاغل سر کے برفانی پہاڑ جو اوپر سے نیچے تک صدیوں کی برفوں سے لدے تھے۔ جو ہم ازلوں سے دیکھتے چلے آرہے تھے۔ یہ راستہ ختم سا گیا تھا۔ کوئی منظر تبدیل نہ ہوتا تھا۔ میں چلتا تو تھا مگر جیسے گھوم کر وہیں آ جاتا تھا، جہاں پہلے تھا۔ وقت رک گیا تھا، نظارے ٹھہر گئے تھے، پاؤں کے چھالے اس گرم ریت میں پھل پھول رہے تھے۔ سورج قریب آ کر مجھ پر ہنستا اور لیڈر صاحب مزید خفا ہو کر، یا آگے نکل جاتے یا پیچھے رہ جاتے۔

ایک گھنٹہ ہوا تو فرمان آباد نزدیک نظر آیا۔ یوں سمجھیں کہ ہم نہیں بلکہ وہ ہماری جانب بڑھتا چلا آیا تھا۔ کچھ گھر، کھیت اور زمانوں سے دیکھتا وہی منظر، رجب شاہ کا پکا گھر اور آرام وہ مہمان خانہ۔ گدے بچھے ہیں، گاؤ تکیے لگے ہیں۔

پورٹر سامان باہر رکھ کر اپنے پاؤں کا مساج کرنے لگے۔ تارڑ صاحب اپنے ہوش سے بیگانہ ہو کر لیٹ گئے۔ میں جرابیں اتار کر اپنے تلوؤں میں نکلے بے شمار چھالوں کو گننے لگا۔ بقا کسی اداس بلے کی طرح کونے میں لیٹا سب کو تک رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ مجھے ہنستے دیکھ کر اس نے بلند آواز میں کہا، بس کچھ دیر کی بات ہے اگلی ٹریک پر پوچھوں گا لوگ خود کو پتا نہیں کیا سمجھتے ہیں۔"

اس انداز گفتگو نے میرے اندر ہنسی کا دریا بہا دیا تھا۔ ہنسی روکے نہیں رک رہی تھی۔ اس لیے میں کھڑا ہو گیا۔

اٹھ کر دیوار کے قریب جا کھڑا ہوا۔ وہاں لگی ایک تصویر دیکھی، فل برفانی لباس میں رجب اور قربان شاہ کے ٹو کی چوٹی پر پاکستانی پرچم لیے کھڑے ہیں۔ میں نے رجب شاہ سے پوچھا۔ "کے ٹو کی برفانی چوٹی سے کیا نظر آتا ہے۔"

"برفانی چوٹیاں۔" رجب شاہ نے مسکرا کر کہا۔

ایک کیلنڈر بھی نظر آیا ہے، جس کے بارہ صفحے کے ٹو ہم کی داستان ہیں۔ کینیڈا سے یہ کیلنڈر شمشال والوں کے لیے پرنٹ ہوا تھا۔ میں کرید کرید کر رجب شاہ سے سوالات کرنے لگا اور وہ سادہ انداز میں جوابات دیتا گیا۔ نہ کوئی بات بڑھا کر بیان کی اور نہ کسی کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔

ہم بھوکے تھے۔ رجب شاہ پنیر، مکھن اور گندم سے بنی کوئی روٹی نما چیز لے آیا۔ میں نے پوچھا۔ "اس کا نام کیا ہے۔"

قربان نے جواب دیا۔ "چلوپنڈنوں۔"

بقا اٹھ بیٹھا اور چیخ کر بولا۔ "چلو! ابھی چلو۔"

تارڑ صاحب بھی اٹھ بیٹھے اور ہنس کر بولے۔ "تو چل ہم آرہے ہیں۔"

بقا نے اس افسردہ ماحول کو رنگین کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ شاید وہ سمجھا تھا کہ چلوپنڈنوں کوئی علاقہ ہے جہاں چلنے کا کہا جا رہا ہے۔ اسی لیے ہنستا اٹھا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے سمجھایا گیا کہ یہ اس روٹی کا نام ہے، تب وہ بہ مشکل کروٹ کے بل لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر کچھ سوچ کر اٹھا اور روٹی چبانے لگا۔

چائے پینے اور چلوپنڈنوں کو نگلنے سے چستی آ گئی تھی۔ پر تھکاوٹ سے اٹھنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ سہ پہر کا قہر باہر برس رہا تھا۔ اپنے چھالوں پر جرابیں

پڑھ جائیں۔ سب بے دلی سے اٹھے اور سفر دوبارہ سے شروع ہوگیا۔

شمشال دو گھنٹوں میں آجاتا ہے۔ مگر آج وہ ہمیں آنسو بہانے پر مجبور کر رہا تھا۔ ہم چل رہے تھے خود کو کوس رہے تھے۔ پیاس لگتی تو بوتلوں کو منہ لگ جاتے۔ کچھ کہنا چاہا مگر چپ رہے۔ رکنے کو من چاہا تو چل پڑے۔ کوئی سایہ ڈھونڈا تو مایوس ہوئے۔ آگے ایک ندی آئی۔ کسی اور گلیشیر کا منہ زور پانی ہمارا راستہ روکے بہہ رہا تھا۔ ہم اس ندی کے کنارے بیٹھ گئے۔

ستانے کے بہانے بیٹھے تھے مگر بقا کا کیا کہنا وہ ویڈیو کیمرا تھامے کبھی ندی کی مووی بناتا اور کبھی عقب میں پھیلی پتھریلی چٹانوں میدانوں کی۔ بقا کی دو خوبیاں اہم تھیں۔ ایک حکم جاری کرنا، وہ بھی اس طرح کہ ٹیپ کا لفظ ہوتا۔ تارڑ صاحب...... ٹھہر جاؤ۔ تارڑ صاحب رک گئے ہیں۔ تیز چلو تارڑ صاحب آگے نکل گئے ہیں۔ بعض دفعہ تو وہ اپنی روایتی آواز میں حکم صادر کرتا وہ بھی ایسے کہ بہرے بھی سن لیں، بقول رجب شاہ اس کی آواز پر مردے بھی جاگ جاتے ہوں گے۔ رجب شاہ جیسے سنجیدہ مزاج کا ایسا جملہ ہم نے تو خوب لطف لیا تھا۔ اس وقت بھی ہماری نظریں بقا پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ وہ کیمرا تھامے چٹانوں کے درمیان ایک جگہ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں وہ اس کے قریب بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسی جگہوں پر پرندے چھپے رہتے ہیں۔ شاید وہ اسی وجہ سے جھاڑیوں کی طرف جا رہا تھا کہ یکا یک وہ زور سے چیخا پھر سرپٹ بھاگا۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی۔ ہم سب حیران، وجہ پوچھی تو ہانپتے ہوئے بولا۔ ”ادھر...... جھاڑیاں چل رہی ہیں۔“

میں نے جھاڑیوں کی طرف دیکھا اور مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ ہوا یہ تھا کہ ایک مقامی بندے نے جھاڑیاں کاٹ کر گٹھر بنایا تھا اور اسے سر پر لیے چلا آ رہا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ اس نے جھاڑیوں کے درمیان بیٹھ کر گٹھر بنایا ہوگا پھر اسے سر پر رکھ کر کھڑا ہوا ہوگا۔ اسی وقت بقا کی نظر اس پر پڑی ہوگی۔ جھاڑیوں کے درمیان کا حصہ اسے نظر نہ آیا بس اسے اوپر اٹھتے دیکھا۔ جھاڑیوں کو یوں یکا یک بلند ہوتے دیکھ کر وہ گھبرا اٹھا تھا۔

ہم سب ہنستے ہوئے آگے کی طرف بڑھ گئے۔

سامنے ندی تھی۔ ندی کی ایک گونج تھی۔ ایک خوف تھا جو ہمارے سامنے پانیوں کی صورت ہمیں للکار رہا تھا۔ ایک ہم تھے کہ سہمے ہرنوں کی طرح ان پانیوں کو دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے رہنے سے تو ندی کے اس پار پہنچ نہیں سکتے تھے۔ ہمت کرکے پار اترنا ہی تھا۔ شمشالیوں کے لیے یہ کوئی خطرناک بات نہ تھی لیکن ہم جیسوں کے لیے یہ چھوٹی سی ندی اور اس کا تیز بہاؤ پل صراط جیسا تھا مگر اترنا پڑا۔

چند قدم ڈولتے سنبھلتے چلے لیکن کچھ قدم کے بعد حوصلے نے دم توڑ دیا۔ ایسے وقت میں ہمارا ہیرو قربان آگے بڑھا۔ اس نے زبردستی مجھے اپنی پیٹھ پر لادلیا۔

آس پاس کی چٹانیں اور دستاغل سر ہمیں حیرت کے ساتھ تک رہی تھیں۔ اس بار مجھے کوئی شرم محسوس نہ ہوئی کہ میں اپنے ہیرو قربان کی پیٹھ پر سوار ہوں۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ سفر شمشال تک جاری رہے اور میں قدم اٹھائے بغیر منزل پر پہنچ جاؤں مگر ندی کو پار ہونا تھا ہم بالآخر ندی کے پار اترے مگر میں اس کی پیٹھ سے نہ اترا اسی طرح چپٹا رہا۔

قربان کو شاید شرارت سوجھی تھی اس نے ایک جھٹکے سے مجھے اتار پھینکا۔ گھبرا کر میں نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا مگر یہاں کسی کو دیکھنے کی سکت نہ تھی۔ میں نے اپنا بیگ پھر سے پیٹھ پر ڈالا اور لنگڑاتا ہوا چل پڑا۔

میں اذیت میں جلتا اپنا ایک ایک من کا بھاری پاؤں اٹھاتا، پتھریلی نگاہوں سے پتھریلی راستوں کو دیکھتا، ریت میں دھنستا چلا چلا جا رہا تھا۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے ایک ہی منظر تھا اور اس کو دیکھتے دیکھتے نگاہیں بھی پتھر کی ہوگئی تھیں۔

ہمیں کہا گیا تھا کہ دو گھنٹے کا سفر ہے مگر تین گھنٹے ہو گئے تھے اور یہ سفر جاری تھا۔ سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سورج تھک ہار کر مدھم پڑ گیا تھا۔ آگے ایک بھربھری بلندی آئی۔ بمشکل اس کے اوپر چڑھے تو سامنے شمشال تھا۔

ایک فنکار کو جب اس کے فن کی داد ملتی ہے تو وہ ایک تسکین محسوس کرتا ہے اور اسی طرح جب ایک کوہ نورد کو اپنے پرآشوب لمبے سفر، صعوبت بھری دشت گردی کے بعد جو انعام ملتا ہے تو وہ شمشال ہوتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ شمشال کتنا خوبصورت تھا پر جب میں نے اپنے رلا دینے والے سفر کے بعد یہ منظر دیکھا تو اپنے آپ کو جنت میں پایا تھا۔ اس لمحے اگر میں کسی جنت کا تصور کرتا تو مجھے لامحالہ وہ شمشال کی صورت ہی نظر آتی۔ میرے سامنے پوری وادی میں، تمام خطے پیلے پھول سے بھرے تھے جو اپنے کھیتوں میں لہرا رہے تھے۔ پیچھے کچھ مکانات تھے۔ درختوں کے پتے

سبز اور زرد تھے۔ مکانات کے پیچھے بھورے، کالے پہاڑ اور ان کے پیچھے برفوں سے لدی چوٹیاں، جو آسمانوں کو چھو رہی تھیں جیسے زمین سے ان کا کوئی رابطہ نہ ہو۔ وہ میری پہنچ سے دور ہوتے ہوئے بھی نظروں میں چھائی ہوئی تھیں۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ وہاں ایک ہی پکی اینٹوں کی عمارت تھی جو جماعت خانہ تھا۔ باقی کا منظر ایک تنہائی میں گھرا، اپنی بھرپور شادابی میں نظر آ رہا تھا۔ مجھے یہ احساس سکون دے رہا تھا کہ میں اپنی منزل پر پہنچ گیا ہوں۔ دنیا میرے پیچھے رہ گئی ہے۔ ایک شور ختم ہوا اور ابدی خاموشیاں میرے سامنے اور چہار جانب سے مجھے تک رہی ہیں اور میں ان سے نظریں ملائے کھڑا ہوں۔ کچھ پا لینے کا اور کچھ کھو دینے کا احساس گھر آ رہا تھا۔ مجھے جکڑ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ جس دنیا سے میں ہو کر آیا ہوں وہ تمام ہوئی۔ یہی میری دنیا ہے۔ جو میرے سامنے خاموشی کی چادر اوڑھے کھڑی ہے۔

تارڑ صاحب اور بقا حیرت میں ڈوبے سامنے سے نظریں نہیں ہٹا پا رہے تھے۔ بقا پر کسی محو حیرت سنگی مجسمہ کا گمان ہو رہا تھا۔ شمشال کی خوبصورتی اس کے مناظر میں نہیں، اس کی تنہائی اور دور افتادگی میں تھی۔ میں ایک ٹائم مشین کے راستے سینکڑوں سال پہلے کی دنیا میں آ نکلا تھا۔

ہم وہیں پتھر بنے کھڑے تھے کہ رجب شاہ نے ٹہوکا دیا۔ سامنے سے کچھ مقامی ہماری جانب بڑھے چلے آ رہے تھے۔ قریب پہنچے تو ان کے ہاتھوں میں ہار تھے۔ انہوں نے مسکرا کر ہمیں خوش آمدید کہا۔

میں تو خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا۔ جلدی سے اپنی گردن آگے کر دی کہ انہیں ہار پہنانے میں آسانی ہو۔ مگر وہ ظالم ثابت ہوئے، مجھ سے کنی کترا کر میرے قریب سے گزر گئے اور ہار تارڑ صاحب کے گلے میں ڈال دیے۔ میری گردن لٹکی کی لٹکی رہ گئی۔ پھر بھی میں شرمندہ نہ ہوا اور ایک پیلا پھول کھیتوں سے توڑ کر اپنے فلسطینی رومال کے اوپر اڑس لیا، جو میرے سر پر لپٹا تھا۔ میں اپنے آپ کو خود ہی یہ اعزاز دے کر شاد تھا کہ گھوڑا نہ سہی گھوڑے کی بو باس سہی۔

تارڑ صاحب نے ہار پہننے کے بعد پوچھا۔ ”خیمے کہاں لگائیں؟“

رجب شاہ بولا۔ ”اگر آپ چاہیں تو قریب ہی دو کمروں کا ایک گیسٹ ہاؤس ہے، آپ وہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ کچھ ادائیگی کرنی ہوگی۔ خیمے تو آپ کہیں بھی لگا سکتے ہیں مگر پانی کا مسئلہ ہوگا اور آپ کو دور دریا کے ساتھ خیمے لگانا پڑیں گے۔“

میں نے دریا کی جانب دیکھا تو وہ کہیں دور، آلو اور مٹروں کے کھیتوں سے بھی دور، پیلے پھولوں سے پار، کہیں بہہ رہا تھا۔

تارڑ صاحب ہار پہنے کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”گیسٹ ہاؤس کہاں ہے؟“

کسی نے اشارہ کر کے دکھایا۔ گاؤں کے کھیتوں سے جڑا، گھروں سے ہٹ کر ایک بلندی پر دو کمرے نظر آئے اور ان دو کمروں کے آگے لکڑی کا بنا برآمدہ تھا جس پر لکڑی کی چند سیڑھیاں چڑھ کر پہنچا جاتا تھا۔ برآمدے کے سامنے ایک باغیچہ تھا اور اس پر کئی درخت جھکے کھڑے تھے۔ اس مقام پر اتنی خوبصورت اور آرام دہ جگہ ہو تو کون اس سے منہ موڑتا ہے۔ اسی وقت فیصلہ ہو گیا کہ گیسٹ ہاؤس میں قیام کیا جائے گا۔

ہم تمام میزبانوں کے ہمراہ آلو، مٹر اور سرسوں کے کھیتوں سے گزرتے ہوئے گیسٹ ہاؤس تک آ گئے اور اب ہم سیڑھیاں چڑھ کر لکڑی کے برآمدے میں کھڑے تھے، جہاں ایک جانب چند لکڑی کی کرسیاں اور میز رکھی تھیں۔ دو کمرے تھے اور نیچے پورا شمشال، پھول، کھیت، درخت بکھرے تھے۔ ایک جانب بھورے کالے پہاڑ تھے اور پیچھے دستاغل سر کی برف تھی۔

کھیتوں کی جانب کمرے میں بقا اور تارڑ صاحب نے اپنا سامان رکھا۔ اس کمرے میں ایک کھڑکی شمشال کے کھیتوں میں کھلتی تھی۔ اس کمرے کے ساتھ جڑا ایک باتھ روم تھا جہاں انگلش ٹوائیلٹ تھا اور ایک بڑے پلاسٹک کے ڈرم میں پانی لبالب بھرا تھا۔ دو آرام دہ بستر دیواروں کے ساتھ لگے تھے اور درمیان میں میز تھی۔ دوسرے کمرے میں کوئی منظر کھلتا نہ تھا صرف ایک بڑا پلنگ تھا جس پر آرام دہ گدے بچھے تھے۔ باتھ روم وہی ایک تھا۔ اتنے تھکا دینے والے سفر کے بعد یہ کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل سے کم جگہ نہ تھی۔ دوسرے کمرے میں، میں نے اپنا سامان رکھا۔

شام اتر رہی تھی۔ تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ شام کا حسن چھا رہا تھا۔ پہاڑ سیاہ سے سیاہ ہوتے جا رہے تھے۔ ہم کرسیوں پر بیٹھے پورے شمشال کو دیکھتے اپنی قسمت پر رشک کر رہے تھے، خدا کے اس انعام پر مسرور تھے۔ طبیعت کی شگفتگی پھر سے اتر آئی تھی۔ ایسے وقت میں دور کہیں سے ایک مدھر آواز کانوں میں رس گھولنے لگی۔ ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر پر کوئی گانا

بجا رہا تھا۔ "یہ سماں موج کا کارواں، لے چلا ہے کہاں"۔

ہمارے پاکستانی گانوں کی یہی تو خوبی ہے کہ اس کی تان روح میں سمانے لگتی ہے۔ مجھے اچھے گانے سننے کا شوق ہمیشہ سے رہا اور اچھا گانا سنتے ہی میری قوت سماعت اس جانب منتقل ہوگئی۔

رجب شاہ کل آنے کا کہہ کر کہیں چلا گیا۔ کہنے لگا کہ وہ واپس فرمان آباد جا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اس شام میں اتنی دور تین گھنٹے کی مسافت کر کے جاؤ گے، یہیں ٹھہر جاؤ۔ کہنے لگا۔ "نہیں، میں ڈیڑھ دو گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا اور کل صبح واپس آجاؤں گا۔"

وہ چلا گیا اور میں دور تک اسے پیلے پھولوں کے درمیان جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ سب پورٹر چلے گئے۔ قدرت مجھ سے یہ کہہ کر چلا گیا کہ رات میں وہ واپس آئے گا۔

وہ میرا دوست بن چکا تھا۔ ہم میں بہت باتیں ہوتی رہی تھیں اور میں بھی اس کی صحبت کو پسند کرنے لگا تھا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ پھر اندھیرا پھیلنے لگا اور سردی ایک ناگہانی آفت کی طرح اتر آئی۔ دن میں جو بدن گرمی سے جھلس رہے تھے وہ اب ٹھٹھر رہے تھے۔ پھر بھی ہم سب کی خوشی دیدنی تھی۔

ہم نے برآمدے کا جائزہ لیا اور ایک کونے کو اپنا کچن بنا لیا۔ مٹی کے تیل کا چولہا جلایا۔ دیگچیاں سجائیں۔ راشن ترتیب سے رکھا۔ ہوا سے بچاؤ کے لیے ایک چادر تان دی۔

سارا کام بقا کی نگرانی میں ہو رہا تھا اور میں صرف دخل اندازی کر رہا تھا۔ تارڑ صاحب ابھی تک وہی ہار پہنے خفا خفا سے بیٹھے تھے۔ میری بات کا مختصر جواب دیتے۔ میں نے کھل کر کہا۔ "تارڑ صاحب! اب پچھلی بات کو بھول جائیں، مجھے معلوم نہ تھا کہ میرے اکیلے چلنے پر آپ خفا ہوں گے۔ ہمیں تین چار دن یہاں ٹھہرنا ہے اور آپ کی خفگی سے میں بہت تکلیف محسوس کروں گا۔"

انہوں میری جانب دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں نرمی اترتی چلی گئی۔ میں نے اس نرمی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اور کیا یہ ہار چار دن تک پہنے رہیں گے؟ اب اسے بھی اتار دیں کیونکہ آپ کے پرستار بھی جا چکے ہیں۔"

انہوں نے ایک قہقہہ لگایا اور ساری خفگی پانی کی طرح بہہ گئی۔

میں بھی پُرسکون ہوتا چلا گیا اور تناؤ بھرا ماحول نرم پڑ گیا۔ تارڑ صاحب اس کے بعد کبھی خفا نہ ہوئے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ بھی جان چکے تھے کہ میں اپنی مرضی سے جیتا ہوں۔ میں نے بھی آئندہ یہی کوشش کی کہ انہیں کوئی شکایت نہ ہو۔ اس دن کے بعد آج تک، اتنے سال ہو گئے، ہم جب بھی ملتے ہیں ایک احترام سے ملتے ہیں اور میں ہمیشہ ان کی حیثیت اور مقام کو قدر سے دیکھتا ہوں۔ پھر اس کے بعد میرے وہ چند دن زندگی کے اہم دن بن گئے۔

بقا ایک بوڑھی خالہ کی طرح چولہے کے پاس بیٹھ گیا، مجھے پیاز چھیلنے کے لیے دیے۔ میں بظاہر خوش دلی سے یہ کام کر رہا تھا مگر پیاز کی جھانس آنکھیں نم کر رہی تھی۔

وہ چائنیز چاول تیار کر رہا تھا۔ رات کا اندھیرا چھا گیا۔ ہم نے لالٹین روشن کر لی۔ پھر پورے شمشال میں کہیں کہیں قمقمے روشن ہوتے چلے گئے۔ ہم سب حیران کہ یہاں بجلی کہاں سے آگئی۔ بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ دستاغل سر سے آتے ہوئے پانی ایک آبشار کی صورت شمشال پر برستے ہیں اور وہاں شمشالیوں نے ایک ٹربائن لگا رکھا ہے، نو سے بارہ بجے تک اتنی بجلی بن جاتی ہے کہ شمشالیوں کے گھروں کے قمقمے جل سکیں۔ پانی کا زور شام کے بعد بڑھتا ہے تو ٹربائن اپنا کام کرتا ہے۔ ہمیں ان کی اپنی مدد آپ کے نظریے نے بہت متاثر کیا۔ کاش یہ جذبہ ہر علاقے میں عام ہوتا تو آج ہمارا ملک اوج پر ہوتا۔

شمشال کے پیلے پھولوں پر تاریکی اتر آئی تھی۔ خنک ہوا ہمیں کپکپا رہی تھی۔ میں اپنے ٹریکنگ سوٹ تبدیل کر کے کاٹن کی شلوار قمیص میں تھا۔ ٹریکنگ شوز کی جگہ چپل پہنے ہوئے تھا۔ اوپر جرسی چڑھا لی تھی۔ اتنے میں قدرت بھی آگیا۔ حالانکہ وہ آٹھ مہینے بعد گھر آیا تھا۔ اس دوران مختلف ٹریکس پر رہا تھا۔ پھر بھی ہماری محبت میں ہمارے ساتھ وقت گزارنا بہتر سمجھ رہا تھا۔ ہم سب نے مل کر ڈنر کیا۔ چائنیز چاول جیسے بھی تھے ایک نعمت تھے۔ قدرت کھانا کھا کر آیا تھا اور ہمارے اصرار پر بھی کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔ ہوا میں برف کا لمس تھا، خنکی اور کپکپاہٹ تھی۔ ہم ڈنر کے بعد قہوے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ایک علیحدہ ماحول میں ہم بیٹھے تارڑ صاحب اور قدرت کے تجربات اور مہموں پر باتیں کرتے رہے۔ ایک شاندار شام تھی اس کے سحر میں ہم سب جکڑ گئے تھے کہ اچانک چند نوجوان برآمدے کی طرف آتے دکھائی دیے۔ یہ وہی تھے جنہوں نے دریا شمشال پر بنے پل پر تارڑ صاحب کو خوش آمدید کہا تھا۔ انہوں نے اپنے خیمے

دریا شمشال کے نزدیک لگائے تھے اور اب تارڑ صاحب سے ملنے چلے آئے تھے۔ ان میں سے ایک بولا۔ ''آپ کے سفرنامے پڑھ کر ہم یہ سمجھتے تھے کہ آپ کوئی سفر وغیرہ نہیں کرتے، بس گھر بیٹھ کر سب لکھ دیتے ہیں مگر آپ تو واقعی سفر کرتے ہیں۔''

مجھے تھوڑا سا ان پر غصہ آیا۔ ''اب آپ نے دیکھ لیا تھا تو آپ کو یہ سوال ہی نہیں کرنا چاہیے تھا اور آپ لوگوں کو اپنے خیموں میں بیٹھ کر تھوڑا تھوڑا شرمندہ ہونا چاہیے تھا، تو کیا واقعی آپ شرمندہ ہوئے ہیں۔''

تارڑ صاحب نے اشارے سے مجھے چپ کرا دیا۔ وہ لوگ شمشال پاس جا رہے تھے۔ بقا نے کسی سو سالہ بڑھیا کا کردار ادا کیا۔ انہیں بہت ساری نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کر دیا۔

پھر کچھ مقامی بچے پینسل اور کاپیاں اٹھائے ایک لائن میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ اجلے اور صاف ستھرے بچے جو مقامی اسکول میں پڑھتے تھے۔ وہ شمشال ماؤنٹین سوسائٹی کے ممبر تھے اور آتی جاتی ٹیموں کا ریکارڈ درج کرتے تھے۔ کہاں سے ٹیم آئی ہے۔ آگے جائے گی یا شمشال میں رکے گی؟ کتنے دن رکے گی؟ اس کی پوری معلومات جمع کرتے تھے۔ وہ شمشال کے گرد پھیلے پہاڑوں اور گلیشیئرز کی معلومات بھی دیتے۔ یہاں سے جو ٹریکس جاتے ہیں ان کے بارے میں بتانے لگے۔ مجھے یقین نہ ہو رہا تھا کہ پاکستان کا یہ دور افتادہ علاقہ اتنا منظم بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بڑی تمیز سے سوالات کرتے اور بڑے ادب سے کاغذوں پر لکھتے جاتے۔ میں نے دیکھا کہ وہ انگریزی میں لکھ رہے ہیں۔ پوچھنے پر بتایا کہ غیر ملکی ٹیمیں بھی آتی ہیں تو انگریزی میں بات کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے ہم انگریزی سیکھنے پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔

ان بچوں کے جانے کے بعد ہم کافی دیر تک ان کے بارے میں سوچتے رہے۔ یہ سوچ یہ فکر ہمارے دوسرے علاقوں میں بھی عام کرنا چاہیے۔

ہوا میں تندی آتی جا رہی تھی۔ تارڑ صاحب اور بقا اپنے بستروں پر رضائیاں اوڑھے دبک گئے۔ میں اور قدرت رات گئے برآمدے میں بیٹھے رہے۔ تیز ہوا سے قدرت کو سگریٹ سلگانے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں کا چھجا بنا کر دیا سلائی جلائی۔ دستاغل سر کی برف کے اوپر چاند چاندنی کی کرنیں بکھیر رہا تھا اور سارے تارے شمشال کے اوپر جمع ہو کر ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ دریا کا بہاؤ ایک شور اور گونج لیے رواں تھا اور اس کی روانی کا شور ہمارے برآمدے میں بھی گونج رہا تھا۔

گیسٹ ہاؤس سے ذرا ہٹ کر نعمت کریم کا گھر تھا جو گیسٹ ہاؤس کا انچارج بھی تھا۔ اتنے میں وہ بھی ہماری محفل میں آ بیٹھا۔ کہنے لگا۔ ''میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو ضرور بتائیں۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔''

دلیے سے ناشتا یا روزانہ چاول کھانا میرے لیے بھی مشکل تھا۔ ہم دیسی بندے تھے اور جب تک گندم کا خمار نہ چڑھے ہمیں نیند نہ آتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''اگر زحمت نہ ہو، جو یقیناً آپ کو ہوگی، کیا آپ ہمارے لیے روٹیاں بنوا کر لا سکتے ہیں؟''

اس نے خوش دلی سے ہامی بھر لی۔ میں نے کہا۔ ''مگر ایک شرط ہے کہ ہم جب یہ روٹیاں لیں گے کہ آپ ہم سے اس کی ادائیگی لیں گے۔''

قدرت نے معاوضہ طے کر دیا اور میں نعمت کریم کا شکر گزار ہوا۔ پھر اگلے تین دن ہمارے لیے صبح کو پراٹھے اور شام کو روٹیاں نعمت کریم کے گھر سے بن کر آنے لگیں۔ میں نے اس سے چھ عدد انڈے بھی خرید لیے جو ہمارے ناشتے میں کام آئے۔ تارڑ صاحب میری اس کارکردگی پر بہت خوش ہوئے تھے۔

قدرت اور نعمت کریم رات گئے تک بیٹھے رہے۔ وہ جب چلے گئے تو پورا شمشال سنسان ہو گیا اور صرف دریا کا پانی شور مچا رہا تھا۔ میں پھر نیند میں ڈوبا تو صبح تک ہوش نہ رہا۔

صبح میں اٹھا جب میری سماعت سے یہ نظم ٹکرائی۔ ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' اس نظم نے مجھے بچپن کی یادوں کے چمن میں کھینچ لیا۔ وہ بھی کیا دن تھے، نہ کوئی فکر نہ پریشانی۔ ہم تھے اور ہماری چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں۔ پل بھر میں روٹھنا اور فوراً ہی من جانا۔ وہ بھی کیا دن تھے۔

میں بیدار تو پہلے سے تھا اور اطمینان سے لیٹا چھت کو تک رہا تھا۔ آج کسی جان لیوا ٹریک پر نہیں جانا تھا۔ پہلے میں جلدی اٹھ بیٹھا تھا کہ اس سے پہلے بقا کی بکرے جیسی آواز میری سماعت سے ٹکرائے اور میرے کان بجنے لگیں۔ اس سے بچنے کا بس یہی ایک طریقہ تھا کہ اس سے پہلے اٹھ جایا جائے کیونکہ میں اکثر جب بھی گہری نیند میں ہوتا بقا کی کھڑکھڑاتی آواز آتی۔ ''اٹھ اوے۔'' میں بیداری سے نہیں ڈرتا تھا جتنا اس خیال سے کہ ابھی بقا اپنی للکارتی ہوئی

آواز میرے کانوں میں زبردستی دھکیلے گا۔

آج میں اس کے ڈر سے پہلے اٹھ بیٹھا تھا مگر جب کمرے کی چھت دیکھی، ماحول کو جانچا تو ایک سکون میں آ کر دوبارہ لیٹ گیا تھا۔ وہ دونوں ابھی سو رہے تھے۔

چھٹی کے ہونے کا اطمینان محسوس کرنے کا میں شاندار تجربہ رکھتا ہوں۔ میں نے اکیس سال کی عمر میں گریجویشن کر لی تھی۔ ڈیرہ اسماعیل خان جیسے شہر سے نکل کر کراچی پہنچ گیا تھا۔ والد صاحب کچھ مہینے پہلے ایک موذی بیماری کے بعد وفات پا گئے تھے۔ والدہ حیات تھیں۔ میں کراچی سے حیدرآباد آ گیا تھا۔ صبح چھ بجے کمپنی کی گاڑی لینے آتی۔ میرے لیے چار پانچ گھنٹے کی کچی نیند کے بعد بیدار ہونا ایک عذاب تھا۔ ایک بار ڈیرہ چھٹیوں پر آیا اور معمول کے مطابق ہڑبڑا کر صبح پانچ بجے اٹھ بیٹھا، جب اردگرد دیکھا تو میں کہیں دور اپنے گھر میں چھٹیوں پر تھا اور جو آرام اور سکون کا احساس اس دن میرے اندر اٹھا تھا وہ میں آج تک نہیں بھلا پایا۔ آج ویسا ہی احساس میرے اندر در آیا تھا جب میں صبح سویرے اٹھ بیٹھا تھا۔ نماز پڑھ کر دوبارہ رضائی لپیٹے لیٹ گیا اور کچھ دیر بعد میری سماعت سے ’لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری‘ کا آخری بند ٹکرایا تو میں اٹھ کر تارڑ صاحب کے کمرے میں آ گیا۔

وہ بھی رضائی میں لپٹے تھے مگر جاگ رہے تھے۔ ان کے کمرے کی کھڑکی کھول کر میں نے شمشال کو دیکھا۔ دھند چھائی ہوئی تھی۔ پہاڑوں سے بادل لپٹے تھے اور آسمان تک تیرتے چلے آ رہے تھے۔ پیلے پھولوں پر دھند تھی۔ ایک بچی اپنا بستہ اٹھائے کھیتوں میں اسکول کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ نیلے فراک میں وہ گڑیا اپنا بستہ سنبھالے بے تحاشا بھاگ رہی تھی۔ ایک کسان جس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی، وہ بیلچے سے اپنی زمینوں کو پانی دینے کے لیے راستہ بنا رہا تھا۔ اس پورے ماحول میں یہی چند چیزیں تھیں۔ اسکول کی جانب بھاگتی بچی، کھیتوں میں کام کرتا کسان، دھند اور لب پہ آتی ہے دعا...... لب پہ آتی ہے دعا ختم ہو چکی تھی اور پاکستان کا ترانہ پاک سرزمین شاد باد فضاؤں میں گونج رہا تھا۔

بھاگتی بچی نے اپنا بستہ زمین پر پھینکا اور احترام میں بت کی طرح کھڑی ہو گئی۔ کسان کا بیلچہ زمین پر پڑا تھا اور وہ دستاغل سر کی طرح تن کے کھڑا تھا۔ شمشال ٹھہر گیا۔ لگتا تھا کہ ہوا رک گئی ہے۔ پرندے خاموش ہو گئے۔

اس بچی نے شاید شمشال سے باہر قدم نہ رکھا ہو۔ وہ کسان بھی شاید ہی شمشال کی سرحدوں سے باہر نکلا ہوگا۔ کتنے بھاشن ان دونوں نے ملک کی محبت کے سنے ہوں گے۔ یہاں تو ٹی وی بھی نہیں تھا جہاں سے وطن کی محبت کے درس نشر ہوتے تھے۔ وہ کیوں اس ارض پاک کے احترام میں اتنے مستعد تھے۔ کیا کوئی ان کو دیکھ رہا تھا کہ ورنہ سزا ملے گی؟ میں اب تک کھڑکی پر جھکا کھڑا تھا؟ تارڑ صاحب آنکھیں جھپک رہے تھے۔ ان کو اٹھا کر یہ منظر دکھایا تو وہ بھی دنگ رہ گئے۔ شمشال کی صبح کا یہ منظر میرے ٹریک کی سب خوشیوں، صعوبتوں، شادمانیوں اور دکھوں پر حاوی ہو گیا۔ فرطِ جذبات سے میری آنکھوں میں پانی اتر آیا، پلکیں بھیگ گئیں۔ تارڑ صاحب کی بھی یہی حالت تھی وطن سے محبت کا یہ جذبہ ان کے لیے میرے دل میں عقیدت پیدا کرنے لگا مگر بقا کے خراٹے جاری رہے۔

نعمت کریم دیسی گھی کی مہک والے پراٹھے لے آیا۔ انڈوں کا آملیٹ ساتھ تھا اور نسیم مجھے ستائشی نظروں سے دیکھتی ہوئی ناشتا کر رہی تھی۔ گرم دودھ میں دلیہ اور پھر چینی کا اس پر چھڑکاؤ اور آخر میں گرم چائے۔ کیا لاجواب ناشتا تھا جس نے ایک نئی توانائی ہم میں بھر دی تھی۔ میں نے کہا تھا۔ ”بقا بھائی! آپ تو یاک بن گئے ہیں۔“

بقا بھائی میرے فقرے پر خفا ہونے کی بجائے مسکرا دیے۔ کیونکہ جس ممبر پر اعتراض اٹھتا تھا کہ وہ کام نہیں کرتا آج وہ ہی سراہا جا رہا تھا مگر تارڑ صاحب بات کی گہرائی بھانپ گئے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھنچ گئی وہ سمجھ گیا کہ میں بقا کو بیل سے تشبیہ دے رہا ہوں۔ بیل جو بے وقوفی کی علامت ہے۔ مگر وہ بے وقوف نہ تھا مگر میں ہی اسے چھیڑتا رہتا تھا۔

اتنے میں چائے کے دوران رجب شاہ بھی آ شامل ہوا۔ ہم نے برآمدے میں چائے پی اور ان بادلوں کو دیکھا جو دستاغل سر سے چلے آ رہے تھے اور برف کی خنکی ساتھ لا رہے تھے۔ کھیت خاموشی کی چادر اوڑھے لپٹے تھے اور پیلے پھول دھیرے دھیرے چلتی ہوا میں جھوم رہے تھے۔

رجب شاہ ہمیں لڑکوں کا اسکول دکھانے لے گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کا نام دولت امین ہے۔ صاف ستھرا اسکول اور اجلے بچے۔ نہ کوئی شرارت اور نہ کوئی شور شرابہ۔ بچوں نے ایک متانت کے ساتھ ہمیں دیکھا۔ برآمدوں میں ڈسٹ بن رکھے تھے۔ کوئی کچرا یا کاغذ کا ٹکڑا ہو تو وہ سیدھا

ڈسٹ بن میں جاتا۔ شمشال کو میلا نہیں رکھنا، شمشالیوں نے یہ اصول بنا رکھا ہے۔ یہ اصول میں نے کینیڈا میں دیکھا جہاں میری بیٹی اریبہ پری اسکول میں داخل ہوئی۔ وہاں کلاس میں کچھ نہیں پڑھاتے۔ کوئی بستہ نہ تھا۔ بس صرف کھیلنے کے لیے کھلونے تھے جس سے اے، بی، سی سکھلائی جاتی تھی اور یہ بتایا جاتا کہ جگہ کو کس طرح صاف رکھنا ہے۔ ڈسٹ بن کا کیسے اور کب استعمال کرنا ہے۔ جب گھر میں اپنی پرانی عادت کے مطابق میں کوئی چیز پھینک دیتا تو اریبہ وہ چیز اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال آتی۔ پھر میں بھی اس سے کچھ نہ کچھ سیکھتا چلا گیا۔ جو اب ایک پختہ عادت بن گئی ہے۔ اب جب بھی پاکستان جانا ہوتا ہے تو یہ عادت وہاں بہت تنگ کرتی ہے۔ ایک بار گتے کے ڈبوں میں آئس کریم کا آرڈر دیا اور میں ڈسٹ بن ڈھونڈ رہا تھا جہاں میں وہ خالی گتے کا گلاس پھینک سکوں۔ مگر ڈسٹ بن نظر نہ آیا۔ میری پریشانی میرے کزن سے چھپی نہ رہ سکی۔ میرے ہاتھ سے کپ لے کر باقیوں کی طرح اسے بھی سڑک پر پھینک دیا اور میں تا دیر دل گرفتہ رہا۔

وہاں لڑکیوں کے اسکول بھی ہیں۔ جہاں خالق صاحب ہیڈ ماسٹر ہیں۔ اسکول کا نام ڈائمنڈ جوبلی مڈل اسکول ہے۔ وہ دفتر میں بیٹھے ان حنوط شدہ پرندوں کو دیکھ رہے تھے جو چھت سے لٹک رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی کسر نفسی کی مجسم تصویر بن گئے۔ ان سے دو چار باتیں کرتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ اس قبیل کے اساتذہ میں شامل ہیں جو تنخواہ کے لیے اسکول نہیں آتے، بلکہ نئی نسل کی تعمیر کا عہد نبھانے اسکول آتے ہیں۔ ان کے پاس معلومات کا خزانہ تھا۔ وہ ہمیں شمشال کے بارے میں بتانے لگے کہ شمشال ایک دور افتادہ مگر مہذب گاؤں ہے۔ علم کی وجہ سے یہاں کسی چہرے سے جہالت نہیں ٹپکتی۔ ان کی کہی ہوئی باتوں کی تصدیق ہماری نظروں نے کر لی۔ وہاں غربت بہت ہے مگر محسوس نہیں ہوتی۔ کوئی طلب گار نظر آپ کی جانب نہیں اٹھتی۔ وہ آپ سے بات کرتے ہوئے آپ کے مقام پر آ جاتے ہیں، یا یہ کہیں کہ ہمیں ان کے مقام تک اٹھنا پڑتا ہے۔ آبادی 1999ء میں تیرا سو تھی۔ سب ایک دوسرے کے رشتے دار ہیں اور ایک خاندان کی طرح رہتے ہیں۔ ہماری موجودگی میں ایک فوتگی ہو گئی تھی تو سارا شمشال سوگ میں ڈوب گیا تھا۔

ہم اسکولوں کے دورے سے فارغ ہوئے تو تین چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہاں سے ہم دریا شمشال کی طرف ایک پہاڑی تک آئے۔ پہاڑی پر ایک دو کچے گھر تھے۔ جن میں ایک قربان علی شاہ کا تھا۔ پورے منظر میں سرسوں کے کھیت تھے اور بھوری آسمانی بلندیوں کے نیچے پیلے کھیت تھے اور چٹانوں سے پرے، بہت اوپر برف جھانک رہی تھی۔

قربان شاید ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ آسمان سے ڈھکے بادلوں کے نیچے ہوا چلی تو ہم کانپ اٹھے۔ قربان گھر سے یاک کا گرم دودھ لایا جو ہم نے ایک پگڈنڈی پر بیٹھ کر مزہ لے لے کر پیا۔

ایک تنہائی اور یگانگی پھیلی تھی۔ جتنے بلند اردگرد کے پہاڑ تھے، اتنا ہی گہرا یہ احساس تھا کہ ہم اپنے بچوں سے دور ہیں۔ دس دن ہو گئے تھے۔ واپسی ایسی آسان بھی نہ تھی کہ کوئی بس پکڑی اور ڈیرہ اسماعیل خان پہنچ گئے۔ واپسی کے لیے اس سے زیادہ پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں جتنے آنے کے لیے تگ و دو کی تھی۔ روڈ کیمپ کے بعد کا آسمانوں سے ہو کر گزرتا، گرتا پڑتا ٹریک اور پھر ملنگٹی گلیشیر سے شمشال تک کا بے سرا راستہ۔ یہ سب کراس کر کے گلگت اور وہاں سے جہاز کی سیٹ حاصل کرنا ایک جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ میں اتنا آج اداس نہ ہوتا اگر میرے دل میں یہ خیال ہوتا کہ اس کے چند ماہ بعد میں اپنے بچوں کو اکیلا چھوڑ کر کینیڈا چلا جاؤں گا۔ حالانکہ کینیڈا جانے کے بہت سے مراحل ابھی باقی تھے۔

قربان ہمیں اپنے ان یاکوں کے بیچ لے گیا جو ایک باڑے کے اندر چر رہے تھے۔ لمبے لمبے بال اور بھینس جتنے حجم میں یاک دیکھ کر خوشی ہوئی۔ زندگی میں پہلی بار اپنی آنکھوں سے اور اتنے قریب سے یاک دیکھ رہا تھا۔ ان کے قریب جاتے ہی ایک عجیب سی مہک اٹھتی ہے۔ یہ یہاں کی معیشت کا ایک اہم پہیا ہے۔ بار برداری، کھیتی باڑی میں تو استعمال ہوتا ہی ہے اس کے دودھ سے دہی اور پنیر بھی بنایا جاتا ہے۔ اس کی اون سے کپڑے بھی بُنے جاتے ہیں۔ جس کے پاس جتنے زیادہ یاک ہوں گے وہ اتنا ہی زیادہ خوشحال سمجھا جاتا ہے۔

ہم سب نے باری باری یاک کی سواری کی۔ میں نے جب کوشش کی تو ایک جانب سے چڑھتے ہی دوسری جانب سے لڑک گیا۔ یہ تماشا کافی دیر تک جاری رہا اور میں اس پر ٹک کر بیٹھ نہ سکا۔ ایک بار تو سر کے بل آ گرا اور کھسیانا سا ہنسنے لگا۔ میں نے فلسطینی رومال سر پر لپیٹ رکھا تھا اور

مونچھیں ٹھوڑی تک آرہی تھیں۔ تارڑ صاحب میرے اس حلیے پر چڑتے تھے اور کچھ نہ کچھ فرماتے رہتے تھے، یہی وجہ اس حلیے میں رہنے کا جواز بن گیا تھا۔

جب سردی بڑھنے لگی تو ہم واپس گیسٹ ہاؤس آ گئے۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ قدرت کے رنگ تبدیل ہونا شروع ہوگئے تھے اور فضاؤں میں سرد ہواؤں اور بہتے دریا کے شور کے علاوہ مکمل خاموشی تھی۔

واپس آئے تو نعمت کریم نے دوپہر کے لیے روٹیاں تیار کی ہوئی تھیں۔ ٹن پیک کوفتوں کو گرم کیا۔ رجب شاہ بھی ساتھ تھا۔ ایک خاموشی میں لنچ ہوا۔ گندم کا خمار چڑھتا ہے تو لیڈر صاحب ڈھیلے پڑتے جاتے ہیں۔ بقا بھی اپنی ڈکار ختم کرنے کے بعد سست پڑ گیا۔ رجب سب کی یہ کاہلی دیکھ نہیں سکتا تھا تو وہ کھسک گیا۔ تارڑ صاحب اور بقا اپنے گرم بستروں میں گھس گئے اور کچھ دیر میں نیند میں چلے گئے۔ میں نے سونے کی کوشش کی مگر یہ نہ ہوسکا۔ کچھ دیر میں برآمدے میں بیٹھ کر ڈائری لکھنے لگا تاکہ بعد میں ان یادداشتوں کو کام میں لاسکوں، وہی ڈائری اب کام آرہی ہے کہ تحریر تیز تر ہوتی جارہی ہے۔ خیر! اس وقت ایک اداسی سی چھارہی تھی۔ تنہائی اپنے جوبن پر تھی۔ بادلوں نے آسمان ڈھکا ہوا تھا۔ آج وقفے وقفے سے بادل چھارہے تھے۔ کچھ بوندیں پھینکتے اور آگے بڑھ جاتے۔ گمان تھا کہ اب برسے کہ تب برسے مگر کوئی زوردار بارش نہ ہوئی۔

کھیتوں میں عورتیں، مرد اور بچے سب کام کرتے نظر آرہے تھے۔ ایک عورت اپنے چھوٹے بچے کو لادے آلو کے کھیت میں کام کررہی تھی۔ کچھ بچے بہتے پانیوں کے کنارے بیٹھے تھے، کھیتوں میں پیلے پھول لگے تھے۔ سب مطمئن اور خوش نظر آرہے تھے۔ دھیمے دھیمے باتیں کرتے، صرف ہنستے، کوئی شور اور جھگڑا نہیں تھا۔

شام سے پہلے تارڑ صاحب اور بقا اپنی نیند پوری کر کے میرے ساتھ برآمدے میں آبیٹھے۔ بھرپور نیند کا ایک گھنٹا بھی آسودگی لے آتا ہے۔ کھنچاؤ کم کردیتا ہے۔ شمشال پر سردی اتر رہی تھی اور ہم گرم چائے پیتے ہوئے خوش ہورہے تھے۔ آج اور کل کے دن ہم اپنی مرضی کے مالک تھے۔ کوئی دردوں والا ٹریک ہمارے سامنے نہ تھا۔ کوئی مہم نہ تھی جو ہم نے سر کرنی ہو۔ ایک فراغت تھی جس نے ہمیں خوش مزاج بنادیا تھا۔ چائے پینے کے بعد بقا اور تارڑ صاحب کے نہ تھمنے والے قہقہے تھے اور سرد ہوائیں تھیں۔ اتنے میں ایک مقامی گائیڈ آگیا۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس، نکھرا ہوا، دراز قد اور سر کے آدھے بال غائب۔ کہنے لگا۔ ”میرا نام عزیز ہے، اور مجھے رجب شاہ نے بھیجا ہے کہ آپ کو شمشال کی سیر کرا لاؤں۔“

بقا ڈکار کر بولا۔ ”ضرور کرالائیں۔ تارڑ صاحب تو آپ کا انتظار کررہے تھے۔“

تارڑ صاحب دراصل اسی برآمدے کی بیٹھک میں بیٹھ کر شمشال کو دیکھنا چاہتے تھے۔ بقا نے ان کے پروگرام کا ستیاناس کر کے رکھ دیا تھا۔ بقا کی جانب ایک گھورتی نظر مار کر وہ اٹھے۔ شوز پہنے، جیکٹ، ٹوپی اور مفلر سے لیس ہوئے۔ ہم نے بھی لیڈر کی تقلید کی۔ بقا نے اپنے واک مین کا ہیڈ فون لگالیا اور ہم سپرد سفر ہوئے۔

کھیتوں سے گزرے تو پیلے پھول دور دور تک اپنی ٹہنیوں پر جھوم رہے تھے۔ قریب سے دیکھا تو ان میں نیلے اور کاسنی پھول بھی شامل تھے۔ مقامی لوگ شام سے پہلے اپنا کام ختم کرنے کی جلدی میں تھے۔ بچے انتہائی خوبصورت اور صحت مند تھے۔ علاج کی سہولت زیادہ نہ تھی۔ ڈسپنسری اور ڈاکٹر کوئی نہ تھا۔ اگر ایک بیکٹیریا آجاتا تو سب میں منتقل ہونے میں اسے کوئی وقت نہ ہوتی۔ اسی لیے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ کئی برس قبل آدھی آبادی ٹی بی میں مبتلا ہوگئی تھی۔ یہ میرے وہاں جانے سے دس سال پہلے کی بات ہے۔ جب میں گیا تو صورت حال بہتر نظر آئی۔ ایک پختہ اینٹوں کی عمارت نظر آئی، جو جماعت خانہ تھی اور وہ ہم نے شمشال میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لی تھی۔ اسماعیلی فرقے کے لوگ یہاں رہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی ندیوں کو پھلانگتے ہم کھیتوں میں سے گزرتے پھولوں کے ہمراہ جھوم رہے تھے۔ شمشال کا رنگ چڑھ چکا تھا۔ بادل ہوا کے زور سے دور ہوتے جارہے تھے۔ برف سے لدی چوٹیاں سنہری ہوگئی تھیں اور چوٹیوں کے نیچے پہاڑوں کے بھورے اور سیاہ وجود تھے۔ آگے ایک قبرستان میں جانکلے۔ ایک قبر کے پاس سے گزرے تو فاتحہ کی دعا بھی بھول گئے۔ خوف سے گھگھی بندھ گئی۔ قبر آدھی سے زیادہ عیاں تھی اور مردے کا سفید کفن بھی نظر آرہا تھا اور ہڈیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔

تارڑ صاحب نے میری یہ حالت دیکھی تو بازو پکڑ کر ہولے سے کان میں تنبیہ کی۔ ”اب چینخنا مت یہاں ایسے ہی دفناتے ہیں اس لیے خاموش ہی رہنا۔“

اس کے بعد ہر قبر دوسری سے زیادہ عبرت ناک نظر

آئی تھی۔ کچھ دیر میں، میں نارمل ہو گیا اور بقا کا ہاتھ پکڑ کر تارڑ صاحب کے پاس لے آیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بقا کو بتائیں ملتان میں اکثر عامل رات کو قبر کھود کر چلہ کرتے ہیں۔ لگتا ہے کوئی ایسا ہی عامل یہاں بھی آ گیا ہے جو وہ اپنا چلہ نامکمل چھوڑ گیا ہے۔ یہ بڑی نحوست ہے۔ اس سے کہیں رات کو کسی بھی قبر میں بیٹھ کر اسے پورا کر لے ورنہ ہم نے واپس بھی جانا ہے اور اس کی نحوست کہیں ہمیں غرق نہ کر دے۔"

تارڑ صاحب نے زور کا قہقہہ لگایا اور بقا کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "ملتان والے کیا جادو سحر کرتے ہیں؟"

میں نے اسے تپانے کے لیے لقمہ دیا۔ "اولیاؤں کی سرزمین ہے وہ، وہاں والوں کے پاس مخفی علم کا ہونا عجیب نہیں۔ اسی لیے کہا کہ اس سے کہہ دو وہ ہمارے جانے کے بعد چلہ کرے۔"

"مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ اس وقت ملتان کا ایک میں ہی ہوں۔ تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔" وہ تو وہیں میری قبر بنانے پر تل گیا تھا اگر تارڑ صاحب بیچ میں نہ ہوتے تو وہ مجھے زندہ ہی کسی کھلی قبر میں دھکیل چکا ہوتا۔

یہاں کا قبرستان دیکھ کر مجھے اپنے ہاں کا قبرستان یاد آ گیا تھا۔ وہی قبرستان جہاں بھری دوپہر میں کسی دوست کو ورغلا کر لے جاتا اور کسی گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر میں کتابیں پڑھ کر وقت گزارا کرتا تھا۔ اکثر میں فیدے کو کھینچ کر لے جاتا۔ فیدے کے والد جھنگ سے ڈی آئی خان آئے تھے۔ بازار میں ایک چھوٹی سی دکان کھول رکھی تھی۔ جہاں مٹھائی جیسی چیزیں بیچتے تھے۔ مٹھائی جیسی چیز کا نام اس لیے لیا ہے کہ لڈو اور برفی کے علاوہ تمام مٹھائی ان کی اپنی ایجاد کردہ تھی جو کھانے میں لذیذ تو تھیں مگر ان کا نام اتنا ہی کجلک ہوتا کہ ہم جیسے لوگ یاد ہی نہیں رکھ سکتے تھے۔ فیدے سے دوستی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اکثر ہماری مدارت کے لیے نظر بچا کر کچھ نہ کچھ لے آتا تھا۔ قبرستان کے سناٹے میں تپتی دوپہر میں اس الھتی عمر میں کسی پیڑ کے سائے میں بیٹھ کر ایسی چوری کردہ چیزیں کھانے کا اپنا ایک خاص مزہ ہوتا ہے۔ ہم اس مزے سے بھرپور لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہر بار بڑھ چڑھ کر اس کی تعریف کرتے تھے۔ ہر بار اپنی تعریف سن کر اس کا ڈھیروں خون بڑھ جاتا تھا جس کا بھرپور عکس اس کے چہرے پر نظر آ جاتا تھا کیونکہ اس

ازدواجیات

☆ شوہر اور بیوی گاڑی کے پہیوں کی طرح ہیں لہٰذا عقل مند شوہر ہمیشہ گاڑی کے پہیے چار کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں، دوسری اور تیسری شادی کی صورت میں۔

☆ شادی شدہ زندگی بہت آسان ہے، جیسے کسی پارک میں واک کرنا، بالکل جراسک پارک کے سیر جیسی آسان۔

☆☆☆

☆ میاں بیوی سفر پر جا رہے تھے راستے میں گدھا گھاس کھاتا ہوا نظر آیا۔ بیوی نے ازراہ مذاق کہا۔ "اپنے رشتہ دار کو سلام کر لو۔"

شوہر نے کہا۔ "کیوں نہیں ضرور۔" اور سر کھڑکی سے نکال کر بولا۔ "سسر جی سلام۔"

گھریلو مسائل کا بہترین حل

بیوی: "ایک بات بولوں؟"

شوہر۔ "نہیں۔"

☆ بیوی بازار سے گھر آنے کے بعد بولی۔ "یہ ڈبا اٹھا لو۔"

شوہر۔ "اس میں ضرور میرے کھانے کی چیز ہو گی۔"

بیوی۔ "ہاں، سینڈل ہیں۔"

☆ بیوی اور بے عزتی ایک جیسی ہوتی ہیں اچھی تب ہی لگتی ہیں جب دوسرے کی ہوں۔

☆☆☆

☆ ایک شریف آدمی کو کیا چاہیے۔

ایک بیوی جو نیک ہو۔

ایک بیوی جو خوب صورت ہو۔

ایک بیوی جو عقل مند ہو۔

ایک بیوی جو گھر ہو۔

اور یہ چاروں بیویاں بڑے پیار سے مل جل کر رہیں۔

مرسلہ: کاشفہ جتول، ملتان

کی رنگت ایسی کھلتی ہوئی تھی کہ سورج کتنا ہی روشن کیوں نہ ہو جائے مگر وہ جلتی ہوئی روئی جیسا ہی نظر آتا۔ ہماری اور اس کی کچہری قبرستان ہے۔ اس کی خبر دوسروں کو بھی تھی اسی لیے اکثر لوگ ہمیں وہاں دیکھ کر کہا کرتے تھے۔ ''بیٹا تمہیں اسکول پڑھنے کے لیے بھیجا جاتا ہے اور تم لوگ یہاں مُردوں کو پڑھانے بیٹھ جاتے ہو۔''

یہی نہیں اسکول کے اساتذہ بھی طنزاً کہتے۔ ''میں تو ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہنے والا ہوں وہ مُردوں کو جاکر سمجھائیں وہ ہمارے اسٹوڈنٹ سے پڑھنا بند کردیں ورنہ ان سے بھی فیس وصولی جائے گی۔''

بچپن کی یادیں ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھینچتی ہیں۔ میں بھی مسکرا اٹھا پھر گیسٹ ہاؤس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

واپس گیسٹ ہاؤس میں پہنچے تو شام اتر چکی تھی۔ ہلکی اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ شام کا اپنا حسن جوبن پر آ گیا تھا۔ چاند دستاغل سر کی چوٹی پر جا بیٹھا اور چاندنی میں دستاغل سر کی برفیں چمک رہی تھیں۔ زہرا ستارہ اس کے قریب تھا جسے تارڑ صاحب زہرہ بائی کہتے تھے۔ بادل بہت کم تھے۔ پہلے پھول ایک سیاہی میں بدل رہے تھے۔ بقا نے پہلے دہی بڑے بنائے۔ اس پر چاٹ کا مسالہ چھڑکا۔ وہ مجھ سے خفا تھا مگر بڑی محبت سے مجھے بھی ایک پلیٹ تھما دی۔ پھر حلیم بنائی۔ بقا نے اپنے واک مین کو چھوٹے اسپیکرز سے جوڑ دیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''بقا بھائی استاد جمن یا پٹھانے خان کا کوئی کلام ہے تو سناؤ۔''

اس نے ''یار ڈھاڈی عشق آتش لائی اے'' لگا دی۔ پٹھانے خان کی آواز شاید پہلی بار شمشال میں گونجی تھی۔ 'میڈا عشق وی توں' کی تال پر ہم سب جھوم رہے تھے۔ سب کی آنکھوں میں شمشال کا خمار اتر آیا تھا۔ گھر سے دوری کا احساس زائل ہوا اور ہم پر حال پڑنے لگے تھے۔

آج شام ہم تینوں اکیلے تھے۔ کوئی مقامی نہ تھا۔ شمشال میں کوئی فوتگی ہوئی تھی اور سوگ میں پورا شمشال تھا۔ تارڑ صاحب کو خیال آیا اور بقا سے کہا کہ موسیقی بند کردو کیونکہ آج شمشال اداس ہے۔

صبح اٹھے تو بادل چھائے ہوئے تھے اور نیچے ہو کر شمشال کے اوپر تیر رہے تھے۔ یخ ہوا چل رہی تھی۔ میں نے جرسی، جیکٹ اور اونی ٹوپی پہن لی۔ آج ہمارا شمشال میں آخری دن تھا۔ کل ہمیں یہاں سے کوچ کرجانا تھا۔ میں اس لیے بھی جلد جانا چاہتا تھا کہ کینیڈا کی ایمبیسی سے اپنے میڈیکل ٹیسٹ کے کاغذات کا پتا کرنا تھا۔ انہوں نے میل کردیئے تھے اور مجھے نہیں ملے تھے۔ آتے ہوئے جب ان کے پاس گیا تھا تو یہی کہا گیا تھا کہ پہلے گھر فون کرکے معلوم کرلینا کہ مل گئے ہیں، اگر نہیں ملے تو ہم ڈپلیکیٹ کاپی بنا کر دے دیں گے مگر اس وقت تو مجھے شمشال کے پہاڑ عبور کرکے گئی اور پہاڑ جیسے سفر کی فکر تھی۔

سب تیار ہوگئے تھے۔ رجب شاہ بھی آچکا تھا۔ نعمت کریم پراٹھے لیے آگیا۔ رات کی حلیم اور انڈوں کے آملیٹ سے ناشتا کیا گیا۔ چائے پیتے ہوئے یہ فیصلہ ہوا کہ آج امین آباد جاتے ہیں۔ امین آباد شمشال کا ایک گاؤں ہے جو ذرا ہٹ کر ایک پہاڑی پر بنا ہے جس کے پیچھے سے شمشال وائٹ ہارن کی چھ ہزار میٹر سے بلند برفانی چوٹی سر اٹھائے جھانکتی رہتی ہے۔

کھیتوں کی پگڈنڈیوں اور چھوٹے بہتے پانیوں کے نالوں پر سے گزرتے ہوئے ہم امین آباد پہنچے۔

پتھروں سے گھرا، امین آباد اپنی طرز کا ایک پرانا گاؤں ہے۔ یہاں ایک سینکڑوں سال پرانے گھر کو شمشالیوں نے عجائب گھر کا درجہ دے رکھا ہے۔ یہ گھر ایک بوسیدہ سی کوٹھڑی ہے، جس کا دروازہ سیاہ پڑ چکا تھا۔ کسی نے بڑھ کر اس کا تالا کھولا اور دروازے کو اندر دھکیلا تو ہم بھی اندر جا پہنچے۔ اس کوٹھڑی کی چھتیں بھی اپنی بوسیدگی سے سیاہ پڑ چکی تھیں۔ سامنے ہی موسیقی کے آلات پڑے تھے۔ تارڑ صاحب نے نیلی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ رباب کی طرز کا آلہ اٹھا کر گود میں لے کر بیٹھ گئے پھر مجھ سے کہا۔ ''میرا فوٹو کھینچو۔''

میں نے کیمرے کا شٹر دبایا تصویر کھینچی جو اس وقت جب یادوں کو میں کاغذ پر منتقل کررہا ہوں میرے سامنے پڑی اس دن کی یاد دلا رہی ہے۔

اس کمرے میں پتھر کے برتن تھے، روسی بندوقیں تھیں، ایک پرانی چھلنی تھی۔ کھیتی باڑی کا سامان تھا۔ میں نے رجب شاہ سے پوچھا۔ ''یہ سامان تو اب بھی شمشال میں استعمال ہوتا ہے۔''

اس نے جواب دیا۔ ''نہیں اب والا اتنا پرانا نہیں ہے۔'' وہ اپنے عجائب گھر میں رکھے سامان کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ ''یہ تو ہمارے باپ دادا استعمال کرتے تھے اور یہ والا جس کا ذکر آپ کررہے ہیں۔ ہم نے نیا بنایا ہے۔''

میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ ٹیکنالوجی وہی پرانی

تھی مگر درمیان میں سالوں کا فرق تھا۔ پتھر کے برتن تھے۔ غلہ اسٹور کرنے کے لیے مٹی کے تندور نما برتن، کوئی پرانی ریڑھی، لسی بنانے کا برتن، بکری کا دودھ دوہنے میں استعمال ہونے والے پیالے...... اسی طرح کا پرانا سامان تھا جو اب بھی نئی شکل میں شمشال میں زیر استعمال ہے۔

کافی دیر تک ہم اس ایک کمرے کے عجائب گھر کی گھوم گھوم کر سیر کرتے رہے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز کا کئی کئی بار معائنہ...... کرلیا تو باہر نکل آئے۔

ہم سب وہاں سے امین آباد آئے۔ یہ سینٹرل شمشال سے بلندی پر ہے۔ گلیشیر سے پانیوں کا تیزی سے بہتا ایک نالہ نیچے گر رہا تھا۔ یہیں وہ ٹربائن لگا تھا جہاں سے بجلی بنتی تھی۔ رجب بتا رہا تھا کہ بجلی جون سے اکتوبر کے مہینے تک ملتی ہے۔ اس کے بعد پانی برف بن جاتے ہیں اور اس طرح بجلی بھی سات ماہ کے لیے غائب ہو جاتی ہے۔

"سردیوں میں کیا آپ لوگ کہیں اور چلے جاتے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

رجب شاہ نے سر کھجاتے ہوئے کہا "نہیں! ہمارے جانور ادھر ہوتے ہیں تو ہم بھی ان کے ساتھ رہتے ہیں۔"

یہاں ہم نالے کے کنارے آبیٹھے۔ بہت سے مقامی ہمارے اردگرد جمع ہو گئے۔

بادل نیچے تک آرہے تھے۔ لگ رہا تھا کہ آج برسیں گے۔ شمشال اپنا اپنا لگنے لگا تھا۔ اب دل اداس سا تھا کہ کل اس کو چھوڑ جانا ہے۔ میں نے رجب شاہ سے پوچھا۔ "آپ لوگ چین کی سرحد کے قریب ہو اور خنجراب نیشنل پارک بھی یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ کبھی سنو لیوپرڈ دیکھا ہے؟"

رجب نے دور دریا کے ساتھ پتھروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "ایک بار سامنے پتھروں پر وہ آ بیٹھا تھا، ہم سب نے اسے دور سے دیکھا۔ شام کا وقت تھا۔ کافی دیر وہ بھی ہمیں دیکھتا رہا اور ہم اسے۔ انسان اور شیر دونوں ایک دوسرے کو خوفزدہ نظروں سے گھورتے رہے۔ پھر وہ شمشال پاس کی طرف چلا گیا۔" یہ کہتے ہوئے رجب شاہ نے اس درے کی طرف اشارہ کیا جو پہاڑوں کے بیچ کسی اور جہانوں میں جاتا تھا۔

سردی کی وجہ سے ہم سب نے اونی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ جیکٹوں اور مفلروں سے ہوا کو روکنے کی کوشش کی۔ میرے پاؤں کے چھالے اب آبلے بن چکے تھے۔ چلنے میں دقت ہو رہی تھی جب کہ میں چپل پہن کر چل رہا تھا۔ تارڑ صاحب اور بقا آگے کسی پل تک جانا چاہتے تھے۔ مگر میں چاہ کر بھی ان کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے میں چھالوں کی تکلیف پر آہ کرتا ہوا واپس گیسٹ ہاؤس آگیا۔ وہ آگے چلے گئے۔

گیسٹ ہاؤس پہنچ کر میں برآمدے میں پڑی کرسی پر آبیٹھا۔ "ان چھالوں کو سوئی سے پھوڑ کر اس کا پانی نکال کر اس کی بینڈیج کرلینا چاہیے۔" میں نے یہ سوچا۔ "پھر ڈائری لکھنے بیٹھوں گا۔"

یہ الفاظ اب بھی میری ڈائری میں لکھے ہیں۔ "شام کے سوا پانچ بج رہے ہیں۔ میں برآمدے میں کرسی پر اکیلا بیٹھا یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ بادل چھائے ہوئے ہیں اور یخ بستہ ہوا شمشال کے کھیتوں سے ہو کر مجھ تک پہنچ رہی ہے۔ ایک تنہائی ہے اور سرسوں کے پیلے پھول دور دور تک پھیلے ہیں۔ ان پھولوں کے آس پاس یاک چرتے نظر آرہے ہیں۔ دستاغل سر کی چوٹیوں سے بادل لپٹے ہیں اور کبھی کبھار

سورج اپنی کوئی جھلک دکھلا کر پھر سے بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ سامنے ایک آدمی بیلچہ لیے کھیتوں میں کام کر رہا ہے۔ دور عورتیں اور بچے کہیں کہیں پھولوں میں سے اپنی جھلک دکھا رہے ہیں۔ بادل گھیرے ہیں، سردی بہت ہے اور گھر یاد آ رہا ہے۔"

میں یہ سب لکھ کر اس ندی کے کنارے آ بیٹھا جو برآمدے سے نیچے اترنے کے بعد کھیتوں کے ساتھ ساتھ بہتی چلی جا رہی تھی۔ کچھ بچے میرے پاس آ بیٹھے۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ میں نے بھی ساتھ دیا کیونکہ میرا حلیہ ہی کچھ ایسا تھا۔ میں رات دن فلسطینی رومال باندھے پھرتا ہوں۔ پچھلے کئی دن کی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی اور مونچھیں دیکھ کر تارڑ صاحب مجھے جانگلوس کہتے تھے۔ کئی دنوں سے میں نے شیشہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اپنا یہ روپ پسند تھا کیونکہ میں اسے اپنی رضا اور خوشی سے اپنائے ہوئے تھا۔ شمشال میں کلچرڈ ہو کر رہنا مجھے اپنے لیے مصنوعی لگتا تھا۔ میں اپنی مرضی کے رات دن گزارنا چاہتا تھا۔

اتنے میں تارڑ صاحب اور بقا واپس آتے دکھائی دیے۔ مشکل سے قدم اٹھاتے وہ چلے آ رہے تھے۔ قریب آئے تو میں نے پوچھا۔ "کیا دیکھ کر آ رہے ہیں۔"

بغیر رکے وہ برآمدے کی جانب بڑھتے گئے پھر بولے۔ "کوئی پل تھا اور کیا تھا!"

بادلوں کی وجہ سے رات جلد ہی اتر آئی تھی۔ یہ ہماری شمشال میں آخری شام تھی۔ قدرت بھی آج ملنے آ گیا تھا۔ نعمت کریم بھی تھا۔ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔

ہم سب خوش تھے کہ چار گھنٹوں سے زائد کے جان لیوا ٹریک سے تو سب کی جان چھوٹی۔ بقا نے بڑھ کر رجب شاہ کو سیلوٹ دے مارا اور ایک قہقہہ برآمدے میں گونجتا چلا گیا۔ اس خوشی میں بقا نے بہت کچھ بنایا اور سب نے مل کر کھایا۔ واک مین کے اسپیکر پر لوک دھنیں بجتی رہیں...... میرا عشق وی توں...... میرا یار وی توں......

سب جا چکے تھے۔ بقا نے سامان لپیٹ لیا تھا۔ ہم یہاں اس تنہائی میں بیٹھے تھے۔ آج بجلی بھی بند تھی اور برآمدے میں لالٹین لٹکی تھی۔ میں نے دور اندھیرے میں سر اٹھائے کھڑے وطن عزیز کی پہرے داری کرتے پہاڑوں کی چوٹیوں پر آخری سلام والی نظر ڈالی مگر دھندلاہٹ نے الوداعی نظروں پر آڑ لگا دی۔ مایوس ہو کر میں کھڑکی سے ہٹا تھا کہ اتنے میں بارش شروع ہوئی اور شمشال بھیگنے لگا۔

آسمان پر بجلی کڑکی اور پھر اپنی پوری قوت سے پانی برسا۔ تارڑ صاحب کے ساتھ ساتھ ہم دونوں بھی اپنی اپنی سوچ میں بہہ رہے تھے۔ تارڑ صاحب نے پوچھا کہ میرے اس سفرنامے کا عنوان کیا ہونا چاہیے۔ مختلف لوگوں نے مختلف نام لیے مگر انہیں پسند نہ آئے۔ میں نے اچانک کہا۔ "شمشال بے مثال"۔

تارڑ صاحب نے تعریفی انداز میں تائید کی۔ تبھی بجلی پھر سے دستانغل سر پر کڑکی اور ہم بارش کے اندر آتے چھینٹوں میں دوبارہ بھیگنے لگے۔

بادلوں کی وجہ سے رات جلد ہی اتر آئی تھی۔ یہ ہماری شمشال میں آخری شام تھی۔ قدرت بھی آج ملنے آ گیا تھا۔ نعمت کریم بھی تھا۔ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ میں نے اپنی تمام میڈیسن ان میں بانٹنا شروع کر دی، پینسل سے لکھتا جا رہا تھا کہ یہ کس مرض کی دوا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ یہ سب پا کر اتنے خوش ہوں گے۔ دراصل اس دور افتادہ علاقے کی جانب سے محکمہ صحت نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اسپتال دور، ڈاکٹر پہنچ سے باہر اس لیے ضروری دوائیں ان کے لیے بیش بہا تحفہ ثابت ہوئیں۔ اسی لیے وہ سب اتنے خوش ہو رہے تھے۔

رجب شاہ نے کہا کہ صبح ٹریکٹر ٹرالی آپ کو میرے گھر فرمان آباد سے آگے تک چھوڑ آئے گی۔

یہ خبر بہار جان فزا تھی۔ ہم سب خوش تھے کہ چار گھنٹوں سے زائد کے جان لیوا ٹریک سے جان چھوٹی۔

بقا نے بڑھ کر رجب شاہ کو سیلوٹ دے مارا اور ایک قہقہہ برآمدے میں گونجتا چلا گیا۔ اس خوشی میں بقا نے بہت کچھ بنایا اور سب نے مل کر کھایا۔ واک مین کے اسپیکر پر لوک دھنیں بج رہی تھیں۔ میرا عشق وی توں۔۔۔ میرا یار وی توں۔۔۔

رات اتر آئی تھی۔ بادل گرج رہے تھے بارش کا لطف دے رہے تھے۔ سب مل کر چلے گئے مگر قدرت گلے لگ کر بہت دیر کھڑا رہا۔ آج اتنے دن بعد بھی اس کا لمس تازہ لگتا ہے، محبت و عقیدت میں گندھا لمس۔ اسی لیے جب پچھلے دنوں اخبار میں پڑھا کہ قدرت کا شمار اب مشہور کوہ پیماؤں میں ہو رہا ہے تو بہت خوشی ہوئی تھی۔

رات بھر بارش میرے کمرے کی چھت پر برستی رہی۔ صبح ٹریکٹر نے ہمیں فرمان آباد سے آگے پہاڑ کے دامن میں چھوڑنا تھا اور وہاں سے آگے ہمارا واپسی کا ٹریک شروع ہونا تھا۔ بارش کا شور مجھے اس خدشے سے سونے نہ دیتا تھا کہ

کہیں یہ ٹریکٹر والا راستہ دلدل نہ بن جائے اور ہمیں یہ گھنٹوں کا سفر پیدل طے نہ کرنا پڑے۔

دن کی روشنی اتری تو صبح ابھی تک ٹپک رہی تھی۔ ہم تینوں کی نظریں آسمان کی وسعتوں میں پھیلے بادلوں پر تھیں جو ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے۔ تارڑ صاحب کہنے لگے۔ ''اگر ٹریکٹر نے نہیں جانا تو ہمیں جلد نکلنا چاہیے۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''تاکہ رات ہم زیارت میں کیمپ لگا سکیں۔''

بقا بری طرح گھبرا اٹھا۔ اس نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔ ''کیا پیدل جانا ضروری ہے؟''

دراصل وہ اس خشک، بے آباد اور ویران راستے پر چلنے سے کتراتا تھا۔ میری اور تارڑ صاحب کی بھی یہی حالت تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وستاغل سرے ہواؤں کے جھکڑ چلنا شروع ہوئے اور بادل شمشال سے پرے کھسکنے لگے۔ سورج کی کرنیں بادلوں کے کناروں کو منور کرنے لگیں اور ساتھ ہی ہمارے چہرے بھی دمکنے لگے۔

اب ہمیں ٹریکٹر کا انتظار تھا جس نے ہمیں لاد کر لے جانا تھا۔ بادل ہٹے مگر ٹریکٹر کی آواز ہوا میں کہیں سے بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ اس وادی میں اگر یاک بھی ڈکراتا ہے تو آواز ہم تک آتی تھی اور یہ تو ٹریکٹر کی آواز تھی، جس پر ہم کان لگائے بیٹھے تھے مگر ابھی تک مایوس تھے۔

اسی انتظار میں دو گھنٹے گزر گئے۔ میں اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ تارڑ صاحب میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے۔ ''ندیم! ٹریکٹر کا تو دور دور تک نام و نشان نہیں۔ کیا پیدل چلنا ہے؟''

میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، مگر بقا سے پوچھ لیں کہ وہ کیا چاہتا ہے؟''

ہم اٹھ کر باہر برآمدے میں آئے تو بقا کرسی پر آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ تارڑ صاحب نے اپنا سوال دہرایا تو وہ چونکا اور التجا بھری نظروں سے انہیں تکنے لگا۔ اتنے میں کہیں دور سے ٹریکٹر کی گڑگڑاہٹ سنائی دی تو بقا اچھل کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ''چلیں پیدل ہی چلتے ہیں۔''

تارڑ صاحب اور میں مسکرا کر رہ گئے۔ اس کی چالاکی تارڑ صاحب نے بھی بھانپ لی تھی۔

ٹریکٹر کچھ دیر بعد ہمارے گیسٹ ہاؤس کے سامنے آ پہنچا۔ ہمارا سامان اس میں شفٹ ہوا۔ رجب بھی اپنے تھری پیس سوٹ میں موجود تھا۔ ہم نے اپنی اپنی جگہ کہیں نہ کہیں بنائی اور ہچکولے لیتے ہوئے روانہ ہوئے۔

قرمان آباد میں اترے تو یہاں رجب شاہ کے گھر پر چائے اور دوسرے لوازمات تیار تھے۔ ہم اس سے فارغ ہوئے تو پھر رجب شاہ نے سامان تول کر پورٹرز کے حوالے کیا۔ ٹھنڈی ہواؤں کے دوش پر ایک بار پھر ٹریکٹر پر بیٹھے اور عازم سفر ہوئے۔ بارش کی وجہ سے دریا کا پانی ہمارے دائیں جانب خوب اچھلتا اور شور مچاتا تھا۔

آگے وہ ندی آئی جہاں سے مجھے قربان نے اپنی پیٹھ پر لاد کر پار کروایا تھا، وہیں ہم کو اتار دیا گیا۔ گزرے لمحے نظروں کے سامنے آگئے۔ ندی کو ویسے ہی پار کیا جیسے پہلے کیا تھا۔ یہیں سے ہمارا ٹریک شروع ہوا۔

شام اترنے سے پہلے ہم زیارت پہنچ چکے تھے۔ خیمے لگے۔ کھانا اسی دھواں دار کمرے میں تیار ہوا۔ بقا کے کیسٹ پلیر سے موسیقی گونجنے لگی۔ تارڑ صاحب موج میں آگئے اور میں اپنی ڈائری لے کر کچھ دور ہو کر ایک پتھر پر بیٹھ کر نوٹس بنانے لگا۔ اردگرد وہی خاموش اور تنہا ماحول تھا اور کوئی گانا فضا میں گونجتا تھا۔ میں نوٹس بنا رہا تھا کہ تارڑ صاحب کی آواز مجھ تک پہنچی۔ ''ندیم! یہاں سے آگے اکیلے نہیں جانا۔ ادھر خطرناک جانور بھی ہوتے ہیں۔''

دوسرے دن صبح ہم واپسی کے لیے روانہ ہوئے تو میرے ذہن میں وہی خطرناک پگڈنڈیاں تھیں جو ہزاروں فٹ کی بلندی پر چلنے والے کو چکرا کر دریا شمشال میں پھینکنے پر پوری قدرت رکھتی تھیں۔ تارڑ صاحب نے روانہ ہونے سے پہلے ہی مجھے ڈرا دیا کہ تم آتے وقت بے خوف ہو کر چل رہے تھے اور میں نے تم کو ٹوکا نہیں تھا۔ اس بار احتیاط کرنا۔

احتیاط تو مجھے کرنی ہی تھی مگر اس بار میں ایک شدید خوف میں بھی مبتلا ہو گیا کہ واقعی میں بے پروا ہو کر چلتا تھا۔ روڈ کیمپ تک میں ڈولتا ڈولتا پہنچا۔ وہاں پورٹر ہم سے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ تارڑ صاحب نے ہمارا سامان ان سب میں بانٹ دیا۔ ہم اس دریا دلی پر خوش تھے اور سب پورٹر شکر گزار بنے کھڑے تھے۔ جیپ موجود تھی جس نے ہمیں کریم آباد تک چھوڑنا تھا اور وہاں سے ہم نے کوئی ویگن لے کر گلگت پہنچنا تھا۔

جیپ روانہ ہوئی اور ہم خاموش بیٹھے اس وادی سے باہر نکل رہے تھے جہاں ہم نے زندگی کے خوبصورت دن رات گزارے تھے۔ شاہراہ ریشم پر جب جیپ اتری تو سب ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے۔ پکی سڑک پر بھاگتی

عصر حاضر کے تان سین استاد نصرت فتح علی خان اپنے بچپن میں محمد رفیع، لتا، آشا، مکیش اور طلعت محمود کے گیت گاتے رہتے تھے مگر ان اعلیٰ پائے کے سنگرز کو وہ عزت اور تکریم عالمی سطح پر حاصل نہیں ہوئی جو استاد نصرت فتح علی خان کو ان کے عروج کے دور میں حاصل ہوئی۔ استاد نصرت فتح علی خان کو عصر حاضر کا تان سین کہنے کی یہ وجہ ہے کہ تان سین کی گائیکی میں جو عجیب وغریب خوبیاں تھیں استاد کی گلوکاری میں بھی کچھ ایسی ہی غیر معمولی قوت تھی جس کا مظاہرہ کئی مواقع پر ہوا۔ 1992ء میں جب پاکستانی کرکٹ ٹیم نے عمران خان کی قیادت میں ورلڈ کپ جیت لیا تو پاکستانی کھلاڑیوں نے عالمی میڈیا کو یہ بیانات دیے تھے کہ ہمیں استاد نصرت فتح علی خان کی قوالیوں نے ایک روحانی تحریک بخشی تھی جس کے نتیجے میں ہم فتح یاب ہوئے جس کے بعد استاد نصرت فتح علی خان دیومالائی کردار بن گئے۔ استاد کہنے کو تو بنیادی طور پر ایک قوال تھے لیکن گائیکی کے میدان میں ان کی صلاحیتیں بہت آگے تک پہنچ گئی تھیں اور ان کے فن کے قدردان ہالی ووڈ سے لے کر بالی ووڈ تک ان سے استفادہ کرنے میں پیچھے نہیں رہے۔ پیٹر گیبریل نے "The last temptation of christ" کے ساؤنڈ ٹریک کے لیے ان کی آواز سے استفادہ کیا۔ انہوں نے ایڈی ویڈر کے ساتھ ٹم روبن کی فلم "Dead man walking" کا ساؤنڈ ٹریک بھی ترتیب دیا جب کہ اولیور اسٹون کی "Natural born killer" کا ساؤنڈ ٹریک بھی بنایا جس پر وہ تنقید کا نشانہ بھی بنے کہ انہوں نے پُرتشدد مناظر کے لیے قوالی کا انتخاب کیا۔

1993ء میں معروف بھارتی ہدایت کار شیکھر کپور اپنی فلم "بینڈٹ کوئن" (پھولن دیوی) کی زندگی پر بننے والی فلم کا میوزک کمپوز کرانے کے لیے خود چل کر ممبئی سے لاہور آئے تھے۔ پھر ممبئی کے دیگر فلم سازوں اور موسیقاروں نے ان کی موسیقی سے

جب سب کو اطمینان میں رکھتی تھی کہ یہ اب ہمیں کریم آباد پہنچا کر ہی دم لے گی۔ قراقرم کے جنوں کے بیچ ہماری جیپ کریم آباد کی جانب بھاگی چلی جاتی تھی۔

راستے میں تارڑ صاحب نے جیپ کے ڈرائیور سے معاملات طے کیے اور اس نے کچھ زیادہ رقم کے بدلے ہمیں گلگت چھوڑنے پر ہامی بھر لی۔ کچھ دیر ہم راکاپوشی کے دامن میں بیٹھے رہے اور چائے کا دور چلا۔ ایک مطمئن اور آسودگی کے ماحول میں بیٹھ کر ہم گرم چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور راکاپوشی سے ٹھنڈی ہوا بلا روک ٹوک ہم کو چھوے ڈالتی تھی۔ گلگت پہنچے تو شام کو اترنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔

☆......☆

شمشال بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا اور اب ہم گلگت میں آبیٹھے تھے۔ اب مجھے اسلام آباد کی فلائٹ پکڑنی تھی۔ تارڑ صاحب اور بقا کسی طرح فلائٹ پر اپنی سیٹیں کنفرم کر کے آ چکے تھے۔ کل خراب موسم کی وجہ سے ایک ہی فلائٹ گلگت پہنچی تھی اور ایئرپورٹ پر دو پروازوں کے مسافر دھکم پیل کر رہے تھے۔ اس میں زور آور نکل گئے اور ایئرپورٹ پر مجھ جیسے پیچھے رہ گئے تھے۔

ہم شمشال سے منزلیں مارتے دو دن پہلے گلگت پہنچے تھے۔ تارڑ صاحب اور بقا دونوں خالد ندیم کے گھر میں ٹھہر گئے اور میں سیدھا گارڈن ہوٹل چلا آیا تھا۔ خالد ندیم پرانا کوہ نورد تھا اور تارڑ صاحب کے ساتھ کئی ٹریکس کر چکا تھا اور ان دنوں گلگت کے کسی بینک میں پایا جاتا تھا۔

میں نے ہوٹل میں سامان رکھا اور گھر فون کیا۔ سمیعہ خفا تھی کہ پچھلے کئی دن سے فون کیوں نہ کیا۔ بیوی کو سمجھانا مشکل ہوتا ہے اسے کیا بتاتا کہ میں کہاں تھا...... اور کیا کر رہا تھا۔ میں نے باتوں کا رخ بدلنے کے لیے پوچھا۔ "کیا ایمبیسی سے کوئی میل آئی ہے۔"

"جی نہیں۔" سمیعہ نے کہا۔ "کینیڈین ایمبیسی سے ابھی تک کوئی میل موصول نہیں ہوئی۔"

اس کے جواب پر میں نے سوچا کہ مجھے میڈیکل کے کاغذات لینے اب خود ہی ایمبیسی جانا ہوگا۔

فون کرنے کے بعد میں سیدھا ایک نائی کی دکان پر گیا۔ بڑھی مونچھیں تراشیں، شیو بنوائی اور مہذب انسان بن گیا۔ کئی دنوں بعد آئینے میں اپنی شکل دیکھی تھی۔ پھر وہاں سے سیدھا خالد ندیم کے گھر گیا۔ تارڑ صاحب مجھے دیکھ کر چونک گئے۔ "تم تو کافی بدل گئے ہو! یہ مونچھیں پہلے کیوں نہیں کٹواتے تھے۔"

اپنی فلموں کو اعزاز بخشا، جب کہ ہالی ووڈ والے پہلے ہی ان سے فیض حاصل کر چکے تھے۔ بات ہو رہی تھی استاد نصرت فتح علی خان کی گائیکی کی روحانی قوت کی۔ اللہ نے عصر حاضر کے اس تان سین کی گلوکاری کو کیا تاثیر بخشی تھی اس کا احوال بھارت کے شہرۂ آفاق موسیقار اے آر رحمن کی زبانی سنیے۔ اے آر رحمن بولی ووڈ میں موسیقی کے حوالے سے ایک بڑا نام ہے۔ جس نے بغیر کسی سہارے، سفارش یا اثر و رسوخ کے صرف دس سال کے عرصے میں موسیقی کی دنیا میں ایسا بلند مقام حاصل کر لیا جہاں تک پہنچنے کے لیے برسوں کی جدوجہد بھی کام نہیں آتی۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جائیں جہاں ہندوستانی بستے ہیں ان کے لبوں پر رحمن کی دھنیں ہوتی ہیں۔ فلم "روجا" کے گیتوں سے رحمن کی مقبولیت کا جو سفر شروع ہوا تھا وہ آج بھی جاری ہے۔ اے آر رحمن 1996ء میں جب اپنی والدہ اور شاعر محبوب کے ہمراہ لاہور آئے تو ایک صحافی کو انٹرویو دیتے وقت یہ باتیں بتائی تھیں۔

"امریکا کے شہر نیویارک میں استاد نصرت فتح علی خان کا ایک کنسرٹ جاری تھا جس میں ہزاروں مسلمانوں کے ساتھ ہزاروں گورے گوریاں بھی استاد کی قوالی "اللہ ہو" سننے کے دوران اللہ ہو کا ورد کرنے میں مصروف تھے۔ کنسرٹ کے بعد جب میں مدراس واپس آیا تو ہر وقت میرے دھیان میں "اللہ ہو" کا ورد رہنے لگا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرا دل دھڑک دھڑک کر اللہ ہو کہہ رہا ہو۔ پھر ایک رات بابا شاہ قادری میرے خواب میں آئے اور انہوں نے مجھے بشارت دی کہ پروردگار نے میرے اور میرے اہلِ خانہ کے لیے کلمۂ طیبہ پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ ہم سب گھر والوں نے اگلی صبح کلمہ طیبہ پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔"

مرسلہ: انور فرہاد۔ کراچی

میں بولا۔ "تارڑ صاحب! وہ دن پیچھے رہ گئے اور اب ہم آگے بڑھتے ہیں......"

بقا ٹانگ پر ٹانگ رکھے آسودگی سے لیٹا تھا اسے دیکھ کر میں نے کہا۔ "پتا نہیں ملتان کے دروازے اپنی جگہ ہیں بھی کہ نہیں۔"

"کون سے دروازے؟" بقا نے چونک کر پوچھا۔

"تمہیں کیا خبر، ملتان کا ایک خونی دروازہ ہے، کوئی اسے نکال لے گیا۔"

"خونی دروازہ......! یہ کہاں تھا خونی برج تو ہے یہ خونی دروازہ پہلی بار سن رہا ہوں۔"

"وہ خونی برج ہے نا، اسی کے ساتھ ایک حویلی ہے۔ اس حویلی کے عقب میں ایک محل ہے محل کے پیچھے ایک گھر ہے اس گھر کے دروازے پر کسی بڑی شخصیت کو قتل کیا گیا تھا اس لیے وہ خونی دروازہ کہلاتا ہے۔ کوئی اسے اکھاڑ کر لے گیا۔" میرے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ لہجہ بھی سنجیدہ تھا اس لیے بقا سمجھ نہ پایا۔ اس نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

"دروازہ کون لے گیا ہوگا؟ تاریخی چیزوں کی تو حفاظت کرنی چاہیے۔"

میرے مذاق پر وہ تارڑ صاحب کی جانب دیکھنے لگا تو بولے۔ "اب خود شیر بن اور میرا سہارا لینا چھوڑ دے۔"

دراصل ٹریک کے دوران وہ سینئر کوہ نورد ہونے کے فائدے اٹھا چکا تھا اور اب ٹریک ختم ہوا تو وہ میری گرفت میں تھا۔

دوسرے دن ٹکٹوں کی بھاگ دوڑ ہوتی رہی۔ میں اپنا سامان لے کر ائر پورٹ پہنچ گیا تھا مگر کچھ دیر بعد کھڑا جہاز کو بلندیوں پر اسلام آباد جاتے دیکھ رہا تھا پھر مایوس ہو کر اداسی میں گھرا ہوٹل کے کمرے میں لوٹ آیا پھر بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ تبھی خالد ندیم اور اشفاق آ پہنچے۔ مجھے کل کی فلائٹ پر ایک سیٹ مل چکی تھی مگر گلگت پر بادل تھے اور برس رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایسے کب تک یہاں بیٹھا رہوں گا۔ دوسرے دن کی کسی پنڈی جاتی بس سے ایک سیٹ بھی کنفرم کروالی تھی۔ اب گھر کے لیے بے چینی تھی اگر بارش کی وجہ سے کل فلائٹ نہیں آتی تو مجھے بائیس گھنٹوں کا سفر شاہراہ ریشم پر کرنا تھا۔ میں مشکل حالات میں گھرا تھا۔

دوسرے دن ائر پورٹ گیا۔ بادل چھائے تھے مگر اللہ کے کرم سے جہاز ائر پورٹ پر اتر آیا۔ سب دوستوں سے

گلے مل کر، ان کی محبتیں اپنے دل کی پوٹلی میں باندھ کر میں واپس اسلام آباد پہنچ گیا۔ یہ ٹریک کر کے میں بہت مسرور تھا۔ ائرپورٹ پر مسعود چودھری آیا تھا۔ ہم سیدھا کینیڈا ایمبیسی پہنچے اور انہوں نے چند لمحوں میں میڈیکل کے کاغذات مجھے تھما دیے۔ تاکید کی کہ ایک تو اس لفافے کو کھولنا نہیں ہے اور ان کے پینل پر کسی ڈاکٹر سے اپنا اور اپنی فیملی کا چیک اپ کروانا ہے۔ پھر وہی ڈاکٹر ہمارے ٹیسٹ کی رپورٹ انڈیا میں امیگریشن کے ریجنل آفس میں بھیجے گا اور اگر میڈیکل کے ٹیسٹ ٹھیک نکلے تو چند ماہ میں آپ کو امیگریشن کے پیپرز مل جائیں گے۔

امیگریشن صرف میری تھی اور ان کے کہنے پر میں پوری فیملی کا میڈیکل کروا رہا تھا کیونکہ میڈیکل کے رزلٹ ایک سال تک قابل قبول ہوتے ہیں تو میں نے یہ سوچا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ میں انھیں ایک سال میں بلوا لوں مگر مجھے یہ مشکل اس لیے لگ رہا تھا کہ اگر ایک سال میں مجھے کوئی اچھی جاب نہ ملی تو کیا ہوگا۔ کیا میں اپنے بچوں کو بلوا سکوں گا؟

ان سے کاغذات وصول کر کے میں نے مسعود کا شکریہ ادا کیا اور ڈیرہ کی بس میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ جون کے آخری دن تھے اور پورا علاقہ جھلس رہا تھا اور میں خود اندر سے بھیگ رہا تھا کیونکہ اب میں کینیڈا جانے والا تھا۔ میرا خواب حقیقت بننے جا رہا تھا۔ وہ خواب جو کئی بار ٹوٹ کر بکھرتا رہا تھا۔ جو میں اب بن بھی نہ رہا تھا اور اس کو زیادہ سوچتا بھی نہ تھا اور اپنے آپ کو امیدی اور ناامیدی کے درمیان رکھتا تھا۔ میں اپنے ساتھ وہ نہ ہونے دینا چاہ رہا تھا جو ایک بار پہلے میرے امریکا کے ویزے کے مسترد ہونے پر میرے ساتھ ہوا تھا اور میں ذہنی دباؤ میں آگیا تھا۔

ڈیرہ آیا تو میری بیوی سمیعہ مجھ سے ابھی تک خفا تھی کہ میں نے اسے شمشال سے فون کیوں نہ کیا...... میں نے اس کو سمجھانا چاہا مگر وہ میری بات سننے کو تیار ہی نہ تھی۔ میں نے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور اس سے کہا کہ ہمیں پشاور میڈیکل کے ٹیسٹ کروانے جانا ہے، ایک دو دن میں تیاری کرلو۔

کئی سال بعد اب جب میں یہ سفرنامہ لکھنے بیٹھا اور شمشال کے فوٹو نکالے تو اسے دیکھ کر سمیعہ نے کہا کہ ”یہاں سے آپ کیسے مجھے فون کرسکتے تھے؟“

میں یہ سن کر بولا۔ ”یہ بات میں مہینوں تمہیں سمجھاتا رہا تھا..... مگر تم نے تو فوٹو دیکھنا بھی گوارہ نہ کیے تھے۔“

کچھ دنوں بعد ہم میڈیکل ٹیسٹ کے لیے ڈیرہ سے پشاور پہنچ گئے۔ اس وقت اریبہ ایک ماہ کی تھی اور اس کے بھی مکمل ٹیسٹ ہوئے۔ اللہ سے دعا کر رہا تھا کہ ہمارے ٹیسٹ کے رزلٹ ٹھیک نکلیں۔ ڈاکٹر کے اسٹاف نے کہا کہ وہ خود انہیں کینیڈا کے ریجنل آفس، جو نئی دہلی میں ہے، کو پوسٹ کر دیں گے۔

میں پشاور میں رکا رہا۔ دو دن بعد میں سخت گرمیوں کی گرم دوپہر کو موٹر بائیک پر ڈاکٹر کے کلینک گیا۔ وہاں ایک اسٹاف سے معلوم کیا کہ میڈیکل کے سب رزلٹ کیا تھے؟ اس نے جواب دیا۔ ”سب ٹھیک تھے اور میں نے پوسٹ بھی کردیے ہیں۔“

یہ سن کر میرے حواس ٹھیک ہوئے۔ میرے خدشات ختم ہوئے تو میں ایک دم سے ریلیکس ہوتا چلا گیا۔ اب میرا پشاور میں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہ تھا اور مجھے ڈیرہ میں رہ کر اپنے ویزے کا انتظار کرنا تھا۔ یہ جولائی 1999 کا پہلا ہفتہ تھا اور ہم سب ڈیرہ لوٹ آئے۔

میں ان دنوں یونیورسٹی میں لیکچرار تھا۔ یونیورسٹی کی جاب سے اتنے پیسے بن نہ پاتے تھے کہ گھر ٹھیک طریقے سے چلا سکوں تو اس لیے ایک دوست سے مل کر فارمیسی کھول رکھی تھی۔ دوپہر کو یونیورسٹی سے واپس آتا اور ایک ڈیڑھ گھنٹے آرام کے بعد میں فارمیسی چلا جاتا اور پھر رات گیارہ بجے واپسی ہوتی۔ دوسرے دن کا لیکچر تیار کرتا اور اس کے بعد سفرنامے لے کر بیٹھ جاتا۔ یہ معمول مجھے ایک چکر میں رکھتا۔ دراصل میں ایک اذیت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ مجھے فرار چاہیے تھا اور یہ فرار مجھے ملنے کی امید بندھ آئی تھی۔ میں دوستوں میں بیٹھ کر یہ کہتا کہ اگر میں ابھی اکیلا جاتا ہوں تو کم سے کم تنخواہ آٹھ ڈالر فی گھنٹا ہوگی۔ ہفتے میں چالیس گھنٹے اور دن میں آٹھ گھنٹے کام ہوتا ہے۔ ان پیسوں میں تو مجھے اپنے خرچ کے بعد اتنی بچت بھی ہو جائے گی کہ میں اپنے بچوں کو بھی پاکستان میں سپورٹ کرسکتا ہوں۔

مجھے یہ خوشی سب سے زیادہ تھی کہ آٹھ گھنٹوں کے بعد میرے پاس وقت ہوگا۔ میں کتابیں پڑھوں گا، سفرنامے لکھوں گا اور کیمپنگ کروں گا۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں اور کچھ نہ ہوتا تھا۔

ڈیرہ آنے کے بعد میں نے اپنا معمول بدل لیا۔ ان دنوں یونیورسٹی گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے بند تھی اور

فارمیسی جانے کا معمول قدرے آسان تھا۔ میں دوپہر تک فارمیسی میں رکتا اور پھر دوبارہ گھر آ کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں کمپیوٹر سیکھنے کے لیے شام سے پہلے کسی پرائیویٹ ادارے میں چلا جاتا تھا۔ یہی دن تھے جب کمپیوٹر پاکستان میں متعارف ہو رہا تھا۔ انٹرنیٹ نہ تھا، کمپیوٹر کا استعمال صرف ٹائپنگ کے لیے ہوتا تھا۔ میں مائیکروسافٹ آفس کے سب پروگرام سیکھ رہا تھا۔

یہ دن میری آزادی اور سرمستی کے تھے۔ دھیرے دھیرے بہتے کسی دریا کی موج میں، میں بھی بہہ رہا تھا۔ نہ مجھے فارمیسی کے کاروبار کی فکر تھی اور نہ لیکچر تیار کرنے ہوتے تھے۔ میں نے فارمیسی پر اپنے دوست حنیف کو بتا دیا تھا کہ میں تو کبھی بھی کینیڈا چلا جاؤں گا اور آج سے اس کاروبار کے مالک تم ہو۔ میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ تم مجھے اتنے ہی پیسے دے دینا جو میں نے شروع میں لگائے تھے۔ میں یہ بھی شاید نہ مانگتا اگر مجھے اپنے ساتھ کچھ ماہ کا خرچ نہ لے جانا ہوتا...... بعد میں وہ پیسے جو اس نے دیے تھے، وہ بھی اس کو واپس کر دیے۔

ان دنوں میں صرف اپنے خوابوں میں رہتا تھا۔ دریا سندھ جو ڈیرہ اسماعیل خان کے مشرق میں ہزاروں سالوں سے بہہ رہا ہے۔ اس کے ٹھنڈے کنارے پر ایستادہ پرانے بلند درختوں کی چھاؤں میں بیٹھا رہتا تھا۔ گرمیوں میں یہ دریا اپنے کناروں سے باہر آ کر بہتا ہے۔ اس کا دوسرا کنارہ بھی بمشکل نظر آتا ہے۔ میں یہیں بیٹھ کر اس دریا کی بہتی لہروں اور موجوں کو دیکھا کرتا۔ ان لمحات کو کھو دینے کا دکھ اور آنے والے پل کی شادمانی ایک دوسرے میں مدغم ہو گئی تھیں۔ میں کچھ زیادہ فرق نہ کر سکتا تھا کہ میں زیادہ خوش ہوں یا افسردہ؟

ہر انسان پر ایک ہی وقت مختلف انداز میں اثر انداز ہوتا ہے۔ بارش کا پانی پختہ زمین پر بہہ جاتا ہے اور کچی مٹی اسے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ سخت دل رشتوں کی پہچان نہیں رکھتے مگر گداز دل انہیں کھونے سے ڈرتے ہیں۔ میں اس زمین پر پل کر جوان ہو کر ایک تنومند درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ڈرتا تھا کہ میں اپنے ہاتھوں اپنی جڑیں اکھاڑ کر کسی نئی زمین میں گاڑ سکوں گا؟ گاڑ بھی دی تو کیا یہ اس مٹی میں اپنی گرفت برقرار رکھ سکیں گی؟

میری کمپیوٹر کی کلاس میں کچھ اور بھی طالب علم تھے۔ انسٹرکٹر کو معلوم تھا کہ میں کچھ مہینوں میں کینیڈا جا رہا ہوں۔ اس نے یہ بات کلاس میں بتا دی تھی۔ ڈیرہ میں شاید میں پہلا شخص تھا جو امیگریشن لے کر کینیڈا جانے والا تھا۔ اسی لحاظ سے میں دوسرے طالب علموں کی نظروں میں رہتا تھا۔ سب مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے اور انسٹرکٹر بھی مجھ سے کم عمر تھا۔ کلاس کے بعد میں ان کی کلاس لیتا اور ان کو کینیڈا جانے کا پورا طریقہ کار سمجھاتا تھا۔

دن اسی معمول سے گزر رہے تھے۔ مجھے اپنے شہر کی گلیوں اور سڑکوں سے پیار ہوتا جا رہا تھا۔ ان سب کو چھوڑنے کا ایک درد بھی تھا جو دل میں کہیں خاموشی سے آ بیٹھا تھا لیکن یہ درد میرے باہر جانے کے ارادے کو کمزور نہ کرتا تھا۔ ایک دن بڑی تیز آندھی آئی۔ پرانے درخت بھی جڑوں سے اکھڑ گئے۔ بجلی کے ٹرانسفارمر بھی کھمبوں سے نکل کر دور جا گرے۔ شہر میں افراتفری پھیل گئی۔ میں اپنی بائیک لے کر سڑک پر آیا۔ میرے دل میں دکھ بھر آیا تھا جب میں نے ٹانگہ اڈے پر اپنے بچپن سے دیکھے، گھنے پیڑوں کو زمین بوس ایک بے بسی سے پڑے دیکھا۔

کسی نے بتایا کہ دریا سندھ میں ہمارے ڈیرہ کی پہچان ایس۔ ایس۔ جہلم بھی الٹ کر دریا میں ڈوب رہا ہے۔ میں بھی وہیں دوڑا چلا گیا۔ وہاں دیکھا تو ڈیرہ وال سینکڑوں کی تعداد میں جمع تھے اور آنسوؤں سے ڈوبی نظروں سے جہاز (ایس۔ ایس۔ جہلم) کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

میں بھی انہی جذبات سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ہم سب خاموش اور ترنگاہوں سے اسے ڈوبتا دیکھ رہے تھے۔ وہ اوندھے منہ پڑا مر رہا تھا۔ اس کا عرشہ ڈوب چکا تھا۔ ایس ایس جہلم نہیں بلکہ ڈیرہ والوں کا دل ڈوب رہا تھا۔

یہ جہاز ہمارے لیے بوڑھا بابا تھا، ہر ایک اپنے بچپن سے اسے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ دریا کے پار پنجاب کے قصبے دریا خان جانے کے لیے سردیوں میں اس شیر دریا پر کشتیوں کا قدیم روایتی پل بنا دیا جاتا تھا۔ دریا خان اور ڈیرہ کے بیچ دریا تین یا چار بڑے بڑے پاٹوں میں بہتا تھا۔ ہر ایک پر پل بنا دیا جاتا۔ 1872 میں انگریزوں نے ایک رپورٹ ڈیرہ پر لکھی تھی۔ اس میں وہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ پل 1850 سے پہلے دریا سندھ پر ڈیرہ اسماعیل خان پر بنایا جاتا تھا۔ بات پھر کہیں اور نہ نکل جائے، میں دوبارہ اس بحری جہاز پر آتا ہوں۔ گرمیوں میں جیسے ہی دریا بھرتا تو کشتیوں کا پل اکھاڑ لیا جاتا اور پنجاب کو

ملانے کے لیے یہی جہاز اپنا کام شروع کر دیتا۔ یہ جہاز پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے جرمنوں کے خلاف بار برداری کے لیے استعمال کیا تھا۔ پھر دوسری جنگ عظیم سے پہلے اسے ہندوستان لایا گیا اور یہ ڈیرہ کے حصے میں آیا۔ پہلے یہ سنا ہے کہ میانوالی کے مقام کالا باغ سے تونسہ تک تجارتی سامان کے لیے استعمال ہوتا تھا اور پھر یہ سکڑ کر ڈیرہ کو دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ملانے لگا۔ گرمیوں میں یہ دوپہر کو دو بجے اپنے مسافروں کو لے کر دریا کے دوسرے کنارے چھوڑ آتا۔ وہاں سے کوئی مدتوں پرانی بسیں انھی مسافروں کو دریا کے دوسرے پاٹ تک چھوڑ آتیں۔ وہاں سے پھر کشتیوں سے پار اترا جاتا۔ پھر کوئی بس اور پھر کشتی اور آخر میں دھول اڑاتیں بسیں آپ کو دریا خان چھوڑ آتیں۔ دو بجے سے پہلے یہ جہاز ایک لمبا صور پھونکتا اور ڈیرہ کے تاجروں اور دوسرے مسافروں کو یہ پیغام دیتا کہ جلدی سے تیار ہو کر سندھ کنارے آپہنچیں۔ بازاروں میں ایک ہلچل مچ جاتی تھی۔ کاروباری لوگ، لاہور یا فیصل آباد جانے والے بازار میں ایک دوسرے کو آوازیں لگاتے کہ گھو گھو بج چکا ہے جلدی کرو۔ پھر سب ایک دوسرے کو کوستے، دوڑتے، بھاگتے سائیکل رکشوں پر دریا کنارے پہنچتے۔ سینکڑوں مسافر اپنے لیے کوئی نہ کوئی جگہ جہاز میں بنا لیتے پھر یہ ایک لمبا صور پھونکتا اور سفر شروع ہو جاتا۔

سردیوں میں یہ جہاز کنارے لگا کھڑا رہتا اور ہم اس کے دوسرے عرشے پر بیٹھ کر دریا کا نظارہ کیا کرتے تھے۔ ہر ایک کی کوئی نہ کوئی یاد اس جہاز سے وابستہ تھی اور وہی جہاز اب میری نظروں کے سامنے اوندھا ہو کر دریا میں ڈوب رہا تھا اور میں بھی سب کی طرح غم زدہ تھا۔

دن گزر رہے تھے اور میرا انتظار بڑھ رہا تھا کہ کب مجھے امیگریشن کے کاغذات ملیں گے؟ میں رات کو جب اپنے گھر کے صحن میں سویا ہوتا تو آسمان پر چمکتے تاروں کو دیکھ کر ان خیالوں میں کھو جاتا کہ میں کینیڈا میں ہوں، میرا اپنا گھر ہے، گاڑی ہے، پہاڑ، میدان اور جھیلیں ہیں۔ میرا خیمہ کسی جھیل کے کنارے لگا ہے۔ پھر میں یہ خیالات اپنے ذہن سے جھٹک دیتا تھا، کیونکہ اگر یہ سب نہ ہو سکا تو؟ پہلے خاندان میں کسی کو معلوم نہ تھا کہ میں کینیڈا جانے کا سوچ رہا ہوں۔ میڈیکل کروانے کے بعد یہ بات پھیل گئی۔ ہر ایک یہ سوال کرتا نظر آتا کہ کب جا رہے ہو؟ فیملی لے جا رہے ہو یا نہیں؟ اگر نہیں لے کر جا رہے ہو تو کب تک بلواؤ گے؟ اسی قسم کی باتیں سنتا رہتا تھا۔

وقت انھی خیالات کے تانے بانے بنتے گزرتا رہا اور ستمبر کا مہینا آ گیا۔ میرے ایک دوست حاجی عطار حسن کو سر پر کوئی پھوڑا نکل آیا۔ اس کا شہر میں ریڈیو کا کاروبار تھا۔ پھوڑے کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دن اس کے بھائی نے مجھے بلوایا۔ میں حاجی صاحب کے گھر گیا تو وہ اپنا سر پکڑے اس یقین سے لیٹا تھا کہ خدانخواستہ برین ٹیومر ہو چکا ہے۔ حاجی صاحب کے تینوں بھائی ان کی حالت پر پریشان بیٹھے تھے۔ حاجی صاحب اپنی وصیت لکھوانا چاہتے تھے۔ بھائی روک رہے تھے اور حاجی صاحب مایوسی کی دلدل میں غرق اپنی وصیت کی جزیات بتاتے تھے۔ میں نے کہا کہ پہلے کسی بڑے شہر میں جا کر سرجن کو دکھلا دو اگر ضروری ہوا تو وصیت وہیں لکھ لیں گے۔

حاجی صاحب میری بات سن کر سکتے میں آ گئے تھے۔ میرے خیال سے یہ ٹیومر نہ تھا، بلکہ ایک پھوڑا تھا جو ان کی کھوپڑی پر نکل آیا تھا اور اب انھیں تکلیف دے رہا تھا۔

فیصلہ یہ ہوا کہ ڈیرہ سے بذریعہ ہوائی جہاز میں انھیں پنڈی لے چلتا ہوں اور وہیں ان کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھلا کر ٹیسٹ بھی کروا لیں گے۔

دوسرے دن ہم پنڈی کے لیے روانہ ہو گئے۔ شام سے پہلے ہم کسی میجر جنرل سرجن کے پاس بیٹھے ان کو اس پھوڑے کی ساری داستان سنا رہے تھے۔ جنرل صاحب نے ایک نظر اس پھوڑے کو دیکھا اور پھر حاجی صاحب کی بھی آنکھوں میں جھانکا اور بولے یہ کوئی ٹیومر نہیں ہے بلکہ ایک عام سا پھوڑا ہے۔

پھر اپنی لمبی فیس اینٹھانے کے چکر میں بولے کہ شکر کرو جلدی آ گئے ورنہ یہ پھوڑا کینسر میں بھی تبدیل ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اس کی سرجری بھی مناسب نہ جانی۔ ہم ڈاکٹر کے کلینک سے باہر نکلے تو حاجی صاحب کا ذہنی تناؤ ختم ہو چکا تھا اور درد کی تکلیف بھی ختم ہو چکی تھی۔ رات ہم دیر گئے راجا بازار کے کونے پر واقع ایک ہوٹل کی چھت پر بیٹھے رہے۔ حاجی صاحب خوب چہک رہے تھے ہمیں اپنے بچپن سے لے کر اب تک کے واقعات سنا رہے تھے۔ شاہ جی، جو میرے فیری میڈو کے ساتھی تھے، ان کا ذکر ہوتا رہا۔ رات گزرتی رہی اور ہوٹل کی چھت پر چارپائیوں پر سوتے مسافر ہمارے قہقہوں سے بے آرام ہو کر کروٹیں بدلتے رہے۔

جو رقم حاجی صاحب اپنی سرجری کے لیے لائے تھے ،وہ اب اس سے وی سی آر کی فلمیں اور دوسرا سامان لینا چاہتے تھے۔میں نے انہیں کہا۔" آپ اپنا سامان خریدیں اتنی دیر میں، میں کینیڈا ایمبیسی سے اپنی امیگریشن کے بارے میں اپ ڈیٹ لے آتا ہوں۔"

ستمبر کی شروعات تھیں اور گرمی کا زور ٹوٹ رہا تھا مگر میں پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔دھڑکتے دل سے ایمبیسی پہنچا۔ڈرتے ڈرتے ان سے اپنے کیس کا پوچھا تو جواب ملا۔" اگر سولہ ستمبر تک امیگریشن کے کاغذات نہیں ملتے تو چھبیس کو خود آ کر لے لینا۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کہ میں ملک سے باہر اور وہ بھی کینیڈا،اب مستقل طور پر جا رہا ہوں؟

واپس آ کر حاجی صاحب کو بتایا۔انہوں نے اس کا کریڈٹ خود لے لیا اور کہا کہ وہ ہیں ہی بہت خوش نصیب اور جو بھی ان کے ساتھ رہا،اس نے خوشیاں پائیں۔

میں نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔میرا بچپن کا دوست لطیف بھی پنڈی میں رہتا تھا۔اس کے پاس جا کر اسے سب بات بتائی۔وہ کہنے لگا۔" چلو اللہ کا شکر ہے کہ تمہارا جنوں کچھ تو رنگ لے آیا۔"

دوسرے دن ہم ڈیرہ واپس پہنچ گئے۔اپنی بیوی کو بتایا تو اس نے کوئی خاص خوشی نہ دکھائی،کیونکہ میں اس سے بھی جدا ہو کر جا رہا تھا۔قندیل ابھی چھوٹی تھی اور اریبہ تو چار ماہ کی تھی۔میرا جوش اپنے عروج پر تھا۔میں خوشی سے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔بہن بھائی سب خوش تھے۔

مجھے اب یہ فکر تھی کہ ٹکٹ،وہاں کی رہائش،کچھ مہینوں کے خرچ کے لیے رقم،پیچھے اپنی فیملی کی ضروریات،کینیڈا میں نوکری...... یہ سب کیسے ہوں گے؟

میں یہ سب سوچنا نہ چاہتا تھا،جب تک کاغذات مل نہ جائیں۔مجھے سولہ ستمبر تک کاغذات نہ ملے تو چھبیس سے ایک دن پہلے میں پنڈی اپنے دوست لطیف کے گھر پہنچ گیا۔دھڑکا تو اب بھی لگا تھا کہ کچھ انہونی بھی ہو سکتی ہے۔دوسرے دن لطیف اپنی جاب پر گیا۔ان دنوں لطیف پنڈی میں کسی دوائیوں کی کمپنی میں پلانٹ منیجر تھا۔میں اللہ کا نام لے کر ایمبیسی کی طرف چل پڑا۔یہ وہی ایمبیسی تھی جس نے مجھے بانوے میں سیاحتی ویزا دینے سے انکار کر دیا تھا اور میں فیض آباد پنڈی کی کچی گلیوں میں کسی تنکے کی طرح بے آسرا اڑتا پھر رہا تھا۔

میں ایمبیسی میں داخل ہوا اور انتظار گاہ میں بیٹھا اپنی باری کا منتظر تھا۔شیشے کی کھڑکی کے پیچھے ایک پاکستانی چہرہ ابھرا،میرا نام پکارا۔میں سامنے گیا تو مجھے مبارک باد دینے کے بعد ایک موٹا خاکی لفافہ تھما دیا اور ساتھ ہی کہا ویلکم ٹو کینیڈا!!!

میں کچھ دیر وہ بھاری پیکٹ اٹھائے کھڑا رہا۔میرا ذہن خالی تھا۔کوئی احساسات نہ تھے۔حالانکہ مجھے خوشی سے پاگل ہو جانا چاہیے تھا۔میں کسی اجنبی سے احساس میں آ گھرا تھا۔وہ پیکٹ دینے والا اب شیشے کے اندر نظر نہیں آ رہا تھا۔وہ جا چکا تھا مگر میں پتھر کا بن گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب میں اس کا کیا کروں؟ کیا یہ مجھے اس لیے دیا گیا ہے کہ اب تم جلاوطن ہونے جا رہے ہو۔تمہارے بچے اور بیوی ...... وہ سب اب اکیلے ہوں گے۔وہ تو ہوں گے سو ہوں گے مگر میں بچوں کے بغیر کیسے رہ سکوں گا؟ ایک اور مشکل یہ بھی درپیش تھی کہ میں بچوں کو چھوڑ کر جاؤں گا کیسے؟

میں اپنی سوچوں میں کھڑا رہا۔پھر بھاری قدم اٹھاتا ہوا کینیڈا میں داخل ہونے اور مستقل رہائش کے پیپرز لیے اس عمارت سے باہر آیا جہاں چند سال پہلے میرا سیاحتی ویزا مسترد کر دیا گیا تھا۔میرے ساتھ ایک افغانی بھی باہر نکل آیا۔مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھے مبارکباد دینا چاہ رہا ہے۔میں کچھ نہ سن رہا تھا۔میری سماعت سے اس کے یہ الفاظ ٹکرائے۔" اکتیس دسمبر سے پہلے کینیڈا میں داخل ہو جانا ...... پھر سن دو ہزار کی نئی صدی شروع ہو رہی ہے اور جو بھی اکتیس سے پہلے داخل ہو گیا،ان سب کو شہریت تین ماہ میں مل جائے گی،تین سال انتظار نہ کرنا پڑے گا۔"

اس نے اس ترتیب سے شاید یہ الفاظ نہ کہے ہوں مگر مطلب یہی تھا۔

میں وہ لفافہ اٹھائے باہر کھڑا تھا کہ کدھر جاؤں؟ ایک ویگن بری امام کے مزار کو جا رہی تھی اور کنڈیکٹر شور مچا رہا تھا۔" بری امام...... بری امام......"

میں اس میں سوار ہوا اور کچھ دیر میں بری امام کے مزار کے باہر کھڑا تھا۔میں جب بھی اسلام آباد آتا تو بری امام کے مزار ضرور آتا۔دو نفل اللہ کے حضور میں پڑھتا۔اللہ سے دعا کرتا اور فاتحہ پڑھ کر کہیں کونے میں گھٹنوں بیٹھا رہتا۔آج بھی یہی ہوا۔میں نوافل پڑھ کر مزار کے کونے میں بیٹھا زائرین کو دیکھ رہا تھا جو اپنی عقیدت میں کیا کیا نہیں کر رہے تھے۔لفافہ میرے ہاتھوں سے نکل کر زمین پر پڑا

تھا۔ کافی دیر گزارنے کے بعد میں نے سوچا کہ کہاں چلا جائے۔ پھر خیال آیا کہ لطیف کے پاس اس کی فیکٹری جا پہنچوں۔

وہیں باہر آ کر لطیف کو فون کیا اور اپنے پیپرز ملنے کا بتایا۔ دوسری جانب سے مبارک بادوں کا نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہوا اور میں نے آنے کا بتا کر فون بند کر دیا۔ مجھے اب بھی حیرت ہوتی ہے کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں اتنا لڑکھڑا کیوں گیا تھا۔ جہاں جانے کے خواب میں پچھلے دس سالوں سے دیکھ رہا تھا اور آج وہ خواب حقیقت کا روپ دھارے میرے سامنے تھا اور میں اس سے اپنی نظریں چرا رہا ہوں۔

بری امام کے مزار سے فیض آباد کی ایک ویگن پکڑی اور سب سے پیچھے والی سیٹ پر جا بیٹھا۔ ویگن چلی اور گرم ہوا کے جھونکے میرے چہرے سے ٹکرائے۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ بند کر کے نہ چاہتے ہوئے وہ لفافہ چاک کیا۔ سب سے پہلے اس میں سے ایک کتاب برآمد ہوئی...... جس کے اوپر انگریزی کے بڑے حروف میں لکھا تھا۔ ویلکم ٹو کینیڈا۔

میں نے اس کو پڑھنا شروع کیا۔ اس میں جو چیدہ چیدہ نکتے لکھے تھے، وہ یہ تھے۔

"تیس سال سے اوپر والوں کو وہاں ہم آہنگ ہونے میں مشکل پیش آتی ہے۔"

"اگر آپ کے بچے بھی ہیں اور وہ ساتھ نہ جا رہے ہوں تو اور زیادہ مشکل ہوتی ہے۔"

"آپ کوشش کریں کہ جس شہر میں آپ جا رہے ہیں، وہاں اپنے ملک کے لوگوں کے درمیان رہیں۔"

"دکانوں پر چوری چکاری سے پرہیز کریں اور تنبیہ کی گئی تھی کہ یہ جرم ہے اور اس کی سزا بھی ہے۔"

"اگر کوئی پولیس والا آپ کو کہیں روکے تو اپنا شناختی کارڈ اپنے ساتھ رکھیں اور پولیس والے سے نظریں بھی مت چرائیں، بلکہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کریں۔"

ان کے علاوہ کچھ کینیڈا کے بارے میں لکھا تھا کہ کتنے صوبے ہیں، کس قسم کے لوگ کن کن علاقوں میں رہتے ہیں، ذرائع پیداوار کیا ہیں اور آپ کو کیا سہولتیں ملیں گی اور آپ کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ ابھی یہی کچھ پڑھ رہا تھا کہ فیض آباد آ گیا۔

میں ویگن سے اترا، ایک ٹیکسی لی اور لطیف کے پاس اس کی فیکٹری پہنچ گیا۔ وہ اپنے کچھ جاننے والوں کے ساتھ میرا انتظار کر رہا تھا۔ سب مجھ سے گلے مل رہے تھے۔ میں مبارکبادیں وصول کرتے ہوئے زبردستی مسکرا رہا تھا۔ مجھے ایک اعزاز کے ساتھ لنچ روم میں لایا گیا۔ کھانا کھلایا گیا اور پھر میرے تمام کاغذات چیک ہوئے۔ درست ثابت ہونے پر ہر ایک نے ایک بار پھر باری باری گلے لگا کر مبارکباد دی۔ میں سچ بتا رہا ہوں کہ میں ان مبارکبادوں سے اکتا رہا تھا۔ میرا دماغ میرا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ مجھے ان کاغذات کے ملنے کی خوشی سے زیادہ پاکستان چھوڑنے کا دکھ اور کینیڈا کی زندگی کے بارے میں وسوسے زیادہ تھے۔

لطیف میرا بچپن کا دوست تھا اور وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ میرے اٹھنے، بیٹھنے اور بولنے کے انداز پر میرے بارے میں صحیح اندازہ لگا لیتا تھا۔ وہ بھی میری حالت دیکھ کر حیران تھا مگر کچھ کہتا نہیں تھا، بس سگریٹ کے دھوئیں فضا میں چھوڑتا ہوا مجھے دیکھتا تھا۔

میں لطیف کے گھر ٹھہرا تھا۔ ہم فیکٹری سے گھر پہنچے۔ سب ہی مبارکباد دینے لگے۔ میں خاموش تھا۔ میں اور لطیف شام سے پہلے اپنے پسندیدہ مقام فیصل مسجد کے پیچھے بڑے بڑے نرم گھاس کے میدانوں میں لیٹے ایک جانب مسجد کے بلند مینار دیکھتے اور دوسری جانب مارگلہ کی پہاڑیاں۔ میں جب بھی پنڈی آتا تو اکثر ہم دونوں کی شام یہیں گزرتی تھی۔ یہاں ہم رات ایک ایک بجے تک بیٹھے رہتے تھے۔ میں یہی سوچتا تھا کہ شاید اگلی بار کب یہاں بیٹھنا نصیب ہو؟ یہ یادیں لے کر میں کیسے سکون سے رہ سکوں گا۔

ہم بہت دیر وہاں بیٹھے رہے۔ جب اٹھے تو میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ لطیف نے کہا کہ وہ میری روانگی سے پہلے ڈیرہ کا چکر لگائے گا۔ دوسرے دن میں وہی خاکی لفافہ لے کر ڈیرہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

مجھے اب بھی سوچ تھی کہ میں کتنا اپنی روانگی کو لٹکا سکتا ہوں اور یہ بھی خیال تھا کہ مجھے دسمبر کی اکتیس سے پہلے کینیڈا میں داخل ہونا ہے۔ اسی طرح میرے پاس دو ڈھائی مہینے تھے۔ اسی درمیان میں مجھے اپنی جاب سے چھٹی لینی تھی۔ اپنے میڈیکل اسٹور کا بھی فیصلہ کرنا تھا۔ کچھ رقم بھی اکٹھی کرنی تھی کہ اگر کچھ مہینے کینیڈا میں نوکری نہیں ملتی تو اپنا خرچ خود اٹھا سکوں۔ اور سب سے بڑھ کر کہ میں وہاں کس کے پاس جاؤں گا اور کون مجھے لینے آئے گا؟ ایسے بہت سے سوالات لیے میں ڈیرہ پہنچ گیا۔

ڈیرہ پہنچا تو ایک طرح کے ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ میرا کزن طارق جو میرا کلاس میٹ بھی تھا، وہ تیرا سال پہلے امریکا جا بسا تھا۔ پھر شادی پاکستان میں کی اور وہ ان دنوں اپنی فیملی کے ساتھ نیویارک میں ایک فارمیسی چلا رہا تھا۔ تمنا بھابی میری بہن کی طرح تھیں اور بہت اچھی دوست بھی۔ طارق کے دوست کا کوئی دوست ٹورنٹو میں رہتا تھا۔ ان دنوں پاکستان سے ڈھائی سو روپے کا ایک کالنگ کارڈ ملتا تھا اور امریکا میں تین منٹ بات ہو جاتی تھی۔ میں نے وہ کارڈ استعمال کر کے طارق کو فون کیا کہ کسی طرح ٹورنٹو میں میری رہائش کا انتظام کروا دے۔ اس نے مجھے تسلی دی اور کہا فکر نہ کرو میں اس دوست کے ذریعے کچھ انتظام کرا دوں گا۔ میں اس طرف سے مطمئن ہو گیا تھا۔

مگر دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اگر انتظام نہ ہو سکا تو میں کہاں جاؤں گا؟ مجھے مطیع اللہ کا خیال آیا۔ مطیع اور میں نے ایک ساتھ کینیڈا کے لیے امیگریشن کی درخواست دی تھی، بلکہ اس نے کچھ مہینے پہلے ہی دے دی تھی۔ سوات کا رہنے والا مطیع ایک علیحدہ دنیا کا باسی تھا۔ کبھی وہ پشاور میں جاب کر رہا ہوتا اور کبھی پنڈی میں۔ ہم رابطے میں رہتے تھے اور ہم کبھی پشاور صدر کے خیبر ہوٹل میں اس کے ہمراہ قہوہ پیتے اپنی امیگریشن کی جزئیات پر بات کر رہے ہوتے اور کبھی کینیڈا کی زندگی پر سیر حاصل گفتگو کرتے۔ کبھی میں اس سے ملنے پنڈی جاتا تھا۔ وہ ایک دکان کے اوپر چوبارے پر رہتا تھا۔ ہم گھنٹوں ساتھ بیٹھے صرف کینیڈا کی باتیں کرتے تھے۔

چھوٹے قد اور باریک آواز میں باتیں کرتا مطیع ایک نہایت ہی مخلص دوست تھا۔ دھیرے دھیرے بات کرتا تھا۔ ایک بار اس کا خط آیا کہ اس کو کاغذات مل گئے ہیں اور وہ اگست میں ٹورنٹو جا رہا ہے۔ مجھے تو سفر کا بہانہ چاہیے تھا۔ میں پشاور پہنچا۔ اسی خیبر ہوٹل میں ہم بیٹھے اب قہوہ کے ساتھ پنیر کے پکوڑے بھی کھا رہے تھے۔ میں نے اس کو مبارکباد دیتے ہوئے پوچھا تھا کہ وہ کہاں رہے گا اور وہاں جا کر کیا کرنے کا ارادہ ہے؟

وہ اپنی باریک آواز میں انتہائی سنجیدگی سے ایک ہی جواب دیتا۔ ”اللہ خیر کرے گی!“

وہ پٹھان تھا اور تھا کی جگہ تھی کا استعمال کرتا تھا۔ اس لیے میں بھی اس سے یہی ہی پوچھتا تھا! یار مطیع...... کب جا رہی ہو۔“

وہ بھی ایسے ہی کوئی جواب مجھ پر پھینکتا تھا۔ ”بس اگلے ماہ جا رہی ہوں۔“

میں جانتا ہوں سب پختون ایسے نہیں بولتے مگر وہ خوبی صرف اپنے مطیع میں زیادہ تھی۔ پھر وہاں پہنچ کر اس نے ایک مختصر خط لکھا کہ وہ ٹھیک ہے، کسی کے ساتھ رہائش رکھتا ہے اور سیکیورٹی کی جاب کر رہا ہے یعنی ہمارے الفاظ میں کہیں تو وہ وہاں چوکیدار تھا۔ یہ خط پڑھ کر میں ڈوب سا گیا کہ اگر مجھے بھی یہ جاب کرنی پڑ جائے تو یونیورسٹی کا لیکچرار ہو کر میں یہ کام کیسے کر پاؤں گا۔ اس نے خط میں اپنا فون نمبر بھی دیا تھا۔ ایک بار ڈھائی سو خرچ کر کے اس کو فون کیا کہ شاید اس کے ہاں رہائش کا انتظام ہو جائے تو کہنے لگا۔ ”میں تو کسی کے ساتھ رہتا ہوں اور جب کینیڈا آنا تو رابطے میں رہیں گے......“

مطلب صاف تھا کہ اس کے پاس میری رہائش کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ اس لیے اب طارق ہی میرا آسرا تھا۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں اب جلد جانے سے کترا رہا تھا۔ ایک سال تک میرے پیپرز درست تھے اور مجھے ایک سال کے اندر پہنچنا تھا۔ مگر میں ایک افواہ کا شکار ہو گیا تھا کہ اکتیس دسمبر سے پہلے پہنچنا ہے اور تین ماہ میں کینیڈا کا پاسپورٹ میرے ہاتھ میں ہوگا۔ میں بھی یہ پاسپورٹ جلد از جلد حاصل کرنا چاہتا تھا کہ پھر میں بھی دنیا گھوم سکوں گا۔

پیپرز ملنے کے بعد احساس ہوا کہ ابھی تو میں جانے کے لیے تیار ہی نہیں ہوں لیکن یہ میرا خواب تھا اور میں اسے بکھرنے بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔

جو لوگ ابھی پاکستان میں ہیں اور میرا یہ سفرنامہ پڑھ رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے جو باہر جانا چاہتے ہیں، مجھ پر شاید رشک کر رہے ہوں کہ مجھے کینیڈا کی مستقل رہائش مل گئی ہے۔ یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا کہ یہ ہجرت کس قسم کے رگڑے لگاتی ہے۔ میں تو اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ میں نے سخت دور بہت کم دیکھا مگر میں نے اوروں کو کہ انہیں کس قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑا کتنی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔

ان دنوں جب کوئی یہ کہتا کہ اچھی بھلی نوکری ہے کیوں اسے چھوڑ کر جا رہے ہو تو میں غصے میں آجاتا۔ یہ نہیں کہ میں کینیڈا جانا ہی نہ چاہتا تھا بس وطن اور بچوں کو اپنے پیچھے اکیلا چھوڑنے پر ہول اٹھتے تھے میری ایک اسٹوڈنٹ نائلہ نے یہ بات کی اور کہا۔ ”اللہ کرے آپ نہ جائیں۔“

میں نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ وہ منہ

بسورتی چلی گئی تھی۔ اور میں اس سے بات کیے بغیر کینیڈا آ گیا۔ یہاں پہنچا تو کسی نے مجھے چند ماہ بعد یہ اندوہناک خبر دی کہ نائلہ کی روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاکت ہو گئی ہے۔ پھر جو میرے احساسات کو ضربیں لگیں، میں بیان نہیں کر سکتا۔ باہر کی دنیا کی ایک کشش ہے جو ہر ایک کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ آپ نہ چاہتے ہوئے بھی کھنچے چلے جاتے ہیں۔ اس میں قصور لوگوں کا نہیں۔ اس نظام کا ہے جس پر چند لٹیروں کا قبضہ ہے اور یہ قبضہ گروپ کسی طرح بھی اپنا تسلط چھوڑنے کو تیار نہیں۔

میں کسی طرح سے کینیڈا کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا تھا۔ نہ میرے پاس کوئی ایسی کتاب تھی اور نہ کوئی ایسی ویڈیو جس سے میں کینیڈا کے بارے میں کچھ اندازہ کر سکوں۔ میرا ایک دوست تھا۔ نام تھا شفیق اور گوہل یونیورسٹی میں لیکچرر تھا۔ وہ چند سال پہلے کینیڈا سے ایم۔ ایس کر کے آیا تھا۔ میں گاہے بگاہے اس سے معلومات لینے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ شفیق ایک انتہائی سادہ مزاج انسان تھا اور کینیڈا کے تین سالوں نے اس کا کچھ نہ بگاڑا تھا۔ مجھے اس سے کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی تھی۔ میں اس سے پہلے لاہور اور پنڈی کی ویڈیو مارکیٹ سے اداکار ندیم کی فلم ”کامیابی“ کی ویڈیو ڈھونڈتا رہتا تھا۔ یہ فلم شائد 1984 میں ریلیز ہوئی تھی۔ یہ فلم کینیڈا میں فلمبند ہوتی تھی۔ علی سفیان آفاقی نے کہانی تحریر کی تھی اور ایک سفرنامہ بھی تحریر کیا تھا۔ سفرنامے سے کچھ معلومات ملی تھیں مگر مجھے کینیڈا کو بھی جانے سے پہلے دیکھنا تھا۔ پندرہ سال پہلے کی ویڈیو لاہور کی کسی ویڈیو شاپ سے نہ ملی۔ پہلے تو دکاندار حیران ہوتے کچھ مسکراتے اور پھر اپنی دکان کی شیلف کھنگالتے اور جواب منفی میں ہوتا۔ میں نے بھی ہمت نہ ہاری اور آخر کار پنڈی کی ویڈیو مارکیٹ سے اس فلم کی ویڈیو ڈھونڈ نکالی۔ وہ فلم میں کئی بار دیکھ چکنے کے بعد بھی کورا کا کورا رہا تھا۔ پھر میں نے شفیق سے رابطہ کیا۔

ویزا ملنے کی خبر پر وہ بہت خوش ہوا کیونکہ اس نے بھی امیگریشن کے لیے درخواست دی ہوئی تھی اور میرے تجربے کے مطابق اسے جلد کینیڈا آ جانا تھا۔ شفیق کے گھر کے ساتھ ایک مزار تھا اور ان کا خاندان ایک طرح سے وہاں کا مجاور بھی تھا۔ مزار میں بوہڑ کے قدیم درخت تلے ایک بیٹھک تھی اور ہم وہیں چٹائیوں پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ شام اتر چکی تھی اور کمرے میں ایک چھوٹا سا زرد بلب روشنی پھینکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ شفیق کے کندھے پر مولویوں والا رومال تھا۔ وہ ڈیرہ کی مشہور ڈش صوبت بنا کر لایا تھا۔ دیسی مرغیوں کا مثالوں سے بنا گرم سوپ ایک تھال میں ڈال کر اس کے اوپر پتلی پتلی تین تین فٹ قطر کی روٹیاں، جن کے ٹکڑے کر کے اس سوپ میں ڈالے جاتے ہیں اور سب افراد اس تھال کے گرد بیٹھ کر اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان افراد میں فیری میڈو کے مشہور زمانہ شاہ جی بھی تھے۔

صوبت کھا کر شاہ جی نے ایک ہلکا سا ڈکار لیا اور تکیے کے سہارے لیٹتے چلے گئے۔ شفیق کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔ ”میرے اس دوست کا باہر جانے کا اتنا شوق نہ ہوتا تو اسے کبھی نہ جانے دیتا...... اس کے ساتھ ایک مرتبہ کے ٹو پہاڑ تو دیکھنے ضرور جاتا۔“

میں نے کہا۔ ”شاہ جی! نانگا پربت پر تو مجھ سے لڑ پڑے تھے۔“

شاہ جی بولے۔ ”وہ تو میں اپنے یار سے لاڈ کر رہا تھا۔“

اتنے میں شفیق برتن سمیٹ کر آ بیٹھا تھا اور گرم قہوہ پیش کر رہا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور پوچھ لیا۔ ”تو شفیق بھائی! آپ تو ٹورنٹو میں تین سال رہے ہیں۔ کچھ بتائیں کہ ٹورنٹو کیسا ہے، کیسے لگتا ہے۔“

شفیق اپنے تئیں مجھے معلومات فراہم کرنے لگا۔ ”ایک تو جب تم ائیرپورٹ سے باہر آؤ گے تو ایک لمبی سیدھی سڑک ہے اور دونوں جانب بڑے بڑے درخت ہیں اور وہ سڑک سیدھا شہر کو آتی ہے۔“ شاہ جی گویا ہوئے۔ ”مار اوے...... سیدھا شہر کو آتی ہے؟“

شفیق نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”ہاں سیدھا شہر کو آتی ہے۔“

دو ماہ بعد جب میں ٹورنٹو آیا تو ائیرپورٹ میرے اپارٹمنٹ سے نظر آتا تھا اور آپ لوگ یقین کریں کہ نہ کوئی سیدھی سڑک تھی جس پر درخت ہوں، بلکہ میں نے ائیرپورٹ کے گرد ساری سڑکیں چھان ماری تھیں جس پر دور تک دونوں جانب درخت ہوں...... اور سڑک شہر کو آتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ٹورنٹو ائیرپورٹ کے ارد گرد میلوں تک کئی ایک چھوٹے چھوٹے شہر بسے ہیں اور یہ سب مل کر گریٹر ٹورنٹو ایریا بناتے ہیں اور ہر جانب کی سڑکیں نکلتی ہیں۔

مجھے شفیق معلومات دیتا تھا اور میں اور شاہ جی بغور سنتے تھے اور شاہ جی ماراوے کے نعرے بھی بلند کرتے تھے جس کو سن کر سادہ لوح شفیق زیادہ جوش میں آرہا تھا۔ میں بولا۔ "اسٹور کیسے ہیں اور چیزیں کیا بہت مہنگی......"

اس نے مجھے سوال ہی مکمل نہ کرنے دیا اور بولا۔ "نہیں بھائی! ایک تو اتنے بڑے اسٹور ہیں کہ پورا دن دیکھنے میں گزر جائے۔"

شاہ جی کو یہ بات ہضم نہ ہوئی۔ "ماراوے...... اتنے بڑے کہ پورا دن دیکھنے میں لگ جاتا ہے...... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔ "ہم تو ایک دن میں نانگا پربت کے بیس کیمپ سے واپس ہو کر فیری میڈو پہنچ چکے تھے۔" میں نے شاہ جی سے درخواست کی کہ یہ معلومات کے خزینے جو بکھر رہے ہیں، انہیں چنتے رہو اور اسے روکو نہیں۔ شفیق اب اپنی دھن میں آچکا تھا۔ "ہر اسٹور پر ایک کونہ ہوتا ہے جہاں وہ کپڑے ہوتے ہیں جن میں کوئی ڈیفیکٹ ہو...... اور میں نے ایک پینٹ دو ڈالر میں خریدی تھی اور صرف اس کی زپ خراب تھی۔"

شاہ جی کہاں رکنے والے تھے کیونکہ وہ خود بھی درزی کا کام کرتے تھے۔ "تو پھر نئی زپ لگوائی ہوگی یا ایسے ہی پہنتے رہے۔"

شفیق افسردہ لہجے میں بولا۔ "میں نے ایک جگہ سے زپ لگوائی تھی اور پورے بارہ ڈالر لگ گئے تھے۔" پھر شاہ جی کے پوچھنے پر جب اس نے یہ بتایا کہ نئی پینٹ دس ڈالر میں مل جاتی ہے تو شاہ جی کا جو قہقہہ نکلا تو شفیق کچھ ناراض سا نظر آنے لگا۔

میں نے حالات کو سنبھالا اور بات آگے بڑھائی۔ "بے حیائی تو زیادہ نہیں ہوگی۔"

میرا سوال سن کر شفیق نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں کو ہمہ تن گوش لگائے اور اس پر شاہ جی چوکنے ہو کر بیٹھ گئے۔ شفیق نے ایک واقعہ شروع کیا اور ہم دونوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ "ایک دن عشاء کا وقت تھا اور میں ٹیوشن پڑھا کر آرہا تھا۔ شارٹ کٹ کے لیے میں ایک پارک سے گزرا اور جو دیکھا......"

شاہ جی اپنی پوری توجہ شفیق پر ملحوظ رکھے ہوئے تھے۔ چونک کر بولے۔ "ہاں ہاں...... تو پھر کیا دیکھا۔"

میں خود بھی بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔" شفیق بولتا چلا گیا۔ "میں جب گزر رہا تھا تو دیکھا کہ ایک لڑکا اور لڑکی ایک بینچ پر بیٹھے ہیں پھر لڑکے نے لڑکی کا بوسہ لے لیا۔"

شاہ جی نے قہوے کی پیالی چٹائی پر رکھ دی اور بولے۔ "پھر آگے کیا ہوا وہ بتاؤ۔"

شفیق کا چہرہ سرخ تھا اور پسینا اس کے ماتھے پر تھا، کہنے لگا۔ "پھر میں تیز تیز قدم اٹھاتا پارک سے باہر چلا آیا۔"

میں اور شاہ جی جو بت بنے اس کو سن رہے تھے۔ کچھ دیر تک تو بت ہی بنے بیٹھے رہے پھر ایک دم ہمارے قہقہے بلند ہوئے اور دیر تک بلند ہوتے رہے۔ میں نے ناراض شفیق کی حالت دیکھ کر اس کو پھر سے سنبھالا اور ایک اور سوال داغا۔ "ہاں یار...... بے حیائی کی تو حدیں پار ہو گئیں۔"

شفیق اب اپنے ماضی میں کھویا تھا۔ "یار پردہ تو بالکل نہیں ہے۔ سب کھلے عام پھرتے ہیں اور تو اور شادی سے پہلے بھی آپس میں ملتے ہیں۔"

اب شاہ جی کے لبوں پر شرارتی مسکراہٹ تھی اور مجھے اندازہ تھا کہ وہ لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ میں نے پھر پوچھا۔ "سنا ہے وہاں صفائی کا بہت زیادہ انتظام ہوتا ہے۔"

فرمانے لگے۔ "بہت ہی زیادہ...... صبح صبح کوڑے کی بند گاڑیاں آتی ہیں اور گند اٹھانے والوں نے چلونیں پہنی ہوتی ہیں۔" پھر وہ اپنی ایک کلائی کو اپنی ٹانگ کے گھٹنے سے ذرا نیچے رکھ کر بولا۔ "یہاں تک اپنے پاؤں میں دستانے چڑھائے ہوتے ہیں......"

شاہ جی اس سے زیادہ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ "او بھائی...... تم واقعی کینیڈا ہی گئے تھے ناں؟ جہاں پاؤں میں بھی دستانے پہنتے ہیں۔"

شفیق وضاحت دیتا رہا کہ ہاتھ کے دستانے اور ہوتے ہیں پاؤں کے کسی اور طرح کے ہوتے ہیں۔ اب میرے لیے اتنی معلومات ہی بہت تھیں۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس دن ہمیں رخصت کرتے وقت چلتے چلتے مجھے اپنے کسی دوست کا نمبر دیا اور تاکید کی کہ میری کچھ دیگچیاں اس کے ہاں رکھی ہیں...... وہ ضرور لے لینا۔

اب میں نے یونیورسٹی کی لائبریری کو کھنگالا اور مجھے کینیڈا کے بارے میں کچھ کتابیں مل گئیں۔ میں نے اس کے اہم باب فوٹو کاپی کروائے اور اس کی تاریخ اور جغرافیہ سے لے کر طرز حکومت اور معیشت تک سے کافی حد تک واقف ہو گیا۔ ہمارے محترم استاد ریاض انجم صاحب جو

دل میں ہمیں تاریخ پڑھاتے تھے، انہوں نے مجھے ایک تصویری کتاب دی جس میں کینیڈا کے صوبے البرٹا اور برٹش کولمبیا کے تصاویر تھیں۔ جس میں راکی ماؤنٹین، ان کے بیچ گزرتی ٹرین، جھیلیں، برف پوش چوٹیاں، میلوں پھیلے جنگلات اور قدرتی حسن کا لازوال شاہکار تھے۔ میں دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ کیا دنیا میں ایسے خوبصورت مقامات بھی ہیں اور وہ بھی کینیڈا میں...... جہاں میں جا رہا ہوں؟ اتنے خوبصورت مناظر دیکھ کر میری رال ٹپک پڑی تھی۔ ایک تصویر کسی عظیم الشان ہوٹل کی تھی جو پہاڑوں میں گھری جھیل کے کنارے تنہا کھڑا تھا۔ بلند پہاڑوں پر چنار کے درختوں کے جنگلات تھے۔ جھیل کی مشابہت ہماری جھیل سیف الملوک کی تھی۔ میں اس کی تصویر کو تادیر دیکھتا رہا۔ سوچا تھا کہ کوئی اس ہوٹل میں ٹھہرے جہاں کمرے کی کھڑکی سے جھیل کا منظر دیکھے گویا اس نے جنت تو دنیا میں ہی دیکھ لی ہو۔ اللہ کی نعمتیں اور عنایتیں ہیں کہ پچھلے اسی ہوٹل میں تین سال گزارے اور ذہن میں استاد ریاض انجم صاحب کی دی ہوئی وہ کتاب تھی اور دل پر اللہ کے احسانوں کا سایہ تھا۔

ان دنوں انٹرنٹ ہمارے شہر میں نہیں آیا تھا اور کینیڈا میں بھی اتنا عام نہ تھا۔ ورنہ آجکل تو آپ ایک منٹ میں دنیا کے کسی کونے کے بارے میں معلومات لے سکتے ہیں۔ ورنہ مجھے تو نیا گرا فال کا ایک فوٹو دیکھنے کی بھی حسرت رہی تھی۔

میرے دوستوں نے دعوتوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن کوئی دعوت ہوتی۔ کوئی کہتا کہ ہمیں بھی بلوا لینا اور کوئی کہتا کہیں بدل تو نہیں جاؤ گے؟

قارئین اس چیز کو ذہن میں رکھیں کہ ایک بندہ جو ایک چھوٹے سے شہر سے تعلق رکھتا ہے، جس کو دنیا دیکھنے کا شوق ہے اور اس کے پاس وسائل بھی نہیں ہے۔ اسے ایک راستہ ملتا ہے اس دنیا کو دیکھنے کا اور دوست اس کو رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہیں تو آپ لوگ خود اندازہ کریں کہ میں نے اپنے آپ کو کس بلندی پر پہنچا رکھا ہوگا۔ غرور اور تکبر کی بلندی پر نہیں بلکہ اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کی بلندی پر۔

میں اپنی تیاریوں میں لگا تھا اور یہ سب تیاریاں ذہنی تھیں۔ عملی طور پر کچھ بھی نہ ہو رہا تھا۔ دو چار دنوں میں طارق کا نیو یارک سے فون آیا کہہ رہا تھا کہ تم کو سہیل مفتی ایئر پورٹ لینے آئے گا اور تمہاری رہائش بھی اس کے ساتھ ہوگی، کیونکہ اس کی فیملی ابھی تک پاکستان میں ہے۔ اور وہ ایک بائیو ٹیک کمپنی، ہیموسال، (Hemosal) میں کام کرتا ہے اور ہو سکتا ہے تمہاری جاب بھی وہاں ہو جائے۔

طارق کہنے لگا کہ جب فلائٹ بک کروا لینا تو اس کو فون کر دینا۔ پھر طارق نے سہیل مفتی کا ایڈریس اور فون نمبر لکھوا دیا اور اسی طرح میرا یہ مسئلہ بھی اللہ پاک نے حل کر دیا۔

رشید علی زئی نے پی آئی اے چھوڑ کر پشاور میں اپنی ٹریول ایجنسی کھولی ہوئی تھی اور میں ان سے یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے جلدی نہیں بلکہ اکتیس دسمبر کے آس پاس کا ٹورنٹو کے لیے ٹکٹ چاہیے۔ وہ کہنے لگے کہ آخری ٹکٹ چھبیس نومبر کا ہے۔ میں بولا یہ تو ایک مہینا جلدی ہے اور میں اتنا جلدی نہیں جانا چاہتا، بچوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔

دراصل مجھے معلوم نہ تھا کہ کتنے عرصے بعد میں ان کی شکل دیکھ پاؤں گا۔ انہوں نے کہا کہ اس کے بعد ہائی سیزن شروع ہو جائے گا اور ٹکٹ لگ بھگ دوگنی قیمت کا ہوگا۔ یہ بھی میرے لیے ناممکن تھا کہ دوگنی قیمت ادا کروں۔ ایک تو میں نے اپنا وی سی آر، اے سی، ٹیپ ریکارڈر، کچھ گھر تھیں وہ سب بیچ رہا تھا۔ فارمیسی اپنے پارٹنرز کو شروع میں لگائے سرمائے کے عوض بیچ دی تھی۔ صرف بیوی کے زیور تھے جن کو میں نے ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔

مجھے ان دنوں پیسوں کی ضرورت تھی اور میں ان کو بلا وجہ خرچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے رشید علی زئی سے کہا کہ چھبیس نومبر کی ٹکٹ کنفرم کر دو۔ پھر ایک دم میرے ذہن میں انوکھا خیال وارد ہوا۔ میں نے دوبارہ اس کو فون کر کے کہا کہ کیا اس طرح نہیں ہو سکتا کہ میں ایمسٹرڈم دیکھتا ہوا ٹورنٹو جاؤں۔

رشید علی زئی میرے بڑے تھے۔ میری بکواس سن کر کچھ دیر تو خاموش رہے اور پھر مجھے خوب ڈانٹا۔ کہنے لگے کہ بندے کے پتر کی طرح سیدھا ٹورنٹو جاؤ اور یہ واہیات خیال دل سے نکال دو تم کوئی سیر کرنے نہیں جا رہے ہو۔

میں بھی تعظیم سے خاموش ہو رہا۔ اب میں سوچتا ہوں تو مجھے اپنی اس بات پر ہنسی آتی ہے۔

ابھی میری فلائٹ کو ڈیڑھ ماہ تھا اور میں یکسوئی سے اپنا پروگرام ترتیب دے رہا تھا۔ اگلے دن یہ خبر ٹی وی پر سنی جس نے میرے اندر ہلچل مچا دی۔ ایک میں ہی کیا پورے ملک میں ہلچل مچ گئی تھی۔ ہر کوئی اضطراب میں تھا۔

سفر کہانی ابھی جاری ہے

بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کریں

کراکاٹوا

فرزانہ نکہت

تاریخ عالم میں ایسے کئی ایک بڑے آتش فشاں کے دھماکے کا ذکر ہے جس نے بہت زیادہ تباہی پھیلائی۔ انہی میں سے ایک کراکاٹوا بھی ہے جس نے تباہی کا ریکارڈ قائم کیا۔ سینکڑوں افراد کی جانیں لیں اور ماحول کو یکسر تبدیل کردیا۔

اس دن کئی ایٹم بموں سے زیادہ قوی دھماکے ہوئے تھے
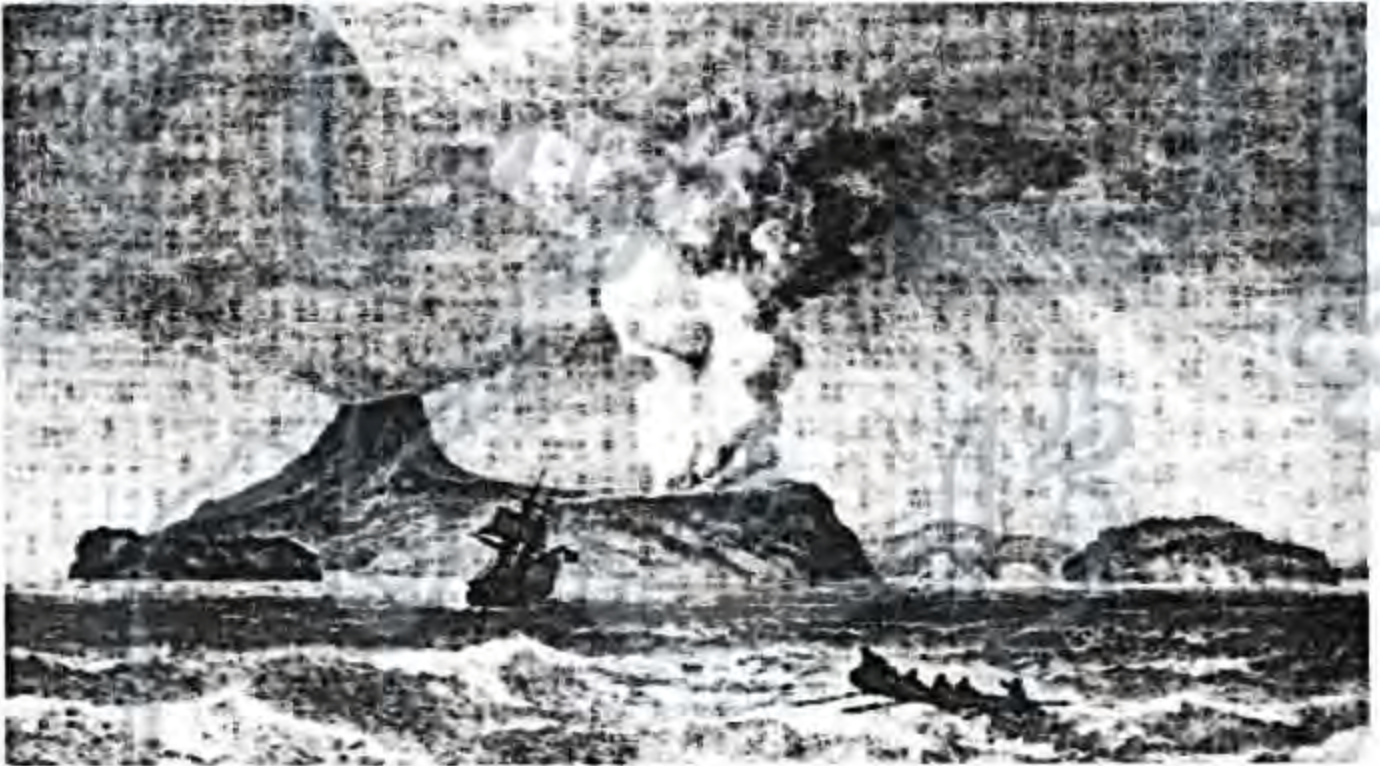
کراکاٹوا کے نام سے ہی اس آتش فشاں پہاڑ کا خیال ذہن میں آجاتا ہے جس نے 1883ء میں اپنے پورے غیظ وغضب کے ساتھ پھٹ کر خلیج سنڈا میں واقع اس گمنام انڈونیشی جزیرے کو چہار دانگ عالم شہرت عطا کی تھی۔ یہ دھماکا چاہے اسے قدرتی کہا جائے یا انسانی ہاتھوں کا کارنامہ، ایسا زبردست تھا کہ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ ان دھماکوں میں ایک سو ہائیڈروجن بموں جتنی قوت تھی جو یکے بعد دیگرے پھٹتے چلے گئے تھے۔

اٹھارہ مربع میل کے جزیرے کا دو تہائی حصہ اس سے جدا ہو گیا تھا۔ پھر جب یہ قیامت صغریٰ موقوف ہوئی تھی تو جزیرے کی جگہ ایک دھوئیں میں لپٹا چھوٹا سا ویران خشکی کا ٹکڑا سمندر میں سر اٹھائے کھڑا تھا۔

آج ڈیڑھ سو سال بعد کراکاٹوا کے اس باقی ماندہ حصے کی کیا حالت ہے؟ کیا یہ ویسا ہی ویران اور اجڑا ہوا غیظ و غضب کا نشانہ بننے کی شہادت دے رہا ہے یا آباد اور ہرا بھرا ہو گیا ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لیے ہم نے وہاں جانے اور زندگی کی استواری و تکمیل کی یادگار دریافت کرنے کا فیصلہ کیا۔

کراکاٹوا پہنچنے کا واحد ذریعہ صرف کشتی ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارے پرانے دوست سیگ اور لائیلو جو جکارتا کے پرانے رہائشی تھے ہماری اس دیرینہ خواہش سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے ہمیں پیش کش کی کہ ہم ان کی اڑتیس فٹ لمبی بادبانی کشتی میں ان کے ہمراہ اس سفر پر چلیں۔ یہ کشتی ہمیں کراکاٹوا اور جنوب مشرقی ایشیا کے حسین ترین ویران جزائر میں لے جا سکتی تھی جو انسانی قدموں سے اب تک ناآشنا چلے آرہے تھے۔

ہمارا سفر جکارتا کی بندرگاہ تانگ جانگ پرایاک سے شروع ہوا۔ ہم دوپہر کے وقت مغرب کے سفر پر روانہ ہوئے۔ موسم گرم اور ہوا میں نمی تھی۔ شہر بھر سے بہہ کر آنے والے گندے پانی کے سبب سمندر کا پانی بھی گندہ اور بدبودار بنا ہوا تھا۔ دس ناٹ کی ہواؤں نے کشتی کے بادبانوں میں ہوا بھر دی اور ہم تیزی سے زنگ خوردہ مال بردار چھوٹے جہازوں اور سامان لانے لے جانے والی طاقت ور کشتیوں اور تیل بردار ٹینکروں کے درمیان سے گزرنے لگے۔

دو میل سفر کے بعد سمندر کا پانی صاف ہونے لگا۔ ایک چھوٹی کشتی "پراسیس" ہمارے قریب سے گزری۔ اس کے پہلوؤں کے شوخ سرخ، نیلے اور نارنجی رنگ چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے مستولوں سے لگے پھٹے ہوئے بادبان ہوا سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اکثر مقامات پر اتھلے پانیوں میں گاڑے ہوئے لمبے لمبے بانسوں کے اوپر چوبی تختوں پر شکار کی گئی مچھلیوں کے ڈھیر لگے تھے۔ ان کا سلسلہ خلیج جکارتا کے اتھلے پانیوں میں تاحدِ نگاہ دراز ہوتا چلا گیا تھا۔ یہاں ہزاروں ماہی گیر رات کے وقت مٹی کے تیل کے چراغوں کی روشنی میں جالوں کی مدد سے جھینگوں کا شکار کرتے ہیں۔

شام ہوتے ہوتے ہم ایک ننھی سی مونگے کی چٹان پر جا پہنچے۔ رات کی تاریکی چھانے کے ساتھ ہی جھینگے پکڑنے والی کشتیوں پر لگی لالٹینوں کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتی دکھائی دینے لگی تھیں اور سمندر میں کسی شہر کا سا نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ ننھے ننھے آبی جانوروں کے جسموں سے خارج ہونے والی روشنیاں پانی میں قوس قزحی رنگ پیدا کر رہی تھیں۔ خطِ استوا سے نیچے راہنمائی کے لیے کھڑا کیا گیا روشنی کا مینار اس چٹان کے اوپر دکھائی دے رہا تھا۔

دو دن کے سفر کے بعد ہم خلیج سنڈا پہنچ گئے اور جنوبی سمت ہو لیے۔ یہاں لنگر اندازی کی محفوظ جگہیں بہت کم ہیں۔ یہاں کشتی آگے بڑھانے میں، بالخصوص رات کو انتہائی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس جگہ چند ہی روشنی کے مینار ہیں اور راننا پیراک خول (Bouys) بالکل نہیں ہیں۔ ہواؤں اور لہروں کے تیور بھی ہر آن بدلتے رہتے ہیں لیکن مقامی ماہی گیر کشتیاں ان پر سوار ملاحوں کے سگریٹوں کے جلتے سروں کی راہنمائی میں بڑی آسانی سے اِدھر اُدھر آتی جاتی رہتی ہیں لیکن یہ کشتیاں ہمارے لیے خطرہ بنی رہیں۔

صبح تڑکے ہم نے پیوکانگ نامی ایک چھوٹے سے جزیرے کی سمندر سے باہر نکلی ہوئی پرت کے گرد چکر لگایا اور حسن و دلکشی کی ایک ناقابلِ یقین سی دنیا میں داخل ہو گئے۔ جزیرہ پیوکانگ کو جنگلات سے بھری مین لینڈ سے ایک صاف و شفاف پُرسکون رودبار جدا کرتی ہے۔ مین لینڈ کے مقابل یو جنگ کولون جزیرہ نما جاوا کا سرا واقع ہے۔ ایک انتہائی قدیم، غیر آباد، برساتی جنگلات مینگریو اور مدوجزری دلدلوں سے بھرا۔

ہم نے پیوکانگ میں جنگل کے عقب میں وسیع ریتیلے ساحل پر لنگر ڈالا۔ سورج غروب ہوتے ہی وہاں روسا ہرنوں کی ڈاریں اور میکاؤ بندروں کے غول آنا شروع ہو گئے۔ بندر ساحل کے ساتھ ساتھ پانی میں تیرتے ہوئے کیکڑے تلاش کرتے رہے اور پکڑتے رہے جب کہ ہرن ساحل پر مٹر گشت کرتے نظر آئے۔ ہماری کشتی کے نیچے سے رنگ برنگی مچھلیوں کا ایک جھنڈ تیرتا ہوا گہرے پانیوں میں غوطہ لگا گیا۔ پھر رات ہونے سے کچھ دیر پہلے "اڑن لومڑیاں" نمودار ہوئیں۔ یہ پانچ فٹ لمبے پروں والی چمگادڑیں جو جنگلی انجیروں کی تلاش میں درختوں کی چوٹیوں کے اوپر اڑ رہی تھیں۔

دوبارہ کھلے سمندر میں پہنچ کر ہم کراکاٹوا کی جانب شمال مشرق روانہ ہو گئے۔ جو اب صرف بیالیس میل کی

دوری پر رہ گیا تھا۔ ہماری کشتی تیزی سے شفاف سبز پانیوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی جارہی تھی۔ جب تین ڈولفن مچھلیاں سطح آب پر نمودار ہوئیں اور اس کے ساتھ ساتھ تیرنے لگیں۔ سہ پہر ہوتے ہوتے ہمیں وہ جزیرہ دکھائی دینے لگا۔ جو دھندلی فضا میں شارک کے کسی پر کی طرح سمندر سے باہر نکلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ شمال مغرب کی طرف جہاں جزیرے کا بیشتر حصہ 1883ء کے آتش فشانی انفجار سے اڑ گیا تھا اور اب ایک ڈیڑھ میل بلند چوٹی سے یہ جنوبی سمت سمندر میں لڑھکی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ بالکل شاقول کی ڈوری کی طرح سیدھی ہے۔

جب ہم اس کے قریب پہنچے تو ہم نے وہاں مہیب گڑھا پڑے ہوئے دیکھا جو چھ میل قطر پر محیط اور ہزار فٹ گہرا تھا۔ پہلے یہ جگہ ٹھوس میدانی ہوا کرتی تھی۔ پھر وہ دھماکے ہوئے جن سے کراکاٹوا کی صورت ہی بدل گئی۔

ستائیس اگست 1883ء کی صبح ٹھیک پانچ بج کر تیس منٹ پر اس جگہ سے سو میل کی دوری پر بٹاویا موجودہ جکارتا کے مکینوں کو ایک مہیب دھماکے نے نیند سے بیدار کردیا۔ جب شہر کی دہشت زدہ آبادی وسط شب کے سیاہ آسمان تلے جمع ہورہی تھی جس پر وقفوں وقفوں سے زبردست آتش فشانی انفجار کے سبب مہیب کڑاکوں کے ساتھ بجلی کی چمکتی ہوئی لمبی لکیریں نمودار ہورہی تھیں تو اسی وقت ایک دوسرا مہیب دھماکا ہوا جس نے عمارات کو بنیادوں سے ہلا دیا اور شیشے توڑ دیے۔ پھر ایک ناقابلِ بیان چنگھاڑ بلند ہوئی اور سمندر کی بپھری ہوئی غضب ناک لہریں غراتی ہوئی گھروں درختوں سب پر سے گزرتی چلی گئیں۔

کراکاٹوا ایک زبردست قسم کا زندہ آتش فشاں پہاڑ تھا۔ اس کے پھٹنے سے سب سے خوف ناک بات جو ظہور میں آئی وہ یہ تھی کہ اس کی تہہ میں جہاں زمین پھٹی تھی لاکھوں ٹن سمندری پانی گرم سفید دھاروں کی صورت میں پھوٹ پڑا جس کے نتیجے میں سمندر کا پانی انتہائی گرم بھاپ میں تبدیل ہوگیا اور جزیرے پر سے گزرتے ہوئے اس کے بیشتر حصوں کو زلزلائی قوت سے ایک دوسرے سے توڑ کر رکھ دیا۔ سیاہ راکھ کے بادل، جلتے ہوئے سوراخ دار بڑے بڑے پتھر، آتش فشانی عمل زدہ سیاہ بلوری چٹان زمین کی گہرائی سے ایک دم ہی کسی راکٹ کی رفتار سے فضا میں پچیس میل تک اوپر اڑ گئے۔ پھر جزیرے کی بیشتر سطح، زمین کے مہیب پیالوں کے اندر جا کر غائب ہوگئے۔

اس انفجار کے چار گھنٹے بعد اس جگہ سے تین ہزار میل دور جانب جنوب مغرب بحر ہند میں واقع جزیرہ ''روڈ ریگز'' کے پولیس چیف نے مشرق سے بھاری گولہ باری کی آوازیں سنائی دینے کی رپورٹ دی۔ دو ہزار تین سو میل دور ایلس اسپرنگ آسٹریلیا کے باشندوں نے بھی شمال مغرب سے دھماکوں کی آوازیں سنیں جو انہیں بے حد پُراسرار معلوم ہوئیں۔

کراکاٹوا کے گرد و پیش کے تین سو میل کے علاقے میں واقع دیہاتوں اور بحری جہازوں پر وقفوں وقفوں سے جلتے ہوئے سرخ پتھروں اور گرم سرخ راکھ کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔ نارتھم کیسل نامی ایک جہاز کے کپتان جو شواسٹون نے عین دن کے وقت کہا۔ ''ہمارے آس پاس گھپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔'' وہ اور اس کا عملہ گرم راکھ کی برسات کے نتیجے میں جہاز پر جگہ جگہ لگ جانے والی آگ سے لڑنے میں مصروف تھے۔ مہیب شور شرابے سے بہت سے آدمیوں کے کانوں کے پردے پھٹ چکے تھے۔ بیشتر بری طرح سے جل گئے تھے مگر معجزانہ طور پر وہ اپنے جہاز کو تباہ ہوجانے سے بچانے میں کامیاب ہوگئے۔ جلتی راکھ اور پتھروں سے لدے تیز و تند ہوائی جھکڑوں نے جنوبی سماٹرا میں بھی مہیب تباہی مچائی۔ لوگوں کو جھلسایا، مکانات عمارات تباہ کیں، جگہ جگہ آگ لگائی۔

سب سے زیادہ تباہ کن وہ عظیم سمندری لہریں ثابت ہوئیں جو اس ہولناک انفجار کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھیں۔ سمندر میں زبردست تموج پیدا ہوا جو ہر طرف پھیل گیا اور ایک ڈیڑھ سو فٹ بلند مہیب سونامی کی صورت میں تمام قریبی ساحلوں کو اپنی لپیٹ میں لیتا چلا گیا۔ یہ جاوا، سماٹرا، بورنیو (موجودہ برونائی) اور سلیبز کے ساحلوں پر چڑھ کر ان کی تمام آبادیوں پر سے گزرتا چلا گیا۔ انتہائی دور آسٹریلیا، انڈیا اور جاپان میں بھی اس مہیب سونامی نے جہازوں کشتیوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ طوفان چار سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے موجیں لیتا ہوا راستے میں جگہ جگہ تباہی و بربادی مچاتا گیارہ ہزار میل دور دور بار انگلستان بھی جا پہنچا اور کئی جہازوں اور کشتیوں کو غرق کیا اور نقصان پہنچایا۔

پھر جب یہ قیامت صغریٰ موقوف ہوئی تو اندازاً 36 ہزار افراد موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ تین ہزار انڈونیشی گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹ چکے تھے۔ چھ ہزار بحری جہاز تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ اگلے ایک سال اس انفجار کے نتیجے میں فضا میں بکھری ہوئی راکھ دنیا کے اکثر علاقوں میں دھوپ چھاؤں جیسا تماشا برپا کرتی رہیں۔

سائنس دانوں کو یقین ہے کہ کراکاٹوا اس سے پہلے بھی

کئی مرتبہ پھٹ چکا ہے اور یہ انفجار زمانہ قبل مسیح میں بھی پیش آتے رہے ہیں۔ یہ اب بھی کسی وقت پھٹ سکتا ہے۔ ژیل یونیورسٹی کے جیالوجی کے پروفیسر فلپ اور ویل کا کہنا ہے۔ ''کراکاٹوا کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے لیکن کب؟ اس بارے میں حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ آتش فشاں پہاڑوں کے بارے میں وثوق کے ساتھ کوئی پیش گوئی کرنا مشکل ہے لیکن ان کے پھٹ پڑنے کا خطرہ بہرکیف موجود ہے۔''

اور اب جب کہ آپ کراکاٹوا کے سیاہ چمکتے ساحل پر کھڑے ہیں تو آپ بمشکل ہی یقین کریں گے کہ ڈیڑھ سو سال پہلے وہاں واقعی ایسی ہولناک قیامت برپا ہوئی تھی۔ اس پر اب خوب گھاس اور درخت اگے ہوئے ہیں۔ منطقۂ حارہ کے جنگلات دور دور تک پھیلے دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر درختوں کی بلندی سو فٹ سے بھی متجاوز ہے۔ انگور کی بیلیں اور دوسری بیلیں، گھاس کے قطعات، سفید پھولوں سے لدے پودے ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ درختوں پر رنگا رنگ پرندے اڑتے چہکتے دکھائی دیتے ہیں۔ بڑی بڑی مکڑیوں کے جالے اور شہد کی مکھیوں کے چھتے بھی ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ خرگوش گرگٹ چھپکلیاں بھی اکثر دکھائی دے جاتے ہیں۔

سائنس دان وہاں زندگی کی اتنی جلد مراجعت پر انتہائی حیرت زدہ ہیں۔ اس وقت جب کہ زمین اب بھی بعض مقامات پر سخت تپتی ہوئی اور بعض مقامات پر دو سو فٹ گہری راکھ کی تہہ سے ڈھکی ہوئی ہے۔ زندگی نے واقعی ایک شاندار پلٹا کھایا ہے۔

انفجار کے ایک سال بعد وہاں ایک ماہر حیاتیات نے ایک ننھی سی مکڑی دریافت کی تھی اور کچھ نہیں لیکن پھر دو سال بعد وہاں نباتات کی لاتعداد اور حیرت ناک اقسام پیدا ہو گئیں۔ ان میں پندرہ پھولدار پودے تھے۔ گیارہ اقسام کی جھاڑیاں تھیں۔ دو اقسام کے کائی کے پودے۔ ان کے بیج جو شاید ہواؤں، سمندری دھاروں، پرندوں اور غالباً مقامی ماہی گیروں کے ذریعے وہاں پہنچے تھے۔ وہاں انہوں نے زمین میں جڑیں پکڑیں اور پھوٹ پڑے۔ بعد میں پرندے، رینگنے والے جانور اور حشرات بھی وہاں پہنچنا شروع ہو گئے۔ یہ ہواؤں کے دوش پر یا سمندری لہروں یا جہازوں اور کشتیوں کے ٹوٹے ہوئے تختوں اور لکڑی کے ٹکڑوں کے ذریعے پہنچتے رہے۔ تباہی کے پچاس سال بعد وہاں اس قیامت کے بہت ہی کم آثار باقی رہ گئے تھے۔

''کراکاٹوا'' پروفیسر اور ویل کہتے ہیں۔ ''فطرت کی نسلی قوت کی ایک نصابی مثال ہے۔''

ہر چند کہ کراکاٹوا آج جنت نظیر دکھائی دیتا ہے۔ وہاں کوئی انسان نہیں رہتا۔ سیاح بھی خال خال اس کا رخ کرتے ہیں۔ وہاں جہازوں اور کشتیوں کی لنگر اندازی خطرے سے کم نہیں۔ اس کی زمین کاشت کاری کے لیے بالکل موزوں نہیں۔ وہاں جو پانی پایا جاتا ہے اس میں گندھک کی آمیزش ہوتی ہے۔ گڑھوں اور تالابوں میں جو بارش کا پانی جمع ہوتا ہے وہ سخت بدبودار ہوتا ہے۔ اس کے ساحلوں کے قریب کا پانی سیاہی مائل سبز ہے اور اس میں خونخوار شارک مچھلیاں منڈلاتی دکھائی دیتی ہیں۔ کراکاٹوا کی چوٹی پر ہر دم بادل چھتری تانے رہتے ہیں اور پہاڑوں کے درمیان تیز و تند ہواؤں کے جھکڑ چلتے رہتے ہیں۔ جن سے عجیب چنگھاڑنے جیسی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ انڈونیشی اس جزیرے کی طرف جانے سے کتراتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ جزیرہ بدروحوں کا مسکن ہے۔

ہم ملبے کے ایک بلند اور عمودی ڈھیر کی چوٹی پر چڑھ گئے۔ وہاں سے ہم گرد و پیش کا بہتر طور نظارہ کر سکتے تھے۔ اس مقام سے تقریباً چار میل کی دوری پر ایک گہرے آبدوزی پیالے میں سے ایک سیاہ رنگ کی چٹان ابھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ جس میں سے دھوئیں کے مرغولے نکل نکل کر فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ یہ آنک کراکاٹوا تھی یعنی کراکاٹوا کا بچہ۔ جو اس ہولناک دھماکے کے پینتالیس سال بعد 1928ء میں خلیج سنڈا کی سطح پر نمودار ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے اس کے حجم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ چٹان اب تک پانچ سو فٹ بلند ہو چکی ہے۔ اس کا دھانا بھی بن چکا ہے جس میں سے مسلسل دھواں خارج ہوتا رہتا ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ فی الحال اس کے پھٹنے کا کوئی امکان نہیں لیکن اگر یہ پھٹ گیا تو گرد و پیش کا تین سو کلومیٹر رقبہ اس سے متاثر ہو سکتا ہے۔

ہمارے لیے اس ملبے کی پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہو کر انتہائی شیطانی انداز میں دھواں اگلتے آنک کراکاٹوا کا نظارہ کرنا جب کہ ہمارے گرد و پیش سمندری پرندے چہکتے اڑتے پھر رہے تھے اور آس پاس پھول کھلے مسکرا رہے تھے، انتہائی وحشت ناک تجربہ تھا۔ کائناتی نظام کے تحت ہمیں یہاں فطرت کی تباہ کن قوتوں کے مقابل کارگزار اور تخلیقی قوتوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔

آخری امتحان

محمد نذر

عورت کو ناقص العقل سمجھا جاتا ہے لیکن اس عورت نے امتحان لینے کے لیے ایک ایسا جال بچھایا کہ چاہ کر بھی وہ بچ نہ سکا۔

مغربی معاشرے کا ایک مکروہ رخ

مسز کیتھی سے میری شناسائی اسی موسم میں ہوئی تھی وہ شاعرانہ مزاج کی حامل ایک افسانوی شخصیت تھی۔ وہ ایک آزاد طبع خاتون ہونے کے علاوہ نڈر اور تاثر خیز عورت تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس میں تھوڑا سا تعصب بھی تھا۔ اس کے باوجود اسے جذباتی، زود رنج، نازک مزاج اور نزاکت پسند بھی کہا جاسکتا ہے۔ وہ ایک بیوہ عورت تھی اور مجھے بیوہ عورتیں خاصی پسند ہیں۔ یہ پسندیدگی دراصل اس لیے ہے کہ میں کاہل ہوں مجھے ایک بیوی کی ضرورت تھی اور پھر مجھے مسز کیتھی پسند آگئی تھی۔ پھر

وہ لمحہ بھی آ گیا کہ میں اپنے دل کی بات اس سے کہہ سکتا تھا کیونکہ میں اسے بے حد چاہنے لگا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آدمی جس عورت سے شادی کرے اس سے اپنی محبت ہرگز نہیں جتانا چاہیے۔ ورنہ پھر اس سے حماقتیں سرزد ہونے لگتی ہیں۔ اس کی سوچیں پُر سقم ہو جاتی ہیں اور وہ بیک وقت احمق اور ظالم بن جاتا ہے۔ آدمی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی بالادستی قائم رکھے۔ ابتدا میں تھوڑی سی کوتاہی بعد میں اسے کہیں کا نہیں رہنے دیتی۔

ایک دن میں اس کے گھر گیا۔ میں اس وقت پیرس میں قیام پذیر تھا۔ یہ ایک لمبی اسٹوری ہے کہ میں وہاں کیوں گیا۔ بہرحال میں نے اٹکتے جھجکتے ہوئے اپنا مدعا بیان کر دیا۔ ”میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں اور خواہاں ہوں کہ تم مجھے زندگی بھر کا ساتھی بنا لو۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم مجھے اس لائق سمجھتی ہو یا نہیں؟“ میں نے وضاحت سے اپنی درخواست پیش کر دی۔

وہ ذرا بھی نہیں جھجکی۔ اس نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا اور پھر ایک دلآویز مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی۔ ”سوال بڑا عجیب ہے۔ میں کچھ نہیں جانتی کہ تم مجھے خوش رکھو گے یا نہیں۔ لہٰذا ایسی کوئی بات اسی صورت میں کہی جاسکتی ہے کہ میں اس ضمن میں تمہیں آزما لوں۔ ایک مرد کی حیثیت سے تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔ البتہ میں تمہارے دل و دماغ اور کردار و عادات سے واقفیت حاصل کرنا ضرور چاہوں گی۔ عموماً شادیاں جذباتی ہو کر کی جاتی ہیں اور میں کسی ایسے عمل کو مجرمانہ سمجھتی ہوں۔ بسا اوقات کوئی بالکل چھوٹی سی حرکت یا عادت بعد میں میاں بیوی کے درمیان خلیج بن جاتی ہے۔ خواہ ان میں کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو۔ پھر وہ دونوں زن و شوہر نہیں رہتے، ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ایسے دشمن جو ایک ہی زنجیر میں بندھے ہوں۔ میں بہرحال کسی ایسے شخص سے شادی نہیں کر سکتی۔ جب تک اس کے ظاہر و باطن کے تقریباً سارے گوشے مجھ پر عیاں اور واضح نہ ہوں۔ میں شادی سے پہلے اس شخص کو اطمینان کے ساتھ چند ماہ تک دیکھنا اور سمجھنا چاہوں گی۔“ کچھ دیر کے توقف کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”اب میں اپنی تجویز تمہارے سامنے رکھوں گی۔ پیرس کے نواحی علاقے میں میرا مکان ہے۔ تم کو گرمیوں کے دنوں میں یہاں آ کر رہنا ہوگا پھر میں دیکھوں گی کہ آیا ہم لوگ ایک ساتھ رہ سکتے ہیں یا نہیں۔“ رک کر اس نے مجھ پر گہری نظر ڈالی پھر کہا۔ ”میں دیکھ رہی ہوں تم مسکرا رہے ہو۔ شاید تمہارے دماغ میں کوئی برا خیال ہے مگر مجھے اپنے اوپر پورا اعتماد ہے۔ جبھی میں نے یہ تجویز رکھی ہے۔ وہ جذبہ جسے تم مرد لوگ محبت کا نام دیتے ہو۔ میں اس جذبے کے لیے اپنے دل میں کچھ اچھے خیالات نہیں رکھتی۔ محبت میں یکا یکی گرفتار ہونے کے بارے میں، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ خیر...... تو پھر یہ تجویز تمہیں منظور ہے یا نہیں؟“

میں نے اس کے ہاتھوں کو تھام کر کہا۔ ”اس کا آغاز کس دن سے ہوگا؟“

”مئی کی دس تاریخ سے۔“

”ٹھیک۔“ میں نے جواب دیا۔

مہینے بھر بعد تجویز کے مطابق میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ واقعی وہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد عورت تھی صبح سے لے کر شام تک وہ میرے ساتھ لگی رہتی تھی۔ اسے گھوڑوں کا شوق تھا۔ ہر روز ہم دونوں گھڑ سواری کرتے ہوئے قریبی جنگل میں چلے جاتے۔ ہمارے درمیان باتیں ہوتی رہتیں مگر وہ کوشاں رہتی تھی کہ میرے ڈھکے چھپے خیالات کو پڑھ سکے۔ جہاں تک میرا معاملہ تھا تو میں اسے واقعی بے حد چاہنے لگا تھا اور اسی جذبے سے مجبور ہو کر میں نے اس بات پر سوچنے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ میرے اور اس کے کردار میں مماثلت بھی ہے یا نہیں۔ تاہم جلد ہی مجھے اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ مجھے اس جگہ سونے کے عالم میں بھی دیکھا بھالا جاتا ہے۔ میری شب خوابی کے کمرے سے ملحق ایک چھوٹا کمرا تھا اور اس کے اندر کوئی سوتا تھا اور جب رات زیادہ ہو جاتی تھی تو وہ بڑے محتاط انداز میں اس کمرے سے نکل کر میرے کمرے میں آتا تھا۔ گویا لمحہ بہ لمحہ میری جاسوسی کی جارہی تھی۔ جاسوسی کا یہ طریقہ مجھے قطعی پسند نہیں تھا مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ میرے دل میں آئی کہ اب اس معاملے کو کسی گھاٹ اتار ہی دینا چاہیے۔ پھر ایک شام میں نے ایک طریقہ بھی سوچ لیا اور اس پر عمل درآمد کی ٹھان لی۔ اس نے مجھے کچھ اس طرح رکھا تھا کہ میری اپنی حیثیت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

میرے ذہن میں یہ بات کھٹکی تھی اور میں نے طے کیا تھا کہ اسے میں تھوڑا سا سبق ضرور دوں گا۔ تاکہ اس کی اس حرکت کی کچھ تلافی ہو سکے۔ میرے پاس ایک مناسب طریقہ موجود تھا۔ الیگزا اس کی نہایت بااعتماد خادمہ تھی۔ اپنی مالکہ کی طرح خوب صورت اور دلآویز! ایک سہ پہر کو میں نے الیگزا کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اس کے ہاتھ پر سو کر

فراک رکھے اور کہا۔ "دیکھو بے بی! میرے دل میں تمہارے لیے کوئی برا ارادہ نہیں ہے۔ میں تم سے صرف ایک کام لینا چاہتا ہوں۔ وہی کام جو تم سے تمہاری مالکہ میرے لیے کرا رہی ہے۔"

لڑکی آہستہ سے مسکرائی مگر میں بولتا رہا۔ "مجھے اس بات کا علم ہے، دیکھا جا رہا ہے کہ میں کس طرح کھاتا ہوں۔ کس طرح پیتا ہوں۔ کس طرح کپڑے پہنتا ہوں۔ کس طرح شیو کرتا ہوں، کس طرح موزے پہنتا ہوں وغیرہ مجھے سب خبر ہے۔"

"جی۔" لڑکی تھوڑی سی حیرت زدہ ہوئی۔

"میں بولتا رہا۔" تم میرے کمرے سے ملحق کمرے میں سوتی ہو۔ صرف اس لیے کہ دیکھ سکو کہ آیا میں رات میں خراٹے لیتا ہوں، کھانستا ہوں، کھنکارتا ہوں وغیرہ۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"جی جناب۔" لڑکی نے کہا اور چپ ہوگئی۔

میرا جوش تھوڑا بڑھ گیا۔ "دیکھو پیاری لڑکی۔" میں نے کہا۔ "تم سمجھتی ہو نا کہ یہ بات اچھی نہیں کہ کسی شخص کے بارے میں تمام باتیں جانی جائیں جب کہ جس عورت کو میں اپنی بیوی بنانے جا رہا ہوں مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ میں اسے بے حد چاہتا ہوں۔ اس کا چہرہ اس کا جسم اس کے انداز سب مجھے پسند ہیں۔ پھر بھی میں چند باتیں ضرور جاننا چاہتا ہوں۔"

الیگزا نے بالآخر میرے دیئے ہوئے نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیے اور میں نے سمجھ لیا کہ یہ سودا پکا ہو چکا ہے۔

"سنو۔" میں نے اس سے کہا۔ "ہم مرد، عورتوں کے بارے میں زیادہ تر جن باتوں کو جاننے کے خواہاں ہوتے ہیں اس کا تعلق عورت کے جسم سے ہوتا ہے۔ جسم کی خوبی عورت کی دلکشی اور قدر و قیمت میں اضافہ کر دیتی ہے۔ میرا مطلب یہ بھی نہیں کہ تم اپنی مالکہ کے جسمانی نقائص مجھے بتاؤ۔ البتہ میں تم سے چار پانچ سوال کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ان کے جوابات پوری ایمانداری سے دو۔ تم مسز کیتھی کو اتنا ہی جانتی ہو جتنا کہ تم اپنے آپ سے واقف ہو کیونکہ تم اسے لباس پہناتی ہو۔ بس تم مجھے بتاؤ کیا واقعی اس کا بدن اتنا گداز ہے جتنا کہ وہ لباس کے بعد دکھائی دیتی ہے؟"

خوب صورت خادمہ چپ کھڑی رہی۔

میں نے کہا۔ "سبھی جانتے ہیں کہ بعض عورتیں اپنی

قابلِ غور

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بہلول بازار میں بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ کا وہاں سے گزر ہوا تو اس نے پوچھا۔ "بھائی یہاں کیا کر رہے ہو؟"

بہلول نے کہا۔ "بندوں کی اللہ سے صلح کروا رہا ہوں، اللہ تو مان رہا ہے مگر بندے نہیں مان رہے۔"

اتفاق سے کچھ عرصہ بعد بہلول کی ملاقات قبرستان میں ہوئی۔ بادشاہ نے پوچھا۔ "بھائی یہاں کیا کر رہے ہو؟"

بہلول نے کہا۔ "اللہ کے بندوں سے صلح کروا رہا ہوں، آج بندے تو مان رہے ہیں مگر اللہ نہیں مان رہا۔"

مرسلہ: فرحانہ رفیق، سرگودھا

جسمانی خوبی کو اجاگر کرنے کے لیے مصنوعی سہارا ڈھونڈتی ہیں۔ کیا میڈم بھی کوئی ایسی چیز استعمال کرتی ہے؟"

خادمہ نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ بالآخر اس نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کی ساری باتوں کے جوابات ایک ساتھ دے دوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے بات کو اور آگے بڑھایا۔ "بعض عورتیں چلتی ہیں تو ان کے ٹخنے ایک دوسرے سے مس ہوتے رہتے ہیں جب کہ بعض عورتوں کی ٹانگوں کے درمیان مناسب فاصلہ رہتا ہے۔ ٹانگوں کی یہ بناوٹ زیادہ خوب صورت ہوتی ہے۔ تمہاری مالکہ کی ٹانگیں کس زمرے میں آتی ہیں؟"

خادمہ اس بار بھی چپ کھڑی رہی۔ میں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "بعض عورتوں کی گردنیں بے حد خوب صورت ہوتی ہیں۔ بعض کے بازو بڑے ہوتے ہیں مگر جسم دبلا ہوتا ہے۔ مجھے بتاؤ تمہاری مالکہ کے ساتھ کیا صورتِ حال ہے۔ میں ان سوالوں کے واضح جوابات چاہتا ہوں۔ تم چاہو تو تمہیں مزید رقم مل سکتی ہے۔"

الیگزا نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھا اور ہنس پڑی پھر اس نے کہا۔ "حقیقت یہ ہے جناب کہ میری مالکہ کا رنگ ذرا دبتا ہے اس کے سوا وہ بالکل میری طرح ہے۔" اتنا کہہ کر وہ وہاں سے فوراً چلی گئی۔

مجھے اس نے بے وقوف بنایا تھا۔ مجھے کھسیاہٹ ہونے لگی۔ میں اس خادمہ پر بھی یکایک برہم ہو گیا اور طے کیا کہ اب اسے بھی سبق سکھاؤں گا۔

ایک گھنٹے بعد میں احتیاط کے ساتھ اس کمرے میں جا گھسا جس میں میری جاسوسی کے لیے خادمہ الیگزا سویا کرتی تھی۔ پھر میں نے اندر کی زنجیر کے بولٹوں سے اسکریو نکال دیے۔ آدھی رات کے وقت وہ اپنی ڈیوٹی پر آ گئی۔ مجھے اپنے کمرے میں دیکھ کر اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس کا منہ بند کر دیا۔ پھر مجھے زیادہ جدوجہد نہیں کرنا پڑی۔ الیگزا اتنی خوفزدہ تھی کہ اس کا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ یہاں ٹھہر کر میں نے اس بات کا اطمینان کیا کہ مسز کیتھی کی ساخت کیا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ خادمہ کے بیان کی روشنی میں وہ بالکل اسی کی طرح تھی۔ مجھے پتا چلا کہ اگر اس کا بیان درست ہے تو پھر مسز کیتھی حسن و دلکشی کا نادر نمونہ ہو گی۔ الیگزا کے بے پناہ حسن نے مجھے وہاں رات گئے تک رکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ واقعی ایک مضبوط اور پرجوش لڑکی تھی۔ البتہ اس میں کچھ ایسی باتیں ضرور تھیں جو نازک طبع افراد کو ناگوار ہو سکتی تھیں۔ میں نے اس لیے دوسری شام کو اسے پرفیوم کا ایک تحفہ بھی دیا اور ساتھ ہی لیونڈر واٹر کا ایک فلاسک بھی پیش کیا تاکہ اس کے اندر کوئی کسر نہ رہ جائے۔

میرے اور اس کے درمیان اب ایک گہری رفاقت کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کی رفاقت نے یہ خیال ہی دل سے نکال دیا کہ مسز کیتھی میرے بارے میں فیصلے میں کیوں تاخیر کر رہی ہے۔ میں بڑا مطمئن بے فکر اور معصوم نظر آنے لگا تھا۔ مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ میری محبوبہ کیتھی بھی اب مجھے پسندیدگی سے دیکھنے لگی ہے۔ مجھے اس بات کا یقین ہو رہا تھا کہ جلد ہی وہ اپنا فیصلہ سنانے والی ہے اور یہ فیصلہ میرے حق میں ہونا تھا۔ میں واقعی روئے زمین پر سب سے زیادہ خوش قسمت انسان تھا۔ مجھے اب شدت سے اس دن کا انتظار تھا کہ قانونی طور پر مجھے وہ عورت مل جائے جسے میں چاہتا رہا ہوں۔

اس موقع پر میں معافی چاہوں گا۔ میرے قصے میں ہر موڑ ذرا نازک سا ہے۔

ایک شام جب میں مسز کیتھی کے ساتھ گھڑ سواری سے پلٹا تو اس نے شکایتاً بتایا کہ اس کے سائیس نے اس کے گھوڑے کے سلسلے میں ان طریقوں پر عمل نہیں کیا جس کے بارے میں کیتھی نے اسے ہدایت دی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ دہرایا۔ ''انہیں سمجھانا ہی ہوگا، وہ مجھے جانتے نہیں اچھی طرح۔''

وہ رات میں سکون سے سو گیا۔ البتہ ذرا جلدی اٹھ گیا تھا۔ میں نے کپڑے پہنے اور اپنے کمرے سے نکل آیا۔ میری عادت تھی کہ ہر روز صبح کو میں مکان کے ٹاور پر جا کر سگریٹ پیا کرتا تھا۔ اوپر پہنچنے کے لیے لائم اسٹون کی بنی ہوئی سیڑھیاں تھیں۔ یہاں روشنی کے لیے ایک کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ یہ کھڑکی کافی بڑی تھی اور پہلی منزل کے اوپر بنی ہوئی تھی۔ میرے پیروں میں مرا کو سلیپر تھے۔ میں بے آواز چلتا ہوا آگے بڑھا۔ ابھی پہلی ہی سیڑھیاں طے کی تھیں کہ مجھے احساس ہوا کہ اوپر کھڑکی میں سے جھکی ہوئی الیگزا نیچے کی طرف دیکھ رہی ہے۔

بے شک یہاں سے میں الیگزا کو مکمل طور سے نہیں دیکھ سکا تھا۔ مجھے اس کا صرف کچھ حصہ ہی دکھائی دے رہا تھا اور یہ اس کے جسم کا نچلا حصہ تھا۔ مجھے تو وہ پوری ہی پسند تھی۔ اس وقت اس کے جسم پر ہلکا سا لباس تھا اور کمر کے گرد صرف اسکرٹ بندھا ہوا تھا۔

میں بہت آہستگی سے بڑھتا ہوا اس کی طرف چلا۔ وہ ہنوز میرے وجود سے بے خبر تھی۔ اس نے میرے قدموں کی چاپ بالکل نہیں سنی۔ اس کے بالکل نزدیک پہنچ کر میں گھٹنوں کے بل دوزانو ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے کسی حیوانی منصوبے پر عمل کرتا ایک زوردار تھپڑ میرے چہرے سے ٹکرایا۔ مجھے اپنی ناک ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسکرٹ کے دونوں کونے میرے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ پھر کھڑکی کی گہرائی میں جھکا ہوا چہرہ سیدھا ہوا۔ گھوما اور میں نے دیکھا وہ چہرہ مسز کیتھی کا تھا۔ اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے وہ غش کھا کر گر جائے گی۔ چند لمحوں تک وہ گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔ جیسے اپنے حواس بحال کر رہی ہو۔ پھر وہ بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

دس منٹ بعد الیگزا میرے پاس پہنچی اور ایک پرچا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے پڑھا، لکھا تھا۔

''بس میں یہی دیکھنا چاہتی تھی آپ میرے نہیں، میری ملازمہ کے لائق ثابت ہوئے۔ اب آپ فوراً یہاں سے رخصت ہو جائیں۔ امتحان ختم ہوا۔ آپ چاہیں تو الیگزا کو ساتھ لے جا سکتے ہیں۔''

افسوس میں یہ نہ سمجھا کہ میری نگرانی کے لیے ایک مرد کی بجائے ایک لڑکی کا تقرر کیوں کیا گیا تھا۔ یہی تو وہ امتحان تھا جس کے بعد کیتھی کو میرے حق میں فیصلہ کرنا تھا۔

پراسرار قاتل

ابن کبیر

کچھ جرائم ایسے ہوتے ہیں جو ایک ہی نظر میں وجہ کھول دیتے ہیں اور کچھ جرائم کبھی حل نہیں ہو پاتے اس لیے کہ تفتیش کار خود نہیں چاہتے کہ مجرم سامنے آئے۔ لندن کی سڑکوں پر کھیلا جانے والا ڈراما جسے لوگ جرم سے تشبیہ دیتے تھے۔ کیونکہ قتل کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

مغرب سے درآمد ایک لاینحل کیس کی روداد

دنیا دھند کی لپیٹ میں تھی۔ حقیقت اور خواب میں فرق مٹتا جا رہا تھا۔

کنول نے لیمپ کی سمت دیکھا۔ یوں لگتا تھا، روشنی کو نیند نے آلیا ہو۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا تھا۔ دور پل پر لگی لائٹس دریا کے تاریک پانی پر جھلملا رہی تھیں۔ کنول کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ اس نے گود میں پڑی کتاب پر توجہ مرکز کی۔ الفاظ ایک قدیم منظر کھینچ رہے تھے۔

”...تاریک گلیوں میں ہر آہٹ کے پیچھے ایک کہانی چھپی تھی۔ ہیٹ جھکائے، کالر کھڑے کیے جو شخص ان گلیوں سے گزرتا، وہ قاتل معلوم ہوتا۔ شراب خانوں میں بیٹھے لوگوں کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ بازاری عورتوں کی آنکھوں میں خوف تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں دنیا کا مرکز تصور کیا جانے والا شہر لندن خوف کی لپیٹ میں تھا۔ اور اس کا سبب تھا انسانی تاریخ کا سب سے سفاک سیریل کلر جیک دی ریپر....

جس نے ضلع وائٹ چیپل میں پانچ جسم فروش خواتین کو بے دردی سے قتل کر کے پورے ملک میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ سیاہ راہوں کا یہ سفاک قاتل اپنے پیچھے کتنے ہی سوالات چھوڑ گیا۔ وہ کون تھا؟ اس کے کیا مقصد تھے؟ کیا ان واقعات کا محرک اس کی جسم فروش خواتین سے نفرت تھی یا اس کا سبب کسی شاہی راز کی حفاظت کرنا تھا؟"

نکول کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ باہر تاریکی گہری ہوگئی۔ لندن نیند کی وادی میں اتر گیا تھا۔ عورت کی گردن دھیرے سے ڈھلک گئی۔

دروازے کی جھری سے ایک جھونکا در آیا۔ عورت کی گود میں پڑی کتاب کے ورق پھڑپھڑائے۔ وہ کتاب ایک سفاک قاتل کا قصہ بیان کرتی تھی۔ کتنے ہی عشرے گزر گئے، کتنی تحقیقات ہوئیں مگر ان خوف ناک راتوں کے سربستہ راز سے، ان دھندلائی ہوئی پُراسرار افواہوں سے کبھی پردہ نہیں اٹھ سکا۔

لندن یہ خیال کیے بیٹھا تھا کہ وہ پھر کبھی اس نوع کے خوف کا سامنا نہیں کرے گا، اب ایسا کوئی درندہ شہر کی سڑکوں پر ظاہر نہیں ہوگا۔ خوابوں میں تیرتی نکول بھی یہی سوچتی تھی۔ وہ سری ادب کی دلدادہ ضرور تھی، لیکن اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کے شہر پر ایک بار پھر خوف کا کہرا چھانے والا ہے...

2 فروری 1964 کو رونما ہونے والے ایک واقعے نے لندن کی تاریخ کا پہیا ایسا گھمایا کہ یہ پھر 1888 کے نوآبادیاتی دور میں پہنچ گیا جہاں جیک دی ریپر کے خوف کی بادشاہی تھی اور تاریکی میں اندیشے جنبش کرتے تھے۔

غنودگی میں اترنے سے قبل نکول نے جس دریائے ٹیمز پر روشنی جھلملاتی دیکھی تھی، وہ شانت تھا۔ لہریں بنا آواز کیے بہہ رہی تھیں۔ ہزاروں مضبوط آہنی رسیوں سے تنا ہیمر اسمتھ برج اس وقت سنسان تھا۔ ابھی صبح ہونے میں وقت تھا۔

اس علاقے میں گشت کرنے والا گارڈ عام طور سے پل کے داخلی حصہ پر سرسری نگاہ ڈال کر آگے بڑھ جاتا تھا مگر اس روز اسے وہاں کچھ عجیب دکھائی دیا۔ پہلی نظر میں وہ کچرے کی بوری لگی مگر جب وہ کچھ آگے بڑھا، آنکھیں اندھیرے سے ہم آہنگ ہوئیں، تو اس بوری کے خدوخال ابھرنے لگے اور اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی۔

وہ ایک لاش تھی۔ اس نے ٹارچ کی روشنی اس سمت پھینکی۔ اس کی چیخ ملگجے اندھیرے میں گونجی۔ کرسی پر سوئی ہوئی نکول ہلکی سی کسمسائی۔ دریا کا پانی خاموشی سے بہتا رہا۔

مسلسل بجنے والی سیٹی نے گرد و نواح میں گشت کرنے والے اہل کاروں کو چوکنا کر دیا۔ وہ سب اس سمت دوڑے۔ قریبی علاقوں کے کچھ مکین جاگ گئے۔ ان کی کھڑکیاں روشن ہوگئیں۔ پولیس اہلکار برج کے شمالی حصے میں اپنے حواس باختہ نوجوان ساتھی سے ملے۔ اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ جب انھوں نے اپنی ٹارچ روشن کی تو ان کا خون بھی خشک ہوگیا۔

ہاں، وہ ایک لاش تھی۔ ایک عورت کی لاش۔ مگر اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ ایسی درجنوں لاشیں دیکھ چکے تھے۔ یہ تو لاش کے ساتھ برتی جانے والی سفاکی تھی، جس نے ان پر ہیبت طاری کر دی۔

قتل ہونے والی عورت کو تیس سالہ حنا ٹیلفورڈ کے طور پر شناخت کیا گیا۔ وہ برہنہ تھی۔ بدن پر بدترین تشدد کے نشانات تھے۔ منہ سے خون رس رہا تھا۔ کئی دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور چہرے پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ اس کے زیر جامہ سے اس کا گلا گھونٹا گیا تھا۔

جب نکول کی آنکھ کھلی، سورج چڑھ چکا تھا۔ اس نے انگڑائی لی۔ گود میں پڑی کتاب بند کر کے میز پر رکھی اور دور بہتے دریا پر نگاہ ڈالی۔ نکول کو خبر نہیں تھی کہ اس کے پُرسکون لہروں کے نیچے ایک طوفان جنم لے چکا ہے۔

☆☆☆

اس سفاک قتل نے شہر میں سنسنی پھیلا دی۔

نکول سمیت ہیمر اسمتھ برج کے آس پاس رہنے والے خاصے پریشان تھے، تاہم جب عورت کی نظر سے اخبار کی وہ رپورٹ گزری، جس میں اس بہیمانہ قتل کا موازنہ جیک دی ریپر سے کیا گیا تھا، تو اس نے وہ سراسیمگی محسوس کی جو کئی دہائیوں قبل اس کے دادا نے محسوس کی تھی جو 1888 میں وائٹ چیپل کے ایک مقامی اخبار سے منسلک تھا۔

اس کیس پر اسکاٹ لینڈ یارڈ نے فوراً کام شروع کر دیا۔ ابتدا میں شک کی بنیاد پر انھوں نے کئی افراد سے تفتیش کی۔ بالخصوص علاقے کے والوں سے پوچھ گچھ کی مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ نہ تو کسی نے کچھ دیکھا تھا، نہ ہی انھیں کسی پر شک تھا۔

کچھ روز خاموشی رہی۔ لوگ اس واقعے کو بھول گئے۔ انھوں نے سوچا، یہ عام سا واقعہ تھا، یورپ میں روز سیکڑوں افراد قتل ہوتے ہیں، پولیس جلد قاتل تک پہنچ جائے گی۔ وہ معمولاتِ زندگی میں مشغول ہوگئے تھے کہ 8 اپریل کو ایک دھماکا ہوا۔

جس مقام سے حنا ٹیلفورڈ کی لاش ملی تھی، وہاں سے کچھ فاصلے پر ٹیمز کے ساحل پر لہروں نے ایک اور لاش لا پھینکی۔ وہ بے لباس لاشہ چھبیس سالہ اریبنی لوکوڈ کا تھا۔ ایک اور جسم فروش عورت قتل ہوگئی تھی۔ قتل سے قبل اس پر خاصا تشدد کیا گیا تھا۔ پیٹ اور چھاتی پر تیز دھار آلے کے نشان تھے۔ بعد میں پوسٹ مارٹم سے یہ حیران کن انکشاف ہوا کہ اس کے ساتھ زیادتی نہیں کی گئی تھی۔

کوئی اس کی توقع نہیں کر رہا تھا یعنی قتل کے پیچھے جنسی حرکات نہیں تھے۔

جب نکول کو اس واقعے کی خبر ملی، اسے اپنے پیروں میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ وہ خوف زدہ ہوگئی۔ اس نے اپنے پیروں کو چھوا۔ وہ بے حس تھے۔ ان میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ دو برس قبل ایک کار حادثے میں اس کے پیر ضائع ہوگئے تھے۔ نچلا دھڑ ناکارہ ہوگیا۔ اس واقعے کے کچھ عرصے بعد تک تو شوہر ساتھ رہا، مگر ایک شام ہونے والے جھگڑے کے بعد دونوں الگ ہوگئے۔ غم زدہ عورت ٹیمز کے پاس ایک فلیٹ میں اپنی بہن کے ساتھ رہتی تھی۔ بہن جینی صبح ملازمت کے لیے نکلتی تو شام کو لوٹتی۔ نکول اپنا وقت کتابیں پڑھ کر گزارتی۔ وہ چند اخبارات کے لیے مضامین لکھا کرتی تھی جس سے مناسب آمدنی ہوجاتی۔

اسے اس وقت اپنے بے جان پیروں میں سنسناہٹ محسوس ہوئی تھی اور یہ سنسناہٹ اس روز بڑھ گئی، جب یہ تصدیق ہوگئی کہ قتل کے ان واقعات کے پیچھے ایک سفاک سیریل کلر ہے۔ یہ تصدیق یوں ہوئی کہ ساحل سے لاش کا تختہ قبول کرنے کے کچھ روز بعد پولیس کو بائیس سالہ ہیلن کا زخموں سے اٹا ہوا جسم ملا تھا۔ تمام نشانیاں یکساں تھیں۔ تشدد زدہ جسم۔ دانت ٹوٹے ہوئے اور پیشہ بھی وہی، جو دیگر مقتولین کا تھا۔ جسم فروشی۔

شہر کی سڑکوں پر ایک بار پھر خوف گردش کرنے لگا۔ عورتیں اور بچے جلد گھروں کو لوٹ جاتے۔ شراب خانوں میں عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ رات پڑتے ہی ہیبت زور مارتی۔ صبح دھند چھائی رہتی۔

ہیلن کی لاش بھی دریا کے نزدیک سے ملی تھی۔ لڑکی بلیک پول کی تھی اور ملازمت کی تلاش میں کچھ برس قبل اس علاقے میں آئی تھی۔ اس بار پولیس کے ہاتھ ایک چھوٹا سا سراغ آ گیا۔ اس کے بدن سے انھیں رنگ کی باقیات ملیں۔ سبز رنگ کا ہلکا سا دھبا۔ تجزیے سے پتا چلا، یہ مخلوط گاڑیوں کو رنگنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پولیس کا قیاس تھا کہ رنگ کا یہ نشان قاتل کی ورکشاپ کی دین ہے۔ انھوں نے اپنی تفتیش کو قریبی علاقوں میں پھیلا دیا۔ رنگ کرنے والوں سے پوچھ گچھ شروع ہوگئی۔ پولیس نکول کی بلڈنگ میں بھی آئی تھی۔ انھوں نے عمارت کے گیراج کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ فلیٹ کے مکینوں سے سوالات کیے۔

اس وقت میڈیا پُراسرار قاتل کو Jack the Stripper کا نام دے چکا تھا۔ یہ ذرائع ابلاغ کا من پسند موضوع بن گیا۔ تجزیہ کار اس گمنام شخص کا نفسیاتی تجزیہ کر رہے تھے... مستقبل بین پیشگوئیاں داغ رہے تھے۔ کچھ لوگ اس پورے معاملے کو کالے جادو سے جوڑنے میں جتے تھے۔ اس پر پیچ مسئلے پر تخیل کے گھوڑے دوڑانے والوں کو یقین تھا کہ آج نہیں تو کل اس کیس کی گتھی سلجھ ہی جائے گی مگر ان کا یہ اندازہ یکسر غلط ثابت ہوگا۔

☆☆☆

جیک دی اسٹرپیر کے کیس کی ذمے داری اسکاٹ لینڈ یارڈ کے چیف سپرنٹنڈنٹ جون روز کو سونپی گئی تھی۔

اس کی کنپٹیاں سفید تھیں۔ جسم گٹھا ہوا۔ چہرے پر سنجیدگی۔ اسے اپنے کام کا ماہر تصور کیا جاتا تھا، مگر اس کیس نے اسے بھی چکرا دیا۔ کیس ہاتھ میں لیتے ہی اس نے مشکوک افراد کی نگرانی کے احکامات جاری کر دیے۔ اس نے خفیف سے اشارے اور خام معلومات کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ بیانات قلم بند کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس وقت کون سوچ سکتا تھا کہ یہ تعداد سات ہزار سے بھی تجاوز کر جائے گی۔

ایک سہ پہر حسب عادت اس نے اپنے اسسٹنٹ سے پوچھا۔ ”کوئی تازہ خبر؟“

”جی جناب۔“ اسسٹنٹ کے چہرے پر شوخی تھی۔ ”لوگ اب اس کیس سے حظ اٹھانے لگے ہیں۔“

آدمی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اسسٹنٹ نے بتایا۔ ”آج صبح نکول جیکسن نامی ایک عورت کا فون آیا تھا، جس نے دوسری منزل پر اپنے فلیٹ کی کھڑکی سے ایک مشکوک آدمی کو دیکھنے کا دعویٰ کیا۔ عورت کے مطابق وہ دراز قد تھا، جسم مضبوط۔ بال سنہری تھے۔ وہ گذشتہ چند روز سے متواتر اس کے فلیٹ کی سامنے والی سڑک سے گزر کر دریا کی سمت جاتا ہے۔“ اسسٹنٹ کے چہرے پر مسکراہٹ قائم تھی۔

”تو اس میں دانت نکالنے کی کیا بات ہے؟“ افسر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''جناب، یہ بھی کوئی معلومات ہے۔ مضبوط بدن، سنہری بال۔'' اسسٹنٹ نے منہ بنایا۔ ''اور جب میں نے پوچھا، آپ اسے دیکھیں گی تو پہچان لیں گی؟ تو محترمہ کا جواب نفی میں تھا۔ بھئی، حد ہے!''

''بکواس بند کرو۔'' افسر دہاڑا۔ ''شہر کی نصف آبادی عورتوں پر مشتمل ہے۔ اور جو مرد ہیں، ان میں کتنے ایسے ہیں، جو دراز قد اور مضبوط جسم کے ہیں؟ کتنوں کے بال سنہری ہیں؟ بیوقوف آدمی۔ ہماری تفتیش لاکھوں کے پھیرے سے نکل کر سیکڑوں تک پہنچ جائے گی۔ فوراً کام شروع کرو۔''

اسسٹنٹ بوکھلا کر باہر چلا گیا۔ اس روز پولیس اسٹیشن کی بتیاں رات گئے تک روشن رہیں۔ گشت بڑھا دیا گیا۔ دیگر علاقوں کے سراغ رساں بھی چیف سپرنٹنڈنٹ جون روز کو رپورٹ کررہے تھے۔

چار روز تک جاری رہنے والی ان سرگرمیوں کے بعد کسرت کا شوقین، سنہری بالوں والا ایک نوجوان جیری ولسن پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ گذشتہ ہفتے دریا کے پاس دیکھا گیا تھا اور اس کی تسلی بخش وجہ بیان نہیں کرسکا۔ یوں لگنے لگا کہ جلد یہ کیس نمٹ جائے گا۔ اسے حوالات میں ڈال دیا گیا۔ اخبارات نے بھی خبریں شائع کردیں کہ قاتل پولیس کے ہاتھ آگیا ہے۔ مگر پھر حالات اس تیزی سے تبدیل ہوئے کہ سب ششدر رہ گئے۔

وہ 14 جولائی 1964 کا دن تھا۔ شہر پر کالی گھٹائیں چھائی تھیں۔ شام ڈھلے آسمان پورے زور سے برسا۔ چھتوں پر پانی کی آواز عجب شور پیدا کرتی تھی۔ لوگ گھروں میں قید ہوگئے۔ اس روز مضافاتی علاقے کی ایک معروف سڑک سے پولیس کو ایک اسکاٹش عورت میری فلیمنگ کی بے لباس لاش ملی۔ اس کی عمر تیس برس تھی۔

انداز یکساں تھا، تمام نشانیاں موجود تھیں، وہ جیک دی اسٹرپر ہی کا شکار تھی۔ جب عورت کا قتل ہوا، جیری حوالات میں تھا۔ یعنی اس کا قتل سے تعلق نہیں تھا۔ اس واقعے نے جیری ولسن کی جان تو چھڑا دی، مگر پولیس کی پریشانی میں اضافہ کر دیا۔ لندن ایک بار پھر خوف کی لپیٹ میں تھا۔ پریشان کن بات یہ تھی کہ اس علاقے سے پولیس کے دستے باقاعدگی سے گزرا کرتے تھے۔ انتہائی معروف سڑک سے دن کی روشنی میں لاش ملنا بھاری دھچکا تھا۔

چٹ پٹی خبروں کے لیے مشہور ایک ٹی وی چینل نے یہ دعویٰ کردیا کہ یہ قاتل جیک دی ریپر کی نقش قدم پر چل رہا ہے اور اس کا مقصد بھی کسی حکومتی راز کو چھپانا ہے۔

جب وہیل چیئر پر بیٹھی تکول نے یہ رپورٹ دیکھی تو گہرا سانس لیا۔ یہ بعید از قیاس نہیں تھا۔ امکانات کی دنیا گنجلک اور چیستانی تھی۔ واضح رہے کہ جیک دی ریپر سے متعلق ایک تھیوری یہ تھی کہ وقت کا شہزادہ ایک جسم فروش عورت کے عشق میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس نے لڑکی سے خفیہ شادی کرلی، جس سے اس کی اولاد بھی ہوئی۔ یہ خبر کسی طرح اشرافیہ تک پہنچ گئی۔ عورت کو اغوا کرکے شدید تشدد کیا گیا اور پاگل خانے میں ڈال دیا گیا۔ پھر ایک شاہی معالج نے عورت کی ان سہیلیوں کو ایک ایک کرکے قتل کرنا شروع کردیا، جو اس واقعے کی خبر رکھتی تھیں۔ سرکار کو یہ گوارا نہیں تھا کہ تخت پر ایک جسم فروش عورت کا بیٹا بیٹھے۔

☆☆☆

سنسنی پھیلانے میں اخبارات بھی پیچھے نہیں رہے۔ ایک اخبار نے مؤقف اختیار کیا کہ قاتل ضرور کوئی پولیس اہل کار ہے، ورنہ اتنے مصروف علاقے میں، جہاں پولیس اسٹیشن نزدیک ہی ہو، اتنی دیدہ دلیری سے لاش پھینکنا ناممکن ہے۔

میری فلیمنگ کی لاش سے بھی رنگ کے ذرات ملے تھے۔ یہ خیال قوی ہونے لگا کہ قاتل رنگ سازی کی صنعت سے وابستہ ہے، تاہم اس امر کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ رنگ کے ذرات پولیس کو بھٹکانے کی کوشش ہوں۔ محلے داروں سے پوچھ گچھ کی گئی، تو انھوں نے ایک سفید رنگ کی گاڑی دیکھنے کا دعویٰ کیا، جو تیز بارش میں شور مچاتی سڑک سے گزری تھی۔ اس کے بعد ہی یہ برہنہ لاش انھیں نظر آئی۔

حکومت شدید دباؤ میں تھی۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ پر تنقید بڑھ رہی تھی۔ خصوصاً جون روز کو اس کے ناقدین نے نشانے پر رکھ لیا تھا۔

اپوزیشن لیڈر نے یہ کہہ کر ماحول کو گرما دیا کہ ایک سفاک قاتل لندن کی سڑکوں پر دندناتا پھر رہا ہے اور ہمارے چیف سپرنٹنڈنٹ دفتر میں بیٹھ کر بیانات قلم بند کررہے ہیں۔

ایک کامیڈین نے پھبتی کسی کہ جون روز کی وجہ سے شہر میں کاغذوں کی قلت ہوگئی ہے اور یونیورسٹی کو امتحانات ملتوی کرنے پڑے۔

وزیر داخلہ نے جون روز کو طلب کرلیا۔ انھیں دباؤ سے نکلنے کے لیے ٹھوس اقدامات کرنے تھے مگر پولیس کے ہاتھ کوئی ٹھوس سراغ نہیں لگا تھا۔ ایسے میں افسر نے ایک پرانی چال چلی۔ اس نے ایک بڑی پریس کانفرنس کی جس میں اعلان کر

دیا کہ پولیس قاتل کے قریب پہنچ گئی ہے۔

"ہماری تفتیش کا دائرہ اب بیس افراد تک سمٹ گیا ہے۔" اس نے اعتماد سے کہا۔ "جلد قاتل قانون کی گرفت میں ہوگا۔"

پریس کانفرنس نے حالات بدل دیے۔ اگلے روز ایک اور خبر اخبار کی زینت بنی، جس نے لوگوں کو چونکا دیا۔

ہلاکتوں کے اس پُراسرار سلسلے سے ٹھیک پانچ برس قبل... جون 1959 میں دریا کی ساحلی پٹی پر الزبتھ فگ نامی ایک لڑکی کی لاش ملی تھی۔ لاش نیم برہنہ تھی اور اس کے جسم پر کئی زخم تھے... اس واقعے کے کچھ ہفتے بعد 57 سالہ کینتھ آرچیبالڈ نامی شخص سامنے آیا تھا جو مکانوں کے نگراں کے طور پر کام کرتا تھا۔ اس نے قتل کا اعتراف تو کیا، مگر اس اعتراف کو پولیس نے شہرت حاصل کرنے کی کوشش کہہ کر نظرانداز کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب اسے مقتولہ کی تصویر دکھائی گئی، تو وہ اسے پہچان ہی نہیں سکا۔ پھر قتل کی جو تفصیلات اس نے بتائی تھیں، ان میں بہت سے سقم تھے۔ نہ تو تاریخیں درست تھیں نہ ہی اس کے بیان کردہ اوقاتِ کار میں کوئی تال میل تھا۔

اخباری اسٹوری میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ الزبتھ کا قاتل کوئی اور نہیں، یہی بدبخت جیک دی اسٹرپر تھا۔ خبر کے چھپتے ہی شہر میں پریشانی گردش کرنے لگی۔ لوگ یہ سوچ کر کانپ اٹھے کہ یہ خوف ناک شخص آج سے نہیں، گذشتہ پانچ برس سے شہر کی گلیوں میں آزادانہ گھوم رہا ہے۔ اگلے روز اسی اخبار نے ایک اور سنسنی خیز رپورٹ شائع کی، جس کے مطابق نومبر 1963 میں ہلاک ہونے والی بائیس سالہ گوینتھ ریس کا قاتل بھی کوئی اور نہیں... یہی سفاک سیریل کلر تھا۔ گوینتھ ریس کی لاش بھی دریا کے کنارے پائی گئی تھی اور اس کے دانت بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس رپورٹ میں ان مقامات کا نقشہ بھی شائع ہوا، جہاں سے لاشیں ملی تھیں۔ اخبار کا دعویٰ تھا کہ اگر ان مقامات کو لکیر سے جوڑا جائے، تو ایک ایسا سمبل ابھرتا ہے، جسے شیطانی۔۔۔ پرستش کرنے والے قربانی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اپوزیشن نے ان رپورٹس کو رد کر دیا۔ حزبِ اختلاف کی حمایت کرنے والے ایک کالم نگار نے مؤقف اختیار کیا کہ حکومت اپنی غفلت پر پردہ ڈالنے کے لیے معاملے کو پُرپیچ اور پُراسرار بنا رہی ہے، کیس کو زبردستی الجھایا جا رہا ہے، برسوں قبل ہونے والے واقعات کو جیک دی اسٹرپر کے کھاتے میں ڈالنا پولیس چیف کی چال ہے۔

یہ مؤقف ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ سیریل کلرز بہت ذہین ہوتے ہیں، ان میں اپنے مقصد سے شدید نوع کی وابستگی پائی جاتی ہے۔ اگر کوئی شے ان کے مقصد کو ضرب لگائے یا اسے بگاڑ کر پیش کرے، تو وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو کر کوئی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ پولیس چیف نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔ یہ اسٹوری رپورٹر کو جون روز ہی نے دی تھی۔ اسے یقین تھا کہ قاتل کسی خاص مقصد کے تحت یہ قتل کر رہا تھا۔ اسے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ دو ایسے قتل بھی اس کے کھاتے میں ڈال دیے جائیں، جو اس نے کیے ہی نہیں۔

جب یہ خبر گلی گلی پھیل گئی کہ چند برس قبل ساحل سے ملنے والی لاشیں بھی جیک دی اسٹرپر ہی کی کارستانی تھیں، تب چیف سپرنٹنڈنٹ نے ایک اور تیر پھینکا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اب تفتیش کا دائرہ بیس کے بجائے دس افراد تک سمٹ گیا ہے۔

"ہم جلد اس وحشی کی گردن دبوچ ... لیں گے۔" پریس کانفرنس میں جان روز نے بڑے فلمی انداز میں یہ جملہ کہا تھا۔

دعوے اور وعدے اپنی جگہ، حقیقت یہ تھی کہ پولیس کو تاحال کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملا تھا۔ وہ اندھیرے میں بھٹک رہے تھے اور خوف کے بادل گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

25 نومبر کو پھر وحشت کا طوفان آیا۔

اکیس سالہ سیاہ فام لڑکی فرانسس براؤن کی برہنہ لاش ایک تاریک اور تنگ سڑک پر پائی گئی۔ وہ ایک ماہ سے لاپتا تھی۔ اسے آخری بار اس کی دوست کم ٹیلر نے سڑک کنارے دیکھا تھا۔ وہ ایک گاہک کے ساتھ گئی تھی اور پھر کبھی دکھائی نہیں دی۔

کم ٹیلر نے ہکلاتے ہوئے بتایا۔ "وہ ایک کار میں سوار ہوئی تھی، وہ فورڈ تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سنہری بالوں والا ایک آدمی بیٹھا تھا۔"

پولیس کے لیے یہ امر قابلِ تفتیش تھا کہ مقتولہ ایک ماہ سے غائب تھی۔ یعنی وہ قاتل کے ساتھ رہ رہی تھی اور اس نے اپنے دوستوں، رشتے داروں سے قطع تعلق کر لیا تھا۔

جون روز نے تھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک ایسا شخص ہے، جو عورتوں کو لبھانا جانتا ہے۔"

☆☆☆

کنول کی بہن جس ادارے میں ملازم تھی، اس نے سینٹرل ہال میں خواتین کے لیے ایک سیمینار منعقد کیا جس کا مقصد انھیں اپنے تحفظ سے متعلق آگہی فراہم کرنا تھا۔

کنول یہ سوچ کر اپنی بہن کے ساتھ چلی گئی کہ دل بہل جائے گا۔ وہ قتل کے حالیہ واقعات کی وجہ سے خاصی اداس تھی۔ اسے لگنے لگا تھا کہ قاتل کا اگلا شکار وہ خود ہے۔ اس نے دریا کی سمت کھلنے والی کھڑکی کے سامنے بیٹھنا چھوڑ دیا۔ ساحل پر اسے بدروحیں گشت کرتی محسوس ہوتی تھیں۔

جس یاسیت سے وہ چھٹکارا پانا چاہتی تھی، وہ سیمینار میں پہنچ کر کچھ اور بڑھ گئی۔ پورا ایونٹ جیک دی اسٹریپر کے گرد گھومتا تھا۔ مقررین کا مقصد عورتوں کو یہ باور کروانا تھا کہ وہ غیر محفوظ ہیں اور انھیں محتاط رہنا چاہیے، کیونکہ ایک درندہ سڑکوں پر آزادانہ گھوم رہا ہے۔

مقررین کے اندازِ بیان اور الفاظ کے انتخاب نے کنول سمیت کئی خواتین کو بے چین کر دیا۔ ایک عورت کھڑی ہو کر چلائی۔ "کیا واہیات لیکچر ہے، کیا آپ کو اندازہ نہیں کہ وہ فقط جسم فروش خواتین کو قتل کر رہا ہے۔"

ہال میں سناٹا چھا گیا۔ سب اس مضبوط کاٹھی کی عورت کی طرف دیکھنے لگے۔ کنول نے بھی دائیں جانب گردن موڑی۔ عورت پر نگاہ کی۔ وہ آئرش لگتی تھا۔ لباس نیم متوسط طبقے کی خواتین والا تھا اور وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔

"آپ کی بات درست ہے۔" مقرر نے کہا۔ "لیکن ہم حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ..."

"کیوں نہیں کہہ سکتے۔" اس نے تنک کر کہا۔ "میرا شوہر ایک سیکیورٹی گارڈ ہے۔ وہ رات بھر ڈیوٹی دیتا ہے، مگر مجھے اکیلے رہتے ہوئے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ قاتل پیشہ ور عورتوں کا شکار کر رہا ہے۔ ہمارا نہیں۔"

عورت اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ رضا کار اس تک پہنچ گئے۔ بیٹھتے ہوئے وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔ "میں نے بینگو سے پوچھا تھا... پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ عام عورتوں کو نشانہ نہیں بنائے گا۔"

گھر لوٹتے ہوئے کنول کے ذہن میں اس آئرش عورت کے الفاظ گونج رہے تھے۔

اگلا قتل اس چیستان کا آخری ٹکڑا ثابت ہوا۔ یہ ٹکڑا بڑے ہی پُراسرار انداز میں پولیس کے ہاتھ آیا۔ ایک نامعلوم شخص نے فون کر کے پولیس کو مطلع کیا کہ صنعتی علاقے ہیرون ٹریڈنگ اسٹیٹ میں ایک لکڑی کے کیبن میں لاش موجود ہے۔

پولیس فوراً حرکت میں آئی۔ وہ ایک بائیس سالہ لڑکی برگیٹ اوہیرا کی لاش تھی۔ اگلے دو دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور پیر کا ناخن اکھڑ گیا تھا۔ لاش پر صنعتوں میں استعمال ہونے والے رنگ کے دھبے تھے۔ پوسٹ مارٹم سے اندازہ ہوا کہ قتل سے قبل اسے کسی گرم جگہ پر رکھا گیا تھا۔

جائے وقوعہ کا جائزہ لینے کے بعد چیف سپرنٹنڈنٹ نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔ "بگ جان کے گرد گھیرا تنگ کردو۔"

یہ جملہ ایک رپورٹر کے کان میں پڑ گیا اور اگلے روز اخبارات کی زینت بن گیا۔ جب جون روز سے اس بارے میں استفسار ہوا، تو اس نے کاندھے اچکا کر کہا۔ "بگ جون... جیک دی اسٹریپر کہلانے والے سیریل کلر کا کوڈ ہے۔ کیبن سے ملنے والے سراغ نے ہمیں قاتل کے نزدیک پہنچا دیا ہے۔ اب مشکوک افراد کی فہرست میں فقط تین آدمی ہیں اور ان میں سے ایک قاتل ہے۔"

چیف سپرنٹنڈنٹ کن تین افراد کی بات کر رہا تھا؟ اس کی اشارہ کس کی طرف تھا...؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔

پولیس ریکارڈز میں ان کا نام ضرور درج ہوگا مگر وہ کبھی میڈیا میں زیرِ بحث نہیں آئے۔ ہاں، ان میں سے ایک کے بارے میں کچھ اشارے ملتے، جن سے میڈیا ایک تصور بنانے میں کامیاب رہا۔ پولیس بینگو ارلینڈ نامی ایک چالیس سالہ اسکاٹش شخص کے گرد گھیرا تنگ کر رہی تھی۔ یہ وہی آدمی تھا، جس کی بیوی گذشتہ دنوں سینٹرل ہال میں ہونے والے سیمینار میں ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔

جیک دی اسٹریپر کی چھٹی شکار... برگیٹ کی لاش صنعتی یونٹ ہیرون ٹریڈنگ اسٹیٹ سے ملی تھی اور اس کے جسم پر رنگ کا دھبا پایا گیا تھا۔ بینگو ارلینڈ نامی شخص اسی یونٹ میں سیکیورٹی گارڈ تھا۔ وہ عام طور سے اسی سڑک سے گزرتا تھا، جہاں وہ کیبن موجود تھا، جس سے تشدد زدہ لاش ملی۔ کچھ اور شواہد بھی اس کے خلاف جاتے تھے۔ بال سنہری مائل تھے اور کاندھے چوڑے۔

پولیس پہلے بھی اس کا بیان ریکارڈ کر چکی تھی، مگر وہ معمول کی تفتیش تھی۔ اس بار... وہ پوری قوت سے حرکت میں آئے۔ بینگو کو پوچھ گچھ کے لیے اسٹیشن بلوایا گیا۔ پولیس انٹرویو کئی گھنٹوں پر محیط تھا۔ اس پر خاصا دباؤ ڈالا گیا۔ جب وہ گھر لوٹا، اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کی بیوی آگے بڑھ کر سنبھالتی، وہ زمین پر آ رہا۔

اسی شام پولیس نے اس کے گھر کی تلاشی لی۔ انھیں نہ تو

کوئی آلۂ قتل ملا، نہ ہی کوئی اور سراغ۔ البتہ وہ بہت سی کتابیں ڈبوں میں بند کر کے لے گئے۔ ان میں کچھ کتابیں تو انسانی جسم کی اناٹامی سے متعلق تھیں اور کچھ دنیا بھر میں ہونے والے قتل کے پُراسرار واقعات کا احاطہ کرتی تھیں۔ گھر کی تلاشی کے دوران ینگو خالی خالی نظروں سے پولیس والوں کو دیکھتا رہا۔ جب وہ چلے گئے، اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''وہ مجھے قاتل سمجھتے ہیں۔''

کیا چیف سپرنٹنڈنٹ جون روز اس سیکیورٹی گارڈ کو واقعی قاتل سمجھتا تھا؟ اس بات کے امکانات رد نہیں کیے جاسکتے۔ پانچ برس بعد... 1970 میں اس نے بی بی سی کو دیے جانے والے ایک انٹرویو میں اعتراف کیا کہ ینگو ممکنہ قاتلوں کی لسٹ میں سرفہرست تھا، مگر ان کے پاس کبھی درکار شواہد اکٹھے نہیں ہوسکے۔

☆☆☆

گرج چمک کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔

آدمی غنودگی میں تھا۔ اس نے خواب میں خود کو ساحل پر دیکھا۔ دریا منہ زور تھا۔ اونچی اونچی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ آہنی رسیوں سے بندھا پل ہوا کے تیز جھکڑوں کے باعث مل رہا تھا۔

ایک کھٹکا ہوا... افسر کی آنکھ کھل گئی۔ اسسٹنٹ سامنے کھڑا تھا۔ چہرہ سپاٹ تھا۔

''مخبروں کی جانب سے ایک لیڈ ملی ہے۔'' اس کی آواز دھیمی اور محتاط تھی۔

افسر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''کہو، میں سن رہا ہوں۔''

''کچھ کہنے کے لیے نہیں ہے سر۔'' اسسٹنٹ بولا۔ ''فقط ایک نام ہے۔ جان پروفومو!''

ماضی کے صحرا سے ایک جھکڑ اٹھا اور ذہن کے پردے سے ٹکرایا۔

''پروفومو اسکینڈل۔'' وہ ٹیک لگا کر کرسی پر جھولنے لگا۔ ''فوکنر، ایک بلیک کافی پلیز۔''

''ضرور سر۔'' اسسٹنٹ جانتا تھا کہ چیف کے ذہن میں طوفان اٹھ رہے ہیں۔

پروفومو اسکینڈل برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ہیرلڈ میکملن کے دور میں سامنا آیا تھا، جس کا محور اپنے وقت کا طاقتور ترین سیاست داں جان پروفومو تھا۔ جب یہ اسکینڈل اٹھا، سرد جنگ عروج پر تھی۔ برطانیہ اور امریکا سوویت یونین سے برسرِپیکار تھے اور پروفومو سیکریٹری برائے جنگی امور جیسا اہم ترین منصب سنبھالے ہوئے تھا۔ کئی اہم معاملات اس کی جنبشِ قلم کے محتاج تھے۔ اور جب یہ مُحِرّ اعتماد شخص طاقت کی چوٹی پر کھڑا دنیا کی سمت دیکھ رہا تھا، ایک اسکینڈل نے نہ صرف اس کا کیریر تباہ کر دیا، بلکہ وزیر اعظم کو بھی لے ڈوبا۔

1963 کے اخبارات میں دل فریب ماڈل کرسٹینا کیلر اور پروفومو کی تصاویر کے ساتھ یہ سنسنی خیز اسٹوری شائع ہوئی کہ سیکریٹری برائے جنگی امور کے دو برس قبل اس حسینہ سے جنسی تعلقات رہے ہیں۔ خبر کا پریشان کن پہلو یہ دعویٰ تھا کہ ان تعلقات کے نازک مراحل پر چند قومی راز پروفومو کے ہاتھ سے پھسل گئے تھے۔

اس نے ان الزامات کی سختی سے تردید کرتے ہوئے الزامات کو بے بنیاد قرار دیا، مگر تعلقات کے شواہد ناقابلِ تردید تھے۔ اپوزیشن حرکت میں آگئی۔ گلی گلی احتجاج ہونے لگا۔ پارٹی کے اندر سے بھی دباؤ بڑھ رہا تھا۔ آخر پروفومو نے ان تعلقات کا اعتراف کرلیا اور اپنا استعفیٰ پیش کردیا۔ معاملہ یہیں تمام نہیں ہوا۔ وزیر اعظم ہیرلڈ نے کچھ عرصے بعد گرتی صحت کو بنیاد بنا کر اپنا عہدہ چھوڑ دیا تھا۔ یہ سب جیک دی اسٹرپر کے منظرِ عام پر آنے سے فقط دو برس پہلے کے واقعات تھے۔

''پروفومو اسکینڈل۔'' وہ بڑبڑایا۔ باہر گرج چمک کے ساتھ بارش ہو رہی تھی اور افسر کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ بلیک کافی کے دو مگ ختم کر چکا تھا اور تیسرے کی طلب ہو رہی تھی۔

''ینگو کے ہاں سے تم کتابوں کا ایک ڈبہ لائے تھے۔'' اس نے اسسٹنٹ کو پکارا۔ ''وہ کمرے میں لے آؤ۔''

کچھ دیر بعد بکس اس کے سامنے تھا۔ کتابیں میز پر بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے ایک کتاب اٹھائی۔ ''جیک دی ریپر شاہی راز کا محافظ!''

فوکنر اپنے افسر کی چمکتی آنکھیں دیکھ کر کچھ بے چین ہوگیا۔ بارش کھڑکی پر دستک دے رہی تھی۔

''کیا آپ واقعی سمجھتے ہیں کہ قتل کے یہ واقعات کسی حکومتی راز پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہیں؟''

''پروفومو آج کیا کر رہا ہے؟'' افسر نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اسسٹنٹ خاموش رہا۔ افسر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''کل وہ برطانیہ کا طاقتور ترین آدمی تھا اور آج وہ ایک فلاحی ادارے میں رضا کار کی حیثیت سے بیت الخلاء صاف کر رہا ہے۔''

وہ پلٹا۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ''وزیر اعظم کو استعفیٰ ...

دینا پڑا... کابینہ سے کتنے ہی اہم نام غائب ہوگئے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ پروفومو کے مانند اور بھی حکومتی اہلکار جال میں پھنس گئے ہوں۔ کچھ اور ماڈلز اور لڑکیاں بھی استعمال کی گئی ہوں۔ اور اب...''

اس نے توقف کیا۔ ''... متوقع خطرے کے پیش نظر انھیں ایک ایک کر کے ٹھکانے لگایا جارہا ہے۔ کیا تم نے غور کیا... لڑکیوں پر تشدد کیا گیا، دانت توڑے گئے، مگر کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' اسسٹنٹ نے سر کھجایا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ ''سر، ایک خیال مجھے بار بار ستاتا ہے۔ میں اسے جھٹک دیتا ہوں، مگر یہ پھر لوٹ آتا ہے۔ نہ جانے اس کی بنیاد کیا ہے... مگر یہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔''

''میں سن رہا ہوں۔'' افسر کی آواز پاٹ دار تھی۔

''سر...'' فوکنر نے تھوک نگلا۔ ''ہم نے ابتدا ہی سے قیاس کرلیا تھا کہ قاتل کوئی شہری ہے۔ ایک جنونی، مگر دیکھنے میں ایک عام سا شخص۔ ہم نے ان ہی خطوط پر کام کیا۔ ہاں، کچھ عادی مجرموں کے ریکارڈز کا بھی جائزہ لیا گیا، مگر ہمارا فوکس یہی رہا کہ قاتل لندن کا ایک شہری ہے۔'' وہ چپ ہوگیا۔

''کھل کر بولو کیا کہنا چاہتے ہو۔'' اسسٹنٹ کی خاموشی اسے کھلنے لگی۔

''سر اگر ہم اس تھیوری کو مان لیں کہ اس کے پیچھے کچھ بااثر حکومتی اہل کار ہیں، تو پھر امکان پیدا ہوتا ہے کہ قاتل کوئی عام شہری نہ ہو...'' اس نے توقف کیا۔ ''ممکن ہے، وہ کوئی پولیس اہل کار ہو، کوئی فوجی افسر ہو۔''

بادل زور سے گرجا۔ لمحے بھر کو کمرا نیلی روشنی میں نہا گیا۔ بارش تیز ہوگئی تھی۔

☆☆☆☆

اس کے ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے۔ جلد سکڑ گئی۔

عورت ایمبولینس کے پاس کھڑی ہچکیاں لے رہی تھی۔ پولیس اہلکار گیراج کا جائزہ لے چکے تھے۔ ایک سمت اوزاروں کا ڈھیر تھا۔ دوسری طرف طرح طرح کے رنگ پڑے تھے۔ گاڑیوں کے پرزے شیلف پر دھرے تھے۔ ایک اہلکار نے کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا چیف سپرنٹنڈنٹ کی طرف بڑھایا۔ افسر نے احتیاط سے اسے پکڑا۔

وہ خودکشی کرنے والے شخص کا نوٹ تھا، جو اس نے اپنی بیوی کے نام لکھا تھا اور ڈرائنگ ٹیبل پر چھوڑ دیا۔ صبح عورت کی اس پر نظر پڑی۔ وہ دوڑی دوڑی گودام میں آئی اور یہاں اپنے شوہر کو مردہ حالت میں پایا۔

افسر نے نوٹ پڑھا۔ پہلا جملہ تھا۔ ''اب میں مزید برداشت نہیں کرسکتا۔''

آگے اس نے عورت سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا تھا۔ نوٹ میں کہیں وہ سبب بیان نہیں کیا گیا تھا، جس نے اسے خودکشی پر مجبور کیا۔ آخری سطر کچھ یوں تھیں۔ ''تم اور پولیس میری کھوج میں خواہ مخواہ پریشان ہوگی... میں گیراج میں ہوں!''

افسر نے گہرا سانس لیا اور ایمبولینس پر نظر ڈالی، جس میں دراز قد، سنہری بالوں والے ٹینگو ارلینڈ کی لاش رکھی تھی۔ کمرے میں اس کی بیوی کی سسکیوں کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسسٹنٹ نے جون روز سے کہا۔ ''جسے ہم قاتل سمجھتے تھے، اس نے ہمارے ہاتھ آنے سے پہلے ہی اپنی جان لے لی۔''

''کیا وہ واقعی قاتل تھا؟'' افسر سڑک کی سمت دیکھ رہا تھا۔ ''صبح تم بتا رہے تھے کہ جب پہلا قتل ہوا... کیا نام تھا اس لڑکی کا، جس کی لاش کیبن سے ملی تھی؟ ہاں، برگیٹ... تب تو ٹینگو اسکاٹ لینڈ میں تھا۔''

''ہاں سر میں نے یہی کہا تھا۔'' فوکنر نے گردن ہلائی۔ ''اس کی سفری دستاویز تو یہی بتاتی ہیں۔''

''یعنی جیک دی اسٹرپر آزاد گھوم رہا ہے۔'' افسر نے گہرا سانس لیا۔ اس کا چہرہ تنا ہوا تھا۔

دفتر جانے کے بجائے وہ سیدھا گھر گیا۔ اس نے ایک پیگ بنایا اور چند نمبر ڈائل کیے۔ وہ دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا۔ آنکھیں تاثرات سے خالی تھیں۔

شام میں بادل امنڈ کر آئے۔ کچھ ہی دیر میں اندھیرا چھا گیا۔ نکول وہیل چیئر پر بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے اکتا کر کتاب رکھ دی۔ آج اس کی سالگرہ تھی۔ خود کو وہ بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔

جب چیف سپرنٹنڈنٹ گھر سے نکلا، موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی کار سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اس نے نہ تو ٹریفک کی پروا کی، نہ ہی رفتار کی۔ اسٹیرنگ پر اس کی گرفت سخت تھی۔

کچھ دیر بعد وہ دریائے ٹیمز کے کنارے کھڑا تھا۔ ہیمر اسمتھ برج کی لائٹیں تیز بارش کی وجہ سے دھندلی پڑ گئی تھیں۔ مگر

نکول کو ٹھنڈ محسوس ہوئی۔ اس نے چادر خود پر ڈال لی۔ کھڑکی کے باہر برستے آسمان کو دیکھا۔ دور دریا میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔

جون روز کا سر گاڑی کی سیٹ پر ٹکا تھا۔ اس کا ذہن خالی تھا۔ شاید وہ کچھ خوف زدہ تھا۔ وہ اسلحے کے بغیر آیا تھا۔ آج اس نے تمام اختیارات سے تجاوز کیا تھا۔ وہ ممنوعہ علاقے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

بارش کی وجہ سے دھند سی چھا گئی۔ اسے دور ایک سایہ دکھائی دیا۔ وہ تن کر بیٹھ گیا۔ کوئی نزدیک آرہا تھا۔ ایک شخص نے گاڑی کی کھڑکی پر ہلکی سی دستک دی۔ اس نے شیشہ نیچے کیا۔ سامنے کھڑے آدمی کا آدھا چہرہ ہیٹ سے ڈھکا تھا۔ اس نے رین کوٹ پہن رکھا تھا اور کالر کھڑے کیے ہوئے تھے۔

اس نے جھک کر اپنا کوڈ بتایا۔ جواب میں چیف کے ہونٹوں نے حرکت کی۔ آدمی نے سر ہلا۔ اس نے کاغذ کا ایک پرزہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ پھر اس نے ہیٹ اٹھا کر اسے الوداع کہا۔ جون روز نے دیکھا، اس کی آنکھیں چھوٹی اور تیز تھیں اور سر بالکل صاف تھا۔

وہ پلٹا اور دھیرے دھیرے دھند میں غائب ہوگیا۔ جون روز نے گہرا سانس لیا۔ اگر پرزہ دینے کے بجائے.. آج اسے گولی ماردی جاتی، تو یہ حیران کن نہیں ہوتا۔ وہ خطرناک حدود میں داخل ہوگیا تھا۔ جب حواس بحال ہوئے تو اس نے پرزہ کھولا۔ اس پر تین الفاظ پر مشتمل ایک مختصر سا جملہ لکھا تھا۔ آدمی نے گہرا سانس لیا۔

جان روز کی گاڑی سے کچھ ہی میل دور، اپنے فلیٹ کی کھڑکی میں بیٹھی نکول کو ایک آہٹ سنائی دی۔ کسی کے قدموں کی آواز تھی۔

”اس وقت کون ہوسکتا ہے؟“ سوال میں گھبراہٹ پنہاں تھی۔

کوئی کمرے کی طرف آرہا تھا۔ اس کی پریشانی بڑھنے لگی۔ اس نے بہن کو پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ اچانک دھڑ سے دروازہ کھلا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ اگلے ہی پل اس کی خوف زدہ آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

”اوہ جیکسن تم۔“ سامنے اس کا شوہر کھڑا تھا، جس کے ہاتھ میں کیک تھا۔ اس کے سنہری بال بھیگے ہوئے تھے۔ پیچھے اس کی بہن موجود تھی۔ دونوں کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”کیسی ہو ڈیئر۔“ آدمی کا لہجہ محبت سے لبریز تھا۔

”جانتی ہو، میں نے اس عرصے میں تمھیں کتنا مس کیا۔“

نکول کے بدن میں خوشی کی سنسناہٹ تھی۔
رازوں کی پوٹلی دریائے ٹیمز میں غرق ہو چکی تھی۔

☆☆☆

چیف سپرنٹنڈنٹ بنا بتائے تین ماہ کی چھٹی پر چلا گیا۔ چھٹی کی منظوری وزیر داخلہ نے خود دی تھی۔

اسسٹنٹ نے رابطہ کرنے کی لاکھ کوشش کی مگر ہاتھ فقط ناکامی آئی۔

ان تین ماہ میں جیک دی اسٹریپر کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ حکومت تو خاموش تھی ہی، حیران کن طور پر اپوزیشن نے بھی اس ایشو کو نہیں اٹھایا۔ کچھ ہی روز بعد مالیاتی بحران پیدا ہوگیا۔ سب کی توجہ اسی جانب مبذول ہوگئی۔ اخبارات میں جیک دی اسٹریپر کا تذکرہ کم ہونے لگا۔ قتل کا سلسلہ بھی یکدم ختم گیا تھا۔ لگتا تھا، قاتل شہر چھوڑ کر چلا گیا ہے... یا پھر ممکن تھا، اس کا مقصد پورا ہوگیا ہو۔

جان روز موسم بہار میں لوٹا۔ درخت سرسبز تھے اور پرندوں کی چہک سے ماحول معطر تھا۔ اسسٹنٹ نے انھیں خاصا ہشاش بشاش پایا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد جب فوکنر نے جیک دی اسٹریپر کیس کے بارے میں سوال کیا، تو افسر نے کاندھے اچکائے۔ ”ہمیں جیکو ارلینڈ پر شک تھا، مگر اس نے تو خودکشی کرلی۔“

”مگر اس وقت تو آپ کہہ رہے تھے کہ وہ مجرم نہیں ہوسکتا۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ قاتل آزاد گھوم رہا ہے۔“

”کیا اس عرصے میں کوئی قتل ہوا؟“ اس نے لاتعلقی سے پوچھا۔

”نن... نہیں۔“ اسسٹنٹ ہکلایا۔

”کوئی مزید ثبوت ملا؟“ اس سوال کے جواب میں بھی اسسٹنٹ نے نفی میں گردن ہلائی۔

جون روز مسکرایا۔ اس کے ذہن میں تین الفاظ پر مشتمل ایک جملہ تھا۔ جملہ... جو اس پرزے پر درج تھا، جو ایک اس گرجتی برستی شام ایک پُراسرار شخص نے اس کی ہتھیلی پر رکھا تھا۔

اس نے وہی جملہ دہرایا۔ ”کیس ختم ہوگیا!“

اسسٹنٹ کچھ دیر اسے حیرت سے دیکھتا رہا، پھر خاموشی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ لندن پولیس جیک دی ریپر کے مانند جیک دی اسٹریپر کا کیس بھی حل کرنے میں ناکام رہی تھی... سب نے حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ کیونکہ حکومت بچانے کے لیے راز پر پردہ پڑا رہنا ضروری ہے۔

ذرہ بنا آفتاب

انور فرہاد

اس نے نامساعد حالات میں زندگی کی ابتداء کی تھی۔ غربت کی گود میں پل کر جوان ہوا لیکن ماحول کی محبوبیت نے اس کے اندر ایک ایسا فنکار تراش دیا تھا جس نے اسے بیکل بنا دیا۔ روح میں ایسی بے چینی بھر دی کہ دل بے چین رہنے لگا۔ دل کے تار گنگنا اٹھنے کی چاہ میں اسے اکسانے لگے۔ تب اس نے روح کی اذیت کوشی سے آزادی کے لیے ایک نئی دنیا میں پناہ لے لی اور ایسی ایسی حرکتوں کو جنم دیا جو اسے امر بنانے کے لیے کافی ہیں۔

وہ واقعات جنہیں ہم بھلا بیٹھے ہیں

قلم بنانے کا اس نے ارادہ کیا تھا۔ فلم بنا لی۔ فلم بنانے کے بعد بھی ایک مرحلہ تھا اور بہت اہم مرحلہ تھا۔ فلم بنا کر اسے اپنے گھر میں رکھنا نہیں تھا۔ اسے سینما گھروں تک پہنچانا بھی تھا اور یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک کوئی تقسیم کار اس فلم کی نمائش کے حقوق حاصل نہیں کرتا۔ دستور کے مطابق تقسیم کار ادارے فلموں کے حقوق حاصل کر کے ان کی نمائش کا سارا بندوبست کرتے ہیں۔ یہ کام ان دنوں وہ خود نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس کی ڈسٹری بیوشن کے

لیے اسے مختلف تقسیم کاروں کے پاس جانا پڑا۔ اس مرحلے پر
بھی اسے دانتوں پسینا آ گیا۔ اس کے بدخواہوں نے اس
فلم کی تکمیل کے دوران جو منفی پروپیگنڈہ مہم چلائی تھی تقسیم کار
اس سے بے خبر نہیں تھے۔ اخباروں کے ذریعے ان تک بھی
رنگیلا کی جگ ہنسائی کے قصے پہنچتے رہے تھے۔ وہ جس تقسیم
کار ادارے کے دفتر جاتا اور اپنی فلم کے سودے کے بارے
میں بات کرتا اس سے پوچھا جاتا۔ ”کون سی فلم؟“

”میری فلم...... ”دیا اور طوفان“۔

تقسیم کار کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتا۔ ”رنگیلا صاحب
سوری ایسا دیا جو طوفانوں کی زد میں ہو ہم سے اس کی
حفاظت نہیں ہو سکے گی۔ اس سلسلے میں ہم آپ کی کوئی مدد
نہیں کر سکتے، کوئی رسک نہیں لے سکتے۔“

پنجاب سرکٹ کے تقسیم کاروں ہی نے اسے ٹکا سا
جواب نہیں دیا۔ سندھ اور بلوچستان کے ڈسٹری بیوٹروں
نے بھی اسے سخت مایوس کیا۔ فلم بنانے کے دوران وہ مخالفین
کی وجہ سے جتنا پریشان ہوا تھا اس سے کہیں زیادہ اس کی
ڈسٹری بیوشن کے سلسلے میں ہلکان ہوا۔ یہ بڑی سخت آزمائش
کا وقت تھا۔ اس نے تو فلم میں اپنی ساری جمع پونجی لگا دی
تھی۔ اس اُمید پر کہ اس کی تقسیم کاری سے سب نہیں تو
ابتدائی طور پر آدھی رقم واپس آ جائے گی۔ مگر تقسیم کار تو اس
فلم کے بارے میں بات کرنے کے بھی روادار نہیں ہوئے۔

اب کیا ہوگا؟

یہ ایک بڑا سوالیہ نشان، ننگی تلوار کی طرح ہر وقت اس
کے سر پر لٹکتا رہتا۔ اس کے اعصاب پر سوار رہتا۔ اس
پریشانی کے عالم میں بھی وہ ہمت نہیں ہارا۔ اپنے اللہ سے لو
لگائے رکھی۔

”میرے پیارے اللہ میاں جس طرح تو نے میری
مدد کی اور تمام تر رکاوٹوں کے باوجود میری فلم مکمل کروائی اسی
طرح یہ آخری مرحلہ بھی بخیر و خوبی طے کرا دے۔“

اسے مسجد کے امام صاحب کی بات اس مرحلے میں
بھی یاد آ گئی۔ ”اللہ اپنے نیک بندوں کو آزمائش میں ڈال کر
ان کا امتحان لیتا ہے کہ وہ کہاں تک ثابت قدم رہتے ہیں؟
اس پر کتنا بھروسا کرتے ہیں؟ اس کی رحمت سے مایوس تو
نہیں ہوتے؟“

اس نے کئی نمازوں کے بعد گڑگڑا کر یہ دعا مانگی۔
”میرے معبود! میں تیرا نہایت گناہ گار بندہ ہوں۔ مجھے
ایسی سخت آزمائش میں نہ ڈال۔ یہ میری آخری کشتی تقسیم
کاری کی کشتی بھی پار لگا دے۔ تجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ
میں کیا اور میری بساط کیا۔ یہ تو تیری مہربانی تھی تیری ذرہ
نوازی تھی کہ مجھے تیرے بندے دو کوڑی کا انسان سمجھتے ہیں
لیکن تو نے مجھے ایک فلم کا پروڈیوسر اور ڈائریکٹر بنا دیا۔ اب
اتنا کرم اور فرما کہ اس فلم کی ڈسٹری بیوشن کا مرحلہ بھی طے ہو
جائے۔“ کہتے ہیں کہ

”دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں رکھتی ہے، پرواز مگر رکھتی ہے“

رنگیلا کی ڈائریکٹ ڈائیلنگ نے بھی اپنا اثر دکھایا۔
سچے دل سے پکارنے والا کبھی اس کے دربار سے مایوس نہیں
لوٹتا جب کہ رنگیلا تو بڑا معصوم تھا۔ بڑا مظلوم تھا۔ اس کی دعا
کیسے باریابی حاصل نہ کرتی؟ اللہ عزوجل نے دو تقسیم کاروں
کے دل میں رحم پیدا کر دیا جو مشترکہ طور پر کام کرتے تھے۔
انہوں نے اپنے خیال میں گویا رنگیلا کے سات پشتوں پر
احسان کرتے ہوئے اس کی فلم ”دیا اور طوفان“ کی تقسیم
کاری قبول کر لی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ ”ہمیں تو ایک فیصد
بھی اُمید نہیں کہ اس فلم سے ہمیں کوئی فائدہ ہوگا۔“

اس کے بعد بھی انہوں نے اس کے زخم پر نمک پاشی
سے گریز نہیں کیا۔ ”نیا فلمساز، نیا ہدایت کار، جسے فلم بنانے
کا کوئی تجربہ نہیں۔ وہ بھلا فلم کیا بنائے گا؟ اور اس کی فلم کیسی
ہوگی؟ جب کہ اس کے بارے میں تمام افواہوں سے
تماشائی بھی باخبر ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہم تمہاری
فلم کی نمائش کی ذمہ داری لے رہے ہیں۔ تم کہو گے کیوں؟
اس کی وجہ؟ تو ہم اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ
تمہارے ساتھ فلم انڈسٹری میں جو سلوک ہوا اس پر ہمیں
افسوس ہوا اور ہم محض تمہارے انہی دکھوں کا ازالہ کرتے
ہوئے اپنے سرمائے کا رسک لے رہے ہیں اگر ہمارا سرمایہ
ڈوب بھی گیا تو اس بات کا ہمیں اطمینان ہوگا کہ ہم نے
ایک نیک مقصد کے لیے قربانی دی۔“

قربانی دینے والے تقسیم کاروں کی باتیں سن کر اس
نے انہیں ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز
میں کہا۔ ”اللہ آپ لوگوں کو جزائے خیر دے۔ آپ لوگوں کی
یہ قربانی فلمی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ اس انسان
کش دور میں آپ لوگوں کی ذات بڑی غنیمت ہے۔“

تقسیم کار کے دفتر سے نکلا تو اسے احساس بھی تھا کہ
قسمت اس کے ساتھ کیسا کھیل کھیلنے والی ہے۔

جب تک ”دیا اور طوفان“ کی تقسیم کاری کا مسئلہ حل

نہیں ہوا تھا، رنگیلا کا مذاق اڑانے والے خوب بغلیں بجاتے رہے۔ بہت خوش ہوتے رہے۔ انہیں یقین تھا کہ اس فلم پر کوئی تقسیم کار ہاتھ نہیں رکھے گا۔ اسے ریلیز کرنے کی رنگیلا کی حسرت بھی پوری نہیں ہوگی مگر

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

جب "دیا اور طوفان" کی ڈسٹری بیوشن ہوگئی تو بدخواہوں کو ایک بار پھر مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا مگر اس موقع پر بھی ان کی بدخواہی کی آگ سرد نہیں پڑی۔ وہ ایک دوسرے سے یہ کہہ کر گویا اپنے زخموں پر پھاہے رکھنے لگے۔ "تقسیم کاری ہونے دو۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ فلم دیکھنے کون آئے گا؟ وہ بے چارہ خود آئے گا یا اس کے تقسیم کار۔ نہ صرف وہ سینما گھر میں سر پکڑ کر روئے گا بلکہ بدنصیب ڈسٹری بیوٹر بھی سینہ کوبی کریں گے کہ ہائے ہم نے یہ کیا کیا! بھئی! ایسے لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے جو جانتے بوجھتے ہوئے سانپ کے بل میں ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ آخر ایسی متنازعہ فلم کی ڈسٹری بیوشن رائٹس حاصل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

جب تک "دیا اور طوفان" نمائش پذیر نہیں ہوئی اس کے خلاف منفی پروپیگنڈوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کوئی کہتا۔ "میری تو سمجھ میں نہیں آتا اس فلم کی عبرت انگیز ناکامی پر اس غریب کا کیا حشر ہوگا؟"

دوسرا آہ بھرتے ہوئے کہتا۔ "ہماری فلم انڈسٹری بے چاری، ایک ابھرتے ہوئے کامیڈین سے محروم ہو جائے گی۔"

"تم درست کہہ رہے ہو۔" تیسرا اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہتا۔ "حقیقتاً یہ صدمہ اس بدنصیب کے لیے بڑا جانکاہ ہوگا۔"

یہ اور ایسی ہی باتیں نگار خانوں کے گرد گردش کرتی رہتیں۔ رنگیلا کا مذاق اڑانے والے آپس میں ایسی باتیں کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہتے تھے۔ رنگیلے نے ایسی باتوں پر کان دھرنا بند کر دیا تھا۔ اب وہ ان باتوں پر توجہ ہی نہیں دیتا تھا۔ بس اپنے تئیں یہی سوچتا رہتا۔ "عزت اور ذلت دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے جو میرے مولا کو منظور ہوگا جو میرے مقدر میں ہوگا وہی ہوگا۔ پھر کسی فکر اور پریشانی کی کیا ضرورت؟"

"دیا اور طوفان" کی نمائش کی جو تاریخ طے کی گئی تھی اسی تاریخ کو ایک بڑے بینر کی فلم بھی نمائش کے لیے پیش کی جا رہی تھی۔ جس کے ہیرو محمد علی تھے۔ اسی بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کتنی بڑی فلم تھی۔ دیگر کاسٹ اور کریڈٹ بھی بڑے ناموں سے مزین تھی۔

ایک دن محمد علی اپنے دوستوں کے ساتھ اسٹوڈیو میں خوش گپیاں کر رہے تھے کہ رنگیلا کسی کام سے ادھر سے گزرا۔ علی بھائی نے اسے دیکھ کر آواز دی۔ "ارے بھئی پروڈیوسر ڈائریکٹر صاحب! اب ایسی بھی کیا بے رخی کہ سلام دعا تک بھول گئے۔ منہ پھیر کر گزر رہے ہو۔"

رنگیلا ان کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ سلام کیا اور کہا۔ "فرمایئے۔"

علی بھائی نے اسے مزید چھیڑا۔ "بس یہی فرمانا ہے کہ اب بھی وقت ہے میری فلم کے مقابلے میں اپنی فلم نہ لاؤ، پٹ جائے گی۔"

رنگیلا نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی مخصوص مسکراہٹ اپنے چہرے پر بکھیر کر کہا۔

"کوئی گل نہیں، جو مقدر میں ہوگا وہی ہوگا۔ میں ہر طرح کی ناکامی کے لیے ہر وقت خود کو تیار رکھتا ہوں۔"

رنگیلا جیسا صابر و شاکر شخص اپنے وقت کے سپر اسٹار کو اور کیا جواب دیتا۔ علی بھائی کے چمچوں نے ان سے کہا۔ "آپ کا جو فرض تھا آپ نے پورا کر دیا اگر اگلے کا مقدر ہی تباہی و بربادی ہے تو اس سے اسے کون روک سکتا ہے؟"

علی بھائی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "پٹھان بچہ ہے نا۔ اس لیے اس کی کھوپڑی میں کوئی اچھی بات جلدی نہیں سماتی۔ چلو اگر ٹھوکر کھا کر ہی سنبھل جائے تو بھی بڑی بات ہوگی۔"

پھر وہ دن بھی آگیا۔ جس دن وہ دونوں فلمیں ایک ساتھ ریلیز ہوئیں۔ لوگ متوقع رزلٹ کے منتظر تھے۔ کان اس خبر کے انتظار میں تھے کہ رنگیلا کا خانہ خراب ہوگیا۔ طوفان نے رنگیلا کی امیدوں کا دیا ہمیشہ کے لیے گل کر دیا۔ بڑے بینر کی فلم طوفان سے ٹکرانے کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا لیکن جب میٹنی شو ختم ہوا اور تماشائی دونوں فلمیں دیکھ کر باہر نکلے تو معاملہ بالکل برعکس تھا۔ سپر اسٹار کی فلم "دیا اور طوفان" کے مقابلے میں پٹ چکی تھی۔ "دیا اور طوفان" دیکھ کر سینما گھروں سے باہر نکلنے والا ہر تماشائی کہہ رہا تھا۔

"واہ وا! رنگیلا نے کیا فلم بنائی ہے جی خوش کر دیا۔" اور گانا بھی کیا خوب صورت گایا ہے۔

گا میرے منوا گاتا جارے
جانا ہے ہم کا دور

ٹھمک ٹھمک نا چل رے بیلوا
اپنی نگریا ہے دور
جانا ہے ہم کا دور

"ارے یار! وہ تو پیدائشی ہدایت کار لگتا ہے۔ اپنی پہلی ہی فلم میں بڑے بڑے طرم خانوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔"

دوسری طرف بڑے بینر کی فلم دیکھنے والے بڑے دل برداشتہ ہوئے۔ "ہم تو بڑے بڑے نام دیکھ کر فلم دیکھنے آئے تھے لیکن یہ تو دو کوڑی کی فلم نہیں۔"

"محض بڑے ناموں کے سہارے بڑی فلم نہیں بنتی۔ بڑی فکر اور بڑی سوچ نہ ہو تو فلم کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

میٹنی شو کے بعد دونوں فلم کے رزلٹ نے فلم انڈسٹری کو جیسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ کیا ہو گیا۔ کیسے ہو گیا۔ دوسرے اور تیسرے شو کے بعد "دیا اور طوفان" کی عوامی پذیرائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اگلے روز کے تمام سینما گھروں کے تمام شوز فل ہو گئے اور سینما گھروں میں "ہاؤس فل" کے بورڈ لٹکا دیے گئے اور پھر اخباروں کی خبروں اور تبصروں نے اس فلم کی مقبولیت اور شہرت میں مزید چار چاند لگا دیے۔ اگلے ہفتے سینما گھروں کی تعداد بڑھانی پڑی۔ بڑے بینر کی فلم کی ناکامی سے جو سینما گھر خالی ہوئے ان میں "دیا اور طوفان" کی نمائش شروع کر دی گئی۔

اس انہونی پر جہاں عام فلم والے حیران پریشان تھے وہاں بدخواہوں کی مارے صدمے کے بولتی بند ہو گئی تھی۔ بے چاروں نے سوچا تھا کیا...... کیا ہو گیا۔ انہیں تو صد فیصد یقین تھا کہ "دیا اور طوفان" سپر فلاپ فلم ثابت ہو گی۔ اس صدمے میں رنگیلا کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہو گا اور اس کے تقسیم کاروں کا دیوالیہ نکل جائے گا لیکن یہ فلم سپر ہٹ ہو گئی اور تقسیم کاروں کی تجوریاں تیزی سے بھرنے لگیں۔ وہ سارے ڈسٹری بیوٹرز جنہوں نے رنگیلا کو دھتکار دیا تھا، ذلت آمیز انداز میں انکار کر دیا تھا۔ اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر اس کی عزت نفس کو مجروح کیا تھا۔ ان پر پچھتاوے کے دورے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ کف افسوس مل رہے تھے۔ اپنے آپ کو کوس رہے تھے کہ ہائے ہائے ہم نے کیا کر دیا۔ اس کے علاوہ اب وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ جن تقسیم کاروں کی عبرت ناک ناکامی کا وہ خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے تھے۔ تجوریاں بھر رہے تھے۔ ان کے بینک بیلنس میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔

رنگیلا...... جسے کم و بیش سب ہی کھوٹا سکہ سمجھ رہے تھے۔ اپنی اس پہلی فلم کی فقید المثال کامیابی سے انتہائی اہمیت کا فلمساز و ہدایت کار بن گیا۔ اس کی شہرت اور مقبولیت عروج پر پہنچ گئی۔ تمام لوگ اس کی فنی خوبیوں اور صلاحیتوں کے گن گانے لگے۔

"یار! وہ تو چھپا رستم نکلا۔"

"ہاں چھوٹے سرمائے اور چھوٹے آرٹسٹوں کے تعاون سے اس نے کتنی بڑی فلم بنا لی۔ اس کے اندر تو فن کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ لوگ اسے خونخوار انڈر اسٹیمیٹ کر رہے تھے۔"

جو جیت جائے وہی سلطان۔ ہمارے ہاں یہ پرانی رسم ہے۔ جیتنے والے کے گلے میں ہار ڈالتے ہیں۔ ہارنے والے کو دھتکار دیتے ہیں۔ فلم والے، تقسیم کار اور سینما مالکان اب سب کی زبانیں رنگیلے کی تعریف و توصیف کرتے تھکتی نہیں تھیں۔ میڈیا نے بھی اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ پہلے جو اس کے بارے میں چھوٹی موٹی خبریں یا تصویریں چھاپ کر یہ سمجھتے تھے کہ اس پر احسانِ عظیم کیا ہے اب اس کا بیان شہ سرخیوں کے ساتھ چھاپنے لگے۔ اس کے بڑے بڑے انٹرویوز شائع کرنے لگے۔

اسی لیے سیانے لوگ کہتے ہیں کہ کبھی کسی کو کمتر نہ سمجھو۔ کسی کو بے توقیر سمجھ کر اس کی بے عزتی نہ کرو۔ رنگیلا کے صبر و شکر کا عالم آج بھی پہلے جیسا تھا بلکہ اس میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا تو رواں رواں رب العزت کا سجدۂ شکر بجالاتا تھا۔ اس موقع پر وہ اپنے استادوں کو بھی یاد کرتا تھا جنہوں نے اسے اچھی اچھی باتیں بتا کر حکمتِ عملی کا سبق پڑھا کر، علم و آگہی کے راستے پر چلا کر اس قابل بنایا تھا کہ آج ہر زبان پر اس کا تذکرہ تھا۔ اس نے کئی مواقع پر اس بات کا اظہار کیا۔

"میں تو پٹھان بچہ تھا اور میری رگوں میں ایسے باپ کا خون دوڑ رہا تھا جو لڑنے مارنے میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ میرے ساتھ یار لوگوں نے جو سلوک کیا جس جس طرح مجھے تنگ کیا، مجھے نقصان پہنچایا، میں چاہتا تو ان کے خلاف بہت کچھ کر سکتا تھا۔ دو چار کے ہاتھ پیر توڑ کر رکھ دیتا، ان کی بتیسی نکال کر انہیں تھما دیتا۔ چند ایک کو جہنم رسید بھی کر سکتا تھا مگر میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اپنے بزرگوں، اپنے استادوں کی باتوں پر عمل کرتے ہوئے صبر و تحمل سے کام لیا۔ غصے کو پی جانا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ میں یہ کڑوے گھونٹ مسلسل پیتا رہا۔

اپنے اللہ پر بھروسا کر کے ہر دکھ سہتا رہا اور دکھ دینے والوں کو معاف کرتا رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری کامیابی اسی صبر و شکر کا انعام ہے۔''

وہ اپنے مخاطب کو کہتا تھا۔ ''میں آپ سے بھی یہی عرض کروں گا کہ غصے کو پی جانا اور دکھ دینے والوں کو معاف کر دینا بڑی بہادری کا کام ہے۔ آپ بھی اس پر عمل کریں اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کریں۔''

رنگیلا نے یہ فلم اس لیے بنائی تھی کہ اسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اس کے اندر جو صلاحیتیں ہیں انہیں کوئی دوسرا اجاگر نہیں کرے گا۔ اسے باہر لانے کے لیے اسے خود فلم بنانی ہو گی۔ اس کا یہ سوچنا غلط نہیں تھا۔ دوسرے جس انداز میں اسے فلموں میں پیش کر رہے تھے، اس طرح تو برسوں لگ جاتے اسے اپنے کو منوانے میں۔ اس نے اپنی فلم بنا کر نہ صرف اپنے آپ کو ایک اچھا فلمساز اور باصلاحیت ہدایت کار ثابت کیا بلکہ اپنی گلوکاری کی پوشیدہ صلاحیتوں کا بھی لوہا منوایا۔ اس فلم میں اس کا گایا ہوا گانا

گا میرے منوا گاتا جارے
جانا ہے ہم کا دور
تھک تھک نا چل رے بیلوا
اپنی نگریا ہے دور
جانا ہے ہم کا دور

بے حد مقبول ہوا۔ یہ گانا فلم کے ہیرو اعجاز درانی پر فلمایا گیا تھا اور فلم کی سچویشن پر اس کا بے حد خوشگوار اثر پڑا تھا۔ یہ سن 1969ء کا سال تھا جب ''دیا اور طوفان'' نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے رنگیلا کے لیے یہ سال بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس فلم کے سپر ہٹ ہونے پر اجتماعی طور پر سب نے اسے ایک باصلاحیت فنکار کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تھا سوائے چند بدخواہوں کے جو ابتدا ہی سے اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے۔ اب انہوں نے اپنی ترکش کے آخری تیروں استعمال کرنا شروع کیے۔ ''یہ رنگیلا کی پہلی اور آخری فلم ہے جو ہائی چانس کلک ہو گئی ہے۔ فلم انڈسٹری میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اچھی سے اچھی فلم فلاپ ہو جاتی ہے اور عام سی معمولی سی چھوٹی سی بے کار سی فلم ہٹ ہو جاتی ہے۔''

لیکن افسوس صد افسوس کہ ان کے یہ تیر بھی خطا کر گئے۔ نشانے پر نہیں لگے۔ ان کی ہر بات بھی غلط ثابت ہو گئی کہ ''دیا اور طوفان'' ہائی چانس کلک کر گئی ہے۔ کیونکہ رنگیلا کی آنے والی دو فلمیں ''رنگیلا'' اور ''دل اور دنیا'' نے تواتر کے ساتھ عظیم الشان کامیابیاں حاصل کیں اور یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ وہ حادثاتی طور پر کامیابی حاصل کرنے والا فنکار نہیں۔ وہ حقیقتاً ایک جینئس کلاکار ہے۔ اس کے اندر زبردست فنی خوبیاں پوشیدہ ہیں جو موقع کی منتظر تھیں کہ انہیں کب سامنے آنے کا موقع ملتا ہے۔

ناقدین نے اس کی پہلی فلم کو اس کے نام کے لحاظ سے بھی بڑا سراہا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جن حالات میں یہ فلم بنائی گئی اس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ تیز اور تند طوفان میں رنگیلا نے اپنا جو دیا جلائے رکھا شاید کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار جاتا۔ اس کا جلایا ہوا دیا طوفان کے نامہربان جھونکوں کی زد میں آ کر بجھ جاتا۔ اس نام کو فلمی دانشوروں نے بڑا علامتی قرار دیا۔

اس کی دوسری فلم کا نام ''رنگیلا'' تھا۔ جو اپنے نام کی مناسبت سے اس نے رکھا تھا۔ اس فلم کی کہانی اس کی اپنی عزم و ہمت کی کہانی سے ملتی جلتی تھی۔ اب اس کے حالات پہلے سے بہت مختلف تھے۔ پہلی فلم ایک ایک پیسا جوڑ کر اس نے بڑی مشکلوں سے مکمل کی تھی۔ بہت سو بجٹ کی فلم تھی۔ اس پر بہت محتاط انداز میں اور ہاتھ روک کر خرچ کیا تھا جب کہ اب اس کے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی لہٰذا اس نے دل کھول کر اس پر خرچ کیا تھا۔ دوسری فلم کی ابتداء ہی سے بڑے بڑے تقسیم کار اس کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کرنے لگے کہ اس فلم کا سودا ان سے کر لے۔ منہ مانگا دام وصول کر لے۔ رنگیلا وہ وقت نہیں بھولا تھا جب انہی لوگوں نے اسے بری طرح دھتکار دیا تھا۔ اپنے دفتر میں جی بھر کر اس کی تذلیل کی تھی اور اسے مایوس ہو کر جانے پر مجبور کیا تھا۔ وہ چاہتا تو انہیں بھی ٹکا سا جواب دے سکتا تھا۔ انہیں ذلیل و خوار کر کے اپنے دفتر سے دھکے دے کر نکال سکتا تھا۔ مگر اس نے کسی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا۔ ہر ایک کو بڑے خلوص اور احترام سے جواب دیتا۔ ''سر جی! مجھے فلم تو مکمل کر لینے دیں۔'' وہ سب سے بڑی شائستگی سے کہتا۔ ''فلم مکمل ہو جائے گی تو میں خود آپ کے پاس آؤں گا۔''

''ایک ایگریمنٹ تو کر لیجیے نا رنگیلا جی! اس میں کیا حرج ہے؟''

دستور یہی تھا بڑے اور مستند فلمساز ادھر اپنی فلم کا اعلان کرتے ادھر ان کی نمائش کے حقوق کا سودا ہو جاتا تھا۔ کچھ فلموں کی تقسیم کاری فلم کی تکمیل کے دوران طے ہو جاتی

تھی۔ بہت سی فلمیں تقسیم کاروں کے پیسوں ہی سے مکمل کی جاتی تھیں۔ رنگیلا اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتا۔

"حرج تو کچھ نہیں سر جی! بس اسے میرا پاگل پن ہی سمجھیے کہ میں اسے اپنے پیسے سے مکمل کرنا چاہتا ہوں اور فلم کی تکمیل سے پہلے اس کے سودے کے جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتا۔ آپ اطمینان رکھیے فلم مکمل کر کے سب سے پہلے آپ ہی کے پاس آؤں گا۔"

اس طرح کے جواب دے کر وہ ہر تقسیم کار کو ٹالتا رہا۔ ہر آنے والا اپنے دل میں جانے کیا کیا ارمان لے کر واپس جاتا کیونکہ رنگیلا اب ان کی نگاہوں میں کھوٹا سکہ نہیں۔ سکے ڈھالنے والا ٹکسال تھا۔ نوٹ چھاپنے والی مشین تھا۔ سچ کہا ہے کسی نے

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تقسیم کار کیسے کیسے سہانے خواب دیکھنے لگے تھے۔ لو بجٹ کی فلم میں اس نے تہلکہ مچا دیا تھا تو اس ہیوی بجٹ کی فلم میں کیا قیامت نہیں ڈھائے گا؟ ظاہر ہے منہ مانگے دام وصول کرنا چاہے گا۔ یہ تو اس کا حق بنتا ہے۔ میں تو اس کی ہر شرط مان لوں گا۔ اگر میں نہیں مانوں گا تو دوسرے مان جائیں گے۔ سب ہی تو اس فلم سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ کیوں نہ بیٹھیں؟ یہ فلم بھی تو رنگیلا کی ہے۔ جس کی پہلی فلم نے دولت کی دھواں دھار بارش برسا دی تھی۔ نئی فلم سے روپے پیسے کی جو بارش ہونے والی ہے اس میں میں کیوں نہ نہاؤں؟

خواب دیکھنے والے خواب دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ "رنگیلا" مکمل ہو گئی مگر اس سے پہلے کہ رنگیلا اس فلم کے لیے کسی کے پاس جاتا یا وہ رنگیلا کے پاس جا کر اس فلم کا سودا طے کرتے۔ انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ رنگیلا اپنی یہ دوسری فلم "رنگیلا" ملک گیر طور پر خود ریلیز کرے گا۔ اس نے اپنا ذاتی تقسیم کار ادارہ قائم کر لیا ہے۔ اسی کے توسط سے پورے ملک میں خود اس کی نمائش کرے گا۔ تمام پُرامید تقسیم کاروں پر ناامیدی کی اوس پڑ گئی۔ ان کے خوابوں کے شیش محل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گئے سب کے منہ سے ہائے نکل گئی......ہائے۔

سوچا تھا کیا کیا ہو گیا!

کسی نے دل ہی دل میں کہا۔ کوئی برملا کہنے پر مجبور ہو گیا۔ "شاید یہ ہمارے اس سلوک کا ردِعمل ہے جو ہم نے اس کے ساتھ اس کی پہلی فلم "دیا اور طوفان" کے موقع پر کیا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم اس کے اسی سلوک کے مستحق تھے۔"

رنگیلا لوگوں کو ہنسانے والا اداکار تھا۔ فلم والے اسے ایک مسخرے کے سوا کچھ اور نہیں سمجھتے تھے مگر وہ اتنا نادان، ناسمجھ اور صرف ایک مخولیا نہیں تھا۔ لوگوں کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کرنے والا یہ اداکار اپنے سنگی ساتھیوں کے سلوک سے بہت رویا تھا۔ بہت تڑپا تھا۔ اس کے بھی اپنے جذبات تھے۔ احساسات تھے۔ اس نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا تھا۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ وہ تو بس یہی چاہتا تھا کہ اگر کوئی مجھے فائدہ نہیں پہنچا سکتا تو نقصان بھی نہ پہنچائے مگر یار لوگوں نے تو حد کر دی۔ اس کے لیے قدم قدم پر کانٹے بچھائے مگر آفرین ہے اس پر کہ اس نے نہ اس وقت کسی سے شکوہ شکایت کی نہ بعد میں۔ اب اگر وہ یہ چال بڑی خاموشی سے چل گیا کہ اپنی فلم سے آس لگانے والوں کو بے آس کر دیا۔ ان کے سندر سپنوں کی پگڈنڈیوں کو ویران کر دیا اس کی فلم سے اپنی تجوریاں بھرنے کے خواب دیکھنے والوں کو مایوس کر دیا تو اتنا تو اسے کرنا ہی چاہیے تھا۔

رنگیلا کے بارے میں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ پیدائشی جینئس تھا۔ اس نے اپنی پہلی فلم میں جو تجربے کیے تھے اور ان میں کامیاب ہوا تھا۔ اس سے اس کے حوصلے بلند ہوئے تھے۔ لہٰذا دوسری فلم میں اس سے کہیں زیادہ انقلابی تجربہ کیا۔ یہ بولڈ تجربہ تھا۔ خود اس کے ہیرو بننے کا تجربہ۔ جی ہاں وہ اس فلم کا ہیرو بھی تھا۔ اس فلم کی کہانی چونکہ اس کی اپنی زندگی سے بہت حد تک ملتی جلتی تھی۔ اس لیے اس نے اس فلم میں خود کو ہیرو کے روپ میں پیش کیا۔ اس مرحلے میں بھی اس کے بدخواہوں کو یہ توقع تھی کہ اس کا یہ تجربہ بری طرح ناکام ہو گا۔ تماشائی ایک کامیڈین کو ہیرو کے روپ میں پسند نہیں کریں گے۔ مسترد کر دیں گے۔ ان کی یہ سوچ اس حد تک غلط نہیں تھی کہ برصغیر ہند و پاک میں فلموں کے ہیرو ہیروئن کا حسن و جوانی کا پیکر ہونا ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ رنگیلا اس فارمولے پر کسی بھی طرح پورا نہیں اترتا تھا۔ اپنے ٹیڑھے میڑھے خدوخال کی وجہ سے وہ مزاحیہ اداکاری میں تو اپنی گاڑی چلا سکتا ہے فلم کے ہیرو کی حیثیت سے ایک دم ان فٹ ثابت ہو گا۔

مگر یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جس سے رب راضی ہو، اس سے سب راضی ہوتے ہیں۔ رنگیلے پر

اس کے مولا کریم کی رحمت تھی۔ اس لیے ساری توقعات دھری رہ گئیں۔ تماشائیوں نے اسے اس روپ میں بھی نہ صرف پسند کیا بلکہ اس قدر پسند کیا کہ فلم سپرہٹ ہوگئی۔ بات دراصل یہ تھی کہ رنگیلا نے اس فلم کا ٹائٹل رول اتنی کامیابی اور اس خوبی کے ساتھ ادا کیا کہ اس کی فنی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑا۔ جیسا کہ عرض کرچکا ہوں ہماری فلموں کے ہیروؤں کا ایک خاص کانسپٹ ہے۔ ہیرو مردانہ حسن اور وجاہت کا نمونہ ہو مگر اس ٹیڑھے میڑھے اداکار نے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی اور جسے گھوڑے کے منہ والا تک کہا جاتا تھا۔ ہیرو بن کر فلم میں آیا تب بھی اپنا لوہا منوالیا۔ فلم کی کامیابی کا دارومدار تماشائیوں کی پسند پر ہوتا ہے یہ الفاظ دیگر جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔ ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کرنے والے کرداروں میں تو اسے فلم بین پسند کرتے ہی تھے۔ فلم کے ہیرو کے روپ میں بھی وہ انہیں برا نہیں لگا۔

اپنی پہلی فلم میں اس نے فلمساز و ہدایت کار بننے کا تجربہ کیا تھا، جس میں کامیاب رہا۔ دوسری فلم میں اس کے ہیرو بننے کا تجربہ بھی کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ یہ اس کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ وہ جو بھی سوچتا تھا کہ اگر دوسروں پر انحصار کیے رہا تو میری صلاحیتوں کو ابھرنے کا کبھی موقع نہیں ملے گا۔ اس کی یہ سوچ غلط نہیں تھی۔ اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے فلم بنانے کا اس کا فیصلہ درست تھا۔ یہ اس کی کامیابی کی ہیٹ ٹرک تھی۔ اس نے زبانی کلامی اپنے بارے میں کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ بڑی خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا جو کچھ اسے ثابت کرنا تھا کرتا رہا۔ اس نے تو ایک ایکسٹرا اداکار کی حیثیت سے اپنا فنی کیریئر شروع کیا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف ایک کامیاب کامیڈین بن کر دکھایا بلکہ فلمسازی بھی کی۔ ہدایت کاری بھی کی، گانے بھی گائے، گانوں کی دھنیں بھی تیار کیں، کہانیاں بھی تخلیق کیں اور فلم کا کامیاب ہیرو بن کر بھی دکھایا۔ وہ جو کچھ کرتا تھا۔ اس کے لیے کسی سے مشورہ نہیں لیتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ مشورہ دینے والے اسے کیسا مشورہ دیں گے۔ لہٰذا وہ اپنے اللہ پر بھروسا کرکے اور اپنے آپ پر اعتماد کرکے اپنا ہر کام کرتا تھا۔ اپنا کام نہایت دیانتداری کے ساتھ کرتا تھا۔ محنت اور لگن کے ساتھ کرتا تھا۔ اس نے کبھی بھی اپنے کام کو بیگار سمجھ کر نہیں کیا۔ اس کی نیت ہمیشہ درست رہتی تھی۔ اس لیے اس کا ہر کام بہتر طریقے پر ہوتا تھا۔ کامیاب ہوتا تھا اور اسے پریشانی اور ندامت کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑتا تھا۔ مسجد کے امام صاحب کی بات اس نے گرہ میں باندھ لی تھی۔

”اللہ نیتوں کا جاننے والا ہے۔ اگر تمہاری نیت درست ہوگی تو تمہیں کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا نہیں پڑے گا۔ خدا اس کا بہتر اجر دے گا۔ تم اپنا کرو یا دوسروں کا، تمہاری نیت درست ہونی چاہیے۔ نیک نیتی سے کام کرنے والوں کو رب کریم بھی مایوس نہیں کرتا۔“

اس نے مسجد سے نکل کر پریکٹیکل زندگی شروع کی تو کسی بھی مرحلے میں اس حکمت کی بات کو فراموش نہیں کیا۔ جو کام بھی کیا جی جان لگا کر کیا اور امام صاحب کے ارشاد کے مطابق رب العزت نے اسے کبھی مایوس نہیں کیا۔ اس کا قدم آگے اور آگے ہی بڑھتا گیا یہاں تک کہ اب وہ تین سپرہٹ فلموں کا پروڈیوسر اور ڈائریکٹر تھا اور پاکستانی فلمی صنعت میں اس کا ایک ممتاز مقام تھا۔ اس کی یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ متواتر تین سپرہٹ فلمیں بنانے کے بعد اس کا دماغ خراب نہیں ہوا تھا۔ جب کہ ہمارے ہاں کسی ایک اداکار کی ایک فلم کامیاب ہوجاتی ہے تو وہ سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ لوگوں کے سلام کا جواب نہیں دیتا لیکن اتنی بڑی کامیابیوں کے بعد بھی رنگیلا کے موڈ مزاج میں تبدیلی نہیں آئی۔ اب بھی اس کی طبیعت میں وہی انکسار تھا، عاجزی تھی، جو ان فلموں سے پہلے تھی۔ وہ اپنی اس کامیابی کو اللہ کی دین سمجھتا تھا۔ اس کی کرم نوازی سمجھتا تھا اور غرور و فخر کرکے اللہ تعالیٰ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا کہ رب العزت کو ایسے لوگ پسند نہیں۔

اگر وہ چاہتا تو اپنی سپر مقبولیت اور شہرت کے بعد اپنے آپ کو صرف اپنی فلموں ہی میں کیش کرتا مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اپنی فلمیں پروڈیوس کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے فلم سازوں کی فلموں میں بھی کام کرتا رہا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اب اس کی حیثیت ایک اداکار سے زیادہ ایک فلم ساز و ہدایت کار کی تھی۔ اس کے باوجود اس نے خودغرضی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اپنی ذات، شہرت اور مقبولیت سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا رہا۔ یہ بہت بڑے ظرف کی بات تھی۔ یہ اس کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اس نے فلم انڈسٹری کے دوسرے لوگوں کو بھی اپنے سے فیض یاب ہونے کا بھرپور موقع دیا۔ اچھے کام کا اچھا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس طرح اسے ہر طرح کے کرداروں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اچھے اور برے ہر طرح کے کرداروں میں پرفارم کرکے اس کے

تجربات میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ اس کی فنی صلاحیتیں بہت بڑھیں۔ اس کو ہر طرح کے کردار ادا کرنے کا اعتماد پیدا ہوا۔

ایک فلم تھی "میری زندگی ہے نغمہ" اس کے ہدایت کار نے اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کو پیشِ نظر رکھ کر اس سے تین کردار کروائے۔ یہ تین کردار، دادا، بیٹا اور پوتا کے تھے۔ کسی اداکار کے لیے ڈبل رول کرنا ہی بڑا آزمائشی ہوتا ہے۔ یہ تو تین کردار تھے۔ ان کی ادائیگی میں رنگیلا نے اس فلم کے فلمساز و ہدایت کار کو مایوس نہیں کیا۔ ان کی توقعات پر پورا اترا۔ تینوں کرداروں میں اس کی اداکاری قابلِ دید تھی۔ قابلِ تحسین تھی۔ ناقدین اور مبصرین نے دل کھول کر اس کی تعریف کی۔

اس کی اس فلم کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے تینوں کرداروں کو انتہائی کامیابی سے نبھانے کا کارنامہ انجام دینے کے بعد ایک فلمساز نے اپنی فلم "پردہ نہ اٹھاؤ" میں اس سے بیک وقت چار کردار ادا کروائے اور اس نے حیرت انگیز طور پر ان چاروں کرداروں کی ادائیگی میں بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اسکرین پر جس نے بھی اسے ان کرداروں میں دیکھا۔ دل کھول کر اس کی تعریف و تحسین کی۔ اسے ورساٹائل اسٹار قرار دیا۔ اس موقع پر بھی اس کے عجز و انکسار میں کمی نہیں آئی۔

"یہ سب کچھ رب العزت کی ذرہ نوازی ہے۔ میں کیا اور میری بساط کیا۔ بے شک اسی کی ذات عزت اور ذلت دینے والی ہے۔"

وہ لوگوں کی تعریف و توصیف کے بعد ایسے جملے ضرور ادا کرتا تھا۔ اس نے ایسے کسی موقع پر کوئی بڑا بول نہیں بولا۔ ہلکے سے بھی غرور اور فخر کا مظاہرہ نہیں کیا۔

"جب آپ کو ایک سے زیادہ کردار ادا کرنے کو کہا گیا تو کیا آپ کو اپنے پر اعتماد تھا کہ آپ انہیں کامیابی کے ساتھ ادا کریں گے؟"

ایسے سوال پر اس کا جواب یہی ہوتا۔ "میں چونکہ اپنا ہر کام اللہ پر بھروسا کر کے کرتا ہوں۔ اس لیے اپنی سی کوشش کرتا ہوں، باقی اللہ پر چھوڑ دیتا ہوں کہ جو اس کی مرضی ہو گی، رضا ہو گی، وہی ہو گا۔"

کوشش اور جدوجہد کرنے کا حکم تو اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے بھی دیا ہے۔ اللہ جدوجہد کرنے والوں کی نیت کو بھی دیکھتا ہے۔ اگر وہ نیک نیتی سے اپنا کام کرتے ہیں اور انجام اپنے رب پر چھوڑ دیتے ہیں تو رب العزت ان کی عزت میں اضافہ کرتا ہے۔ انہیں کامیابیوں اور کامرانیوں سے سرفراز کرتا ہے۔

مسجد کے امام صاحب اپنی تقریروں میں نمازیوں کے لیے حکمت کے جو موتی لٹاتے تھے اور جنہیں اس نے بھی اپنے دامن میں محفوظ کر لیے تھے۔ آج وہ اس کے کام آرہے تھے۔

نیک نیتی سے کیا ہوا کوئی فیصلہ، کوئی کام کبھی گھاٹے کا سودا نہیں ہوتا۔ رنگیلا نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور زبردست عوامی عزت، شہرت اور مقبولیت کو صرف اپنے لیے مختص نہیں رکھا۔ اس بات کی کوشش نہیں کی کہ انہیں صرف اپنی ذات کے لیے کیش کرے۔ اس نے اپنی بے پناہ خوبیوں اور صلاحیتوں سے پوری فلم انڈسٹری کو فیض یاب کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس سے دوسرے بھی ثمر یاب ہوئے اور بلواسطہ یا بلا واسطہ اس کے ثمرات خود اسے بھی ملتے رہے۔ اپنی ابتدائی تین فلموں میں تواتر کے ساتھ کامیابی سے اس کے لیے آگے بڑھنے کے تمام راستے کھل گئے تھے۔ وہ کامیابی کی ضمانت بن گیا تھا۔ اس لیے اب یہ اس کا وقت تھا۔ ہر فلمساز و ہدایت کار اسے اپنی فلم کی کامیابی کے لیے اپنی فلم میں کاسٹ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کسی کو انکار نہیں کیا۔ منہ مانگے معاوضے اور اپنی شرائط پر سب کی فلموں میں کام کرتا رہا۔ اس طرح جہاں اس کے بینک بیلنس میں بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا وہیں اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھرنے اور نکھرنے کا بھی سنہری موقع ملا۔ اگر وہ صرف اپنی فلموں تک اپنے آپ کو محدود رکھتا تو شاید اس کے تجربات میں وہ اضافہ نہ ہوتا جو دوسری صورت میں ہوا۔ اس کی صلاحیتوں کو دیکھ کر فلم ساز و ہدایت کار نہایت الجھے ہوئے اور مشکل کردار اس سے کرواتے اور وہ ان کے معیار پر پورا اترتا جب کہ تماشائی اسے نت نئے کرداروں میں دیکھ کر زیادہ سے زیادہ اس کے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔

اگر وہ دوسروں کی فلموں میں اداکاری نہ کرتا تو بہت ممکن ہے اس کی اپنی انیس بیس فلموں میں کچھ اضافہ ہو جاتا۔ شاید 35,30 فلموں کا فلم ساز و ہدایت کار بن جاتا جب کہ دوسری صورت میں ان باتوں کے بھی امکانات تھے کہ وہ یہ 19 فلمیں بھی نہیں بنا سکتا کیونکہ اس کی ابتدائی تین فلموں کی طرح دوسری فلموں نے ایسی ریکارڈ کامیابی حاصل نہیں کی۔ کچھ فلمیں درمیانی درجے کی ثابت ہوئیں تو

اور کچھ پیر فلاپ ہوگئیں۔ وہ مسلسل فلمیں اس طرح بناتا رہا کہ بطور اداکار اس کی آمدنی بہت ساؤنڈ تھی۔ اپنی فلمیں بنانے کے لیے اسے کبھی انویسٹر یا تقسیم کاروں کا محتاج نہیں ہونا پڑا۔ اس لیے یہ کہنا کسی طرح بھی غلط نہیں ہوگا کہ اس کا فیصلہ صد فیصد درست تھا کہ اسے اپنی صلاحیتوں سے سب کو فائدہ پہنچانا چاہیے اور خود بھی مستفیض ہونا چاہیے۔ اس نے دوسروں کی فلموں میں کام کر کے محض مالی فائدہ حاصل نہیں کیا بلکہ ان فلموں سے اس کی فنی خوبیوں کو بھی سنورنے اور نکھرنے کے بہتر مواقع ملے۔ جس کا ثبوت اس کی فلموں کے بے شمار ایوارڈز ہیں۔ ایوارڈز عوامی پسندیدگی کو پیش نظر رکھ کر دیے جاتے ہیں۔ رنگیلا نے اپنی اور دوسروں کی فلموں میں اپنی فنی خوبیوں کے جو جوہر دکھائے اس کی تعریف و توصیف نہ صرف اس کے تماشائیوں نے کی بلکہ فلمی مبصرین اور ناقدین نے بھی اس کا برملا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں اسے جو ایوارڈز ملے وہ اس کی بہترین مزاحیہ اداکاری کے علاوہ سنجیدہ اداکاری، ایک سے زیادہ کرداروں کی بہترین پرفارمنس اور بہترین کہانی نویس کے طور پر ملے۔

رنگیلا ظاہری شکل وصورت اور اپنے قد کاٹھ کی بنا پر کوئی پرکشش شخصیت کا مالک نہیں تھا۔ قدرت نے اسے کچھ ایسا غیر متوازن پیکر بنایا تھا کہ اسے دیکھ کر لوگوں کی سنجیدگی ختم ہو جاتی تھی۔ کیا یہ بات قابل غور وفکر نہیں کہ جس شخص کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی وہ فلموں کا ہیرو بننے لگا اور اس کی فلمیں دیکھنے والوں نے اسے اس روپ میں بھی مسترد نہیں کیا۔ ہیرو کی حیثیت سے بھی اسے پسند کیا۔ یہ بھی اس کا کمال تھا کہ فلموں کا کامیاب ہیرو بننے کے باوجود اس نے کامیڈی کرداروں سے توبہ نہیں کی، کیونکہ اس کی اصل پہچان تو کامیڈین ہی کی تھی۔

رنگیلا نے یوں تو سب ہی مزاحیہ اداکاروں کے ساتھ کام کیا۔ ننھا اور علی اعجاز کے ساتھ بھی فلم سازوں نے اس کی کامیاب جوڑی بنائی لیکن منور ظریف کے ساتھ جو جوڑی بنائی گئی۔ وہ بے حد کامیاب ہوئی۔ اس جوڑی کی طرح کوئی اور جوڑی عوامی پسندیدگی کی سند حاصل نہ کر سکی۔

رنگیلا کی منور ظریف سے دوستی بھی خاصی پکی تھی۔ وہ منور ظریف کو ایک اچھا اور سچا دوست سمجھتا تھا۔ افسوس کہ منور ظریف کی بے وقت موت نے رنگیلا کو ایک اچھے ساتھی سے محروم کر دیا۔ وہ اکثر اسے یاد کر کے کہتا۔ ”وہ میرا بہت اچھا دوست تھا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اداس ہو جاتا تھا۔ پھر ٹھنڈی آہ بھر کر کہتا۔ ”وہ جتنا بڑا، جتنا عظیم فنکار تھا اتنا ہی بے نظیر انسان بھی تھا۔ مجھے اس جیسا دوست پھر کبھی نہیں ملا۔“

منور ظریف بلاشبہ ایک باصلاحیت مزاحیہ اداکار تھا۔ رنگیلا نے کامیڈین کو ہیرو بنانے کی جو طرح ڈالی تھی اس کا فائدہ منور ظریف کو بھی پہنچا تھا۔ کئی فلموں میں منور ظریف کو بھی ہیرو یا سائیڈ ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا تھا مگر اس کے ساتھ یہ آسانی تھی کہ وہ ہیرو کے پیمانے پر پورا اترتا تھا۔ اس کی خداداد فنی خوبیوں سے بھی فلمسازوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔

حسب روایت فلم والوں نے اس کی صلاحیتوں سے اتنا فائدہ اٹھایا اور اس قدر اس سے کام لیا کہ مسلسل کام کرنے اور آرام نہ کرنے کی وجہ سے اس کی صحت متاثر ہوتی چلی گئی اور اس کے عین عروج کے زمانے میں موت نے پاکستانی فلمی صنعت کو ایک بے حد ٹیلنٹڈ اداکار سے محروم کر دیا۔ منور ظریف کی موت کا رنگیلا پر بہت اثر ہوا۔ وہ اس کی کمی اکثر محسوس کرتا تھا۔ اس کی باتیں یاد کر کے اداسی کے باوجود اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی تھی۔

”بڑا شریر اور کھلنڈرا تھا وہ۔“ وہ اپنی یادوں کی راکھ کریدتے ہوئے کہتا۔ ”ہم دونوں حج کی ادائیگی کے لیے ایک ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ دوران حج ہم دونوں ساتھ ساتھ ہی رہے۔ جب میں شیطان کو کنکریاں مار رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا، کوئی شخص شیطان کو چھوڑ کر مجھے کنکریاں مار رہا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا بھلا ایسا کون شخص ہے۔ جس کی کنکریاں انجانے طور پر مجھے لگ رہی ہیں یا جو جان بوجھ کر مجھے کنکریاں مار رہا ہے؟ تو میں نے دیکھا۔ وہ کوئی اور شخص نہیں۔ اپنا یار منور ظریف ہے جو تاک کر مجھے کنکریاں مار رہا ہے۔“ اس وقت تو میں مسکرا کر رہ گیا۔ بعد میں اس سے پوچھا۔

”یہ تیری کیا حرکت تھی۔ تو مجھے کیوں کنکریاں مار رہا تھا؟“

”میں بھی شیطان ہی کو کنکریاں مار رہا تھا۔ میرے لیے تجھ سے بڑا شیطان اور کون ہو سکتا ہے؟“

منور ظریف کی باتیں کرتے کرتے اکثر اس کی آواز گلوگیر ہو جاتی تھی۔ وہ دونوں ہی جینئس تھے۔ اس لیے فلموں کے سیٹ پر اکثر اسکرپٹ سے ہٹ کر فی البدیہہ مکالمے بول جاتے تھے ایسے میں کبھی کبھی دوسرا کھل کھلا کر ہنس

بھی جڑی ہوئی ہیں جو کسی خاص سچویشن کے لیے فلمائے گئے مگر بعد میں یہ گیت ہمارے معاشرے میں ایک رسم کے طور پر اپنا لیے گئے جیسے فلم ''مسٹر بدھو'' کا یہ گیت

ڈھولک بجا کے سہیلیاں بلا کے
بنڑے کے گیت میں گاؤں گی
اپنے بھیا کو دولہا بناؤں گی
او بھیا! پیارے پیارے بھیا!

اداکارہ دیبا پر پکچرائز ہونے والا یہ گیت آج بھی شادیوں کی تقاریب میں گایا جاتا ہے۔ 1976ء میں اس نے فلمساز راشد مختار کے فلمساز ادارہ نگار پکچرز کے بینر پر فلم ''گنوار'' ڈائریکٹ کی۔ اس فلم کا ہیرو بھی وہ خود تھا۔ نثار بزمی کی زبردست موسیقی اور ہٹ گانوں کے باوجود یہ فلم کامیاب نہ ہوسکی۔ اس فلم کے لیے مہدی حسن کا گایا ہوا گانا

بند آنکھوں میں سپنے تھے
سپنوں میں تم اپنے تھے
آنکھ کھلی تو ہم نے یہ جانا
سپنے آخر سپنے تھے

یہ گیت آج بھی امر سنگیتوں میں شامل ہے۔ ''گنوار'' کی باکس آفس پر ناکامی کے باوجود بطور ہیرو رنگیلا کی عوامی مقبولیت میں کوئی حرف نہیں آیا۔ یہی وہ دور تھا جب بطور ہیرو اس کا طوطی بول رہا تھا اور فلمساز آنکھیں بند کرکے اسے ہیرو کاسٹ کررہے تھے۔ اسی دور میں رنگیلا اور منور ظریف کی جوڑی بھی کامیابیوں کے بام عروج پر تھی۔ جب کہ بطور فلمساز و ہدایت کار اس کا ستارہ گردش میں تھا۔ غالباً اسی وجہ سے اس نے 1976ء سے 1978ء کے دوران کوئی ذاتی فلم نہیں بنائی۔ 1977ء میں پنجابی فلم ''بے گناہ'' بنائی لیکن وہ زیادہ نہ چل سکی۔ شاید اس لیے کہ وہ ''دل اور دنیا'' کی ری میک تھی۔ جب کہ 1979ء میں اس کی اپنی فلم ''عورت راج'' نے پچھلی ناکامیوں کا خسارہ پورا کردیا۔ یہ فلم بے حد کامیاب ہوئی کیونکہ اپنے منفرد موضوع اور تھیم کے لحاظ سے عام ڈگر سے ہٹ کر تھی۔ اس فلم میں اداکاروں نے خواتین اور اداکاراؤں نے مردوں جیسے کردار کیے تھے۔ جن میں وحید مراد، رانی اور سلطان راہی جیسے فنکار بھی شامل تھے۔ حقیقتاً یہ فلم سہراب مودی کی فلم ''الٹی گنگا'' کا چربہ تھی لیکن رنگیلا کو ناکامیوں کے دور میں کامیابی کی جھلک دکھا گئی لیکن ابھی ناکامیوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ 1980ء میں بطور فلم ساز اس کی پنجابی فلم ''اک دوجی تین لاڑے'' ناکام ہوگئی۔ 1981ء میں اس نے پھر اپنی ایک کامیاب فلم ''دیا اور طوفان'' کی ری میک پنجابی فلم ''امانت'' کے روپ میں پیش کی۔ یہ فلم ناکام تو نہیں ہوئی بس واجبی کامیابی حاصل کرسکی مگر یہ فلم اس نے اپنے لیے نہیں فلم ساز ایس اشتیاق کے لیے آشیانہ فلمز کے بینر تلے بنائی تھی۔ دوسری فلم سازوں کے بینر تلے فلمیں بنانے کا سلسلہ 1981ء سے جو شروع ہوا تو 1987ء تک جاری رہا۔ 1982ء میں کوہ نور فلمز کے بینر پر فلمساز شیخ اشفاق کے لیے پنجابی فلم ''جہیز'' بنائی جو ڈبہ ثابت ہوئی۔ 1983ء میں فلم ساز شان مصطفیٰ کے لیے پنجابی فلم ''سونا چاندی'' بنائی۔ اس کا مصنف بھی وہ خود تھا۔ یہ فلم سپرہٹ ہوئی۔ 1984ء میں بطور ہدایت کار رنگیلا کی تین فلمیں نمائش پذیر ہوئیں۔ ان میں پہلی فلم فلم ساز جمشید ظفر کی پنجابی فلم ''نمک حرام'' دوسری فلم فلمساز شان مصطفیٰ کی پنجابی فلم ''کاکا جی'' جب کہ تیسری فلم شان مصطفیٰ ہی کی پنجابی فلم ''راجا جانی'' تھی۔ یہ تینوں ہی فلمیں باکس آفس پر بری طرح ناکام ثابت ہوئیں۔ 1985ء میں فلم ساز ریاض بخاری کے لیے پنجابی فلم ''صاحب بہادر'' 1986ء میں ظہور فلمز کے بینر تلے پنجابی فلم ''قلی'' 1987ء میں فلم ساز جلال الدین خٹک کے لیے ''چنبیلی'' بنائی۔ یہ تینوں فلمیں بھی ناکامی سے دوچار ہوئیں۔

ان ناکامیوں کے بعد سات سال تک اس نے نہ کوئی فلم خود پروڈیوس کی نہ کسی دوسری فلم ساز کی کوئی فلم ڈائریکٹ کی۔ 1994ء میں اس نے اپنے ہی بینر پر فلم ساز و ہدایت کار کے طور پر اپنی آخری فلم ''خوب صورت شیطان'' بنائی۔ اس فلم میں اس نے نشو بیگم کی بیٹی صاحبہ کے مقابل اپنے بیٹے سلمان کو ہیرو کے طور پر پیش کیا لیکن اس فلم کی طرح اس کی قسمت میں بھی کامیابی نہیں تھی۔ اس فلم کی عبرت ناک ناکامی کے بعد سلمان کا مستقبل بھی ہمیشہ کے لیے گمنامی کے اندھیرے میں گم ہوگیا۔ اپنی آخری فلم کی ناکامی کے بعد رنگیلا گیارہ سال تک زندہ رہا لیکن اس مدت میں کوئی فلم نہ بناسکا جب کہ اپنی موت سے پانچ سال پہلے بطور اداکار بھی کسی فلم میں کام نہیں کیا۔

اس ضمن میں یہ بات بتانے سے رہ گئی تھی کہ 1972ء میں رنگیلا کی دو فلمیں ''میری محبت تیرے حوالے'' اور ''دور رنگیلے'' ریلیز ہوئیں جب کہ 1973ء میں ''کبڑا عاشق'' 1974ء میں ''صبح کا تارا'' نمائش پذیر ہوئیں۔

ہنس دیتا اور شاٹ دوبارہ ری ٹیک کرایا جاتا تھا۔ کبھی دوسرا اپنی جانب سے اسی انداز میں جواب دے کر اس فی البدیہہ مکالمے کی لاج رکھ لیتا۔

"منور ظریف اکثر کیمرا اسٹارٹ ہونے سے پہلے ہی مجھے ہنسا دیا کرتا تھا۔" وہ اس کی یاد تازہ کرتے ہوئے کہتا تھا۔ "مجھے میری زندگی میں سب سے زیادہ منور ظریف نے ہنسایا۔ جو لوگوں کو ہنساتا ہے، خود اسے بھی ہنسنے کی ضرورت پڑتی ہے اور میری یہ ضرورت میرا یار پوری کیا کرتا تھا اسے دیکھ کر ہی میری طبیعت خوش ہو جاتی تھی۔"

اپنی یادوں کی راکھ کریدتے ہوئے وہ ایک اور ساتھی اداکار کا بھی تذکرہ کرتا تھا۔ "یہ ان دنوں کی بات ہے جب اپنے وقت کے لیجنڈ ڈائریکٹر ایم جے رانا صاحب نے مجھے اپنی فلم "چنّی" میں چانس دیا تھا۔ اس فلم میں اس دور کے سپر کامیڈین نذر کے ساتھ مجھے کام کرنا تھا۔ کام کیا تھا۔ کئی ایکسٹرا اداکاروں کے ساتھ مجھے شریک کیا گیا تھا۔ کیمرا اسٹارٹ ہوا تو میں جوش جذبات میں بتائی گئی ساری باتیں بھول گیا۔ مجھ سے جس حد تک رہنے کو کہا گیا تھا اور جس ایکشن کی ہدایت دی گئی تھی۔ سب فراموش کر کے ایکٹنگ کرتے ہوئے نذر کے سامنے آ گیا جس پر ہدایت کار کو سین کٹ کروانا پڑا۔ مجھے اسسٹنٹ ڈائریکٹروں نے سمجھایا، بلکہ دھمکایا کہ خبردار۔ ہماری بتائی ہوئی جگہ سے ایک انچ بھی آگے نہ جانا۔ جس اداکاری کے لیے تم کو بتایا گیا ہے اس کے علاوہ تمہیں اور کچھ نہیں کرنا ہے لیکن میں کیا عرض کروں کہ اس وقت مجھ پر کیا کیفیت طاری تھی۔ ساری باتیں سن کر ہاں ہاں تو کرتا لیکن کیمرا اسٹارٹ ہوتے ہی سب باتیں بھول جاتا اور سارے حدود و قیود توڑ کر اداکاری کرتے ہوئے نذر کے قریب پہنچ جاتا۔ غالباً میں لاشعوری طور پر اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ ساتھی ایکسٹراؤں سے بڑھ کر اپنی اداکارانہ صلاحیت کا مظاہرہ کروں۔ ظاہر ہے میری اس حرکت پر سین دوبارہ کٹ کروانا پڑتا۔ کئی بار سین ری ٹیک ہوا تو نذر کا پارہ چڑھ گیا اور وہ غصے میں چیخنے لگا۔ پروڈکشن کنٹرولر کو مخاطب کر کے اس نے کہا۔ "تم کس جنگلی کو پکڑ کر اداکاری کرانے لائے ہو؟ اسے اٹھا کر اسٹوڈیو سے باہر پھینک آؤ۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ بار بار سین ری ٹیک کراؤں۔"

اس کی یہ متکبرانہ بات مجھے بری لگی تھی لیکن میں نے انتہائی صبر و ضبط سے کام لیا تھا کیونکہ اس وقت میں ایک ایکسٹرا تھا جس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "قدرت کو بھی شاید نذر کا یہ رویہ اچھا نہیں لگا تھا۔ عزت شہرت مقبولیت اور دولت آنی جانی چیزیں ہیں۔ ان کی وجہ سے جب کوئی اپنا توازن برقرار نہیں رکھتا تو اس کا حشر نذر کی طرح ہوتا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کا ڈاؤن فال شروع ہو گیا اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب وہ فلمی منظر نامے سے فیڈ آؤٹ ہو گیا۔ جب کہ وہ جنگلی اور گنوار ایکسٹرا اداکار ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا فلم انڈسٹری میں شہنشاہ ظرافت بن گیا۔"

رنگیلا کو بطور ایکسٹرا اداکار اور دو انٹری کے کرداروں سے نکال کر نسبتاً بہتر رول میں پیش کرنے کا سہرا شباب کیرانوی کے سر ہے۔ شباب صاحب جوہر شناس تھے۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس اول جلول سے لڑکے میں بڑی اداکارانہ صلاحیتیں ہیں لہٰذا انہوں نے اپنی فلم گل بدن، ثریا اور سپیرن وغیرہ میں کچھ بہتر کرداروں میں اسے پیش کیا۔ یہ ظریف، نذر، آصف جاہ جیسے مستند اور مانے ہوئے مزاحیہ اداکاروں کا دور تھا جب کہ 1956ء سے لہری بھی میدان میں آ چکے تھے۔ دوسری طرف ہم عصر کامیڈینز میں علی اعجاز، ننھا، منور ظریف اور زلفی سے بھی مقابلہ تھا لیکن تمام باتوں کے باوجود رنگیلا اپنے لیے راستہ ہموار کرتا چلا گیا اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب وہ ہر اردو اور پنجابی فلم کی ضرورت بن گیا۔ اس نے برصغیر کے ایسے واحد فنکار کے طور پر اپنی شناخت کروائی جس کا صرف چہرہ اسکرین پر نمودار ہوتا اور شائقین پر ہنسی کا دورہ پڑ جاتا۔ وہ واحد فنکار تھا جو اپنی ذات پر خود تنقید، طنز اور جملے لگوا کر لوگوں کے لیے ہنسنے ہنسانے کا سامان پیدا کرتا تھا۔ یہ خوبی برصغیر کے جملہ فنکاروں میں کسی میں نہ تھی۔

رنگیلا کے فن کی کئی جہتیں تھیں۔ کئی رنگ تھے۔ اس نے نہ صرف کامیڈی بلکہ درجنوں فلموں میں المیہ کردار نگاری میں بھی خود کو منوایا۔ جن لوگوں نے اس کی فلمیں رنگیلا، میری زندگی ہے نغمہ، ایماندار، بے ایمان، دو رنگیلے، بانو رانی اور امانت دیکھی ہیں وہ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ رنگیلا میں جذباتی مناظر میں ناظرین کو جکڑنے کی بھرپور صلاحیت موجود تھی۔ "میری زندگی ہے نغمہ" میں کیریکٹر کے روپ میں اس نے وہ اداکاری کی کہ شائقین کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔

رنگیلا کی شخصیت سے ایسے بے شمار گیتوں کی یادیں وا

"میری محبت تیرے حوالے" قطعی ناکام ثابت ہوئی کیونکہ اس کی کاسٹ بی کلاس تھی۔ رنگیلا نے غالباً اس خیال سے ایسا کیا تھا کہ اس کے نام کے سہارے فلم چل جائے گی۔ "دو رنگیلے" اس کی پہلی پنجابی فلم تھی جس میں اس نے ڈبل رول کیا تھا جب کہ اس نے خود اس کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ اس فلم نے اچھی خاصی کامیابی حاصل کی تھی۔

"کبڑا عاشق" اور "صبح کا تارا" بری طرح ناکام ہوئیں۔ "کبڑا عاشق" کی ناکامی نے رنگیلا کی مالی طور پر کمر توڑ دی۔ اس کے اگلے سال "صبح کا تارا" بھی کامیاب نہ ہوسکی۔

رنگیلا کا عروج اس کی اپنی فلم "دیا اور طوفان" سے ہوا تھا جب کہ اس کا زوال بھی اس کی اپنی ہی فلم "کبڑا عاشق" سے ہوا۔ اس کی اپنی زندگی سے ملتی جلتی کہانیوں پر مبنی کئی فلمیں کامیاب ہوئیں جن میں اس کے کلیدی کردار تھے تو اسے خیال آیا کہ کیوں نہ میں شہرہ آفاق فلم، ہنچ بیک آف نوٹرے ڈیم کو اپنے طور اردو زبان میں بناؤں۔ اس فلم کا ہیرو عالمی شہرت یافتہ اداکار انتھونی کوئن تھا۔ یہ بھی ایک کبڑے عاشق کی کہانی تھی مگر اس کی کہانی اور ہدایت کاری کے علاوہ انتھونی کوئن کی اداکاری کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس فلم کا شمار عالمی کلاسکی فلموں میں ہوتا ہے۔ اس فلم پر اردو میں فلم بنانا اور وہ بھی پاکستان میں! زبردست غلطی تھی۔ جو کہانی "کبڑا عاشق" کے لیے لکھوائی گئی وہ نہ "ہنچ بیک آف نوٹرے ڈیم" کے معیار کی تھی نہ اس کی ہدایت کاری، اسکرین پلے اور اداکاری اس پائے کی تھیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رنگیلا نے اس کی تیاری میں اپنی استطاعت سے بڑھ کر محنت کی تھی۔ سرمایہ بھی دل کھول کر خرچ کیا تھا۔ اس کے باوجود اسے اپنی توقعات کے مطابق کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ بات دراصل یہ تھی کہ فلم بننے سے پہلے ہی یہ بات عام ہوگئی تھی کہ "کبڑا عاشق" ہنچ بیک آف نوٹرے ڈیم کا تصور لے کر بنائی گئی تھی ایسی فلم اسی وقت کامیاب ہوتی ہے جب وہ پہلی سے بہتر ہو۔ "کبڑا عاشق" دیکھ کر تماشائیوں کے خیال کو دھچکا لگا۔ ان کے تصور پر کبڑا عاشق پوری نہیں اتری۔ اگرچہ سچی بات یہ ہے کہ "کبڑا عاشق" کوئی بری فلم نہیں تھی۔ اگر اس پر ہنچ بیک آف نوٹرے ڈیم کا سایہ نہ ہوتا تو یہ فلم ایسی نہیں تھی کہ تماشائی اسے مسترد کردیتے۔ تماشائیوں کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ بڑی "ظالم مخلوق" ہوتی ہے۔ اپنے موڈ مزاج کے برخلاف کچھ برداشت نہیں کرتی۔ یہی رنگیلا تھا جسے انہوں نے کوئی دو درجن فلموں میں بطور ہیرو پسند کیا تھا۔ یہی رنگیلا تھا جس کی فلموں کو بار بار دیکھ کر اسے کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرتے تھے جب کہ یہی رنگیلا تھا جسے "کبڑا عاشق" بنا دیکھ کر انہوں نے اپنی انتہائی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ نہ صرف اس فلم کی وجہ سے رنگیلا کو مسترد کردیا بلکہ اس فلم کو بھی قابل دید نہیں سمجھا۔ جب کہ رنگیلا کو اس بات کی توقع تھی کہ جو تماشائی اس سے کمتر کرداروں میں اسے بطور ہیرو پسند کرتے رہے ہیں وہ "کبڑا عاشق" کے کردار میں اسے کہیں زیادہ پسند کریں گے۔ شاید وہ ایسا ہی کرتے اگر یہ فلم ہنچ بیک آف نوٹرے ڈیم کی ری میک نہ ہوتی۔ جس وقت رنگیلا نے "کبڑا عاشق" بنائی تھی اس وقت کئی فلموں کی کامیابی کے بعد اسے اپنے آپ پر کچھ زیادہ ہی اعتماد پیدا ہوگیا تھا۔ ویسے تو اس کی پرانی عادت تھی کہ وہ مناسب کی مگر کرتا وہی تھا جو اس کا دل چاہتا تھا۔ جب اسے اوپر پے در پے کامیابیاں نصیب ہوئیں تو اس کا اپنے آپ پر بھروسا زیادہ پختہ ہوتا گیا۔ اب وہ اپنی سوچی ہوئی باتوں کو صد فیصد درست سمجھنے لگا تھا۔ بس یہیں سے اس کی خرابی کی ابتدا ہوگئی تھی۔ انسانی فطرت ہے کہ جب اسے ہر قدم پر کامیابی نصیب ہو تو اپنے بارے میں کچھ خوش فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ رنگیلا اگرچہ اپنی ہر کامیابی کو اللہ کی دین سمجھتا تھا اور اس کا اظہار بھی کرتا تھا۔ اس کی حد سے زیادہ خوداعتمادی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ کسی قدر ڈس بیلنس ہوگیا تھا۔ جس کے نتیجے میں ٹھوکر کھا کر گرنا اس کا مقدر بن گیا۔

ابتداء میں تو وہ دوسروں کی باتیں سن لیتا تھا۔ بے شک ان پر عمل کم ہی کرتا تھا لیکن جب کامیابیوں کا تاج اس کے سر پر سج گیا تو کسی کی بات کسی کا مشورہ سننا بھی اسے گوارا نہ ہوتا تھا۔ جو لوگ اس کی بہتری کے لیے اسے مخلصانہ مشورہ دینا چاہتے تھے انہیں سننا پسند نہیں کرتا تھا۔ جب اس نے "کبڑا عاشق" بنانے کا فیصلہ کیا تھا اس وقت بھی فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے اس کے کچھ بہی خواہوں نے اور میڈیا کے کچھ لوگوں نے اس فیصلے پر نظرثانی کا اسے مشورہ دیا تھا اور کہا تھا۔ "یہ بہت رسکی گیم ہے۔ کسی بہت بڑی فلم کی ری میک بنا کر کامیابی حاصل کرنا بڑا غیر یقینی کام ہے۔ رنگیلا کو اتنا بڑا رسک لینے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ وہ ایک خطرناک کھیل کھیلنے جا رہا ہے۔"

مگر رنگیلے نے ایسی باتوں اور مشوروں کا کوئی نوٹس

نہیں لیا کیونکہ اس نے دوسروں کی باتوں پر غور وفکر کرنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اس نے ایسے مخلصانہ مشوروں کو بھی اپنے خلاف سازش سمجھا۔ "یہ سب مجھے مس گائیڈ کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ نہیں چاہتے کہ مجھے ایک بڑی کامیابی ملے۔"

اسے اپنی سوچ فکر اور صلاحیتوں کے علاوہ اپنے سرمائے پر بھی بہت زیادہ بھروسا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی بساط سے بڑھ کر اس فلم پر محنت کی اور دل کھول کر خرچ کیا کہ کوئی کمی نہ رہ جائے۔

اس فلم کی تکمیل سے پہلے اور تکمیل کے بعد کئی تقسیم کاروں نے اس فلم کے حقوق حاصل کرنے کی کوشش کی تو رنگیلا نے نیا حربہ استعمال کیا۔ بہت بڑی رقم کا مطالبہ کر دیا جسے ماننا تقسیم کاروں کے بس کی بات نہیں تھی۔ دراصل وہ اپنی یہ بڑی فلم بھی خود ہی ریلیز کر کے اس کا بڑا فائدہ بھی خود ہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شاید اسے کامل یقین تھا کہ اس کی یہ فلم بھی سپر ہٹ ہوگی اور دولت کے انبار لگا دے گی مگر اس کی سوچ کے برعکس وہی ہوا جس کا فلمی دانشوروں نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ تماشائیوں نے یہ فلم یکسر رجیکٹ کر دی کیونکہ "کبڑا عاشق" کسی طرح بھی ہنچ بیک آف نوٹرے ڈیم سے بہتر فلم نہیں تھی۔

اس کی دو بڑی غلطیوں کی وجہ سے اس فلم پر لگایا ہوا کثیر سرمایہ ڈوب گیا۔ پہلی غلطی ایسی فلم بنانے کی، دوسری غلطی اس کی نمائش کے حقوق فروخت نہ کرنے کی۔ اگر وہ تقسیم کاروں سے سودا کر لیتا تو کچھ رقم کی واپسی تو ہو جاتی لیکن اسے ڈوبنے والے سرمائے کا دکھ اتنا نہیں تھا جتنا اپنی ساکھ کے متاثر ہونے کا افسوس تھا۔ اب بھی اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی جب کہ مختلف ذرائع سے کمانے کے راستے بھی کھلے ہوئے تھے لیکن اس کی ساکھ پر جو داغ لگ گیا تھا اس نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے لیے حقیقتاً یہ بہت بڑی ناکامی تھی۔ وہ جو ہر مقابلے میں مرد میدان ثابت ہوتا تھا اس کی بہت بڑی فلم سپر فلاپ ہو گئی تھی۔ یہی اس کی فنی زندگی کا ایک ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ یہیں سے اس کے انحطاط کا دور شروع ہوا۔ اگرچہ اس نے نئے عزم اور نئے ارادے سے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کی کوشش کی لیکن اسے پہلے جیسا عروج پھر کبھی حاصل نہ ہوا۔

اپنے آخری ایام میں جب وہ زیادہ تر بیمار رہتا تھا۔ تیمارداروں اور ملنے والوں سے گزرے دنوں کی باتیں کر کے دل بہلایا کرتا تھا۔ انہی دنوں کی بات ہے۔ ایک بار "کبڑا عاشق" کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ "میرا خیال ہے ان دنوں میرے اندر غرور اور فخر کا کچھ عنصر بھی داخل ہو گیا تھا۔ میں جو کسی کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں اپنے آپ کو بہت کچھ اور دوسروں کو کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ پتا نہیں آپ اس بات کو کیا معنی دیں مگر میرا ذاتی خیال ہے کہ اس میں صریحاً غرور کا عنصر تھا اور میرے اللہ کو یہ بات کسی طرح بھی پسند نہیں کہ اگر اس نے کسی کو کوئی خوبی کوئی بڑائی کوئی عزت عطا کی ہے تو اس پر وہ اکڑتا پھرے۔ اپنے رب

سعادت حسن منٹو

(1913ء-1955ء)

اردو افسانہ نگار۔ سمرالہ ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امرتسر میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان پاس کر کے علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے لیکن تعلیم ادھوری چھوڑ کر امرتسر واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ بعد لاہور کے رسالوں میں کام کیا پھر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک ہو گئے۔ بعد ازاں بمبئی میں متعدد فلمی رسالوں کی ادارت کی اور فلمی کہانیاں لکھیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بمبئی کا ماحول بہت راس آیا۔ چنانچہ ان کے بیشتر نمائندہ افسانے اسی دور کی تخلیق ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور چلے آئے اور یہیں انتقال کیا۔ منٹو کے افسانوں مثلاً "ٹھنڈا گوشت"، "کھول دو" پر حکومت نے فحش نگاری کے جرم میں مقدمے چلائے۔ پہلی کہانی "تماشا" ہے اور آخری "کبوتر کبوتری"۔ تصانیف میں منٹو کے افسانے، گنجے فرشتے، یزید، نمرود کی خدائی، خالی بوتلیں خالی ڈبے، سڑک کے کنارے، بادشاہت کا خاتمہ، سرکنڈوں کے پیچھے، منٹو کے مضامین، جنازے، کروٹ نور جہاں سرور جہاں، منٹو کے ڈرامے لذت سنگ، ٹھنڈا گوشت، سیاہ حاشیے، تلخ ترش شیریں، اوپر نیچے اور درمیان، پھندنے، کالی شلوار، شکاری عورتیں، آؤ، تین عورتیں، لاؤڈ اسپیکر، بغیر عنوان کے، ایک مرد، سرگزشت اسیر (ترجمہ)، گورکی کے افسانے (ترجمہ) وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

مرسلہ: محمد وہاب الدین انصاری۔ پاک پتن

جبوتی Djibouti

افریقا کے شمال مشرقی ساحل پر ایک چھوٹی سی جمہوریہ سابق نام فرانسسی افارس و اساس۔ اس کے شمال مغرب میں اری ٹیریا جنوب میں صومالیہ، مغرب اور شمال مغرب میں ایتھوپیا ہے۔ رقبہ 9,000 مربع میل یا 23310 مربع کلومیٹر۔ دارالحکومت جبوتی جو ایک آزاد بندرگاہ ہے اور ایتھوپیا کے دارالحکومت ادیس ابابا سے بذریعہ ریل (488 میل لمبی) ملی ہوئی ہے۔ ایتھوپیا کا ایک تہائی مال یہیں سے دساور جاتا ہے۔ ملک کی نصف آبادی دارالحکومت میں رہتی ہے۔ بقیہ نصف خانہ بدوش ہے۔ یہاں کی زبان، فرانسیسی، قبائلی بولیاں اور عربی ہے۔ مذہب اسلام (94 فیصد) بقیہ مسیحی اور مظاہر پرستی پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ جبوتی افریقا کا مختصر ترین اور غریب ترین ملک ہے لیکن جغرافیائی محل وقوع کے سبب بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ بیشتر علاقہ گرم خشک صحرا ہے۔ پیداوار برائے نام ہے۔ معدنیات بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ شہر کے عوام بندرگاہ پر محنت مزدوری یا چھوٹی موٹی تجارت کرتے ہیں۔ آبادی کا خاصا حصہ پڑوسی ملکوں کے کارخانوں میں کام کرتا ہے۔ یہ علاقہ 1886ء میں فرانس کے زیر تسلط آیا۔ اس وقت یہاں دو بڑے قبائل افار اور اسایا آباد تھے۔ چنانچہ فرانسیسیوں نے اسے افارس و

کا شکر بجالانے کی بجائے اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر اور افضل ظاہر کرے۔“

رنگیلا ایک جینئس فنکار ہی نہیں ایک حقیقت پسند انسان بھی تھا۔ اپنی اچھائیوں کے علاوہ اپنی برائیوں کا بھی اسے احساس تھا۔ اس لیے اس نے خود محسوس کرلیا تھا کہ اس میں غیر محسوس طور پر غرور و فخر کا بھی کچھ عنصر داخل ہو گیا تھا اور اس کے نتیجے ہی کے طور پر اس پر آہستہ آہستہ زوال کے بادل چھانے لگے۔ وہ یادِ ماضی بنتا چلا گیا۔ اس کی اہمیت اور افادیت دھیرے دھیرے ختم ہوتی گئی۔ فلمساز اور ہدایت کار ہی کی حیثیت سے نہیں، کامیڈی آرٹسٹ کے طور پر بھی اس کی مانگ کم ہوتی گئی۔ تماشائیوں کی طرح فلم والے بھی اس سے بے تعلق ہوتے چلے گئے لیکن ایسا اس وقت ہوا جب وہ اپنی بھرپور اننگز مکمل کر چکا تھا۔ اس وقت تک وہ بہت کچھ کر چکا تھا۔ اپنے لیے، اپنے بال بچوں کے لیے جو کچھ اسے خاندان کے سربراہ، فرض شناس شوہر اور ذمّہ دار باپ کی حیثیت سے کرنا چاہیے تھا۔ احسن طریقے پر اپنے فرائض انجام دے چکا تھا۔

اس سے پہلے کہ رنگیلا کے آخری ایام کا ذکر کروں اس کی گلوکاری کے بارے میں بھی بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ رنگیلا نے فلموں کے لیے پلے بیک سنگر کے طور پر گانے بھی گائے جن میں بہت سے مقبول بھی ہوئے۔ جو آج بھی شوق سے سنے جاتے ہیں۔ اس نے 21 فلموں میں 30 گانے گائے۔ جن میں دو فلمیں ایسی بھی ہیں جو ریلیز نہ ہو سکیں مگر دونوں فلموں کے گانے مقبول ہوئے۔ ان میں ایک فلم ”بہروپیا“ تھی جب کہ دوسری فلم ”انجانا“ تھی۔ بہروپیا 1970ء میں شروع ہوئی تھی لیکن بوجوہ مکمل نہ ہو سکی۔ اس فلم میں رنگیلا کے گائے ہوئے گیت کے بول تھے۔

چل بھاگ یہاں سے ساتھی، یہ دنیا تیری قاتل ہے

مرنا ہے آسان یہاں پر جینا لیکن مشکل ہے

فلم ”انجانا“ کا گانا رنگیلا نے گلوکارہ نیرہ نور کے ساتھ ریکارڈ کروایا تھا۔ اس کے بول تھے۔

زمانے کی دولت سے کیا کام مجھ کو

میرا پیار موتی مرا پیار ہیرا

رنگیلا کی کامیاب پنجابی فلم ”دو رنگیلے“ کا موسیقار وہ خود تھا جب کہ ”عورت راج“ کا نغمہ ”اپنے آنسوؤں میں“ رنگیلا نے لکھا بھی خود ہی تھا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ رنگیلا

اساس کے نام سے موسوم کیا۔ اسا یا عیسی قبیلے کے بیشتر لوگ مسلمان ہیں اور آبادی میں انہی کی اکثریت ہے۔ فرانسیسیوں نے مظاہر پرست افار کی سرپرستی کی جن کی اکثریت نے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا۔ دونوں قبائل عرصے تک باہم متحارب رہے ہیں۔ 1967ء میں فرانسیسیوں نے یہاں ریفرنڈم کرایا جس میں عوام کی اکثریت نے فرانس کے زیر تسلط رہنے کو ترجیح دی لیکن افریقن ممالک نے اسے نمائشی قرار دے کر مسترد کردیا بالآخر 27 جون 1977ء کو فرانس نے اسے آزاد کردیا اور بندرگاہ کے نام پر پورے ملک کا نام جمہوریہ جبوتی رکھا گیا۔ ایتھوپیا اور صومالیہ اس علاقے پر اپنا حق جتاتے ہیں اور ان کے ممکنہ حملے کے پیش نظر یہاں فرانس کا ایک طاقت ور ہوائی بیڑا اور پانچ ہزار فوج متعین ہے۔ حسن گولڈ اپٹی ڈان اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ انہیں جون 1981ء میں دوبارہ صدر منتخب کرلیا گیا۔ 1984ء میں فرانس نے اسے 2.10 ملین ڈالر کی فوجی امداد اور 1988ء میں بجٹ کو سہارا دینے کے لیے 45 ملین فرانک کی امداد دی۔ 4 ستمبر 1992ء کو ریفرنڈم کے ذریعے کثیر الجماعتی آئین کی منظوری دی۔ 7 مئی 1993ء کو صدارتی انتخابات ہوئے جن میں صدر اپٹی ڈان کو اگلے چھ سال کے لیے ملک کا صدر منتخب کرلیا گیا ہے۔

مرسلہ: نصیر الدین۔ حاصل پور

کے گائے ہوئے 90 فیصد گانے مقبول ہوئے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک کامیاب گلوکار تھا۔ اس کی آواز مکیش سے ملتی جلتی تھی۔

گلوکاری کا خیال اس کے دل میں کراچی کی ایک فلم ''عورت اور زمانہ'' دیکھ کر آیا جو 1967ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم میں ایک نیا اداکار رنگیلا کراچی والا کے نام سے متعارف کرایا گیا تھا جو گلوکار بھی تھا۔ ''عورت اور زمانہ'' میں اس کا گایا ہوا ایک گانا

ناچ کے دکھا گوری، تیرے فن کی بڑی دھوم ہے

اس پر پکچرائز بھی ہوا تھا۔ اس فلم کی نمائش کے بعد موسیقار حسن لطیف نے رنگیلا کو مشورہ دیا کہ وہ بھی گلوکاری شروع کردے۔ اس نے کہا ''میں تمہارا گانا کمپوز کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

رنگیلا نے مذاق مذاق میں ہاں کہہ دی۔ یوں 1968ء میں فلم ''میں زندہ ہوں'' کے اس گانے نے جنم لیا اور رنگیلا اداکار سے گلوکار بن گیا۔ مالا نے اس گانے میں اس کا ساتھ دیا تھا گانے کے بول تھے

چھٹی ہے چھٹی چھٹی چھٹی بیری
بیری اکھیوں کی ندیا اڑ گئی

1968ء میں رنگیلا نے جب اپنی فلم ''دیا اور طوفان'' بنائی تو اس نے دو گانے اپنی آواز میں ریکارڈ کروائے۔

گا میرے منوا گاتا جارے
جانا ہے ہم کا دور

☆

سنورے دل والو کنوارے مر جانا
مگر ان حسینوں سے دل نہ لگانا

اس گانے میں اس کی ساتھی گلوکارہ نسیم بیگم تھی۔ بطور گلوکار 1970ء میں رنگیلا کی دو فلمیں ''انسان اور آدمی'' اور ''رنگیلا'' ریلیز ہوئیں۔ اس سال ایک پنجابی فلم ''کچھی'' کے لیے بھی اس نے ایک گیت اپنی آواز میں ریکارڈ کروایا۔ منور ظریف نے اس گانے میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ ''انسان اور آدمی'' کے بول تھے۔

ہم نے تم سے پیار کیا ہے
الفت کا اقرار کیا ہے

یہ گانا طلعت حسین پر فلم بند ہوا تھا۔ فلم ''رنگیلا'' میں اس نے دو گانے گائے تھے۔

ہم نے جو دیکھے خواب سہانے
آج ان کی تعبیر ملی

☆

چھیڑ کوئی سرگم آوارگی سارے گاما پا دھانی سا
اس گانے میں منور ظریف نے اپنی آواز کی سنگت دی تھی۔

1971ء میں رنگیلا نے جن فلموں میں اپنی آواز کا جادو جگایا وہ "مسٹر 303" اور "دل اور دنیا" تھیں۔
مسٹر 303 کے گانے کے بول تھے۔

اک ٹیڈی پیسا مانگے رنگیلا فقیر
تیرے بچوں کی خیر چھوٹے بچوں کی خیر

"دل اور دنیا" گلوکاری کے لحاظ سے رنگیلا کی ساتویں فلم تھی۔ اس فلم میں اس نے تین سولو نغمات گائے تھے۔

چل میرے ہمراہی یوں نہ ٹھمک ٹھمک دھر پاؤں
ارے چل رے چھیلوا سجنیا کے گاؤں

☆

بتا اے دنیا والے یہ کیسی تیری بستی ہے
کہیں ہے غم اور کہیں خوشی اور کہیں پہ فاقہ مستی ہے

☆

میری وفاؤں کا یہی صلہ دیا
اچھا کیا تم نے میرے پیار کو بھلا دیا

1972ء میں رنگیلا کی ایک پنجابی اور تین اردو فلمیں نمائش پذیر ہوئیں پنجابی فلم "دو رنگیلے" میں اس نے تین گانے گائے جن کے بول ہیں

سن میرے ککو سن میرے پپو

☆

مٹ گئے اج میرے دل دے تار

☆

لوگو وے لوگو اس منڈے نو روکو

اس گانے میں رنگیلا کی ساتھی گلوکارہ مادام نور جہاں تھیں اور فلم "میری محبت تیرے حوالے" کا ایک سپرہٹ نغمہ جسے نسیم بیگم نے رنگیلا کے ہمراہ گایا تھا اس کے بول تھے

میرا پیار بھرا سنسار لٹا منزل پر لا کر چھوڑ دیا
قسمت یہ بتا میری کیا ہے خطا

اس فلم کا دوسرا گیت "نگاہوں سے دل میں چلے آؤ" رنگیلا نے مالا کے ساتھ مل کر ریکارڈ کرایا تھا۔ اس سال کی دوسری اردو فلم "میری زندگی ہے نغمہ" میں بھی رنگیلے نے دو سولو گیت گائے تھے۔

یہاں قدر کیا دل کی ہو گی
یہ دنیا ہے شیشہ گروں کی

☆

تیرا کسی پہ آئے دل تیرا کوئی دکھائے دل
تو بھی کلیجہ تھام کر مجھ سے کہے کہ ہائے دل

اس فلم کے ان دو گانوں کے علاوہ رنگیلا نے یہ شعر بھی اپنی آواز میں گنگنایا تھا جو اول الذکر نغمہ سے پہلے فلم میں شامل کیا گیا تھا۔

جوڑنے کے قابل بھی دل برباد نہیں ہے
ٹکڑے کہاں گرے ہمیں کچھ یاد نہیں ہے

اس سال کی تیسری اردو فلم "میں بھی تو انسان ہوں" تھی۔ جو رنگیلا کی گلوکاری کے حوالے سے تیرھویں فلم تھی۔ اس نے اس فلم میں تین سولو گیت گائے تھے۔

میرا محبوب مرے پیار کا قاتل نکلا
آرزوؤں کا جنازہ سر محفل نکلا

☆

میں گلیوں کا راجا
میرے ساتھی میرے نغمے اور یہ ٹوٹا باجا

☆

کیا ملا ظالم تجھے کیوں دل کے ٹکڑے کر دیئے
رنگ محفل دیکھ کر محفل کے ٹکڑے کر دیئے

اگلے سال 1973ء میں رنگیلا نے بطور گلوکار دو فلموں کے لیے گلوکاری کی۔ یہ فلمیں "مسٹر بدھو" اور "انسان اور گدھا" تھیں۔

"مسٹر بدھو"۔ اس دنیا میں پیار نہ کرنا جیتے جی مر جاؤ گے۔

انسان اور گدھا۔

میں تے ماراں گا دولتیاں سنسار نوں
ایتھے لوکی ترس دے نے پیار نوں

1974ء میں رنگیلا نے دو فلموں میں گلوکاری کی۔ دونوں اردو فلمیں تھیں پہلی کا نام "صبح کا تارا" جب کہ دوسری کا نام "پردہ نہ اٹھاؤ" تھا۔ صبح کا تارا کا دوگانا اس نے نیرہ نور کے ساتھ گایا تھا۔ گیت کے بول تھے

نہ رو بہنا مری مسکرا
اپنے آنسو مری آنکھوں میں ڈال دے

"پردہ نہ اٹھاؤ" میں رنگیلا نے بیک وقت تین کردار بیٹا، باپ اور دادا کے ادا کیے تھے۔ اس فلم میں اس نے احمد رشدی اور روبینہ بدر کے ہمراہ یہ گانا گایا تھا۔

دادا جی اپنے پوتے کو سمجھاؤ
دادا جی اس کی باتوں میں نہ آؤ

یہ رنگیلا کا گایا ہوا پچیسواں گانا تھا۔ اس گانے کے بعد پانچ سال کا وقفہ آ گیا جس میں اس نے کوئی گانا نہیں گایا۔ 1979ء میں رنگیلا کی کامیاب فلم "عورت راج" منظر عام پر آئی۔ اس کے لیے اس نے دو گانے گائے۔ پہلا گانا قوالی کی شکل میں تھا جس کے بول تھے

یہ نیا دور ہے عورت کی حکومت ہو گی

اس قوالی میں رنگیلا کے ساتھ شمسہ کنول، نسرین کوثر، حمیدی، روشن، ترنم ناز، البیلا اور اے نیر کی آوازیں شامل تھیں۔ جب کہ اس فلم کا دوسرا گانا رانی پر فلمایا گیا تھا۔ یہ واحد مردانہ گانا تھا جو کسی خاتون اداکارہ پر فلم بند ہوا تھا گانے کے بول تھے

اپنی سانسوں میں بسا لو تو عنایت ہو گی
ورنہ پروانے کو اے شمع شکایت ہو گی

"عورت راج" کے 8 سال بعد 1987ء میں رنگیلا کی آواز فلم "ہمت والا" میں سنائی دی۔ اس فلم میں رنگیلا نے مشہور پاپ سنگر حدیقہ کیانی کے ساتھ ایک کورس گیت میں حصہ لیا۔ جس کے بول تھے

تندانا تندانا تیرے لیے بے چین کتنا
آج دل دیوانہ وش ملے

اس فلم کے بعد ایک بار پھر درمیان میں 8 سال کا گیپ آیا اور 1994ء میں اس کی بطور گلوکار اس کی آخری ذاتی فلم "خوب صورت شیطان" ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں اس کا گایا ہوا گیت اس کے بیٹے پر پکچرائز ہوا جو اس فلم کا ہیرو تھا۔ گیت کے بول تھے۔

میرا چین چرا کر لے گئیں
تری رنگ برنگی چوڑیاں

رنگیلا نے متذکرہ تمام گیت 8 موسیقاروں کمال احمد، ایم اشرف، نثار بزمی، حسن لطیف، ناشاد، جی اے چشتی، تصدق حسین، چندر موہن، بخشی رام کی کمپوز کی ہوئی دھنوں میں گائے جب کہ "دو رنگیلے" کا وہ خود موسیقار تھا۔

جب رنگیلا اپنی ریٹائرمنٹ لائف گزار رہا تھا تب وہ اپنے سارے کام نمٹا چکا تھا۔ اس کے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں تھا۔ تب اس نے ایک نیا کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ جان بوجھ کر دوسروں کے ہاتھوں لٹنا شروع کر دیا تھا۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

ایک صاحب نے رنگیلا سے اس کے ایک پلاٹ کا سودا کیا۔ ایک علاقے میں اس کے دو پلاٹ تھے۔ ایک فرنٹ رخ پر دوسرا اس سے کچھ فاصلے پر پچھلے حصے میں۔ دونوں کی قیمت میں 30 لاکھ کا فرق تھا جس بندے نے ان میں سے ایک کا سودا کیا اس نے پچھلے پلاٹ کے پیسے دیئے جب کہ رنگیلا سے فرنٹ والے پلاٹ کے کاغذات پر دستخط کرالیے۔ وہ جان بوجھ کر اس چالاک آدمی کا شکار اس لیے بن گیا کہ اس کے لیے یہ احساس ہی بڑا اطمانیت بخش تھا کہ اگلا اس بات پر کس قدر خوش ہو رہا ہو گا کہ رنگیلے کو کس خوب صورتی سے بے وقوف بنا دیا۔ اس دور میں وہ ایسی ہی عیاشی کرتا تھا۔ دوسروں کی جائز ہی نہیں ناجائز خوشیوں کے لیے بھی قربانی کا بکرا بننے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔

اس کا ایک ڈرائیور تھا جو اس کی آنکھوں میں دھول جھونکتا تھا۔ رنگیلا مختلف فلم سازوں سے اپنے پیسے وصول کرنے کے لیے اس ڈرائیور کو بھیجتا تھا۔ وہ جو کچھ وصول کر کے لاتا اس میں سے کچھ دیتا کچھ خود رکھ لیتا۔ رکھتا کیا ریس کھیل کر ہار جاتا۔ رنگیلا کو جب پتا چلتا کہ اس نے سارے پیسے واپس نہیں کیے ہیں تو اس سے پوچھتا۔ "اور باقی پیسے کیا ہوئے؟"

"باقی پیسے؟ وہ تو میں نے خرچ کر دیے۔"

"کیوں خرچ کیے؟ وہ پیسے تو میرے تھے یا تیرے؟"

"آپ ہی کے تھے سر جی اور یہی سمجھ کر خرچ کیے کہ میں کون سا بھاگا جا رہا ہوں ادا کر دوں گا۔"

"کب ادا کرے گا؟"

"جس دن میرا گھوڑا مجھ پر مہربان ہو جائے گا۔"

رنگیلے نے گلبرگ میں ایک بڑی شاندار کوٹھی خریدی تھی۔ اس کی نگرانی کے لیے ایک شخص کو تنخواہ پر ملازم رکھا۔ چند مہینوں کے بعد اس نے رنگیلا سے اجازت لے کر اپنی فیملی کو بھی وہیں منتقل کر لیا۔ ایک طرف وہ باقاعدگی کے ساتھ رنگیلا سے تنخواہ وصول کرتا رہا دوسری طرف بڑی خاموشی کے ساتھ جعلی کاغذات تیار کروا کر خود اس بنگلے کا مالک بن بیٹھا جب رنگیلا کو اس کی اس حرکت کا پتا چلا تو اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی۔ مسکرا کر بس اتنا

کہا۔

"بے وقوف شخص ہے۔ مجھ سے کہتا تو میں خود اس کے نام لکھ دیتا۔"

دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے وہ بڑی آسانی سے ان کی سازشوں کا شکار بن جاتا تھا۔ اگلا یہی سمجھتا تھا کہ اسے بے وقوف بنا دیا۔ وہ بے وقوف بن کر اور دوسرے کو فائدہ پہنچا کر جی بھر کر خوش ہوتا تھا۔

رنگیلا نے زندگی بھر کام کیا تھا اور اپنے آپ کو مصروف رکھا تھا۔ اس کی انہی مصروفیات نے کامیابیاں بخشیں۔ ایسا شخص جس نے زندگی بھر مسلسل محنت کی، کام کیا، وہ بیکار ہو کر گھر بیٹھ گیا تو اس کا بیمار ہونا لازمی تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی صحت گرنے لگی اور وہ یکے بعد دیگرے کئی امراض میں مبتلا ہو گیا۔ ان میں ایک گردے کی بیماری بھی تھی۔ سال بھر اس کا علاج ہوتا رہا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ابتدا میں شیخ زید اسپتال میں اس کا علاج جاری رہا۔ پھر اشفاق اسپتال میں زیرِ علاج رہا۔ اس کے بعد اس دور کے وزیراعظم نواز شریف کی ہدایت پر شریف میڈیکل کمپلیکس میں اسے داخل کر دیا گیا۔ بیماری کے دوران یوں تو اس کے تمام عزیز و اقارب اور چاہنے والے دوستوں اور پرستاروں نے اپنی محبت کا ثبوت دیا لیکن اس کی بیٹی فرح دیبا اور مزاحیہ اداکار اظہر رنگیلا نے اس کی بڑی خدمت کی۔ اظہر رنگیلا، رنگیلا کو اپنا روحانی استاد سمجھتا تھا۔ رنگیلا بھی اسے اپنے بیٹوں سے کم تصور نہیں کرتا تھا۔ اس کے دیگر بچوں نے بھی اس کے علاج معالجے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

وہ فلم نگری جس کی ریت ہے کہ بڑے بڑے فنکاروں کے بھی آخری دنوں میں ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا، رنگیلا کی خوش نصیبی دیکھیے کہ اس کا حال احوال پوچھنے والے ہی نہیں اس کے علاج معالجے میں دلچسپی لینے والے متعدد لوگ تھے جن میں اہم سیاسی شخصیتیں بھی تھیں۔

اس کی آخری سالگرہ ٹی وی چینل جیو نے اسپتال ہی میں منائی تھی۔ اس سے پہلے کسی ٹی وی چینل نے کسی فنکار کو ٹریبوٹ پیش کرنے کے لیے ایسی کسی تقریب کا اہتمام نہیں کیا تھا جو لائف ٹیلی کاسٹ کیا گیا ہو جس میں اس کے ساتھی فنکار اور دیگر فلم والے پھولوں کے گلدستے اسے پیش کر کے مبارک باد پیش کرتے رہے۔ یہ اس کی زندگی کی آخری سالگرہ تھی۔ اس لیے کسی نے اس سے "تم سلامت رہو ہزار برس" جیسے کلمات نہیں کہے۔ دوسروں کے علاوہ خود اسے بھی علم تھا کہ زندگی کی شام ڈھل چکی ہے اور کسی وقت بھی کوچ کا وقت آ جائے گا۔ اس لیے ایسے دعائیہ کلمات لبوں تک آتے آتے لڑکھڑا جاتے تھے۔ اس دوران بڑے رقت آمیز مناظر سامنے آئے۔ کبھی مبارک باد پیش کرنے والے کی آواز گلوگیر ہو جاتی کبھی رنگیلا کی آنکھیں چھلک جاتیں مگر اگلے ہی لمحے وہ اپنے اصلی روپ میں واپس آ جاتا اور کوئی ایسا شگفتہ جملہ کہہ دیتا کہ روتے ہوئے لوگ مسکرا دیتے۔

بسترِ مرگ پر وہ بہت کم سنجیدہ نظر آتا تھا۔ اپنے تیمارداروں اور مزاج پرسی کرنے والوں کو اپنی چلبلی باتوں سے گدگداتا رہتا تھا۔

موت سے ایک ہفتہ پہلے رنگیلا کچھ کھانے پینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کے معدے میں نالی رکھ کر خوراک دینا شروع کر دی تھی جب کہ اس کے اہلِ خانہ سے دبے لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ "اب انہیں دواؤں سے زیادہ دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ موت کے قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔ موت سے ایک روز قبل کومے کی حالت میں چلا گیا اور پھر اگلے ہی دن 24 مئی 2005ء کی سہ پہر تین بجے زندگی کی بازی ہار گیا۔

ساری زندگی مداحوں کو ہنسانے والا اپنی جدائی سے سب کو رلا گیا۔ اس کی وفات پر جس طرح پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا نے کوریج کی اس کی مثال پاکستان کی فلمی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ اس کے عوامی فنکار ہونے کی واضح دلیل ہے۔ جن دنوں وہ بیمار تھا ان دنوں بھی میڈیا نے اسے اپنی خبروں میں نمایاں رکھا تھا۔ اخبارات اس کے بارے میں ایک ایک لمحہ کی رپورٹ دیتے رہے۔ چینلز پر اس کی بیماری کے حوالے سے خبریں اور رپورٹس آتی رہیں۔ جب اس کا انتقال ہوا تو تمام چینلز نے بریکنگ نیوز کے طور پر اس کے انتقال کی خبر ٹیلی کاسٹ کی۔ اس کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے خصوصی پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوئے۔ اخبارات نے اس کی یاد میں خصوصی ایڈیشن شائع کیے۔ میڈیا نے جو کچھ کیا وہ اس کا فرض تھا کیونکہ مرحوم حقیقی معنوں میں اس کا مستحق تھا۔

رنگیلا جیسے فنکار صدیوں میں جنم لیتے ہیں لیکن اب شاید کوئی دوسرا رنگیلا کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔

(ختم شد)

غلطی

اختر شہاب

ذریعہ معاش کی تگ و دو زندگی کا ضروری عنصر ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرد روزی کے حصول میں اس قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ اس کا گھر اس کے بچے ثانوی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ زیرِ نظر تحریر بھی ایک ایسے ہی شخص کی حالات کے گرد گھوم رہی ہے۔

مغرب سے درآمد ایک سبق آموز تحریر

میں اپنی پُرسکون اور آرام دہ زندگی کے بارے میں اچھی باتیں سوچنے پر حق بجانب ہوں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے۔ میں نے اس کے لیے بڑی محنت کی ہے۔ بڑی قربانیاں دی ہیں۔ تب جا کے میں اس مقام پر پہنچا ہوں۔ اس دنیا میں عام انسان کو اور کیا چاہیے۔ ایک اچھی اور مثالی بیوی، ایک پُرسکون گھر اور مثالی اور تابعدار بچے۔ ان سب کے ساتھ اس قدر روپیا جس سے وہ اپنے گھر کے تمام اخراجات پورے کرنے کے علاوہ چھٹیوں میں کسی اچھی جگہ سیر و تفریح کرنے بھی جا سکے اور اگر کوئی شخص یہ سب کچھ حاصل کر لے تو اسے کامیاب کہا جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک کامیاب زندگی کیا محض انہی چیزوں کا مجموعہ ہے۔

میرا نام ہیرالڈ کوشینز ہے۔ میری بیوی کا نام سنوریٹی ہے۔ وہ ایک خوش مزاج، حسین اور خوش لباس عورت ہے۔ جس سے میرے دو پیارے پیارے بچے ہیں، پیارے پیارے بچوں سے آپ سوچ رہے ہوں گے کہ شاید ہماری شادی کو دو چار سال ہی ہوئے ہوں گے۔ جی نہیں! ہماری شادی کو 31 سال ہو گئے ہیں اور یہ سب میری بیوی کی تربیت کا نتیجہ ہے جو ہمارے بچے پیارے مثالی اور تابعدار ہیں۔ ویسے بھی اپنے بچے جیسے بھی ہوں پیارے ہی ہوتے ہیں۔ میرے رہنے کو ایک کھلا اور شاندار گھر ہے اور میں اپنی فیملی کو چھٹیوں میں گھمانے کہیں بھی لے جا سکتا ہوں گویا میں ایک خوش قسمت اور کامیاب انسان ہوں۔

آپ بھی یہی سمجھ رہے ہوں گے مگر ان تمام باتوں کے باوجود اگر مجھ میں قدرت ہوتی کہ میں کسی چیز کو بدل سکوں تو میں ان دنوں کو بدل دیتا، ان دنوں کو واپس لوٹا دیتا جن میں میری تمام توجہ اپنے کام پر اور اپنے مستقبل بنانے پر مرکوز تھی۔ میں اپنے بیوی بچوں کی ضروریات زندگی پوری کرنے ان پر توجہ دینے سے غافل ہو گیا تھا۔ دنیا کے تمام مردوں کی طرح میری پہلی ترجیح میرا ذریعہ معاش تھی۔ میں نے دنیا کے دوسرے مردوں کی طرح اسے معمول کے مطابق نہیں لیا تھا۔ کام اور گھر کو الگ الگ نہیں کیا تھا۔ بلکہ اپنے کام میں ہی اس قدر غرق ہو گیا تھا کہ میرا کام میری ''دوسری بیوی'' بن گیا تھا۔ اس دوسری بیوی نے میری وہ طاقت، توانائی، وقت اور توجہ جسے مجھے اپنے گھر میں استعمال کرنا چاہیے تھا۔ اپنی فیملی کو دینا چاہیے تھا۔ اپنے لیے استعمال کر لیا تھا اور مجھے اس خوفناک غلطی کا اس کمی کا احساس تک نہ تھا۔ بائبل میں حضرت سلیمانؑ کا کلام جو مجھے ان بیتے دنوں کی یاد دلاتا ہے۔ جب میں اپنے گھر میں ہونے کے بجائے گھر سے دور ہوا کرتا تھا۔ کچھ یوں ہے۔

''انہوں نے مجھے کسی اور کے انگوروں کے باغ کا رکھوالا بنا دیا ہے لیکن میں اپنے باغیچے کی دیکھ بھال سے غافل ہوں۔''

اس طویل عرصہ میں میری بیوی سنوریٹی مسلسل مجھے یہ باور کراتی رہی کہ میں گھر پر توجہ نہ دے کر بہت بڑی غلطی کر رہا ہوں اور اسے اور خاص طور پر بچوں کو آپ کی توجہ کی سخت ضرورت ہے۔ وہ اس بات پر بھی احتجاج کیا کرتی تھی کہ میں نے ڈاکٹر کے علاج کے لیے وقت لینے سے، بچوں کو اسکول چھوڑنے، لینے اور رات کو سوتے وقت بچوں کو کہانیاں سنانے سمیت تمام ذمہ داریاں اس کے سر پر لاد دی ہیں۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ ان بچوں کی نشوونما اور ان کی بڑھوتری کے دنوں میں ان کی توتلی باتوں کو سننا اور ان کی معصوم شرارتوں کو دیکھنا اور ان میں حصہ لینا تمہارا حق ہے۔ یہی تمہاری یادوں کا سرمایہ ہوگا، اگر تم نے اپنی مصروفیات میں کمی نہ کی اور ان کی طرف توجہ نہ دی تو یہ سب کچھ ہوا ہو جائے گا۔ یہ دن خواب و خیال ہو جائیں اور تم انہیں کھونے کی حسرت لیے پچھتاتے رہو گے مگر بعد میں تمہارے ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔

اس وقت اس کی باتیں مجھے بہت بری لگتی تھیں۔ مجھے اس پر غصہ آتا تھا۔ غصے میں ہی میں نے اسے بتایا کہ میں آفس میں مسلسل اس لیے تو نہیں بیٹھا رہتا یا وہاں کام کرتا رہتا ہوں کہ تم مجھے بہت بری لگتی ہو یا پھر مجھے بچے اچھے نہیں لگتے۔ یا پھر گھر کے بجائے مجھے آفس میں زیادہ آرام ملتا ہے۔ بلکہ آفس کا کام تو بہت سخت اور تھکا دینے والا بلکہ بیزار کر دینے والا ہے۔ مگر میں یہ سب تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کر رہا ہوں۔ مجھے بھی بچوں سے محبت ہے۔ مگر رات کو سوتے وقت توریت سے نبیوں کی کہانیاں سنانا محبت جتانے کا واحد ذریعہ نہیں ہے۔ بچوں کے لیے خوراک، لباس، ایک آراستہ و پیراستہ گھر اور خاص طور پر پرائیویٹ اسکولوں میں اچھی تعلیم بھی ضروری ہے۔ تمہاری محبت و جاں نثاری کا طریقہ الگ ہے اور میرا الگ۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بچے کسی معاملے میں کسی سے بھی پیچھے رہیں۔ انہیں کسی قسم کا بھی احساس محرومی نہ ہو۔ وہ کسی چیز کے لیے ترستے نہ رہیں۔ اس لیے میں زیادہ آمدنی کی خاطر آفس میں جان توڑ محنت کرتا ہوں۔

اس وقت اپنی باتوں سے میں سنوریٹی کو لاجواب کر کے خوش ہوتا تھا۔ اپنے بچوں کو اچھے اسکول میں تعلیم حاصل کرتے اور عام بچوں سے ممتاز دیکھ کر میرا سر فخر سے اونچا ہو جاتا تھا۔ مگر اب اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ مجھے اپنی دونوں ذمہ داریوں میں توازن رکھنا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے خود کو کام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ میں جذباتی طور پر اپنے کام میں ملوث ہو گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میرے کام پر انگلی دھرے۔ کسی کو اس میں کسی کمی کا احساس نہ ہو۔ میں نے باپ اور شوہر کا رول نبھانے کے بجائے ایک کارآمد ورکر کا رول نبھایا۔ اور محض میں اسی ایک رول میں کامیاب رہا۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ کاش میں نے سنوریٹی کی بات پر کان دھرے ہوتے۔

ابھی حال ہی میں میری نظر سے ایک مضمون گزرا ہے جس کا عنوان ہے۔ ''خدا کا شکر ہے آج سوموار کا دن ہے کا وائرس'' اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ میری طرح کے ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جنہیں گھر میں چھٹی کا دن گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ اسی دوران خود کو پژمردہ اور بیکار سمجھتے ہیں۔ جبکہ گھر سے باہر اپنے کام پر اور اپنے آفس میں وہ خود کو بہت خوش و خرم اور سرگرم محسوس کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی سوسائٹیوں میں یہ خیال بھی عام ہے کہ انسانی روح کی بالیدگی اور لوگوں کی دلجوئی اور دادرسی میں گزرا ہوا وقت، وقت کا ضیاع ہے۔ اور بچوں کی نسبت بالغوں میں وقت گزارنے کی اہمیت ہے۔ کیونکہ اس سے

سماجی تعلقات بڑھتے ہیں۔ سماجی تعلقات بڑھنے سے نہ صرف کام نکلتے ہیں بلکہ پیسا آتا ہے۔ اور اصل اہمیت تو پیسے کی ہے۔ پیسا ہو تو انسان سب کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ یہ باتیں کس قدر خوفناک ہیں کہ کسی کو اس کا احساس بھی نہیں ہے۔ میں بھی شاید لوگوں کی دیکھا دیکھی انہی خیالوں کا اسیر رہا۔ اسی غلط فہمی میں رہا کہ یہی اصل کامیابی ہے۔

اپنی جوانی کے دور میں مسلسل کام کر کے میں نے نہ صرف اپنی فیملی پر ظلم کیا۔ ان سے دھوکا کیا ان سے زیادتی کی۔ بلکہ اپنے آپ پر بھی ظلم کیا۔ خود کو بھی دھوکا دیتا رہا۔ جب دوسرے یہودی ربی بڑے اجتماعات میں مدعو کیے جاتے تھے وہ اپنے وعظ سے لوگوں کے ایک وسیع حلقے کو متاثر کر لیتے تو انہیں دیکھ کر مجھے شرمندگی ہوتی۔ میں ان پر رشک کرنے کے بجائے ان سے جلنے لگتا۔ بجائے ان کی کامیابی پر فخر کرنے کے اور یہ سوچتے کہ ہم سب ایک ہی مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں لہٰذا میں ان کی کامیابی کو اپنی لیاقت اور اپنے علم کی کمی سمجھ کر اپنے علم میں اضافہ کرنے کی جدوجہد کرتا۔ اپنے لیکچروں کو اور موثر اور مفید بنانے کی کوشش کرتا۔ اپنا اوریجنل اسٹائل چھوڑ کر ان کا اسٹائل اپناتا مگر کامیابی نہ ملتی۔

کمپنیوں میں یہ صورت حال تو بدترین ہے۔ جہاں دوسری چیزوں کے علاوہ ملازموں کے درمیان مقابلہ بازی کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ انسان کم اور مشین زیادہ بن جاتے ہیں۔ اس سے کسی اور کا فائدہ ہو نہ ہو کمپنیوں کے منافع میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے امریکا کے انشورنس کمپنیوں کے کامیاب ترین سیلز مینوں کے کنونشن کے موقع پر ایک سیلز مین سے پوچھا۔

"اس ہفتے تمہارے یہاں آنے پر کیا خرچا ہوا ہے۔ میں ہوائی جہاز کے ٹکٹ یا کھانے اور ہوٹل کے اخراجات کے بارے میں نہیں پوچھ رہا۔ بلکہ میں تو یہ دریافت کر رہا ہوں کہ اس دربدری کا تمہاری اور تمہاری فیملی کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ روزگار کے لیے انشورنس پالیسیاں بیچنا بھی اپنی جگہ اہم ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ یہ ایک استوار کام ہے۔" سیلز مین بولا۔ "مگر میں نے اپنی زندگی کو خانوں میں تقسیم کیا ہوا ہے اور ہر چیز کو اس کے مطابق وقت دیتا ہوں۔ اس لیے خوش ہوں اور کامیاب بھی جبکہ میرے ساتھی جو صرف کام اور کام کے چکرے میں ہیں وہ کامیاب تو ہیں مگر سکون ان کی زندگی سے خارج ہو گیا ہے۔"

میں احمق تھا اس شخص کی بات بھی نہ سمجھ سکا۔

ایک دفعہ میں نے ایک لوک گلوکار کو ایک گیت گاتے سنا جو باپ سے متعلق تھا۔ اس کے بول کچھ یوں تھے۔

"مجھے دوسرے تمام لوگوں کی نسبت اپنے باپ سے کم پیار ہے۔" یہ گیت سن کر میرے ذہن میں جو پہلا خیال آیا وہ یہ تھا۔ "ہاں! میں بھی بالکل یہی بات اپنے باپ کے بارے میں کہہ سکتا ہوں۔"

دوسری سوچ جس نے مجھے لرزا دیا تھا وہ یہ تھی۔ "کیا میرے بچے بھی میرے بارے میں یہی کہیں گے!"

آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ بچہ اپنے باپ سے ہمیشہ کم محبت کرتا ہے۔ کیا اس کی وجہ باپوں کا سخت رویہ اور کام کے سلسلے میں اپنی اولاد سے دور رہنا اور ان کو کم وقت دینا تو نہیں...... میں نے سوچا۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ اصول بہت سے مردوں پر لاگو ہوتا ہے۔ ہم مرد حضرات اپنی محبت، اپنی چاہت اور اپنے رشتوں کے حوالے سے فخر کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ ہمیں تو اپنی آمدنی پر فخر کرنا اچھا لگتا ہے۔ جتنی زیادہ آمدنی ہوتی ہے اس میں ہماری گردن اکڑی رہتی ہے۔ اصل میں ہمارا معاشرہ مردوں کی سماجی طور پر اس طرح تربیت کرتا ہے کہ وہ آپس میں مقابلے اور برتری کے رجحان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جبکہ بے تکلفی اور برابری کے معاملے میں وہ بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ اور آسانی سے نہ تو کسی کی برتری تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے سے بے تکلف ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں عورتوں کا رویہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ نہ صرف آپس میں جلد بے تکلف ہو جاتی ہیں بلکہ ان میں حاکمیت اور مقابلے بازی کا رجحان بھی بے حد کم ہوتا ہے۔ لیکن اب عورتیں بھی اس کام کی دنیا کا حصہ بنتی جا رہی ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کام کی اس دنیا میں وہ اپنا حصہ لینے کے لیے بڑی تعداد میں مارکیٹ میں شامل ہو رہی ہیں اور مردوں کی طرح کامیابی کی جل پریوں کے گائے ہوئے گیت اب ان کے کانوں میں بھی رس گھولنے لگے ہیں۔ وہ مردوں کی طرح کامیابیاں بھی حاصل کرتی جا رہی ہیں۔ انہیں اب اندازہ ہو گیا ہے کہ گھروں میں بیٹھ کر وہ بچوں کے پوتڑے بدلنے کے بجائے وہ دوسرے کاروبار مثلاً جائداد کی خرید و فروخت کے کاروبار میں زیادہ کمائی کر سکتی ہیں اور

خودمختار ہوسکتی ہیں۔ میری ذاتی رائے میں عورت کا رویہ زندگی کے معاملات میں بہت بہتر ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ زندگی صرف جینے کا نام نہیں ہے بلکہ زندگی تو ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے اور محبت کرنے کا نام ہے۔

مجھے اس حقیقت کا اندازہ تب جا کے ہوا جب میری عمر پچاس کے ہندسے سے گزر گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میری بیوی صحیح کہتی ہے اور میری سماجی قدریں تہہ و بالا ہو چکی ہیں۔ لیکن اس لمحہ جو آگہی ہوئی تھی اس نے مجھے نہیں بدلا یہ تو آگہی کا ایک لمحہ تھا جو گزر گیا اور میں دوبارہ کاروبارِ زندگی میں مصروف ہو گیا۔ بلکہ میں تو اس وقت بھی خود کو نہ بدل سکا جب میرا چودہ سالہ بیٹا ''آرون'' ایک ایسی بیماری سے مر گیا جو دنیا میں بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ میں نے اسے بھی خدا کی رضا سمجھ کر صبر کر لیا۔ مگر اس کے بھائی اور غمزدہ ماں کو زیادہ وقت نہ دیا۔ مجھے بدلا تو میری طاقت میں کمی کے احساس نے میری تھکن اور بڑھاپے کی آمد کے احساس نے۔ جب مجھے اندازہ ہونا شروع ہوا کہ میں اپنے سینئر اور اپنے سے طاقتور لوگوں سے نہیں جیت سکتا اس لیے مجھے نہ صرف ان سے آگے بڑھنے کی کوششیں ترک کر دینی چاہئیں بلکہ مجھے نئے آنے والوں کے لیے جو مجھ سے زیادہ جوشیلے اور متحرک ہیں جگہ خالی کرنا ہوگی۔

جب مجھے یہ احساس ہوا کہ میں اب تھک گیا ہوں تو میں نے سوچ کے برعکس اپنی جوانی کی خواہشات یعنی آگے بڑھتے اور کام کرتے رہنے کی خواہشات کو ترک کر دیا تو اس پر مجھے افسوس ہونے کے بجائے خوشی اور آزادی کا احساس ہوا۔ پر میرے خیال میں اب شادی کے ابتدائی ایام کے رومانوی دنوں اور باپ بننے کے ابتدائی جوش و خروش اور بچوں کے ساتھ کھیلنے کی خوشیوں کے دنوں کو اب واپس لانے میں بہت دیر ہو گئی ہے۔

میں عمر کی پچاس بہاریں گزارنے کے بعد اس تکلیف دہ حقیقت کو محسوس کر رہا ہوں جبکہ میں تو ان لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو چالیس کی دہائی میں ہیں اور اپنے بچوں کا جواب سننے کے بعد رنج و الم کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔

انہوں نے اپنے ٹین ایج بچوں سے کہا۔ ''بچو! مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ پچھلے کئی سالوں سے میری ترجیحات غلط تھیں لیکن آج سے میں اپنے کام کو کم سے کم وقت دوں گا۔ اور ہر وقت پیسا کمانے کے چکر میں نہیں لگا رہوں گا۔ بلکہ اب میں زیادہ سے زیادہ وقت تمہارے ساتھ گزاروں گا۔ تمہارے ساتھ مل جل کر رہوں گا۔''

''یہ تو ٹھیک ہے ڈیڈ!'' بچوں نے جو جواب دیا وہ بھی سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ ''مگر اب ہم بڑے ہو گئے ہیں۔ ہمارے اپنے منصوبے ہیں اور آپ کی اس میں شرکت ان کا بیڑا غرق کر دے گی۔ بہتر ہے آپ اپنی روٹین جاری رکھیں۔''

سوال یہ ہے کہ آپ اپنی ادھیڑ عمری کے پچھتاووں کو کم کرنے کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ شاید اس کی شروعات کے لیے آپ اپنے دفتر میں ایسا شخص تلاش کریں جو عمر میں آپ سے 10 پندرہ سال بڑا ہو اور اس سے پوچھیں کہ جب آپ میری عمر کے تھے تو اپنی زندگی بدلنے، اسے نئے ڈھب پر لانے کے لیے کیا خاص کام کرنا چاہتے تھے۔ ہو سکتا ہے اس کے جواب میں آپ کو کوئی رہنمائی مل جائے ورنہ مایوسی تو آپ کا مقدر ہے۔

آج کل میری پسندیدہ کہانیوں میں ایک کہانی پیٹر لانچ کی ہے۔ جو سرمایہ کاری کا سپر اسٹار تھا۔ اس نے 1990ء میں اپنے اس فیصلے سے کہ وہ دن میں 14 گھنٹے کام کر کے کروڑوں ڈالر کی آمدنی کو محض اس لیے چھوڑ رہا ہے کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکے اس کے اس فیصلے نے وال اسٹریٹ کو حیران و پریشان کر دیا تھا۔

اس کا کہنا تھا۔ ''جب میری پہلی بیٹی چھوٹی تھی تو میرے پاس وقت نہیں تھا لیکن میں اس کے ساتھ ٹی وی پر سیسمی اسٹریٹ دیکھتا تھا۔ اسے میکڈونلڈ لے جاتا تھا۔ اسے کھیل کے میدان میں لے جاتا۔ اس کے ساتھ کھیلتا۔ اس کے ساتھ پتنگیں اڑاتا مگر بعد میں پیسا کمانے کی دھن میں باقی دونوں بیٹیوں کے ساتھ مجھے یہ سب کرنے کا موقع نہ ملا۔ میں انہیں بالکل وقت نہ دے سکا۔ لیکن چاہے کچھ بھی ہو یہ کام دوبارہ شروع کرنے میں ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔''

لانچ کو یقین تھا کہ اس نے وال اسٹریٹ چھوڑ کر بالکل صحیح کام کیا ہے۔ اس نے کہا..... ''میں زندگی میں کسی بھی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس نے بستر مرگ پر یہ تمنا کی ہو کہ کاش اس کا زیادہ وقت گھر کے بجائے آفس میں گزرا ہوتا۔''

میں آپ سے بھی یہی کہتا ہوں کہ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ خدا کے لیے کام اور فیملی کے درمیان نازک سے احساس کو سمجھیں اور زندگی کی طرف لوٹ آئیں۔ میں خود بھی یہی کرنے جا رہا ہوں۔ گو شروع میں مجھے کچھ تکالیف محسوس ہوں گی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آخر کار میں کامیاب ہوں گا۔

جون کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے چھٹے مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنھوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جا رہا ہے

☆ رعنا لیاقت علی

ان کا شمار تحریکِ پاکستان کے اہم رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ مسلمان خواتین کی فلاح و بہبود اور انہیں منظم کرنے میں ان کا کردار کلیدی رہا۔ وہ پاکستان کے پہلے وزیرِاعظم کی اہلیہ، پاکستان کی پہلی خاتونِ اوّل تھیں، مگر وجہ شہرت سماجی خدمت کے میدان میں ان کی گراں قدر کاوشیں قرار پائیں۔ "اپوا" یعنی آل پاکستان انجمن خواتین کی تشکیل اور تنظیم اُن کا عظیم ترین کارنامہ تھا۔ 22 فروری 1949 کو انہوں نے ملک بھر سے ایسی خواتین کو مدعو کیا، جو زندگی کے مختلف شعبوں میں مؤثر اور مثبت کردار ادا کر رہی تھیں۔ ان خواتین کو ایک پلیٹ فورم پر اکٹھا کر کے انہوں نے پاکستانی عورتوں کی سماجی، تعلیمی اور ثقافتی اصلاح اور بہبود کے لیے کام شروع کیا۔ اپوا کی شاخیں پاکستان کے چاروں صوبوں میں کھلیں۔ یہ تنظیم تیزی سے پھیلی۔ اس نے لاکھوں لڑکیوں کی تربیت کی۔

تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب اور دیگر خطوں سے مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ لاکھوں افراد لٹے پٹے پاکستان پہنچے۔ مہاجرین کے کیمپوں میں خواتین کی حالتِ زار نے انہیں فلاحی میدان میں قدم رکھنے کی تحریک دی۔ اُنھوں نے "جمعیت رضا کار خواتین پاکستان" قائم کی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب عورتیں گھر تک محدود تھیں، تعلیم سے محروم تھیں، انہیں فلاحی میدان میں لانا سہل نہیں تھا، لیکن بیگم لیاقت دھن کی پکی تھیں۔ عزم کے ساتھ یہ کام شروع کیا اور پھر اسے مثال بنا دیا۔ حیرت انگیز کامیابیاں ان کے حصے میں آئیں۔ خواتین نے گھر سے باہر قدم رکھا اور مہاجرین کی بحالی میں کردار ادا کیا۔ رعنا لیاقت علی ہی کی کوشش سے روزگار اور گمشدگان کے محکمے کھولے گئے۔ لڑکیوں کی شادی کے لیے ایک محکمہ بنایا گیا، بیواؤں کو گھر فراہم کیے گئے۔ فسادات اور ہنگاموں میں اغوا ہونے والی خواتین کی بازیابی کے لیے مراکز کھلے۔ سچ تو یہ ہے کہ پاکستان کے اہم ترین سیاسی قائد کی بیگم ہونے کے باوجود، جس نے پہلے وزیرِاعظم کا عہدہ سنبھالا، انہوں نے اپنا آرام تج کر انسانیت کی خدمت کو کل وقتی مصروفیت بنا لیا تھا۔

رعنا لیاقت علی خان 13 فروری 1905 کو شمالی ہند کے علاقے الموڑہ میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم نینی تال کے ولزلی ہائی اسکول سے حاصل کی۔ لکھنؤ سے میٹرک کیا۔ ازابیلا تھابرن کالج سے بی اے کا مرحلہ طے ہوا۔ زمانہ طالب علمی میں وہ اپنی بذلہ سنجی اور شگفتگی کے لیے مشہور تھیں۔ ہم نصابی م

سرگرمیوں میں پیش پیش رہا کرتی تھیں۔ انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے معاشیات اور عمرانیات میں ایم اے کیا۔ پھر وہ درس وتدریس کی جانب آگئیں۔ دہلی کے پرستھ کالج میں اکنامکس کی پروفیسر ہوگئیں۔ 1933 میں لیاقت علی خان سے شادی کے بعد ان کی زندگی یکسر بدل گئی۔ لیاقت علی خان کی زندگی میں انہوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ وہ ان کی دست راست تھیں۔ لیاقت علی خان کی خط وکتابت اور ٹائپنگ کا کام رعنا لیاقت علی خان ہی انجام دیتی تھیں۔ سیاسی محاذ پر بھی ان کا ہاتھ بٹایا۔ ساتھ گھریلو ذمّہ داریاں بھی احسن طریقے سے نبھائیں۔ انہوں نے دو بیٹوں اشرف لیاقت اور اکبر لیاقت کو جنم دیا۔ ان کی پرورش کی ذمّہ داریاں بھی انہی کے کاندھوں پر تھی کہ قائد ملت اپنی اولاد پر بھرپور توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کی جنگ لڑ رہے تھے۔

تقسیم کے بعد وہ ایک نئے روپ میں سامنے آئیں۔ انہوں نے نرسنگ کے پیشے کا وقار بحال کرنے کے لیے کلیدی کردار ادا کیا۔ بڑی ذہانت اور ہمت سے تعصبات کا مقابلہ کیا۔ لوگوں کے ذہن تبدیل کیے۔ ان ہی کوششوں کے طفیل پاکستانیوں نے اپنی بیٹیوں کو نرس بننے کی اجازت دی، ورنہ مسلمانوں کی اکثریت اس شعبے میں اپنی بچیوں کو بھیجنا پسند نہیں کرتی تھی۔ انہوں نے خواتین کی جسمانی صحت وحفاظت کے لیے خواتین کے محافظ دستے تشکیل دیے، جس کی قیادت وہ خود کیا کرتی تھیں۔ کئی شہروں میں لڑکیوں کو نیم عسکری تربیت دی گئی۔ متوسط طبقے کی ڈھائی ہزار لڑکیاں خواتین نیشنل گارڈ میں شامل ہوئیں۔ ''مصنوعاتِ دیہہ'' نامی انجمن کا قیام ان کی ذہانت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اس کا مقصد گھریلو مصنوعات کی سرپرستی کرنا اور ہنرمندی کے معدوم ہوتے پیشے بحال کرنا تھا۔ اس سلسلے میں جون 1949 میں انہوں نے کراچی میں گھریلو مصنوعات کا ایک مرکز قائم کیا۔

لیاقت علی خان کی شہادت جیسے سانحے کو برداشت کرنا آسان نہیں تھا، مگر وہ کوئی عام خاتون نہیں تھیں۔ انہوں نے بڑے حوصلے کے ساتھ یہ کرب سہہ لیا اور اپوا کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ وہ کئی اہم عہدوں پر فائز رہیں۔ کئی اعزازات ان کے حصے میں آئے۔ 1952 میں اقوام متحدہ کے اجلاس میں وہ پاکستانی مندوب کی حیثیت سے شریک ہوئیں۔ 1954 میں ہالینڈ اور بعدازاں اٹلی میں سفیر رہیں۔ وہ سندھ کی گورنر بھی رہیں۔ رعنا لیاقت علی خان سندھ کی پہلی خاتون گورنر تھیں۔ 1973 میں یہ عہدہ سنبھالا اور 1976 تک اس پر فائز رہیں۔

انہوں نے طویل عمر پائی۔ 13 جون 1990 کو حرکتِ قلب بند ہونے کے سبب کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ عظیم خاتون مزار قائد کے احاطے میں لیاقت علی خان کے پہلو میں مدفون ہیں۔

☆ مہدی حسن

وہ موسیقی کے بے تاج بادشاہ تھے، اپنی مثال آپ۔ اُن سے پہلے کوئی ان سا نہیں گزرا، نہ ان کے بعد کوئی ان جیسا ہوگا۔ ''غزل گائیکی کا کوئی ایسا پہلو نہیں، جس پر ان کے اثرات نہ ہوں۔ مستقبل میں جو بھی غزل گائے گا، ان ہی کے ڈھب پر گائے گا، ان سے بچ کر غزل گانا اب ممکن نہیں۔

ہم استاد مہدی حسن خان کی بات کر رہے ہیں، جو ایک زندہ داستان تھے۔ ایک عظیم کلاکار۔ ایک جادوگر، جن کی آواز سماعتوں سے ہوتی ہوئی سیدھی دل میں اتر جاتی، روح میں گھل جاتی۔ برصغیر پاک و ہند میں ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ غزل گائیکی میں وہ یکتا تھے۔ ان کی عظمت یہی کہ ان کے بعد جس نے بھی غزل کے میدان میں قدم رکھا، ان ہی کے انداز کو اپنایا۔ وہ پاکستان اور ہندوستان میں یکساں مقبول تھے۔ بھارت کی ممتاز گلوکارہ لتا منگیشکر نے ایک بار کہا تھا۔ ''ان کے گلے میں بھگوان بولتا ہے۔'' نیپال کے شاہ بریندرا ان کے احترام میں کھڑے ہوجاتے تھے، انہوں نے متعدد بار کہا کہ انہیں مہدی حسن کی کئی غزلیں زبانی یاد ہیں۔

ان کا سریلا سفر کئی دہائیوں پر محیط تھا۔ انہوں نے پچیس ہزار کے لگ بھگ گیت اور غزلیں گائیں، جن میں سے بیش تر سپرہٹ ثابت ہوئیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق انہوں نے 441 فلموں کے لیے گانے گائے۔ فلمی گیتوں کی تعداد 626۔ ان میں 366 اردو فلمیں تھیں۔ دراصل یہ اردو فلموں کی موسیقی تھی، جس کے ساتھ اُن کی آواز ہم آہنگ ہوتی تھی، مگر پنجابی فلموں میں بھی اُن کی طلسماتی آواز سنائی دی۔ انہوں نے 82 گیت گائے۔ فلمی گائیکی کا سفر 1962 میں شروع ہوا، تو 1989 تک جاری رہا۔ یعنی 28 تک برس ان کی آواز فلمی شائقین کے کانوں میں رس گھولتی رہی۔

جن اداکاروں پر ان کی آواز سوٹ کرتی تھی، ان میں محمد علی سرفہرست ہیں۔ سو سے زیادہ گانے اداکار محمد علی پر فلمائے گئے۔ 1968ء میں ریلیز ہونے والی ایک فلم "شریکِ حیات" میں خان صاحب نے اداکاری بھی کی۔ ان کا کمال یہ تھا کہ وہ کلاسیکی گائیکی کو وادیوں سے نکال کر پوری دنیا کے سامنے لے آئے۔ کلاسیکی فن سے اُنھوں نے غزل کو زرخیز کیا، اس میں نئی روح پھونکی۔ یہ ان کا تنوع تھا کہ فلموں کے لیے بھی انہوں نے یکساں مہارت سے گایا۔ خدا نے مہدی حسن کو بین الاقوامی شہرت دی مگر ان کی ذات تکبر سے پاک تھی۔ سادہ مزاج انسان تھے۔ گول مول بات کرنے کا فن نہیں جانتے تھے۔

مہدی حسن 18 جولائی 1927 کو راجستھان کے ایک گاؤں لونا میں پیدا ہوئے۔ وہ موسیقی کے کلاونت گھرانے کی سولہویں نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد استاد عظیم خان اور چچا استاد اسماعیل خان دھرپد گائیکی کے ماہر تھے۔ مہدی حسن کی ابتدائی تربیت گھر ہی میں ہوئی۔ 1947 میں بیس سالہ مہدی حسن اہلِ خانہ کے ساتھ پاکستان آ گئے۔ گانے کا شوق تھا مگر ساتھ پیٹ لگا ہوا تھا، جسے بھرے بغیر جینا محال۔ گزربسر کے لیے وہ چیچہ وطنی میں سائیکلیں مرمت کیا کرتے تھے۔ پھر مکینک کا کام سیکھا، جلد اس میں مہارت حاصل کرلی۔ پہلے تو موٹر مکینک کے طور پر کام کیا پھر ٹریکٹروں کی مرمت کرنے لگے۔ یعنی جم کر محنت کی۔

کیا ان کٹھن حالات نے انہیں گائیکی سے غافل کردیا تھا؟ قطعی نہیں۔ وہ خوب مشق کیا کرتے تھے۔ ریاض سے کبھی جی نہیں چرایا۔ جب والد نے کلاسیکی موسیقی سے انہیں متعارف کروایا تھا، اس وقت عمر فقط آٹھ برس تھی۔ یعنی موسیقی ان کے خون میں شامل ہوگئی تھی۔ جب بھی وقت ملتا اوزار رکھتے، ہاتھ پونچھتے اور ہارمونیم سنبھال لیتے۔ نشست جم جاتی۔ اوائل میں انہیں خاصی جدوجہد کرنی پڑی۔ اس وقت ریڈیو پاکستان میں قدم رکھنا ہر گلوکار کا سپنا ہوتا تھا۔ کڑا مقابلہ تھا۔ نوجوان مہدی حسن کی آنکھوں میں خواب تھے۔ دل جذبے سے بھرا ہوا تھا۔ محنت رنگ لائی۔ 50 کی دہائی کے وسط... میں انہیں ریڈیو پاکستان کے کراچی اسٹوڈیو میں قدم رکھنے کا موقع ملا۔ ان کے بڑے بھائی پنڈت غلام قادر کراچی ریڈیو سے منسلک تھے۔ ان ہی کی سفارش پر موقع ملا۔ میر کی غزل "دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے" نے انہیں راتوں رات شہرت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ ریڈیو پر خود کو منوالیا، تو اگلی منزل فلم انڈسٹری تھی مگر اس زمانے میں وہاں داخلہ سہل نہیں تھا۔ بڑا سخت مقابلہ تھا، تاہم ان کی صلاحیت کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں ٹھہر سکی۔ وہ آئے، انہوں نے دیکھا، اور وہ چھا گئے۔ فلم فرنگی، صاعقہ، زرقا، میری زندگی ہے نغمہ، نیا راستہ، شرافت، زینت، شبانہ اور فلم آئینہ میں ان کا فن اوج پر نظر آیا۔ مذکورہ فلموں کے لیے انہوں نے نگار ایوارڈ اپنے نام کیا۔

پاک و ہند کے علاوہ وہ یورپ اور مشرقِ وسطیٰ میں بہت مقبول تھے۔ انہیں عالمی محبت ملی۔ جہاں اردو سمجھی اور بولی جاتی ہے، وہاں مہدی حسن کی پزیرائی ہوئی۔ اتنے غیرملکی دورے کیے کہ ان کی گنتی رکھنا محال ہے۔

زندگی کا پہلا سرکاری ایوارڈ اُنھوں نے جنرل ایوب خان سے وصول کیا تھا۔ 1979 میں ہندوستانی حکومت نے انہیں سہگل ایوارڈ سے نوازا۔ 1983 میں نیپال کی جانب سے گورکھا دکشینا باہو ایوارڈ ان کے حصے میں آیا۔ جنرل ضیاء الحق نے اُنھیں تمغہ برائے حسن کارکردگی اور جنرل پرویز مشرف نے ہلال امتیاز سے نوازا۔ مہدی حسن کو پاکستان ٹیلی وژن کراچی سینٹر نے جولائی 2001 میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دیا۔ الغرض ایوارڈز کی ایک طویل فہرست ہے۔

آخری برسوں میں وہ شدید علیل رہے۔ ان کی علالت کی خبریں وقفے وقفے سے نشر ہوتی رہتیں۔ خدشات بڑھ جاتے مگر ہر بار ان کے چاہنے والوں کی دعائیں خان صاحب کو واپس لے آتیں، مگر 13 جون 2012 کو ٹی وی چینلو سے نشر ہونے والی خبر ان کی علالت کی نہیں تھی۔ یہ کرب ناک خبر ان کے انتقال کی تھی۔ وہ 84 سال کی عمر میں جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کے انتقال کے وقت انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کے ایک عہدیدار نے اعلان کیا کہ راجستھان میں ان کا کانسی کا مجسمہ نصب کیا جائے گا اور ایک سڑک ان سے موسوم

کی جائے گی۔ پاکستان میں بھی ریڈیو اورٹی وی چینلز نے ان کی یادگار میں پروگرام نشر کیے۔

ان کے درجنوں شاگرد ہیں، جو غزل گائیکی کے فن کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے، وہ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ غزل کے آسمان پر ان کا نام ہمیشہ دمکتا رہے گا۔

☆ وسیم اکرم

کیفے ٹیریا میں میز کے گرد بیٹھے لوگوں کے درمیان اگر ان کی شخصیت زیر بحث آئے، تو کچھ اس طرح کے جملے سنائی دیتے ہیں۔ "بھئی وہ تو سوئنگ کا سلطان تھا... اپنے زمانے میں دنیا کا سب سے خطرناک بالر تھا وہ... گورے تو اس کے نام سے کانپتے تھے۔ وہ چند گیندوں میں میچ کا نقشہ بدل دیتا تھا۔ پاکستان نے 92ء کا ورلڈ اسی کی تباہ کن بولنگ کے طفیل جیتا۔ قائد بھی خوب تھا۔ ایک عرصے تک پاکستانی ٹیم کو سنبھالے رکھا۔ کتنے ہی تنازعات آئے، اس پر کتنے الزامات لگے، مگر کوئی شے اس کے اعصاب کو نہیں توڑ سکی... بھئی وہ تو با کمال تھا۔"

یہ پاکستانی تاریخ کے کامیاب ترین بولر اور ایک باصلاحیت کپتان کا ذکر ہے، جس کی صلاحیتوں کے سامنے پوری دنیا نے سر خم کر دیا تھا۔ ایک ایکسپرٹ کے مطابق وسیم اکرم جیسا بولر نہ تو کبھی پیدا ہوا اور نہ ہی ہوگا۔ جب 2013 میں "وزڈن" نے "آل ٹائم ٹیسٹ الیون" کا اعلان کیا تو وہ دنیا کے گیارہ عظیم ترین کھلاڑیوں میں شامل تھے۔ گیند پر ان کی گرفت حیران کن تھی۔ وقار یونس کے ساتھ ان کی خوب جمتی تھی۔ یہ جوڑی دنیا بھر کے بیٹسمینوں کے لیے قہر تھی۔ ان کی تیز رفتار گھومتی ہوئی گیندوں کے سامنے کیسے کیسے عظیم کھلاڑیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ان دونوں کو "ٹو ڈبلیوز" کہہ کر پکارا جاتا۔ اُن کی مہارت مخالفین کے پرخچے اڑا دیتی۔ وقار کے مانند وسیم اکرم کو بھی پالش کرنے میں عمران خان نے کلیدی کردار ادا کیا۔ عمران نے ان دو ہتھیاروں کو اتنا تیز دھار کر دیا کہ مخالفین گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے۔ وسیم اکرم نے 104 ٹیسٹ میچز میں 414 وکٹیں اپنے نام کیں۔ 25 بار انہوں نے میچ میں پانچ وکٹیں لیں۔ پانچ بار دس وکٹیں لینے کا کارنامہ انجام دیا۔ بولنگ اوسط 23.62 تھی جو انتہائی متاثر کن ہے۔ بیٹنگ کی بھی خوب صلاحیت رکھتے تھے۔ ان میچز میں 2898 رنز بھی بنائے۔ 7 نصف سنچریاں اور 3 سنچریاں اسکور کیں۔ 257 رنز ناٹ آؤٹ کی شاہکار اننگز بھی کھیلی۔

ون ڈے میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ 356 میچز میں 23.52 کی اوسط سے 502 وکٹیں اپنے نام کیں۔ وہ پہلا بولر جس نے اس فارمیٹ میں 500 کا ہندسہ عبور کیا... وسیم اکرم ہی تھے۔ چھ بار پانچ وکٹیں لینے کا کارنامہ انجام دیا۔ بلے بازی کا فریضہ وقتاً فوقتاً اس فارمیٹ میں بھی انجام دیتے رہے۔ چھ نصف سنچریاں اسکور کی انہوں نے۔ وسیم اکرم نے ٹیسٹ اور ون ڈے میں مجموعی طور پر نو سے زائد وکٹیں لیں۔ یہ ایک ورلڈ ریکارڈ رہا، جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنے کارگر تھے۔ ون ڈے میں ان کی وکٹوں کی تعداد کو فقط مرلی دھرن ہی نے عبور کیا۔ 2002 میں وزڈن نے دنیا کے عظیم ترین کھلاڑیوں کی جو فہرست جاری کی تھی، اس میں وسیم اکرم کو ون ڈے کا عظیم ترین بولر ٹھہرایا گیا تھا۔ اس دوڑ میں وہ وقار یونس، مرلی دھرن، میگ گرا سے آگے تھے۔

وسیم اکرم 3 جون 1966 کو لاہور میں مقیم ایک آرائیں خاندان میں پیدا ہوئے۔ کرکٹ کا شوق بچپن سے ساتھ۔ پہلے گلی محلوں میں کرکٹ کھیلی۔ پھر اسکول کی نمائندگی کی۔ وہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج، سول لائنز کی ٹیم کا حصہ رہے۔ آج کے مانند اس زمانے میں بھی سینئر پلیئر کی سفارش ہی نئے کھلاڑیوں کو ٹیم میں لانے کا سبب بنتی تھی۔ یہ بات ثانوی تھی کہ وہ کتنا باصلاحیت ہے۔ وسیم اکرم کے کیس میں یہ عظیم کام جاوید میاں داد نے کیا، جن کی توجہ نے انہیں امکانات کے میدان میں لا کھڑا کیا۔

1985 میں نیوزی لینڈ کے خلاف انہوں نے اپنے ٹیسٹ کیریر کا آغاز کیا۔ دوسرے ہی ٹیسٹ میچ میں وہ دس وکٹیں لے اڑے اور پورے ملک میں یہ خبر پھیل گئی کہ ایک باصلاحیت بالر پاکستان کے ہاتھ آ گیا ہے۔ کل تک جو شخص کلب کرکٹ کا ایک گمنام کھلاڑی تھا، جسے کالج کی ٹیم میں جگہ برقرار رکھنے کے لیے بھی محنت کرنا پڑتی تھی، جو قذافی اسٹیڈیم ٹرائل دینے آیا، تو دو روز تک اسے بولنگ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا... وہ کھلاڑی اب ایک ہیرو تھا۔ دراصل قذافی اسٹیڈیم

کے ٹرائل میں تیسرے روز جب گیند نوجوان وسیم اکرم کے ہاتھ میں آئی، خوش قسمتی سے جاوید میاں داد نیٹ پر موجود تھے۔ ان کی تجربے کار نگاہوں نے بھانپ لیا کہ ایک گوہر نایاب سامنے ہے۔ کسی ڈومیسٹک تجربے کے بنا ہی انہیں ٹیم میں شامل کرلیا گیا۔ آگے جو ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔

ون ڈے کیریر کا آغاز انہوں نیوزی لینڈ کے خلاف کیا تھا۔ اس وقت ظہیر عباس کپتان تھے۔ 1985 میں انہوں نے آسٹریلیا کے خلاف ون ڈے میچز میں پانچ وکٹیں حاصل کرکے دنیا کو اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ وہ 1988 میں ویسٹ انڈیز کا دورہ کرنے والی ٹیم کا حصہ تھے مگر بعد کے برسوں میں وہ انجریز کا شکار ہوگئے۔ انہیں دو بڑی سرجریز کروانی پڑیں۔ وہ جلد ٹیم میں واپس آئے اور ایک بار پھر اس کا مستقل حصہ بن گئے۔

انہوں نے کئی ریکارڈز بنائے۔ 17 ٹیسٹ میچز میں انہوں نے مین آف دی میچ کا ایوارڈ اپنے نام کیا۔ انہوں نے چار ہیٹ ٹرک کیں۔ دو ٹیسٹ کرکٹ میں اور دو ون ڈے میں۔ ون ڈے میں ان کے حصے میں 22 مین آف دی میچ ایوارڈ آئے۔ زمبابوے کے خلاف 257 رنز کی ٹیسٹ اننگز میں انہوں نے بارہ چھکے مارے تھے۔ یہ کسی بھی ٹیسٹ اننگز میں سب سے زیادہ چھکوں کا بھی ریکارڈ ہے۔ یہ اننگز نمبر آٹھ پر بیٹنگ کرنے والے بالے باز کی سب سے بڑی اننگز تصور کی جاتی ہے۔

وسیم کی کامیابیوں کے تذکرے میں یہ ذکر از حد ضروری ہے کہ وہ ذیابطیس کے مریض ہیں۔ 30 برس کی عمر میں اس مرض کی تشخیص ہوئی۔ یہ ایک ہولناک انکشاف تھا۔ وہ اپنے کیریر کے عروج پر تھے اور ابھی مزید کتنی ہی منازل طے کرنی تھیں۔ انہیں لگا کہ ان کا مستقبل تاریک ہوگیا۔ ہمدردوں کا بھی یہی خیال تھا مگر انہوں نے شکست تسلیم کرنے کی بجائے جنگ کا فیصلہ کیا اور آج ہم جانتے ہیں وہ اس جنگ کے فاتح ٹھہرے۔ بعد کے برسوں میں وہ ذیابطیس سے متعلق مختلف آگاہی پروگراموں میں شرکت کرتے نظر آئے۔ 1995 میں وسیم اکرم کی ہما مفتی سے شادی ہوئی، وہ ایک سلجھی ہوئی اور خوبرو خاتون تھیں۔ ان سے دو بچے تیمور اور اکبر پیدا ہوئے۔ 2009 میں مختلف اعضا ناکارہ ہونے کی وجہ سے وہ انتقال کر گئیں۔ 2013 میں انہوں نے ایک آسٹریلوی خاتون سے شادی کرلی۔ دسمبر 2014 میں ان کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوئی۔ وسیم اکرم کرکٹ کے ساتھ دیگر وجوہات کے بنا پر بھی خبروں میں رہے۔ شروع شروع میں تو تنازعات اور میچ فکسنگ کے الزامات تھے۔ ساتھی کھلاڑیوں نے بھی اُن پر متعدد الزامات لگائے۔ بعد میں خبروں میں رہنے کا سبب ان کی بین الاقوامی شہرت ٹھہری۔ وہ آئی پی ایل کی ٹیم کولکتہ نائٹ رائیڈرز کے کوچ ہوگئے۔ اس ٹیم کو فاتح بنایا۔ انڈیا میں کرکٹ ایکسپرٹ کے طور پر بھی وہ بہت مشہور ہیں۔ اُن کی ڈاکومینٹری کو بھی بہت پسند کیا جاتا ہے۔ گذشتہ برس ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک شخص نے کراچی میں ان پر گن تان دی اور ان کی گاڑی پر فائر کیا۔ اس خبر نے بین الاقوامی توجہ حاصل کی۔ رواں برس ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ کے دوران وہ رپورٹنگ کرتے ہوئے ایک غیر متوقع صورت حال کا شکار ہوگئے تھے۔ ٹی وی دیکھنے والوں کو یوں لگا، جیسے ان پر حملہ ہوا ہے۔ ہندوستان میں پاکستان مخالف جذبات کی وجہ سے پہلے تاثر تو یہی تھا کہ انہیں ہندو انتہا پسندوں نے نشانہ بنایا ہے، مگر جلد یہ معاملہ نمٹ گیا۔

☆ جاوید میاں داد

گزشتہ دنوں بی بی سی نے تیس برس پرانے واقعے پر ایک رپورٹ شائع کی۔ یہ واقعہ 18 اپریل کو شارجہ میں پیش آیا تھا، جب ایک سنسنی خیز میچ کے اختتامی اوور میں ایک پاکستانی بلے باز نے بھارتی بولر کی گیند کو اٹھا کر باؤنڈری سے باہر پھینک دیا تھا۔ بی بی سی کی رپورٹ کے مطابق کوئی ہندوستانی شہری وہ دن یاد نہیں رکھنا چاہتا، مگر کیا کریں، جب جب 18 اپریل کا دن آتا ہے، زخم پھر ہرا ہو جاتا ہے۔ وہ دن، جاوید میاں داد کا دن تھا۔ اس عظیم کھلاڑی کا دن، جو اپنی خداداد صلاحیتوں اور ناقابلِ شکست جذبے کے طفیل پاکستان کو آسمان کی بلندی پر لے گیا۔ ناقدین کرکٹ متفق ہیں کہ یہ میاں داد ہی تھا، جس کے 18 اپریل کے کارنامے نے پاکستانی کرکٹ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ جاوید میانداد نے آخری اوور کی آخری گیند پر چھکا لگا کر پاکستان کو ایشیا کپ کا فاتح بنادیا۔ ایک سروے کے مطابق وہ دنیائے کرکٹ کے پانچ سنسنی خیز مقابلوں میں سے ایک تھا۔ اس روز آخری گیند پر

پاکستان کو چار رنز کی ضرورت تھی... آخری وکٹ تھی، جاوید میانداد 110 رنز پر کھیل رہے تھے۔ اور فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ اپنی سمت آنے والی گیند کو باؤنڈری سے باہر پھینک دیں گے۔ چیتن شرما کی گیند کو انہوں نے آگے بڑھ کر فل ٹاس بنایا اور ایک زوردار ہٹ لگائی... اگلے ہی پل پاکستان کا نام آسمان کی بلندی پر چمک رہا تھا۔ یاد رہے کہ اس ٹورنامنٹ سے قبل پاکستان نے ون ڈے کا کوئی بڑا ٹورنامنٹ نہیں جیتا تھا۔

پاکستان کا یہ عظیم ہیرو 12 جون 1957 کو کراچی میں پیدا ہوا۔ کرکٹ رگوں میں خون بن کر دوڑتی تھی۔ جذبہ بلند تھا مگر اس زمانے میں ٹیسٹ کرکٹ میں جگہ بنانا سہل نہیں تھا، کیسے کیسے لیجنڈ تھے مگر نوجوان جاوید بھی دھن کا پکا تھا۔ جو ٹھان لیتا، کر گزرتا۔ اسی جذبے کے طفیل اس نے عالمی شہرت حاصل کی۔ 1975 تا 1996 انتہائی مشکل محاذوں پر پاکستان کی نمائندگی کی اور خود کو منوایا۔

وہ ایک عرصے تک ٹیسٹ میچوں میں پاکستان کی طرف سے سب سے زیادہ اسکور کرنے والے بلے باز رہے۔ کچھ حلقے انہیں پاکستانی تاریخ کا سب سے مستند اور قابلِ اعتبار کھلاڑی بھی ٹھہراتے ہیں۔ ایک سچا فائٹر، ایک جینئس، جس کا بلا غضب کے کمالات دکھاتا۔ بلکہ جس کی ذہانت بھی مخالفین کو پریشان رکھتی۔ اس ضمن میں مایۂ ناز ہندوستانی کھلاڑی سنیل گواسکر نے ایک قصہ سنایا۔ کہتے ہیں۔ پاک بھارت میچ تھا۔ ہم نے ایک نیا اسپنر کھلایا تھا۔ جاوید بیٹنگ کر رہے تھے۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ بولر اگر سیٹ ہو گیا، تو مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ انہوں نے بولر کو ڈسٹرب کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ سیدھے بلے سے گیند روکتے۔ بولر گیند اٹھانے آتا تو پوچھتے: "ہیلو، ہوٹل میں تمھارے کمرے کا نمبر کیا ہے؟"

بالر بڑا اسٹپٹایا، مگر خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد پھر گیند روکی۔ بولر قریب آیا، تو پھر یہی سوال داغا۔ اب وہ ذرا بوکھلا گیا۔ میں (سنیل گواسکر) سلیپ میں کھڑے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وکٹ کیپر بھی پریشان تھا۔ اگلی بار جاوید نے یہ سوال کیا، تو بولر بھڑک اٹھا۔ "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

جاوید میاں داد نے جواب دیا۔ "اس کمرے تک چھکا مارنا ہے!"

اس واقعے سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ نفسیاتی جنگ لڑنے کے ماہر تھے۔ اور یہ جنگ انہوں نے مخالفین ہی سے نہیں، اپنوں کے خلاف بھی لڑی۔ انہیں پاکستانی ٹیم میں شدید مخالفت کا سامنا رہا۔ بالخصوص ان کے اور عمران خان کے روابط انتہائی کشیدہ رہتے۔ یہ دو عظیم کھلاڑیوں کی انا کا ٹکراؤ تھا۔ کہتے ہیں، وہ دونوں ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کرتے تھے، مگر میدان میں اترتے ہی وہ سب بھول جاتے۔ اسی جذبۂ الوطنی نے پاکستان کو 92ء کا ورلڈ کپ جتایا۔ وہ منظر کون بھول سکتا ہے، جب جیت کے بعد ہاتھ میں پاکستان کا جھنڈے تھامے میاں داد عمران خان سے بغل گیر ہوئے تھے۔ عمران کے جانے کے بعد وسیم اکرم بورڈ کے پسندیدہ کھلاڑی بن گئے۔ انہیں کپتانی سونپنا عظیم میاں داد کے ساتھ زیادتی تھی۔ اسی طرح کے مسائل کے ساتھ ان کا کیریر اختتام کو پہنچا۔ انہوں نے 96ء میں ہندوستان کے خلاف اپنا آخری ون ڈے میچ کھیلا تھا۔

اُن کا کیریئر تقریباً 21 سالوں پر محیط ہے۔ ایک روزہ بین الاقوامی میچوں میں کسی کھلاڑی کا 20 سال اور 272 دنوں تک کھیلنا طویل ترین کیریر تصور کیا جاتا ہے۔ انہوں نے چھ ورلڈ کپ مقابلوں میں شرکت کی۔ 1975 میں پہلی بار ورلڈ کپ کے میدانوں میں اترے تھے، آخری بار 1996 کے مقابلوں میں نظر آئے۔ چھ ورلڈ کپ کھیلنا بھی ایک ریکارڈ ہے۔ انہوں نے 19 سال کی عمر میں، نیوزی لینڈ کے خلاف قذافی اسٹیڈیم میں 9 اکتوبر 1976 کو اپنا پہلا ٹیسٹ میچ کھیلا تھا۔ کیریئر کی پہلی اننگز میں، میچ کے پہلے ہی دن سنچری بنا کر شائقین کرکٹ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ دوسرے پاکستانی بلے باز تھے، جس نے پہلے ٹیسٹ میں سنچری اسکور کی۔ ساتھ ہی وہ ٹیسٹ سنچری بنانے والے کم عمر ترین کھلاڑی بھی تھے۔ برسوں بعد یہ ریکارڈ محمد اشرافل نے توڑا۔

اس سیریز میں سنچری ان کا اکلوتا کارنامہ نہیں تھا۔ سیریز کے تیسرے میچ میں جو 30 اکتوبر 1976 کو نیشنل اسٹیڈیم کراچی میں کھیلا گیا، انہوں نے جادوئی ڈبل سنچری اسکور کی اور ڈبل سنچری اسکور کرنے والے کم عمر ترین بلے باز کا ریکارڈ بھی اپنے نام کر لیا۔ انہوں نے ویسٹ انڈیز کے کھلاڑی جارج ہیڈلی کا 46 سال پرانا ریکارڈ توڑا تھا۔ جاوید میاں داد کا ریکارڈ اب بھی قائم ہے۔

اس ٹیسٹ سیریز میں انہوں 126 کی اوسط سے 504 رنز اسکور کیے، مگر انگلینڈ میں وہ ناکام رہے۔ انہوں نے ان ناکامیوں کو ورد سر نہیں بنایا۔ بھارت کے دورۂ پاکستان کے موقع پر انہوں نے دو متاثر کن سنچریاں اسکور کیں۔ 1979 میں نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کی سیریز میں بھی ان کی کارکردگی خاصی اچھی رہی۔ نیوزی لینڈ کے خلاف کرائسٹ

چرچ میں 160 رنز اسکور کر کے اپنی پانچویں اور بیرونِ ملک پہلی سنچری بنائی۔

1982 میں بھارت کا دورہ یادگار رہا۔ انہوں نے مجموعی طور دو سنچریوں اور ایک نصف سنچری کے ساتھ 594 اسکور بنائے، جس میں حیدر آباد میں کھیلی گئی 280 رنز کی ناقابلِ شکست اننگز بھی شامل تھی۔ انہوں نے اپنے کیریئر میں چھ ڈبل سنچریاں اسکور کی ہیں، جو کسی بھی پاکستانی کی سب سے زیادہ ڈبل سنچریاں ہیں۔ عالمی فہرست میں ڈبل سنچریوں کے لحاظ سے وہ چوتھے نمبر پر ہیں۔

وہ ون ڈے کے بھی عظیم کھلاڑی تھے۔ انہوں نے 233 مقابلوں میں 41.70 کی متاثر کن اوسط سے 7381 رنز بنائے، جن میں 8 سنچریاں اور 50 نصف سنچریاں شامل تھیں۔

انہوں نے بطور کوچ بھی فرائض انجام دیے۔ ان کی کوچنگ میں پاکستانی ٹیم کی کارکردگی حیران کن رہی۔ بھارت کے خلاف صحارا کپ کی فتح، اسی طرح 99ء کے ورلڈ کپ سے پہلے بھارت کو بھارت میں شکست۔ ایشیا کپ کی جیت... ایک طویل فہرست ہے، مگر ہر بار تنازعات اور اختلافات نے انہیں ٹیم سے دور کر دیا۔ بعد میں بھی انہوں نے بورڈ میں کئی عہدے سنبھالے۔

☆ جان شیر خان

اسکواش کے عظیم کھلاڑی... فخرِ پاکستان جان شیر خان 15 جون 1969 کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بہادر خان پاکستان ایئر فورس سے وابستہ تھے۔ اُن کے دو بھائی محب اللہ خان جونیئر اور اطلس خان بھی اسکواش کے میدانوں میں آئے، باصلاحیت وہ بھی تھے، مگر جان شیر خان تو ایک ہی تھا۔ اُس وقت کون سوچ سکتا تھا کہ پشاور کا یہ لڑکا کل ستارہ بن کر یوں چمکے گا کہ جہانگیر خان جیسے دیو قامت کھلاڑی کی چمک ماند پڑ جائے گی۔ کہاں کھلاڑی ایک بار ورلڈ اسکواش ٹورنامنٹ جیتنے کی آرزو کرتے ہیں، اور ایک

جان شیر خان تھے، جنھوں نے آٹھ مرتبہ ورلڈ اوپن اسکواش ٹورنامنٹ جیتا۔ قصہ یہیں تمام نہیں ہوتا۔ چھ مرتبہ برٹش اوپن اسکواش ٹورنامنٹ ان کے نام رہا۔ وہ 99 پروفیشنل ٹائٹلز جیتنے کا اعزاز رکھتے ہیں۔ ایک اور ٹائٹل ان کے ہاتھ آجاتا، تو سنچری ہو جاتی۔ حکومت پاکستان نے جان شیر خان کو 14 اگست 1988 کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔ 14 اگست 1997 کو ہلال امتیاز ... ان کے حصے میں آیا۔

فتوحات کی گاڑی چل پڑی تو پھر کسی اسٹیشن پر نہیں رکی۔ ایسا سگنل ہی نہیں بنا تھا جو انہیں رکنے پر مجبور کر سکتا۔ 1986 میں پہلی مرتبہ ورلڈ جونیئر اسکواش چیمپئن شپ جیتنے کا اعزاز حاصل کیا۔ 1987 میں انہوں نے پہلی مرتبہ ورلڈ اوپن اسکواش ٹورنامنٹ جیتا۔ 21 اکتوبر کو برمنگھم میں جان شیر خان نے آسٹریلیا کے کرس ڈٹمار کو شکست دے کر پہلی مرتبہ عالمی چیمپئن شپ جیتنے کا اعزاز اپنے نام کیا۔ اسی وقت ناقدین نے اعلان کر دیا وہ جہانگیر خان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آنے والے برسوں میں کئی ریکارڈ قائم کرے گا۔ یہ اندازے درست ثابت ہوئے۔ انہوں نے کچھ زیادہ ہی تیزی سے کامیابی کے زینے عبور کیے۔ لوگ ان کی رفتار پر حیران رہ گئے۔ 1992 میں پہلی مرتبہ انہوں نے برٹش اوپن اسکواش ٹورنامنٹ جیتا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

جہانگیر خان پانچ سال تک ناقابلِ شکست رہے، 10 مرتبہ برٹش اوپن اسکواش چیمپئن شپ جیتی، وہ سب سے کم عمر ورلڈ اوپن اسکواش چیمپئن ہونے کا اعزاز رکھتے ہیں۔ انہوں نے آٹھ مرتبہ ورلڈ اوپن اسکواش چیمپئن شپ جیتی۔ یہ ایک ریکارڈ ہے۔

1998 میں انہوں نے بین الاقوامی اسکواش سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا مگر وہ اسکواش سے مکمل کنارہ کش نہیں ہوئے۔ یورپ میں نمائشی میچ کھیلتے رہے۔ 2002 میں بین الاقوامی اسکواش میں واپسی کا اعلان کر دیا۔ ماہرین کا خیال تھا کہ اب ان میں پہلی جیسی بات نہیں رہی اور یہ خدشات غلط نہیں تھے۔ وہ ڈچ اوپن کے پہلے ہی راؤنڈ میں آؤٹ ہو کر ایک بار پھر میدانوں سے دور ہو گئے۔ خیر خواہوں نے مشورہ دیا کہ اب کوچنگ کی سمت نکل جائیں مگر ان کے اندر کا کھلاڑی واپسی کا تقاضا کرتا رہا۔ 2004 میں وہ پھر ایک بڑے ٹورنامنٹ میں ایکشن میں نظر آئے۔ انہوں چیف آف نیول اسٹاف ٹورنامنٹ میں حصہ لیا تھا مگر کوارٹر فائنل میں

دوسرے درجے کے ایک مصری کھلاڑی سے ہار گئے۔
2007 میں اس عظیم کھلاڑی نے پھر واپسی کی کوشش کی۔ انہیں نارتھ لندن اوپن اسکواش ٹورنامنٹ کھیلنے کی پیشکش ہوئی تھی، اس میں وہ وائلڈ کارڈ انٹری تھے۔ اس کا معاوضہ بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ انٹرنیشنل اسکواش میں واپسی کا اعلان کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی کہا کہ کچھ برس پہلے جب انہوں نے میدانوں میں قدم رکھا تھا، انہیں گھٹنے اور کمر کی انجری نے گھیر لیا تھا جس کا بروقت سدباب نہیں ہوسکا اور وہ ان فٹ ہوگئے مگر اب وہ فٹ ہیں۔ جان شیر خان پھر میدان میں اترے مگر اب ان کا دور گزر چکا تھا۔ توانائی اور جذبہ وقت کے ساتھ گھٹتا جاتا ہے۔ وہ ایک عرصے تک اسکواش فیڈریشن پر تنقید کرتے رہے۔ انہیں یہ شکایت بھی تھی کہ ارباب اختیار نے ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جس کے وہ حقدار تھے۔ ساتھ ہی جونیئر کھلاڑیوں کو بھی گروم نہیں کیا۔

دیگر سپر اسٹارز کے مانند ان کے بھی اسکینڈلز سامنے آئے۔ یہ کہا گیا کہ وہ خود کو نہ صرف جہانگیر خان سے بڑا کھلاڑی تصور کرتے ہیں بلکہ اپنے اس خیال کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ دراصل یہ دو عظیم کھلاڑیوں کی جنگ تھی جس کا ایک واضح پس منظر تھا۔ جب جان شیر خان نے کم عمر ترین ورلڈ چیمپئن بننے کا اعزاز حاصل کیا، اس وقت بین الاقوامی اسکواش پر جہانگیر خان چھائے ہوئے تھے۔ وہ ایک اسٹار تھے۔ ابتدا میں جب دونوں کا سامنا ہوا تو جہانگیر کی عظمت نے جان شیر خان کو شکست دے دی۔ مگر ان شکستوں پر جان شیر خان دل برداشتہ نہیں ہوئے۔ وہ پوری قوت سے پلٹے۔ 1987 میں جان شیر خان نے جہانگیر خان کو ہانگ کانگ اوپن کے سیمی فائنل میں شکست دے کر سنسنی پھیلا دی اور پاکستان میں ان کی مداحوں کی تعداد بڑھنے لگے۔ اگلے دس مقابلوں میں بھی جان شیر خان کا پلہ بھاری رہا۔ فتوحات کے اس سلسلے نے جہانگیر خان کے چاہنے والوں کی نظر میں جان شیر خان کو ولن بنا دیا۔ تاریخ میں اس واقعے کو پیشہ ورانہ رقابت کا نام دیا جائے گا۔

2006 میں رقم کی لین دین کے ایک معاملے میں ان پر مقدمہ بھی بنا۔ وہ گرفتار ہوئے اور انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ اخباری رپورٹس کے مطابق مقدمہ پشاور کے مضافات میں ایک خاتون نے دائر کیا تھا۔ الزام لگایا گیا کہ جان شیر اور ان کے کئی دیگر ساتھیوں نے اسے اس کے مکان سے زبردستی بیدخل کرنے کی کوشش کی تھی۔

ناقدین کے مطابق پاکستان... جو کبھی اسکواش کے میدانوں پر راج کیا کرتا تھا، اس کے دور اقتدار کا آخری بادشاہ جان شیر خان تھا۔ ان کی اسکواش سے علیحدگی کے بعد پاکستان اس کھیل پر اپنی گرفت نہیں رکھ سکا۔ جان شیر خان کے بیٹے نے بھی اسکواش کے میدان میں قدم رکھا۔ 2011 میں انہیں پارکنسن کے مرض کی تشخیص ہوئی۔

☆یوسف رضا گیلانی

کسی ریاست کا وزیراعظم بننا بڑے اعزاز کی بات ہے، اس کے لیے بڑی قربانیاں دی جاتی ہیں، جدوجہد کا طویل سفر ہے۔ البتہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں حالات ذرا مختلف ہیں۔ یہاں چار مارشل لا لگ چکے ہیں اور ان زمانوں کے وزیراعظم فیصلوں کے لیے آمر کی طرف دیکھا کرتے تھے، محمد خان جونیجو اور شوکت عزیز کی مثال سامنے ہے۔ یوسف رضا گیلانی وزیراعظم بنے طاقت کا محور آصف علی زرداری تھے۔

یوسف رضا گیلانی کے لیے وزارت عظمیٰ حقیقی معنوں میں کانٹوں کا تاج تھی۔ ملک بے شمار مسائل میں گھرا ہوا تھا۔ دہشت گردی ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جارہی تھی۔ پرویز مشرف کے جانے کے بعد جمہوری حکومت کو کئی مصائب درپیش تھے۔ پھر اختیارات کا فقدان، اسی باعث سیاست کے وسیع تجربے کے باوجود یوسف رضا گیلانی اس کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکے، جس کی ان سے اُمید کی جارہی تھی۔

مخدوم یوسف رضا گیلانی کی مادری زبان سرائیکی ہے۔ وہ 9 جون 1952 کو ضلع ملتان کے ایک ایسے بااثر جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوئے، جو کئی نسلوں سے سیاست میں تھا۔ پیر مریدی کا بھی مضبوط سلسلہ تھا۔ ملتان کی درگاہ حضرت موسیٰ پاک کا گدی نشین ہونے کی باعث اُن کا خاندان پیروکاروں کا وسیع حلقہ رکھتا ہے۔ انہوں نے 1970 میں گریجویشن کی۔ 1976 میں صحافت میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ سیاست میں آنا فطری تھا۔ ملتان میں

اثر و رسوخ کے باعث وہ کئی پارٹیوں کے اوّلین انتخاب تھے۔ انہوں نے اپنی عملی سیاست کا آغاز 1978 میں کیا۔ 1983 میں انہوں نے ضلع کونسل کے انتخابات میں حصہ لیا اور پیپلز پارٹی کے رہنما سید فخر امام کو شکست دے کر چیئرمین منتخب ہوئے۔ 1985 میں انہوں نے ضیاء الحق کے غیر جماعتی انتخابات میں خود کو آزمایا۔ وزیراعظم محمد خان جونیجو کی کابینہ میں وزیر ہاؤسنگ و تعمیرات اور بعد ازاں وزیر ریلوے رہے۔ 88ء میں حالات بدلنے لگے۔ پیپلز پارٹی پھر ابھرنے لگی۔ وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اسی برس ہونے والے عام انتخابات میں انہوں نے پی پی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا۔ ان کے مدمقابل نواز شریف تھے، جنھیں شکست ہوئی۔ یوسف رضا گیلانی وفاقی کابینہ کا حصہ بنے۔ محترمہ نے انہیں سیاحت اور ہاؤسنگ و تعمیرات کی وزارت دی۔ وہ الزامات کا زمانہ تھا۔ ان کے خلاف اختیارات کے ناجائز استعمال کے الزامات تھے۔ نیب نے ریفرنس دائر کیا۔ کئی برس بعد، مشرف دور میں راولپنڈی کی ایک احتساب عدالت نے یوسف رضا گیلانی کو قومی اسمبلی سیکریٹریٹ میں تین سو ملازمین غیر قانونی طور پر بھرتی کرنے کے الزام میں دس سال قید با مشقت کی سزا سنائی۔ البتہ 2006 میں عدالتی حکم پر یوسف رضا گیلانی کو رہائی مل گئی۔ یوسف رضا گیلانی نے اڈیالہ جیل میں اسیری کے دوران اپنی یادداشتوں پر مبنی پر ایک کتاب "چاہ یوسف سے صدا" بھی لکھی۔

1990 میں انہوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ وہ ن لیگ کے اوج کا زمانہ تھا۔ میاں صاحب نے حکومت بنائی۔ 1993 میں پی پی قوت کے ساتھ واپس آئی۔ انہیں پھر کامیابی ملی۔ گیلانی صاحب نے بلدیات اور دیہی ڈیولپمنٹ کے وزیر کی حیثیت سے حلف لیا۔ محترمہ کی جانب سے انہیں قومی اسمبلی کے اسپیکر کے لیے نامزد کیا گیا۔ انہوں نے یہ اہم ترین عہدہ سنبھالا اور 1997 میں پی پی کی حکومت کے خاتمے تک اس عہدے پر رہے۔ ایک بار پھر ن لیگ نے حکومت بنائی۔ پی پی اور یوسف رضا گیلانی کے لیے وہ مشکل دور تھا۔ مشرف دور کا آغاز ان کے لیے خوش آیند ثابت نہیں ہوا۔ وہ کرپشن کے الزامات میں زیر عتاب آئے، مگر این آر او نے ایک راستہ نکال ہی لیا۔

وہ فروری 2008 کے انتخابات میں ملتان سے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر پانچویں مرتبہ رکن اسمبلی منتخب ہوئے ہیں۔ وہ عجیب صورت حال تھی۔ زرداری اور میاں صاحب میں قربتیں بڑھ رہی تھیں۔ مخدوم امین فہیم کو محترمہ نے اپنے قتل سے پہلے وزیراعظم نامزد کیا تھا، زرداری صاحب نے اوائل میں اس فیصلے کو برقرار رکھنے کا عندیہ دیا، مگر اب مخدوم امین فہیم اور زرداری صاحب میں فاصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ بالآخر یوسف رضا گیلانی کو وزیراعظم نامزد کیا گیا۔ وہ پاکستان کے 24 ویں وزیراعظم تھے۔ عہدہ سنبھالنے کے بعد وہ چار سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ 19 جون 2012 کو توہین عدالت کے مقدمہ میں سزا ہونے کے بعد ان کی پارلیمانی رکنیت ختم ہو گئی اور وہ عہدے سے برطرف ہو گئے۔

توہین عدالت کا معاملہ اس مسئلے کی جانب اشارہ کرتا ہے، جو گیلانی صاحب کو اپنے دور میں درپیش رہا۔ این آر او کالعدم قرار دیے جانے کے بعد عدالت عظمیٰ نے وفاقی حکومت کو حکم دیا کہ آصف علی زرداری کے خلاف سوئس عدالتوں میں زیر سماعت مقدمات کو دوبارہ کھولنے کی درخواست دی جائے۔ وزیراعظم دو سال ٹال مٹول سے کام لیتے رہے۔ اپنی پارٹی کے سربراہ کے خلاف بھلا کیسے حکم جاری

کرتے۔ عدالت نے وارننگ دی، ڈیڈ لائن دی، مگر گیلانی صاحب کے لیے یہ کسی طور ممکن نہیں تھا۔ ان کے تاخیر حربوں کو توہین عدالت کے زمرے میں ڈالتے ہوئے فروری 2012 میں ان پر فرد جرم عاید کر دی گئی۔ 26 اپریل 2012 کو عدالت نے انہیں توہین عدالت پر 30 سیکنڈ کی سزا سنائی، وہ پارلیمان کی رکنیت سے نااہل ہو گئے۔ وزیر اعظم کا عہدہ ہاتھ سے لمحوں میں پھسل گیا۔

بعد کے دور میں بھی ان پر کرپشن کے کئی الزامات لگے۔ 2013 کے الیکشن میں انہیں بھاری صدمے سے گزرنا پڑا۔ ان کے بیٹے کو اغوا کر لیا گیا۔ آج پی پی کو پنجاب میں شدید مشکلات درپیش ہیں، گیلانی صاحب جیسے سینئر سیاست دان اسے اس مشکل سے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر فی الحال کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

☆ میاں طفیل

انہوں نے جو صحیح جانا اس کے لیے جدوجہد کی۔ جو ان کا نظریہ تھا، اس کے نفاذ کے لیے دن رات ایک کر دیے، اس بے لوث جدوجہد نے لاکھوں چاہنے والے عطا کیے، انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مخالفین بھی بہت تھے، اور کیوں نہ ہوں، جس زمانے میں انہوں نے پاکستان کی سب سے بڑی مذہبی جماعت کا علم سنبھالا، اس وقت ملک واضح طور پر دو طبقات میں بٹا ہوا تھا، دایاں بازو اور بایاں بازو۔ دونوں پرقوت، دونوں جذبے سے سرشار۔ تو ان کے مخالفین ہزاروں میں تھے۔ البتہ ان کے نظریات پر تنقید کرنے والوں نے کبھی ان پر بدعنوانی کا الزام نہیں لگایا۔ ان کا دامن بے داغ تھا۔

یہ میاں طفیل محمد کا ذکر ہے، جن کے بغیر جماعت اسلامی پاکستان کا تذکرہ ادھورا ہے۔ انہوں نے اس تنظیم کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ عشروں اس سے وابستہ رہے۔ اوائل میں اس کے سیکریٹری جنرل کا عہدہ سنبھالا، 1966 سے 1971 تک مغربی پاکستان کے امیر رہے۔ پھر نائب امیر کا عہدہ ان کے پاس آیا۔ نومبر 1972 تا اکتوبر 1987 وہ امیر جماعت اسلامی پاکستان رہے۔ وہ بڑا پر آشوب زمانہ تھا۔ سرد جنگ عروج پر۔ بھٹو کے دور کا خاتمہ ہوا، ضیا الحق کی آمد ہوئی، افغانستان پر سوویت یونین کی یلغار، پھر امریکا کا میدان میں اترنا اور پاکستان کا اس کا ساتھ دینا... الغرض وہ اس خطے کی تاریخ کا نازک دور تھا۔ پاکستان میں مارشل لا کی چھتری تلے مذہبی بیانیہ لکھا جا رہا تھا اور جماعت اسلامی میاں طفیل کی قیادت میں اس کی ترویج میں جتی تھی۔

میاں طفیل محمد نومبر 1913 میں مشرقی پنجاب کی ریاست کپورتھلہ کے ایک کاشت کار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں بڑے ہیں۔ خاندان مذہبی رجحان کا حامل تھا۔ اُن کے والد معلم تھے۔ جفاکش آدمی۔ پڑھاتے بھی اور کاشت کاری بھی کیا کرتے تھے۔

ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کی۔ پھر قصبہ بھڈالہ کے اسکول میں داخلہ لے لیا۔ میٹرک کا امتحان کپورتھلہ کے ہائی اسکول سے پاس کیا۔ پری انجینئرنگ سے ایف ایس سی کا مرحلہ طے ہوا۔ اب لاہور کا رخ کیا۔ نیا شہر، نیا ماحول۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج سے بی ایس سی آنرز کیا۔ 1937 میں پنجاب یونیورسٹی لا کالج سے ایل ایل بی کا مرحلہ طے ہوا۔

وہیں سابق چیف جسٹس آف پاکستان محمد منیر سے اکتساب فیض کیا۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد جالندھر میں شیخ محمد شریف جیسے سینئر اور قابل وکیل کی سرپرستی میں وکالت شروع کی۔ پھر کپورتھلہ منتقل ہو گئے اور انفرادی حیثیت میں پریکٹس شروع کرنے لگے۔ کچھ محققین کے مطابق وہ ریاست کپورتھلہ کے پہلے مسلمان وکیل تھے۔

اس زمانے میں مودودی صاحب کا چرچا تھا۔ نئی نسل کے لیے ان کے نظریات اور فکر میں بڑی کشش تھی۔ ان کی کتب ملک بھر میں پھیلتی جا رہی تھیں۔ میاں طفیل بھی سید ابو الاعلیٰ مودودی کے رسالے ترجمان القرآن کے مستقل قاری تھے۔ جب جماعت اسلامی کا تاسیسی اجتماع ہوا، تو انہوں نے اس میں شرکت کی۔ وہ مودودی صاحب کی فکر سے اتنے متاثر ہوئے کہ خود کو کلی طور پر جماعت کے لیے وقف کر دیا۔ جنوری 1942 میں انہوں نے وکالت کو خیرباد کہہ دیا۔ اب جماعت اسلامی ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ گزر بسر کے لیے تجارت کا پیشہ اختیار کیا، مگر دین کی تبلیغ اولین ترجیح تھی۔ ایسے میں کاروبار کہاں پنپ سکتا تھا۔ خاصے معاشی مسائل رہے، مگر انہوں نے

ہمت نہیں ہاری۔

اس وقت کے امیر جماعت اسلامی، لاہور ملک نصر اللہ خان کی تجویز پر انہیں قیم مقرر کیا گیا۔ یہ بڑی ذمے داری تھی۔ اپریل 1944 میں یہ عہدہ سنبھالا۔ انہوں نے بطور منتظم اپنی قابلیت کا بھرپور استعمال کیا۔ رابطہ مہم تیز کی، ارکان کو قریب لائے اور جماعت کو فعال کیا۔ اس ضمن میں ہندوستان بھر کے دورے کیے اور مسلمانوں کو جماعت کے پلیٹ فورم پر متحد کیا۔ ان دوروں میں ان کئی سیاسی اور مذہبی رہنماؤں سے ملاقات ہوئی۔ ایک معنوں میں یہ مستقبل کے امیر جماعت اسلامی کی تربیت کا دور تھا۔

وہ پُرآشوب دور تھا۔ تقسیم قریب تھی، انگریز سرکار کی جھنجلاہٹ نے شدت اختیار کر لی۔ مخالفین زیرِ عتاب آئے مگر میاں طفیل ہر طرح کی سختیاں برداشت کرنے کے لیے تیار تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان کی نومولود حکومت انہیں اپنے لیے خطرہ تصور کرنے لگی۔ اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریک اپنے عروج پر تھی اور وہ اس کی اگلی صفوں پر لڑ رہے تھے۔ اسی تحریک کے دوران 4 اکتوبر 1948 کو انہیں گرفتار کر کے قصور جیل منتقل کیا گیا۔ کچھ روز بعد ملتان جیل بھیج دیا گیا۔ مولانا مودودی بھی وہیں تھے۔ ان کی صحبت نے جیل کی سختیوں کا اثر زائل کر دیا۔ انہوں نے مولانا مودودی سے قرآن اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔

اپریل 1950 میں ان کی نظر بندی کی مدت میں توسیع کر دی گئی، اسی دوران لاہور ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت کسی شخص کو اٹھارہ ماہ سے زیادہ قید نہیں رکھا جا سکتا۔ یوں وہ اور مولانا مودودی ملتان جیل سے رہا ہوئے۔ 1959 میں انہوں نے اسلامک پبلی کیشنز کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد اسلامی و تعمیری لٹریچر کی تجارتی بنیادوں پر اشاعت کا اہتمام کرنا تھا۔ انہوں نے 1965 تک قیم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ جنوری 1966 میں نائب امیر کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی۔ اس دوران وہ جماعت اسلامی، مغربی پاکستان کے امیر بھی رہے، مودودی صاحب اور شوریٰ ان پر اعتماد کرتی تھی۔ 1965 میں جوائنٹ اپوزیشن کا قیام عمل میں آیا، تو میاں طفیل کی مصروفیات میں یکدم اضافہ ہو گیا۔ جمہوریت کی بحالی کے لیے انہوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے طوفانی دورے کیے۔ پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ اور ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی میں جماعت کی نمائندگی کی۔ کچھ حلقوں کا دعویٰ ہے کہ 1969 میں آمریت کے خاتمے اور انتخابات کے انعقاد میں جماعت کی تحاریک کا کردار کلیدی تھا۔

الیکشن نے ایک عجیب و غریب تقسیم پیدا کر دی۔ حالات بگڑنے لگے۔ مشرقی پاکستان میں کشیدگی بڑھ رہی تھی۔ 1971 میں جب مغربی پاکستان سے کوئی لیڈر مشرقی پاکستان جانے کے لیے تیار نہیں تھا، انہوں نے وہاں کا تفصیلی دورہ کیا اور وہاں پاکستان کے دونوں بازوؤں کے اتحاد پر زور دیا۔ بدقسمتی سے ان کی کوششیں ثمرآور ثابت نہیں ہوئیں۔ پاکستان دولخت ہو گیا۔

نومبر 1972 میں انہوں نے امیر جماعت اسلامی پاکستان کا حلف اٹھایا۔ کارکنان کی قیادت سے براہِ راست رابطے کا اہتمام کیا۔ امیر جماعت کی حیثیت سے ملک بھر میں تربیت گاہوں کو فعال کیا اور جماعت کے لٹریچر کی ترویج شروع کی۔ تلاوت قرآن اور درس کی نشستوں کا اہتمام کیا۔

بھٹو سوشلزم کے نعرے کے ساتھ اقتدار میں آچکے تھے۔ مذہبی جماعتیں انہیں اپنا حلیف تصور کرتی تھیں۔ نیپ کی حکومت کے خاتمے کے بعد ولی خان اور اصغر خان بھی ان کے خلاف ہو گئے۔ مارچ 1973 میں اپوزیشن جماعتوں پر مشتمل متحدہ جمہوری محاذ کے قیام میں میاں طفیل نے مرکزی کردار ادا کیا۔ 1973 میں پاکستان کو متفقہ آئین نصیب ہوا، تو کچھ حصہ اس تحریک کا بھی تھا۔ بھٹو دور میں الیکشن ہوئے تو اپوزیشن نے اسے رد کر دیا اور ایک بھرپور تحریک شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں جنوری 1977 پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) کا قیام عمل میں آیا۔ وہ اس کے قائدین میں شامل تھے۔ اس تحریک کے نتیجے میں ڈیڈلاک پیدا ہو گیا۔ وہ بھٹو سے مذاکرات کرنے والی تین رکنی کمیٹی میں شامل تھے، مگر معاہدے میں تاخیر کے سبب ضیاالحق کو جمہوریت پر شب خون مارنے کا موقع مل گیا۔ اوائل میں تو جماعت نے جمہوریت کی حمایت کی مگر بعد میں وہ ضیاء کابینہ میں شامل ہوئے۔ صحافت کو پابند سلاسل کرنے میں آمر کا ہاتھ بٹایا۔ افغان وار کے دوران پاکستان میں سوویت یونین کی مخالفت کے لیے زمین تیار کی۔

اکتوبر 1987 تک وہ امیر جماعت اسلامی رہے۔ ان کے بعد قاضی حسین احمد نے امارت سنبھالی۔ امارت چھوڑنے کے بعد وہ ادارہ معارف اسلامی، منصورہ کے چیئرمین اور عالمی مساجد کونسل کے ذمے دار رہے۔ دھیرے دھیرے میاں طفیل کی صحت گرنے لگی۔ 24 جون 2009 جمعرات کو لاہور میں انتقال ہوا۔ ان کی عمر پچانوے برس تھی۔

☆ملک معراج خالد

یہ عام خیال ہے کہ پاکستانی سیاست پر جاگیردار اور وڈیرے چھائے رہے۔ ابتدا ہی میں بیوروکریسی نے سازشیں شروع کر دیں، پھر مارشل لا لگ گیا۔ بھٹو صاحب آئے تو کچھ اُمید پیدا ہوئی مگر ان کی جیت کے بعد جاگیرداروں کا پارٹی میں اثر بڑھنے لگا۔ ڈاکٹر مبشر حسن اور معراج محمد خان جیسے لوگ الگ ہو گئے۔ بعد میں بھی کچھ اُجلے ستھرے، نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے سیاست دان نے اپنی سی کوشش کی۔ مگر سسٹم اتنا بگڑ چکا تھا کہ نیک نیتی کے باوجود ایسے افراد مؤثر تبدیلی لانے میں ناکام رہے۔ اس فہرست میں ایک نام ملک معراج خالد کا بھی ہے، جنہیں ایک زمانے میں نگران وزیراعظم کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔

اُنھیں ایک سادہ اور ملنسار انسان کے طور پر شناخت کیا جاتا ہے، جو مراعات اور کروفر کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔ وہ اکثر لاہور کے مال روڈ پر گھومتے ہوئے اور باغ جناح میں سیر کرتے ہوتے نظر آتے۔ رکشوں پر سفر کیا کرتے۔ کوئی سیکیورٹی نہیں ہوتی۔ لوگ ان کے سامنے اپنے مسائل بیان کرتے۔ جب وزیراعظم بنے تو انہوں نے وی آئی پی کلچر کے خاتمہ کی کوشش کی۔ ایئرپورٹ پر عام مسافروں کا راستہ استعمال کیا کرتے تھے۔

ملک معراج خالد 20 ستمبر 1916 کو ضلع قصور کے ایک گاؤں کوٹ رادھاکشن میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک چھوٹے کاشت کار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ محنتی انسان تھے۔ گنتی قابل طلبا میں ہوتی تھی۔ انہوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ خاندانی پس منظر سیاست سے کوئی لگا نہیں کھاتا تھا، مگر اس دور میں طلبا میں سیاسی شعور پایا جاتا تھا۔ پھر وکالت جیسے پیشے نے بھی تربیت کی۔ 60 کی دہائی میں مسلم لیگ کے پلیٹ فورم سے سیاست کا آغاز کیا۔ وہ ایوب خان کا دور تھا۔ تبدیلی کی خواہش تھی۔ ایوب خان کے خلاف ایک پمفلٹ لکھ دیا، جس میں حکومت کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ جب ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خان حکومت سے علیحدگی اختیار کی تو لاہور میں ملک معراج خالد کی بنائی ہوئی تنظیم ایفرو ایشین پیپلز سالیڈریٹی کے پلیٹ فارم سے پہلی بار حزب اختلاف کے رہنما کے طور پر عوام کے سامنے آئے۔

معراج صاحب ترقی پسند افکار کے حامل تھے۔ بعد میں بھٹو نے سوشل ازم کا نعرہ لگایا تو اس جانب متوجہ ہوئے۔ وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہونے والے ابتدائی افراد میں شامل تھے۔ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر لاہور سے 1970 کا الیکشن لڑا اور رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے۔ اُس وقت کے آئین کے تحت ایک رکن قومی اسمبلی کو چھ ماہ کے لیے کسی صوبے کا وزیراعلیٰ بھی منتخب کیا جا سکتا تھا۔ تو وہ پنجاب کے وزیراعلیٰ بنے۔ اس وقت گورنر غلام مصطفی کھر تھے۔ دونوں کے درمیان اختیارات پر خاصا تناؤ رہا۔

بعد میں انھیں ذوالفقار علی بھٹو کی کابینہ میں وفاقی وزیر زراعت بنایا گیا۔ 1977 کے متنازع انتخابات کے بعد قومی اسمبلی میں وہ اسپیکر منتخب کیے گئے۔ کچھ ہی عرصے بعد مارشل لا لگ گیا اور پارلیمنٹ تحلیل ہو گئی۔ آنے والے برسوں میں وہ تحریک بحالی جمہوریت میں پیش پیش رہے۔ یہ مشکل مرحلہ تھا مگر انہوں نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ اس پاداش میں پابند سلاسل بھی رہے۔ 1986 میں بے نظیر بھٹو سیاست میں واپس آئیں۔ اب پی پی پی کا مزاج بدل رہا تھا۔ نصرت بھٹو کی مرکزی حیثیت تحلیل ہونے لگی۔ نظریاتی اور سینئر ارکان پس منظر میں جانے لگے تھے۔ معراج خالد بھی اسی فہرست میں شامل تھے۔ انھیں آہستہ آہستہ پارٹی کے معاملات سے دور کیا جانے لگا۔ 1988 کے انتخابات کے بعد معراج خالد کو قومی اسمبلی کا اسپیکر بنایا گیا۔ البتہ پارٹی پالیسی میں ان کی رائے کی پہلی سی اہمیت نہیں رہی تھی۔

جب صدر غلام اسحاق خان اور فوج کے سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ نے بے نظیر بھٹو کی حکومت کو رخصت کرنے کا حتمی فیصلہ کیا، تو انہوں نے ملک معراج خالد سے رابطہ کیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ بے نظیر بھٹو کے خلاف تحریک عدم اعتماد لائیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہیں وزیراعظم بننے کی پیشکش ہوئی تھی۔ البتہ ان کے ضمیر کو یہ گوارا نہیں ہوا۔ خیر، ان کی مخلص کوششیں محترمہ کی حکومت کو نہیں بچا سکیں۔ حکومت ختم ہو گئی اور میاں صاحب حکومت میں آگئے۔

1993 کے انتخابات میں ملک معراج خالد کے بے نظیر بھٹو سے اختلافات شدت اختیار کر گئے۔ انھیں لاہور کی روایتی نشست پر انتخاب لڑنے کے لیے ٹکٹ نہیں دیا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر پیپلز پارٹی سے دور ہو گئے۔ اسی زمانے میں

انہوں نے اخوان المسلمون نامی تنظیم بنا کر لاہور کے دیہی علاقہ میں اسکول کھولے اور انہیں کامیابی سے چلایا۔ وہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے ریکٹر بھی رہے۔

محترمہ کی دوسری حکومت کی اپنے ہی لائے ہوئے صدر...فاروق احمد خان لغاری سے نہیں نبھ سکی۔ صدر نے حکومت توڑ دی۔ عبوری حکومت میں معراج خالد کو نگران وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ انہوں نے تین ماہ کی مقررہ مدت میں انتخابات کروا کے اقتدار نواز شریف کے سپرد کر دیا۔ گو انہوں نے کبھی باضابطہ طور پر پیپلز پارٹی چھوڑنے کا اعلان نہیں کیا، لیکن وہ پورے ایک عرصے اس سے لاتعلق رہے۔ ملک معراج خالد 13 جون 2003 کو لاہور، پاکستان میں انتقال کر گئے۔

اس ماہ کی شخصیات میں سنتوش کمار اور محترمہ بے نظیر بھٹو بھی شامل ہیں، جن کا تفصیلی تذکرہ پہلے بھی آچکا ہے، مگر ان کی اہمیت کے پیش نظر یہاں مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے۔

☆ سنتوش کمار

سنتوش کمار 25 دسمبر 1925 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام سید موسیٰ رضا تھا۔ ان کا تعلق ایک تعلیم یافتہ خاندان سے تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن میں زیر تعلیم رہے۔ اداکاری کا شوق فلم انڈسٹری کی طرف لے آیا۔ "اہنسا" پہلی فلم تھی۔ پھر پاکستان آگئے۔ 1950 میں ریلیز ہونے والی پنجابی فلم "بیلی" میں نظر آئے۔ ان کی فلم "دو آنسو" نے سلور جوبلی کی۔ انہوں نے ایک کے بعد ایک ہٹ فلم دی۔ انہیں پاکستانی فلم انڈسٹری کا اصل چہرہ قرار دیا جانے لگا۔ پاکستان کا پہلا نگار ایوارڈ بھی فلم "وعدہ" کے لیے سنتوش کے حصے میں آیا۔ فلم "سرفروش" اور "انتظار" بھی مقبول ہوئیں۔ 1965 میں ریلیز ہونے والی پہلی رنگین فلم "نائلہ" کے ہیرو بھی سنتوش ہی تھے۔

صبیحہ خانم اور ان کی جوڑی بہت مقبول ہوئی۔ دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ بالآخر شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ سن 1950 سے 1982 تک وہ چوراسی فلموں میں جلوہ گر ہوئے۔ وہ اپنے دور کے ایک اور معروف ہیرو درپن اور فلم ڈائریکٹر ایس سلیمان کے بھائی تھے۔ پاکستان فلم انڈسٹری کا یہ منفرد فن کار 11 جون 1982 کو انتقال کر گیا۔ انہیں لولی ووڈ کا پہلا سپر اسٹار قرار دیا جا سکتا ہے۔

☆ بے نظیر بھٹو

جس پہلی خاتون نے پاکستان میں وزیراعظم کا منصب سنبھالا، وہ بے نظیر بھٹو ہی تھیں۔ 1988 میں وہ پہلی بار وزیراعظم بنیں۔

وہ 21 جون 1953 کو پیدا ہوئیں۔ پندرہ برس کی عمر میں اولیول کا امتحان پاس کیا۔ ہارورڈ یونیورسٹی سے 1973 میں پولیٹیکل سائنس میں گریجویشن کیا۔ وہیں سے ایم اے کی سند حاصل کیا۔ 1977 میں وطن لوٹیں۔ یہاں ایک حادثہ منتظر تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ بینظیر بھٹو اور اہل خانہ کے لیے وہ دن انتہائی کٹھن تھے۔

اپریل 1979 میں بھٹو صاحب کو پھانسی ہوئی۔ بے نظیر بھٹو نے آنے والے برسوں میں نظر بندیاں جھیلیں، انہیں جلاوطن رہنا پڑا۔ مارشل لا ختم ہونے کے بعد پاکستان لوٹیں تو ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ ان کی مقبولیت ضیا حکومت کے لیے درد سر بن گئی۔ اسی زمانے میں آصف علی زرداری سے ان کی شادی ہوئی۔ ضیاالحق کی موت کے بعد انتخابات ہوئے، پیپلز پارٹی نے کامیابی حاصل کی۔ محترمہ نے وزیراعظم کا حلف اٹھایا۔ (کچھ محققین انہیں مسلم دنیا کی پہلی وزیراعظم قرار دیتے ہیں) اگست 1990 میں ان کی حکومت کرپشن کے الزامات کی وجہ سے ختم کر دی گئی۔

1993 میں یہ پارٹی پھر ابھر کر آئی۔ بینظیر پھر وزیراعظم بن گئیں، مگر کرپشن ان کی حکومت کو لے ڈوبی۔ اب انہوں نے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کر لی۔ 2007 میں وہ واپس آئیں۔ 18 اکتوبر کو کراچی میں ان پر حملہ ہوا، جس میں وہ معجزانہ طور پر بچ گئیں، مگر 27 دسمبر کو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں انہیں قتل کر دیا گیا۔

سراب

راوی : شہباز ملک

قسط: 110

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب..... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زرو سکی کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی میرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرو سکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرو سکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بختی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر۔۔۔ آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی "شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچا دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا "کنور ہوشیار" ساوی کو لے کر چھپ۔۔۔۔" مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور ساوی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور ساوی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو چیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا چیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کردیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائینائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کرکے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا۔ مگر آگے جا کر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کرکے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہوگیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا "پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کردیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہوگیا۔ ہم ہم چلے جارہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ زنی نے سنبھال لیا۔

کرنل نے باسو کو رسی پھینک کر بچا لیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے کپٹی دبا کر بے ہوش کر دیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے انہوں نے مجھے گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچا دیا، وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو از سرِ نو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریناٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زیرِ لب کہا" اعلان جنگ" میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنہ کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحہ کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈبھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ تبھی سومرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔ مجھے ملزم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا اچھی نہیں تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقہ زادِ راہ کے علاوہ ایک رہبر کو بھی ساتھ کر دیا۔ پھر مجھے روبیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آ گئے۔ سامیرا نے وبیک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔ ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور روبیر کو اٹھا لے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے کہ۔۔۔ ساشا ملی جو گیرٹ کی بیٹی تھی۔ گیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تیاری کر رہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ کو کہ میں سامیرا کے قلعے میں جا نہیں سکتا تھا مگر برف والے کی منشا یہی تھی کہ میں سامیرا کی مدد کروں، میں نے اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور چھاپہ مار جنگ پر تیار ہو گیا۔ آرگون کی فوج نے آ کر سامیرا کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ہم نے فوج کے عقب میں کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان پہنچا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ آرگون میں داخل ہو جاؤں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت شہر میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مرد پر سپاہی تشدد کر رہے ہیں۔ اس مرد، عورت اور بچے کو بچا کر اس کے گھر پہنچایا تھا کہ سپاہیوں کے دوسرے دستے نے مکان کو گھیر کر گھر والوں پر تشدد شروع کر دیا۔ حملے کا سن کر میں نے لائحہ عمل تبدیل کر دیا۔ ایزارٹ نے نیا دستہ تیار کرا دیا پھر ہم خفیہ راستے سے اندر داخل ہوئے اور ریناٹ کے محل پر قابض ہو گئے۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ریناٹ اپنے آدمیوں کے ساتھ تہ خانے میں جا چھپا ہے اور ڈیوڈ شا باسو کے ہمراہ معبد میں چلا گیا ہے۔ اس کے تعاقب میں ہم نکلے تو ایک جگہ فصیل ٹوٹی ہوئی تھی جس سے ہارن اندر آ گیا تھا۔ ہم ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے کہ دیکھا کرنل نے ڈسک بچھا کر جلتی بجھتی روشنی پیدا کر دی۔ گویا مصنوعی رن وے بنا دیا تھا۔ تبھی ایمار کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر گری اس کی آواز سے ہارن بھڑ کے اور درخت یوں ہلا جیسے کوئی چیز اس سے ٹکرائی ہو ایمار پکڑ مضبوط نہ رکھ سکا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ مگر اس کی قسمت اچھی تھی کہ نچلی شاخوں میں اٹک گیا پھر ہم نے حملہ کر کے ہارن کو بھگا دیا۔ وہاں سے ہم واپس اسی عمارت میں آئے روبیر اندر کے حالات پتا کرنے چلی گئی ہم ابھی معبد پر نظریں جمائے کھڑے تھے کہ دیکھا کہ ایک ہاتھ گاڑی میں کسی عورت کی لاش کو باہر لایا جا رہا تھا۔ حالات سنگین ہو گئے تھے کیونکہ ایزارٹ روبیر کی محبت میں باہر نکل گیا تھا۔ اسی وقت میدان میں کرنل اور باسو نکل آئے۔ وہ ہماری طرف آ رہے تھے انہیں دیکھ کر میں بھی پریشان ہوا تھا مگر حوصلے سے کام لیا اور میں ایک باتھ روم میں چھپ گیا۔ کرنل پتا کرنے آیا تھا کہ قیدی عورت باہر کیسے نکلی۔ پہرے دار کو ڈانٹ کر وہ لوگ چلے گئے۔ میں روبیر کی تلاش میں معبد میں گھس گیا اور روبیر کو تلاش بھی کر لیا۔ اس دوران ڈیوڈ شا کی ایک گن بھی ہاتھ لگ گئی۔ میں گن کے ساتھ ایک کمرے میں مقید ہو گیا تھا کہ ڈیوڈ شا نے ایک گیس بم اندر پھینکا۔ میں چکرا کر گر پڑا۔ باسو مجھے کھینچ کر باہر لے آیا۔ میں ڈیوڈ شا سے بحث کر رہا تھا کہ شاہین اندر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ اور لوگ آ گئے ہیں۔ ان کے پاس بھی آتشی اسلحہ ہے اور وہ ہمارے آدمیوں کو مار رہے ہیں۔ ڈیوڈ شا باہر نکلا تھا کہ شاہین نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے چاقو سے اسے ختم کر دیا۔ ڈیوڈ شا لوٹا تو شاہین مر چکا تھا۔ ڈیوڈ نے باسو کو حکم دیا کہ مجھے گولی مار کر باہر آ جائے اسی وقت سلوپ کی طرف سے کسی نے باسو پر فائر کیا۔ باسو اسی کمرے کی طرف دوڑ گیا۔ میں سلوپ پر اترا، سامنے والی عمارت سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس عمارت میں سفیر تھا۔ سفیر نے بتایا کہ ہماری پوری ٹیم وادی میں آ چکی ہے، ہم سب کو راجا عمر دراز لے کر آئے ہیں اور سامیرا جلد حملہ کرنے والی ہے۔ میں نے اسے واپس سامیرا کے پاس بھیج دیا اور ریناٹ کو تہ خانے سے جبراً نکالنے کے لیے محل پہنچا۔ میں نے آگ لگانے والے روغن کے ڈرم منگوا لیے تھے کہ تہ خانے میں گرا کر ان سب کو خوفزدہ کروں گا لیکن عین وقت پر زینی نمودار ہو گئی۔ اس نے ہمیں گن کے نشانے پر لے لیا تھا۔

(اب آگے پڑھیں)

سیٹی کے جواب میں سیٹی سنائی دے گئی تھی گویا وسیم نے اشارہ سمجھ لیا تھا اسی لیے میں تیزی سے اس جانب بڑھ رہا تھا کہ ایک نئی افتاد رونما ہوئی۔ داہنی جانب سے ایک ہارن سامنے آ گیا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان بہت کم فاصلہ تھا۔ وہ گھوڑے سے زیادہ تیز دوڑ سکتا ہے اس لیے یہ فاصلہ اس کے لیے کچھ نہ تھا۔ اب میرے پاس اتنا بھی وقت نہیں تھا کہ میں کسی پیڑ پر چڑھ کر خود کو محفوظ کر لیتا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ ہارن کی انسان دشمنی اظہر من الشمس

ہے۔اس سے کس طرح خود کو محفوظ رکھوں اسی پر غور کر رہا تھا لیکن غور کرنے کا بھی وقت کہاں تھا۔اس لیے کہ اس درندے نے اب غرّانا بھی شروع کر دیا تھا۔شاید وہ پہلے سے ہی غصے میں تھا اس کی وجہ سامنے تھی۔اس کے جسم میں ایک نہیں کئی تیر پیوست تھے جو نشاندہی کر رہے تھے کہ بھٹکتا ہوا اس طرف چلا گیا ہوگا جہاں فوجیں ہیں اور انہوں نے اسے زخمی کر دیا۔

یہ درندہ مقابلے سے فرار نہیں ہوتا۔آخری وقت تک مقابلہ کرتا ہے جب تک دشمن کو ختم نہ کر دے لیکن اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ خوفزدہ ہے۔اتنی بڑی فوج دیکھ کر وہ گھبرا اٹھا ہوگا۔جب تیروں کا مینہ برسا ہوگا تو اس نے فرار ہو جانے میں ہی عافیت سمجھی ہوگی۔اب مجھے اکیلا دیکھ کر انتقام لینے پر اتر آیا ہے۔میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ اس نے اپنی فطرت کے مطابق پیروں کو زور زور سے پٹخنا شروع کیا۔یہ اشارہ تھا کہ وہ حملہ کرنے والا ہے۔اس سے نمٹنے کا بس ایک ہی طریقہ تھا اور میں نے گن سنبھال لی۔شست باندھی اور ایک کے بعد ایک کئی گولیاں داغ دیں۔ایک تو دھماکا اور اس کے ساتھ گولیوں کا اس کے جسم میں اترنا۔وہ چنگھاڑنے کے سے انداز سے چیخا اور گرتا چلا گیا۔

مجھے خطرہ تھا کہ کہیں اس کا کوئی اور ساتھی آس پاس نہ ہو کیونکہ یہ ہمیشہ جوڑے میں نکلتا ہے۔میں متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ سامنے کی جھاڑیاں ہلیں۔میں نے گن کا رخ ادھر کر لیا۔یہ تو اچھا ہوا کہ ٹریگر دبایا نہیں کیونکہ جھاڑیوں کے پیچھے سے وسیم کا چہرہ نمودار ہوا تھا۔وسیم نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اس نے پوچھا ”فائر کس پر کیا تھا؟“

”مقتول سامنے پڑا ہے۔“میں نے اشارے سے دکھایا۔

وسیم نے اس عجیب الخلقت جانور کو دیکھ کر کہا ”یہ ہے کیا؟“

”یہاں کا سب سے خطرناک درندہ۔انتہائی طاقتور۔یہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ میرے پاس گن موجود تھی ورنہ ابھی تم فاتحہ پڑھ رہے ہوتے۔“

وسیم اس کے پاس بیٹھ کر معائنہ کرنے لگا تھا۔کبھی اس کے ہاتھ کو دیکھتا کبھی اس کے گھوڑے جیسے جسم کو اور کبھی اس کے سر کو۔

”بھائی میاں اب اٹھ بھی جاؤ۔اگر اس کا ساتھی کہیں نزدیک ہوا تو وہ بو سونگھتا ہوا آ سکتا ہے۔“

”کاش میرے پاس کیمرا ہوتا تو میں اس کی تصویر کھینچ لیتا۔اگر ایک آدھ یہاں سے پکڑ کر ساتھ لے چلیں تو کیسا رہے گا۔دیکھنے والے ٹوٹ پڑیں گے۔“

”بات تو صحیح ہے لیکن اسے قابو میں رکھنا آسان نہیں۔یہ دس گھوڑے کی طاقت رکھتا ہے اور انسان سے اسے ازلی بیر ہے۔یہ انسان کو دیکھتے ہی پل پڑتا ہے اور ایک منٹ میں چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔“

”اس کے بچے تو ہوں گے۔کسی بچے کو پکڑ لیں گے۔“

”میں نے کہا نا کہ اسے پکڑنا ناممکن سی بات ہے۔“

”میرا دل آ گیا ہے۔سامیرا کے مسئلے سے نمٹ لیں تو اس پر غور کریں گے۔جاتے وقت میں ہر حال میں اس قبیل کا جانور لے جاؤں گا۔“

”اچھا اچھا....یہ بعد کی بات ہے۔پہلے ادھر کی خبر سناؤ؟“

”ادھر کی خبر یہ ہے کہ سامیرا اپنی فوج کو لے کر قلعہ سے نکل پڑی ہے۔پو پھٹنے کے ساتھ اس کے سپاہی تیار ہو گئے تھے۔میں اور سفیر دو طرف سے انہیں کور دے رہے ہیں۔“

”راجا صاحب بھی سامیرا کے ساتھ ہیں؟“

”نہیں، انہیں سامیرا نے زبردستی روک دیا ہے۔وہ قلعہ میں ہی آرام کر رہے ہیں۔اب یہ بتاؤ تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟“

”یوں تو اب دس بھی نہیں ہوں گے لیکن شہر میں اچھی خاصی تعداد میں میرے ہمنوا موجود ہیں۔“

”ایسا کریں کہ کچھ اور لوگوں کو بلا لیں۔سفیر کے ساتھ آٹھ یا دس بندے ہیں جو تیر کمان سے لیس ہیں۔وہ اپنے ساتھیوں میں سے کچھ مجھے دینا چاہتا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔آپ کے ساتھ جتنے لوگ ہیں انہیں میرے ساتھ کر دیں اور آپ شہر سے مزید کچھ لوگوں کو بلا لیں۔ہمارا پلان یہ ہے کہ سامیرا سامنے سے حملہ کرے گی۔سفیر دائی جانب میں بائیں جانب سے اور آپ عقب سے۔گویا ریناٹ کی فوج کو بھاگتے راستہ نہیں ملے گا۔“

”پلان ہی غلط ہے۔اس طرح ریناٹ کے سپاہی محصور ہو کر رہ جائیں گے اور وہ مجبوری کی حالت میں مقابلہ کو ترجیح دیں گے۔تم اور سفیر پیچھے چلے جاؤ۔میں تمہارے ساتھ اپنے تمام ساتھیوں کو کر دیتا ہوں۔تم سب عقب سے

حملہ کرو گے تاکہ جو فرار ہونا چاہے وہ دائیں بائیں سے فرار ہو سکے۔"

"بات تو صحیح ہے۔ میں سفیر کو بلاتا ہوں۔" کہہ کر اس نے الو کی آواز نکالنا شروع کر دیا۔ ایک بار دو بار کئی بار کے بعد کافی دور سے سیٹی کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ سفیر کافی دور ہے۔ وسیم نے بھی سیٹی کی آواز سن لی تھی۔ اس نے جوابی سیٹی بجائی۔ ادھر سے بھی سیٹی سنائی دی۔ سفیر کی سیٹی سن کر اس نے کہا "وہ کافی دور ہے۔ کیسے آئے گا۔ اسے آنے کے لیے واپس سامیرا کے لشکر میں جانا پڑے گا۔"

"میں خود جاتا ہوں۔" کہہ کر میں نے اپنا رخ تبدیل کر لیا تاکہ روبیر وغیرہ کو بلا کر وسیم کے ساتھ کر دوں پھر خیال آیا کہ وہ لوگ تو کافی دور ہیں۔ میں وسیم کو ساتھ لے کر اسی طرف چل پڑا۔ کافی دور آنے کے بعد وہ سب نظر آئے۔ سب کے سب آرام سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے، جیسے پکنک پر آئے ہوں۔ میں نے قریب پہنچ کر ان سب سے کہا "دوستو! بس آخری جنگ کا وقت آ پہنچا ہے۔ سامیرا اپنی فوج کے ساتھ قلعہ سے نکل پڑی ہے۔ اب ہمارا امتحان شروع ہے۔ آپ سب ریناٹ کی فوج کے عقب میں پہنچ جائیں۔ آپ کے ساتھ میرا یہ ساتھی رہے گا۔ ایک اور ساتھی بھی آرہا ہے۔ یہ دونوں بہادری میں مجھ سے کم نہیں ہیں۔ اب آپ ان کے حکم کے مطابق چلیں گے کیونکہ یہ جنگ کا اصل طریقہ آپ کو بتائیں گے تاکہ آپ کی قسمت میں فتح لکھ دی جائے۔"

"ہم تیار ہیں۔ ریناٹ کو جہنم پہنچا کر ہم اپنے ملک کو آزاد کرائیں گے۔" سب نے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔

"آپ میں سے کوئی ایک آدمی آرگون چلا جائے اور وہاں جو دوست موجود ہیں ان میں سے کچھ کو ساتھ لے آئے۔ ان سے کہنا کہ یہ میرا حکم ہے۔"

ان سب کو وسیم کے ساتھ کر دیا۔ روبیر ان کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی اور میں اس پیر تسمہ پا کو مزید برداشت کرنے پر تیار نہ تھا۔ بمشکل اسے وسیم کے ساتھ جانے پر تیار کیا۔ وہ سب وسیم کو اپنے ساتھ لے کر اس جانب بڑھنے لگے جہاں سے ریناٹ کی فوج نظر آتی۔ میں نے قلعہ کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ مجھے بیک وقت دو قسم کے دشمنوں سے بچنا تھا۔ ایک تو ہارن اور اسمار وغیرہ اور دوسرے ریناٹ کی فوج۔ ان دونوں سے بچتے بچاتے ہوئے میں آگے بڑھنے لگا۔ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ سیٹی سنائی دی۔ آواز قریب کی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ سفیر ہمیں ڈھونڈتا ہوا قریب آ چکا ہے۔ میں نے جوابی سیٹی بجائی۔ میری سیٹی کی آواز کافی بلند تھی۔ ادھر سے جوابی سیٹی سنائی دی اور پھر سفیر نظر آ گیا۔ وہ پورا رامبو بنا ہوا تھا۔ اس کے کندھے سے دو دو گن لٹک رہی تھیں، اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ خوشی سے چیخا "اوئے یہ تو ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ وسیم ہے۔"

"میں نے ہی اسے کہا تھا کہ سیٹی بجا کر اطلاع دیتا رہے۔"

"جبکہ مجھے اس طرف کا محاذ سنبھالنا تھا۔" سفیر نے کہا۔

"وہ پلاننگ ہی غلط تھی۔ چار جانب سے گھر کر تو دشمن لڑ مرنے کو ترجیح دیتا۔ یہ لوگ بس نام کے فوجی ہیں۔ ایک حملے میں بھاگنے کا راستہ تلاش کریں گے اس لیے ان کے دو طرف میں نے جان کر راستہ کھلا رکھا ہے۔ تم ایسا کرو کہ شہر کی طرف نکل جاؤ۔ سیٹی بجاتے ہوئے جانا۔ وسیم جوابی سیٹی بجا کر اپنی پوزیشن بتا دے گا۔ تم اور وسیم مقامی ہمدردوں کے ساتھ مل کر عقب سے حملہ کرنا میں سامیرا کی طرف جا رہا ہوں تاکہ اسے صحیح مشورہ دے سکوں۔"

"جو حکم ...... میں تو یہاں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں۔"

"بہت شکریہ جناب کا۔ اب حضور چلتے پھرتے نظر آئیں۔ اور ہاں یہاں کے خطرناک درندوں کو پہچانتے ہو جو انسان کے دشمن ہیں۔ ان سے بچ کر رہنا۔"

"اسمار اور ہارن سے بچ کر رہنے کے لیے سامیرا نے بھی کہا ہے لیکن میں ان درندوں کو پہچانتا ہی نہیں۔"

"درندے صرف درندے ہوتے ہیں۔ ان کی حرکات خود بتا دے گی کہ وہ درندے ہیں۔ اس لیے کسی بھی قسم کے جانور کو دیکھتے ہی گولیاں آزما لینا۔ خاص کر ہارن کو تو سانس لینے کا بھی موقع نہیں دینا۔ وہ انتہا سے زیادہ خطرناک جانور ہے۔"

"جی بہتر ہے۔ اب یہ بھی بتا دیں کہ مجھے کس طرف جانا ہے۔"

"بس سیدھے سیدھے چلتے چلے جاؤ۔ ایک ڈیڑھ فرلانگ کے بعد سیٹی بجا دینا۔ جواب آ ہی جائے گا۔"

سفیر نے شہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ میں نے بھی قلعہ کا رخ کر لیا۔ میں اپنی دھن میں بڑھتا جا رہا تھا۔ میرا ہر

موئے تن جاگ رہا تھا۔ ہر طرف سے ہوشیار تھا۔ کیونکہ یہ جنگل خطروں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ بات تو اظہر من الشمس تھا کہ ہارن، اسمار اور دیگر تمام جانور فوج کی پیشقدمی اور نقارے کی آواز سے دور بھاگ چکے ہوں گے پھر بھی کوئی بھولا بھٹکا جانور راہ میں آسکتا تھا۔ جیسے وہ زخمی ہارن سامنے آ گیا تھا۔

ابھی میں کچھ ہی دور گیا تھا کہ نقارے کی گونجدار آواز آنا شروع ہو گئی۔ اس آواز میں کیا پیام دیا جارہا ہے یہ میری سمجھ سے باہر کی بات تھی کہ ایک اور نقارہ بجنے لگا۔ دونوں کا ردھم ایک تھا۔ ایک آواز نزدیک سے سنائی دے رہی تھی جب کہ دوسری آواز دور کی تھی۔ دور والی آواز قلعہ کی طرف سے آرہی تھی اس لیے میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ آواز سامیرا کے سپاہیوں کی جانب سے آرہی ہے۔ دونوں طرف کے نقاروں کا ردھم ایک تھا یعنی یہ اعلانِ جنگ ہے۔ اب مجھے اپنی رفتار تیز کرنا تھی۔ میں نے دوڑنے کی حد تک چال تیز کر دی جھاڑیوں کو پھلانگتا ہوا بڑھنے لگا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت طے کر کے میں سامیرا کی فوج میں پہنچ گیا۔ میرے آنے کی خبر تیز رفتاری سے پوری فوج میں پھیل گئی۔ کیونکہ ابھی میں پانی بھی پی نہ پایا تھا کہ ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا اور بولا۔ ”آپ کو طلب کیا گیا ہے۔ میں اس کے ساتھ سامیرا کے حضور پہنچ گیا۔ سامیرا نے شفقت بھرے انداز میں مجھے خوش آمدید کہا۔

میں نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا کہ میرا آنا لوگوں کو برا تو نہیں لگے گا کیونکہ میں شہر بدر کیا گیا ملزم ہوں تو سامیرا نے ہنستے ہوئے کہا کہ جنگ میں تمام قانون منسوخ ہو جاتے ہیں۔ پھر میں نے بلایا ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ تمہاری سزا منسوخ کر دی گئی ہے۔

میں نے سامیرا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”راجا صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟“

”حکیم اپنی دوا آزما رہے ہیں اور پُر اُمید ہیں۔ تمہاری دنیا کے حکیموں نے انہیں ڈرا دیا ہے لیکن یہاں کے حکیم کا کہنا ہے کہ یہ بیماری زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ حکیم نے خود جنگل سے بوٹیاں ڈھونڈی ہیں۔ ان جڑی بوٹیوں کا اثر بھی نظر آرہا ہے۔“

”خیر یہ باتیں ہوتی رہیں گی۔ جنگ کہاں پر لڑنا ہے۔ پہلے سے کوئی جگہ منتخب کی ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ ریناٹ نے جگہ سوچ رکھی ہو گی۔ تم نے بھی دیکھا ہوگا۔ جہاں پر یہ جنگل ختم ہورہا ہے اور باغات سے پہلے ایک وسیع و عریض میدان ہے۔“

”ہاں وہ جگہ میں نے دیکھی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے پاس مشرقی سمت میں جو پہاڑ ہے آپ اس پر مورچہ لگائیں۔“

”لیکن ادھر سے تو صرف ایک راستہ اترتا ہے وہ بھی بہت تنگ ہے۔“

”اسی وجہ سے میں نے اس پہاڑی کو منتخب کیا ہے۔ جن دنوں میں اس جنگل میں اکیلا بھٹک رہا تھا اس وقت میں نے اس تنگ درّے نما راستے کو دیکھا تھا۔“

”اگر تمہارے خیال میں وہاں مورچہ لگانا بہتر ہے تو یہی صحیح۔“ سامیرا نے میری بات مان لی۔

اس نے پیش قدمی کا بگل بجوا دیا۔ اس کی سپاہ آگے بڑھنے لگی۔ میں نے سپاہ کی تعداد کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ تقریباً دس ہزار کا لشکر ہوگا۔ سب کے سب روایتی ہتھیاروں سے لیس تھے۔ آگے آگے سامیرا تھی ایک رتھ نما سواری پر سوار۔ اس کے ساتھ سوار سپاہیوں میں سے دو نے ایک قسم کی چھتری سی تان رکھی تھی۔ وہ ایک شان سے آگے بڑھ رہی تھی۔ پہاڑی کی طرف بڑھنے سے اس کی فوج کے افسران حیران تھے کہ بجائے میدان کی طرف جانے کے وہ پہاڑی کی طرف کیوں بڑھ رہی ہے۔ یہ سوال ان سب کی آنکھوں سے عیاں تھا۔ حیرانی ان کے چہروں پر چھائی ہوئی تھی۔ مگر یہ وقت ان سوالات کا نہ تھا اس لیے وہ سب نہ چاہتے ہوئے بھی بڑھتے جارہے تھے۔ کافی اوپر ایک مسطح جگہ پہنچ کر ان سب کو رکنے کا اشارہ دیا گیا۔ وہاں سے میں نے ریناٹ کی فوج پر نظر ڈالی تو حیران رہ گیا کیونکہ سروں کا ایک سمندر تھا جو دور دور تک لہریں لے رہا تھا۔ میرے اندازے سے بھی بڑی فوج جمع تھی۔ کچھ فوج تو وہ تھی جو بہت پہلے سے آرگون سے باہر نکل کر سامیرا کے لیے چیلنج بنی ہوئی تھی اور کچھ فوجی بعد میں آ کر ملے تھے۔ شہر میں پہلے دستے بھی شامل ہوتے گئے تھے۔ اس طرح ایک بڑی فوج جمع ہو گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں سامیرا کی فوج کچھ بھی نہ تھی۔ دونوں طرف کی فوج پوری تیاری کے ساتھ کھڑی تھی۔ بڑی بڑی ڈھالیں لیکن چوبی۔ لکڑی کی ڈھالیں جن پر تیر رو کے جاتے ہیں۔ افسران کے جسم پر لکڑی کے زرہ بکتر۔ ہمارے یہاں کے اسلحوں کے سامنے یہ کاغذ ثابت ہوتے لیکن وہ سب اس میں خود کو محفوظ سمجھتے تھے۔ سامیرا

کے افسران بھی اسی قسم کے لباس میں تھے۔ میری داہنی طرف سومرو کھڑا تھا۔ جب میں نے قلعہ کے میدان میں سامیرا کی فوج کی صف بندی کر کے معائنہ کیا تھا اس روز پہلی بار میرا تعارف سومرو سے ہوا تھا۔ سامیرا نے اس درمیانی عمر کے آدمی کا یہ کہہ کر تعارف کرایا تھا کہ یہ فوج کا سربراہ ہے۔ اس وقت بھی وہی فوجیوں کو ہدایت دے رہا تھا۔ میری بائیں طرف کا ٹمنور تھا۔ اس سے بھی پہلی ملاقات اسی دن اسی میدان میں ہوئی تھی۔ سامیرا نے ہی بتایا تھا کہ وہ تیرانداز دستے کا سربراہ ہے۔ نیزہ بردار دستے کا سربراہ ینات بھی قریب تھا اور اس کے ہاتھ میں میرا بنایا ہوا ہتھیار تھا۔ اسے میں نے کلہاڑا بنا کر دیا تھا۔ اس سے کیسے حملہ کیا جاتا ہے یہ بھی بتایا تھا۔ اسے بھی یہ ہتھیار بہت پسند آیا تھا اور اس نے اس کی نقل بنوائی تھی جو اس نے اپنے کئی سپاہیوں میں تقسیم کیے تھے۔ میں نے ینات کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ اب تک وہ مجھ سے دور دور تھا۔ شاید اسے اپنی غلطی یاد آتی ہو گی کیونکہ جب مجھ پر روبیر نے الزام لگایا تھا تو یہ بھی میرا مخالف ہو گیا تھا۔

ینات نے نزدیک آ کر سر کو خم کیا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کا سلام لیا پھر سامیرا کے توسط سے پوچھا ''تمہارا دستہ پوری طرح تیار ہے نا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے جواب دیا ''میرا دستہ آگے بڑھنے کے لیے بےتاب ہے۔''

''اس جنگ میں ہر ایک کا اپنا کردار ہے۔ آپ کا دستہ اشارہ ملتے ہی ٹوٹ پڑے گا۔ کا ٹمنور کا دستہ پہل کرے گا۔ اس کے تیرانداز آپ کے لیے راستہ صاف کریں گے اور تب آپ آگے بڑھیں گے۔''

''آپ کا حکم حکیم آخر ہے۔'' اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''آپ کے لیے سنہری موقع ہو گا۔ میں نے اس جگہ کو اس لیے منتخب کیا ہے کہ اوپر آنے کا راستہ بہت زیادہ دشوار ہے۔ اتنے پتلے راستے پر ریلا مار کر سپاہی نہیں آ سکتے۔ ایک ایک دو دو کر کے آئیں گے۔ اس وجہ سے آپ کو بھرپور موقعہ ملے گا۔''

''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ میرا دستہ بہت بےجگری سے لڑے گا۔''

''آپ اپنے لشکر کو لے کر آگے بڑھیں لیکن زیادہ آگے نہیں جانا ہے۔ درمیان میں رک جانا ہے تاکہ ریناٹ کے فوجی مقابلہ کرنے آگے آئیں اور آپ کے سپاہی ان کو نشانے پر لے لیں۔''

''اور میرے سپاہی ان کو زندہ واپس نہیں جانے دیں گے۔''

''اب جا کر وہاں صف بندی کر لیں۔'' میرا حکم سنتے ہی وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ اس گھاٹی کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے مڑ کر کا ٹمنور سے کہا۔ ''آپ کا دستہ نیم گولائی میں صف بنا لے اور اس صف کے آگے بالکل پہاڑی کے کنارے تقریباً بیس تیرانداز لیٹ جائیں گے۔ جب ان کو اشارہ دیا جائے گا تو وہ بیٹھ کر نشانہ باندھیں گے اور پھر لیٹ جائیں گے۔''

''بالکل صحیح ....ہمارے تیرانداز آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔''

''اپنے تیراندازوں کو آپ جگہ پر متعین کر دیں۔ ادھر سے بگل بجتے ہی حملے میں پہل آپ کا دستہ کرے گا۔''

''جی بہتر۔'' کہہ کر وہ اپنے دستے کی جانب لوٹ گیا۔

سومرو پوری طرح مجھ سے متفق دکھائی دیتا تھا۔ اب تک اس نے ایک بار بھی میرے کسی بات کی کاٹ نہیں کی تھی۔ وہ فوج کا سربراہ تھا اس لیے اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں خود اس کے قریب پہنچا اور پوچھا ''میں نے جو پیش بندی کی ہے اس پر آپ نے اب تک کوئی رائے نہیں دی ہے؟''

''آپ کی پیش بندی سو فیصد درست ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ شاید میں بھی اتنی بہتر پیش بندی نہ کر پاتا۔''

''دو دستے اپنی اپنی جگہ متعین کر دیئے اب ایک اور دستہ چاہیے جو آپ کی نگرانی میں آگے بڑھے گا اور اسی کا کام اہم ہو گا۔ آپ کا دستہ میمنہ پر حملہ کرے گا۔ اور یکایک سامنے آ کر ٹوٹ پڑے گا تاکہ افراتفری پھیلے۔ ادھر سے میسرہ پر میں خود حملہ کراؤں گا۔ پھر تیرانداز اپنا کام کریں گے گویا ہم ریناٹ کی فوج کو کئی حصوں میں بانٹ دیں گے۔''

''آپ کی پیش بندی یقیناً بہت بہتر ہے۔ ہم سب تعاون کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ریناٹ کو شکست دینے کے لیے ہم اپنی جانوں کو بھی نچھاور کر دیں گے۔'' سومرو کا لہجہ پرجوش تھا۔ اس نے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے

سپاہیوں میں سے کچھ کو منتخب کیا اور پھر انہیں لائحہ عمل بتانے لگا۔ میں واپس سامیرا کے پاس آ گیا۔

"حیرت ہے کہ رینائٹ نے اب تک اعلان جنگ کا نقارہ نہیں بجایا۔ کیا دوپہر کے بعد جنگ کرے گا؟" میں نے سامیرا سے کہا۔

"میں خود بھی یہی سوچ رہی ہوں کہ وہ اب تک جنگ کا اعلان کیوں نہیں کر رہا ہے۔" سامیرا نے رینائٹ کی فوج پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "اس کی فوج اب تک صف بندی ہی کر رہی ہے۔"

"پھر بھی میں نے اپنے تئیں تیاری کر لی ہے۔ فوج کو تین حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ مینائٹ کا دستہ پہاڑی پر آنے والے راستے کی گھاٹی پر گھات لگائے گا۔ نیزہ بردار دستہ ہے اس لیے ادھر سے اوپر آنے والے دشمنوں کو وہ اکیلا روکے گا۔ کامینور درمیان سے حملہ کرے گا اور تیر انداز دستہ وہ کام کر دکھائے گا جس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ سومرو کو میں نے اچانک حملہ کرتے' افراتفری پھیلانے کی ڈیوٹی دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح رینائٹ کی فوج کئی حصوں میں بٹ جائے گی اور تب ہماری فوج پوری قوت سے حملہ کرے گی۔ افراتفری کی وجہ سے رینائٹ کی فوج ہمارے بہادروں کا مقابلہ نہیں کر پائے گی۔"

"تمہاری عقل تیز ہے تمہارا فیصلہ غلط ہو ہی نہیں سکتا۔" سامیرا نے ہنس کر کہا پھر کچھ سوچ کر بولی "اب مجھے بھی اپنا فرض نبھانا چاہیے۔"

جملہ تمام کر کے وہ ایک اونچی جگہ پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھ چل رہے افسران میں سے ایک نے سیٹی جیسی چیز نکالی اور اسے زور سے بجایا۔ تقریباً تمام سپاہیوں کا رخ سامیرا کی طرف ہو گیا۔ اس نے اپنی فوج پر ایک نظر ڈالی پھر پرجوش انداز میں تقریر کرنے لگی "میرے بیٹو! آج تم سب حق کی فتح کے لیے یہاں جمع ہوئے ہو۔ ہم سب ظلم اور جبر، ناانصافی کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ تم سب سوچ لو کہ ہماری اولادوں کو ایک ایسا وطن دینا ہے جس میں ظلم و ناانصافی نہ ہو۔ ہمارے ساتھ برف والے کا بھیجا ہوا بہادر ہے۔ اس کی مدد کے لیے برف والے نے اس کے ساتھیوں کو بھی وادی میں بلا لیا ہے۔ اب یہ سب اپنی بہادری کا جوہر دکھائیں گے لیکن یہ سب اوپر سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ یہ جنگ ہماری ہے۔ ہماری اولادوں کے لیے ہے اس لیے میں چاہوں گی کہ آپ سب بہادری اس طرح دکھائیں کہ یہ باہر والے لوگ بھی مان لیں کہ ہماری مائیں بہادر پیدا کرتی ہیں۔ باہر سے آنے والوں کی وجہ سے۔ برف والے کی دعا سے فتح ہمارا مقدر ٹھہرے گی لیکن شرط یہی ہے کہ تم سب بہادری کا ثبوت دو ورنہ ہماری آنے والی نسل تک تم پر لعنت کرتی رہے گی کہ ہم بزدلوں کی اولادیں ہیں۔"

سامیرا کی تقریر نے ہر سپاہی میں جوش بھر دیا تھا۔ ہر سپاہی اپنا اسلحہ اونچا کر کے سامیرا کے حق میں نعرہ لگانے لگا۔ ان کی آوازوں سے پہاڑوں میں ایسی گونج پیدا ہونے لگی جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ میں نے سامیرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو ایسے جانباز سپاہی ملے ہیں جو آپ کے لیے جانوں کا نذرانہ دینے پر ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔"

سامیرا نے اپنا نیزہ بلند کیا اور پوری قوت سے ایک نیا نعرہ لگایا جس کا لب لباب یہ تھا کہ فتح ہماری ہے۔

جواب میں اس کے فوجیوں نے بھی نعرہ لگایا۔ ابھی اس نعرے کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ عین اسی وقت رینائٹ کی فوج میں نقارے پر چوٹ پڑنا شروع ہو گئی۔ یعنی اعلان جنگ ہو چکا تھا۔ میں نے ان لوگوں کی جانب دوڑ لگا دی جنہیں اس کام کے لیے چنا تھا کہ میسرا پر حملہ کیا جا سکے۔ میمنہ اور میسرا لشکر کے یہ دو اہم حصے ہوتے ہیں اور میں نے سوچ لیا تھا کہ ان دو کو پہلے نشانہ بنایا جائے تاکہ رینائٹ کی فوج افراتفری کی شکار ہو جائے۔

میں نے گھاٹی کے نزدیک پہنچ کر مینائٹ کے دستے پر نظر ڈالی۔ وہ اس درہ کے درمیان سے گزرتے راستے پر آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے آگے چلنے والے نے اپنے ہاتھوں میں ایک پرچم اٹھا رکھا تھا۔ کسی جانور کے چہرے سے بنا وہ پرچم شاید ان کا نشان تھا یقیناً وہ اونچا ہونے کی وجہ سے رینائٹ کی فوجوں کو بھی نظر آ رہا ہوگا۔ اسے بڑھتے دیکھ کر رینائٹ کی فوجوں میں طلاطم پیدا ہوا تھا۔ وہ سب تیزی سے مینائٹ کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ان کی تعداد کسی بھی طرح تیس چالیس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ بقیہ سپاہی ابھی اپنی جگہ جمے ہوئے ان کی کارگزاری دیکھ رہے تھے۔ رینائٹ کی آگے بڑھنے والی فوج جس جوش و خروش سے آگے بڑھی تھی یکا یک رک گئی تھی۔ اس لیے کہ گھاٹی کے نزدیک پہنچ کر انہیں احساس ہو گیا تھا کہ آگے کا راستہ خاصہ دشوار ہے۔ وہ

درہ نما راستہ گہرائی میں تیس سے چالیس گز ہوگی اور چوڑائی میں دس سے بارہ قدم۔ اس درہ میں داخل ہونا اتنا آسان نہیں تھا پھر ایک اور دشواری ان کے سامنے تھی کہ جس درے نما راستے کو میں نے منتخب کیا تھا اس کی ایک جانب گہری کھائی تھی اور دوسری جانب دیوار جیسی سپاٹ چٹان جو سیدھی اوپر اٹھتی چلی گئی تھی۔ اسی لیے وہ رک گئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک سپاہی جو افسر لگ رہا تھا اس نے ایک تیغہ جیسا ہتھیار اٹھا رکھا تھا، وہ آگے بڑھا، اس کی تقلید میں کئی اور بھی ساتھ ہو گئے۔ وہ اپنے زعم میں تیغہ لہراتا ہوا دوڑا جیسے سامیرا کے اس دستے کو پیس کر رکھ دے گا۔ اس کے ساتھی بھی اسی تیزی سے آگے بڑھے تھے کہ میناٹ کے دستے میں ہلچل ہوئی اور وہ بھی ریناٹ کے دستے کی طرف دوڑے۔ دونوں دستے ٹکرائے۔ اسلحوں کی جھنکار اور نعرے کی گونج ہوئی اور پھر دونوں دستے ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ ایسا لگا جیسے کوئی تشخص نہ رہا ہو۔ صرف وردی سے پہچان ہو رہی تھی کہ سپاہی کس طرف کے ہیں۔ میناٹ کا دستہ بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ ریناٹ کے وہ سپاہی جو درے کے باہر تھے وہ بھی پُرجوش ہو کر نعرے لگا رہے تھے۔ ہتھیاروں کے ٹکراؤ سے ایک عجب سماں بندھ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آج زندگی موت کی بانہوں میں سو کر رہے گی۔ ایک بندہ بھی نہ بچے گا۔ دونوں طرف ایک جیسا جوش تھا۔ لوگ گر رہے تھے۔ مر رہے تھے مگر جگہ خالی نہیں ہو رہی تھی۔ مرنے والے کی جگہ کوئی دوسرا آ جاتا۔ ریناٹ کی فوج اس درے میں سما نہیں پا رہی تھی مگر باہر سے دباؤ برقرار تھا۔ پیچھے رہ جانے والے سپاہی درے میں گھسنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ میناٹ کے فوجی بھی بہادری کی تاریخ رقم کر رہے تھے۔ ان کا جانی نقصان کم ہو رہا تھا لیکن وہ جواں مردی سے بڑھ بڑھ کر حملہ کر رہے تھے۔ ان کے ولولے مجھے بھی جوش دلا رہے تھے۔ بار بار میرا دل کر رہا تھا کہ میں بھی میدان میں اتر جاؤں۔ لیکن یہ بے وقوفی ہوتی اس لیے کہ میرا پلان ہی کچھ اور تھا لیکن کچھ ہی دیر میں میں نے محسوس کر لیا کہ ریناٹ کی فوج تجربے کار ہے اور اس کے حملے کی نوعیت الگ ہے اسی لیے وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ گو کہ رفتار بہت کم تھی لیکن وہ بڑھ رہے تھے اور میناٹ کے سپاہی پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں۔ اس طرح درے پر ان کا قبضہ ہوتا جا رہا تھا۔ گویا وہ کچھ کمزور پڑ رہے تھے۔ تب میں نے ان کی مدد کی ٹھانی اور مڑ کر کامینور کے دستے کو اشارہ دیا۔ اس کا دستہ آگے بڑھا۔ وہ سب نیم دائرے میں آگے آئے تھے پھر انہوں نے کمان کھینچ کر نشانہ لیا اور چلے سے تیر اڑا۔ ایک ساتھ ان سب نے نشانہ لگایا تھا۔ تیروں کا مینہ سا ریناٹ کی فوج پر برسا۔ پہلے ہی ہلہ میں تیر اندازوں نے ریناٹ کی فوج کو دہلا دیا۔ سو سے اوپر لوگ گر کر تڑپ رہے تھے۔ جب کہ ابھی تو کامینور کا آدھا دستہ دوسری طرف خاموش کھڑا تھا۔ تیرانداز ایک ساتھ سو کی تعداد میں آگے بڑھتے اور تیر چلا کر پیچھے ہٹ جاتے۔ ان کی جگہ لینے کے لیے دوسرا دستہ آگے بڑھ جاتا۔ اس طرح وہ باری باری سے تیر پھینک رہے تھے۔ وہ سب اتنے منظم انداز میں حملہ کر رہے تھے کہ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ پہلی بار جنگ میں حصہ لے رہے ہیں۔ ان تیراندازوں نے جنگ کا نقشہ بدل دیا تھا۔ میناٹ کے دستے کے اکھڑتے پیر جم گئے تھے۔ ریناٹ کی فوج کو عقب سے جو مدد مل رہی تھی وہ رک گئی تھی۔ اندر آ جانے والے دشمن میناٹ کے بہادروں کا شکار بنتے جا رہے تھے۔ اس لیے کہ وہ دو تین کی تعداد میں آگے بڑھ کر حملہ کرتے اور اسی تیزی سے واپس پلٹ آتے۔ ریناٹ کے فوجی سنبھلنے سے پہلے خاک اور خون میں لوٹنے لگتے۔

سامنے والے میدان میں بھی اب جنگ شروع ہو گئی تھی۔ وہاں ایک عجب سا شور اٹھ رہا تھا جو کانوں کے پردے پھاڑے دے رہا تھا۔ ہتھیاروں کی جھنکار، نعروں کی گونج اور زخمیوں کی چیخ و پکار سے پورا جنگل گونج رہا تھا۔ ہر ایک پر جنگی جنون سوار تھا۔ صفیں درہم برہم ہو گئی تھیں۔ ہر سپاہی مقابل سے الجھا ہوا تھا۔ خون کے فوارے اچھل رہے تھے۔ سر خربوزوں کی طرح کٹ رہے تھے۔ لوگ گر رہے تھے، سنبھل رہے تھے۔ کچھ دیر تک تو سامیرا کا پلہ بھاری رہا پھر ریناٹ کے فوجی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ سامیرا کے سپاہی حوصلہ ہار رہے ہیں اس لیے کہ موت کا فرشتہ نہایت تیزی سے اپنا کام کیے جا رہا تھا اور قتل ہونے والوں میں زیادہ تعداد سامیرا کے فوجیوں کی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے قدم اکھڑ رہے ہیں۔ یہ بات میناٹ کی عقابی نظروں سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔ یکایک اس نے اپنا وزنی کلہاڑا بلند کیا اور پھر ایک زوردار نعرہ لگایا۔ نعرہ لگاتے ہی وہ پوری قوت سے حملہ آور ہوا۔ ڈھال پر ہتھیار پڑے ایک جھنکار ابھری۔ نیزے بلند ہوئے۔ کلہاڑا چلا۔ کئی سر اڑے اور پھر تو خون کی گویا بارش

شروع ہوگئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ میدان اب مکمل طور پر لال رہے گا۔ انسان گاجر مولی کی طرح کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ میں نے ریناٹ پر نظر ڈالی ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم میں کوئی مشین فٹ ہوگئی ہو۔ وہ مسلسل کلہاڑا چلائے جا رہا تھا۔ ریناٹ کے سپاہی اب خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پہلی صف کا صفایا کر دیا تھا۔ تبھی میں نے تیر اندازوں کو دوبارہ حکم دیا اور وہ پھر اسی انداز میں تیروں کا مینہ برسانے لگے۔ تیروں کی تعداد اتنی تھی کہ جب تیر انداز تیر پھینکتے تو آسمان سیاہ ہو جاتا۔ تبھی داہنی طرف سے کمین گاہ سے نکل کر تازہ دم دستے نے بھرپور انداز میں ریناٹ کے لشکر پر چڑھائی کی اور تمام صفیں الٹ پلٹ کر رہ گئیں۔ سومرو نے بروقت فیصلہ کیا تھا اور یہ فیصلہ جنگ کا نقشہ بدلنے میں معاون ثابت ہوا۔ ریناٹ کی فوج کے قدم اکھڑ گئے اور افراتفری سی پھیل گئی۔ میں عقابی نظروں سے ریناٹ کی فوج کا جائزہ لے رہا تھا۔ میری نظریں ڈیوڈ شا کو تلاش کر رہی تھیں کہ وہ کہاں گیا۔ اسے سامنے آنا تھا مگر وہ پتا نہیں کہاں چھپا بیٹھا تھا۔ یہ تعجب خیز بات تھی۔ اسی کی وجہ سے میں نے اپنی گن اب تک استعمال نہیں کی تھی کیونکہ میں چاہتا تھا کہ آتشی اسلحہ کا استعمال ڈیوڈ شا کی طرف سے ہو۔ جواب میں میں اسلحہ استعمال کروں۔

ابھی میں فکر کے گرداب سے نکلا بھی نہیں تھا کہ ایک زبردست شور ہوا۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ یکایک عقب سے زبردست قسم کا حملہ ہوا تھا۔ یہ یقیناً ہمارے بہادروں نے کیا تھا۔ میں نے سفیر وغیرہ کو اسی طرف سے حملہ کرنے کو کہا تھا۔ یہ حملہ اتنا زبردست تھا کہ ریناٹ کی فوج پوری طرح بوکھلا گئی۔ اس لیے کہ ان کے اہم افسران سامنے کی طرف تھے۔ سامیرا کی طرف۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ادھر سے بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ مگر ہوا تھا۔ اسی وقت سومرو نے داہنی جانب سے یلغار کر دی۔ اب میدان جنگ عجب انداز کا ہو گیا۔ تین طرف سے حملہ ہو رہا تھا اس لیے ریناٹ کی فوج تین حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ہر طرف شور۔ چیخ پکار اور نعروں کے علاوہ کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ ریناٹ کی فوج کے پیر اکھڑ چکے ہیں اور وہ فرار پر آمادہ ہے۔ اس لیے کہ ان کی تعداد مسلسل گھٹ رہی تھی جو اس بات کا اشارہ بھی تھی کہ سپاہی فرار ہو رہے ہیں۔ اور تبھی میں نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لیے اپنی گن سیدھی کی اور دنادن کئی فائر کر دیے۔ دھماکوں نے ریناٹ کی فوج کو مزید بوکھلا دیا۔ ابھی میری گن کے دھماکے کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ عقب سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ سفیر وغیرہ نے یہی سمجھا ہوگا کہ میں نے انہیں فائر کرنے کا اشارہ دیا ہے۔ یہ دوطرفہ فائرنگ قیامت ڈھا گئی۔ ریناٹ کے سپاہی کھلے عام اپنے ہتھیار پھینک پھینک کر بھاگنے لگے۔

میں اسی موقع کا منتظر تھا۔ سامیرا کو اشارہ دیا کہ وہ اب خود بھی میدان میں اتر آئے اور دشمن کو للکارے۔ یہ بات میں نے پہلے ہی سامیرا سے کہہ دی تھی اس لیے میرا اشارہ پاتے ہی اس نے اپنے جاں نثاروں کے دستے کے ساتھ ریناٹ کی فوج کی جانب جھپٹی۔ پلٹ کر جھپٹنا۔ جھپٹ کر پلٹنا کی وہ مکمل تفسیر بن گئی تھی۔ اس کے دستے میں ڈھائی تین ہزار افراد ہوں گے۔ سب کے سب نے بہادری کے جوہر دکھانا شروع کر دیے تھے۔ سامیرا کی پیشقدمی نے زبردست کام دکھایا۔ ریناٹ کی فوج لڑنے کی بجائے بھاگنے لگی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدان تقریباً خالی ہو گیا تھا۔ ایسا لگنے لگا تھا کہ ریناٹ کو بھی اب اپنی جان بچانے کی فکر پڑ گئی تھی۔ اس کی سواری اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی۔ شاید وہ اپنے ساتھیوں کی بزدلی سے بددل ہو گیا ہے۔ میری نظریں اس کی سواری پر جمی ہوئی تھیں کہ عقب سے فائر کرنے والوں نے اس کی سواری کو نشانے پر رکھ لیا ہے کیونکہ اب سیدھا اسی پر فائر ہو رہا تھا۔

میں نے پلٹ کر سامیرا کی طرف دیکھا۔ اب وہ ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر کھڑی ہوگئی تھی اور اپنے سپاہیوں کی بہادری دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں ریناٹ کی سواری پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ ریناٹ کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ شاید اسے خیال آرہا ہو کہ یہ وہی ریناٹ ہے۔ جس نے اس کے خاندان کو شہر بدر کیا۔ جس نے سینکڑوں بے گناہ لوگوں کو ہلاک کرایا۔ جس نے ظلم و ابتلا کا ایک باب رقم کیا تھا، جس کی لغت میں رحم نام کا لفظ نہ تھا، وہ آج کس طرح اپنی جان بچانے کے لیے ادھر سے ادھر بھاگ رہا ہے۔ جن پر وہ اکڑتا تھا آج وہی فوج اسے چھوڑ کر بھاگنے لگی ہے۔

ابھی وہ... اسی طرف دیکھ رہی تھی کہ میں دہل اٹھا۔ اس کے تمام سپاہی میدان جنگ میں جان کی بازی لگا رہے تھے۔ وہ جوش میں ہوش کھو بیٹھے تھے۔ جنگ صرف طاقت سے نہیں جیتی جاتی۔ جنگی چالیں ہی فتح دلاتی

ہیں۔اس کے سپاہیوں کی یہ بھول تھی کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ گئے تھے۔اسی کا اس دستے نے فائدہ اٹھایا تھا۔یکا یک ہی رینانٹ کا ایک دستہ ٹیلے کی دوسری طرف سے نمودار ہوا تھا اور اس نے سامیرا پر حملہ کر دیا تھا۔سامیرا اکیلی تھی اور اس دستے میں چالیس سے زیادہ لوگ تھے۔ان لوگوں نے سامیرا کو گھیر لیا تھا۔وہ عورت تھی۔اکیلی تھی لیکن حوصلے والی تھی۔وہ نیزہ سے ان کا مقابلہ کر رہی تھی۔نیزہ اکیلے سپاہی پر چلانا آسان ہے لیکن اس سے پورے دستے کا مقابلہ کرنا آسان نہیں۔وہ سخت خطرے میں گھر گئی تھی۔

اسے خطرے میں دیکھ کر اس کے جاں باز اس کی طرف لپکتے ہوئے بڑھے تھے۔وقت کم تھا۔کسی بھی وقت کسی کا بھی ہتھیار سامیرا کا کام تمام کر سکتا تھا۔میں نے رسک لے لیا۔اندھی چال چلی۔اپنی گن کا رخ رینانٹ کے دستے کی طرف کر کے فائر کرنا شروع کر دیا۔میں ڈرڈر کر سنگل فائر کر رہا تھا اس لیے کہ گولی جب چلتی ہے تو دوست دشمن کی پہچان نہیں کرتی۔کسی کے بھی جسم میں دھنس کر موت کی نیند سلا دیتی ہے۔کوئی بھی گولی سامیرا کو لگ سکتی تھی۔اسی وجہ سے میں احتیاط کر رہا تھا۔

فائرنگ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ سپاہی جو سامیرا کو گھیرے ہوئے تھے۔اپنے ساتھیوں کو لاشوں میں بدلتے دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگے۔اسی وقت میدان میں ایک زوردار دھماکا ہوا۔میں نے پلٹ کر دیکھا۔ایک گرنیڈ آ کر سیدھا رینانٹ پر گرا اور اس کی سواری ٹکڑوں میں بدل گئی۔سواری کے ساتھ اس کا بھی نام ونشان مٹ گیا۔

رینانٹ کا حشر دیکھ کر باقی فوج نے اپنے ہتھیار پھینکنا شروع کر دیئے۔اس وقت بھی چھ سے آٹھ ہزار سپاہی اس کی طرف سے میدان میں لڑ رہے تھے مگر رینانٹ کی موت نے انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔اس طرح صبح سے جاری جنگ نے ایک دم ہی دم توڑ دیا۔سامیرا کی فوج نے فتح کا بگل بجا دیا۔اس کی فوج جوش وجذبات میں اچھل رہی تھی۔سامیرا کے نام کا نعرہ لگا رہی تھی۔

میں نے سامیرا سے کہا کہ وہ اپنے سپاہیوں کو پیغام دے دے کہ کوئی بھی کسی کو ناحق قتل نہ کرے۔لوٹنے کا بھی سلسلہ موقوف سمجھا جائے۔

سامیرا کے پیامبر میدانِ جنگ میں ادھر سے اُدھر دوڑنے لگے۔اس کا پیغام پہنچانے لگے۔تبھی سومرو نے بھونپو نما چونگا اپنے منہ سے لگا کر اعلان کرنا شروع کر دیا کہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔اب کوئی کسی پر ہتھیار نہ اٹھائے۔رینانٹ کے سپاہی بھی ہمارے بھائی بند ہیں۔جنگ کے وقت وہ ہمارے دشمن تھے مگر اب نہیں۔

اس اعلان نے بہت اچھا اثر ڈالا۔رینانٹ کی فوج کے کئی افسروں نے سامیرا کی اطاعت کا اعلان کر دیا۔میدان جنگ اب خاموشی کی چادر سے ڈھک گیا تھا۔صرف زخمیوں کی آہ وبکا سنائی دے رہی تھی۔جراح اور حکیم اپنی دواؤں کا اعجاز دکھا رہے تھے مگر میں اسی اونچی جگہ پر کھڑا ہوا اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔میری نظریں اب بھی ڈیوڈ شا کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

ابھی میں جائزہ لے ہی رہا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے سفیر، وسیم اور عبداللہ نظر آ گئے۔وہ تینوں مجھے دیکھ چکے تھے اس لیے سیدھے میری طرف بڑھتے آ رہے تھے۔ان کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔فتح کی ایک اپنی خوشی ہوتی ہے۔انہوں نے ایک معمولی سی قوت کو ایک بڑی قوت پر فتح دلا دی تھی۔میرا اپنی جگہ کھڑا رہنا مناسب نہیں تھا اس لیے میں بھی ان کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

اِدھر اُدھر لاشیں ہی لاشیں پڑی تھیں۔زخمیوں کو طبی امداد دی جا رہی تھی۔سامیرا کے سپاہی ابھی اپنے ساتھیوں کی لاشیں ہی اٹھا رہے تھے۔دشمنوں کا نمبر بعد میں آتا اسی لیے ان کی لاشیں جا بہ جا پڑی ہوئی تھیں۔سفیر اور وسیم و عبداللہ ان لاشوں کو پھلانگتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے کہ ایک عجیب بات ہوئی۔زخمی سپاہی میں سے ایک نے لیٹے لیٹے اپنا نیزہ اٹھا دیا تھا۔وسیم جو اس پر سے پھلانگ رہا تھا الجھ کر اسی پر گرا۔اس کے گرتے ہی سفیر نے گن کا رخ اس زخمی کی طرف کر دیا۔ایک ساتھ کئی گولیاں چلیں اور وہ زخمی ہمیشہ کی نیند سو گیا۔شاید یہ اس کا اضطراری عمل تھا کہ اس نے نیزہ بلند کر دیا تھا۔اس نے نیزے پر پکڑ مضبوط کی ہوگی کہ نیزہ کھڑا ہو گیا اور وہ وسیم سے ٹکرایا۔نیزے کی انی نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔وسیم کی ران پر ایک لمبا زخم آ گیا تھا جس سے خون کی دھار نکل رہی تھی۔میں نے دوڑ کر اسے سنبھالا اور اس کے پینٹ کے پائنچا کو پھاڑ کر زخم کا معائنہ کیا۔زخم زیادہ گہرا نہیں تھا پھر بھی میں نے زخم پر کپڑے کی تہہ رکھی اور اسے کس کر باندھ دیا۔اس وقت اس سے زیادہ کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔اس کام سے فرصت پا کر میں سامیرا کی طرف بڑھا۔وہ خوشی سے سرشار ایک بلند مقام پر کھڑی تھی۔میرے ساتھ میرے ساتھی تھے۔ہم سب اس کے

نزدیک پہنچے تو اس نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا ''تم نے دیکھا۔ ظلم کا کیسے انجام خراب ہوا۔ اب اس وادی میں امن وسکون ہوگا۔''

''یقیناً ایسا ہی ہوگا لیکن ابھی دو بڑے خطرے باقی ہیں۔ ایک مہا پجاری اور دوسرا ڈیوڈ شا۔ ان دونوں کو ڈھونڈیں۔ اگر انہیں چھوڑ دیا گیا تو یہ الجھنیں پیدا کرتے رہیں گے۔''

''میرے سپاہی انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جاسوسوں کو بھی ہر طرف پھیلا دیا ہے۔ ان خطروں کے بارے میں سومرو نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔''

''تو اب ارادہ کیا ہے؟''

''میدان جنگ کی صفائی میں پورا ایک پہر لگ جائے گا۔ اس لیے آرام کرنے کے لیے خیمہ لگایا جا رہا ہے۔ جہاں ہم اور ہمارے تمام افسران آرام کریں گے۔ کل دن میں جب سورج طلوع ہوگا تو ہم آرگون میں... داخل ہوں گے۔''

''آرام کے وقت بھی اپنے سپاہیوں کو کہنا کہ وہ جاگتے رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ مہا پجاری یا ڈیوڈ شا رات کے اندھیرے میں شب خون مار دے۔''

اس وقت سامیرا پر فتح کا نشہ سوار تھا.... وہ میری بات پر مسکرا دیا۔ وہ بولی ''رات میں جنگ کرنا بزدلی کی علامت ہے۔ رات میں کوئی بھی حملہ نہیں کرتا۔ جو کرتا ہے اس پر بلا میں ٹوٹ پڑتی ہیں۔ مہا پجاری ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ مذہب کے قوانین کو چلانے والا ہے۔ خود ہی مذہب کو کیسے پامال کر سکتا ہے۔''

معبد میں پجاری کس قسم کی زندگی گزارتے ہیں۔ کیسے مذہب کی خدمت کرتے ہیں اس کا نمونہ میں دیکھ چکا تھا۔ لیکن سامیرا جس انداز میں بات کر رہی تھی میں سمجھ گیا کہ وہ میری باتوں کو اہمیت نہیں دے گی۔ اس لیے میں اس کے پاس سے ہٹ آیا۔ عبداللہ، وسیم اور سفیر ایک جگہ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں ان کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ سفیر نے مجھے دیکھتے ہی کہا ''آیئے جناب۔ اس میدان کارزار کے اصل ہیرو۔ ہم آپ ہی کا تذکرہ کر رہے تھے۔''

''اچھا'' میں نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ذکر مہوشاں تھا۔ تم نے جو ایک دم چھلا ساتھ لگایا ہے وہ تو دن رات صرف تمہارے قصیدے پڑھتی رہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ تمہیں اس وادی سے نکلنے نہیں دے گی۔'' وسیم نے ہنستے ہوئے کہا ''پتا نہیں تمہارے پاس کون سی گیدڑ سنگھی ہے کہ لڑکیاں تم پر مرنے کے لیے کھنچی چلی آتی ہیں۔''

''اگر وہ گیدڑ سنگھی چاہیے تو میں تمہیں دے سکتا ہوں مگر ایک شرط ہے۔''

''کون سی شرط؟'' وسیم نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بہت معمولی سی شرط ہے۔ گیدڑ سنگھی میں تمہیں دے سکتا ہوں لیکن اس بارے میں سفارش کرے گی سادی۔''

''واہ وا..... گویا میرے قتل کی سازش ہے یہ..... سعدیہ کو گیدڑ سنگھی کی خبر ملی اور اس نے میرا گلا دبایا.... نہ بابا نا.... چوہا لنڈورا ہی بھلا.... مجھے گیدڑ سنگھی نہیں چاہیے۔'' اس کے لہجے پر عبداللہ اور سفیر نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''ویسے یہ بات غلط بھی نہیں ہے۔ اب تک میں نے ایسی تین لڑکیوں کو دیکھا ہے جو آپ کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہو گئی تھیں۔ ایک تو وہ برٹ شا کی بیٹی دوسری....'' وہ میری شان میں قصیدے پڑھتا کہ میں نے اسے روک دیا۔

''بھائی میاں اس وقت ہم میدان جنگ میں ہیں۔ یہ مت سمجھنا کہ سامیرا کی فتح نے جنگ کا خاتمہ کر دیا ہے۔ دو اہم کردار ابھی باقی ہیں۔ بڑا پجاری اور ڈیوڈ شا... بڑے پجاری کی تو خیر ہے۔ اسے ہم سنبھال لیں گے لیکن ڈیوڈ شا عیاری کی آخری سرحد پر ہے۔ اسے سنبھالنا اتنا آسان نہیں ہے۔ وہ کب کس طرح حملہ آور ہوگا کہا نہیں جا سکتا۔ اس لیے ہمیں ہر وقت ہوشیار رہنا ہے۔''

''آپ خواہ مخواہ ڈیوڈ شا کو اہمیت دے رہے ہیں۔ جب ہم نے اتنی بڑی فوج کو شکست دے دی تو ڈیوڈ شا کی حقیقت کیا ہے۔''

''ریناٹ کی فوج اور خود ریناٹ ترقی یافتہ لوگوں کی عیاری اور مکاری سے ناواقف تھا اسی لیے اتنی آسانی سے شکست کھا گیا لیکن ڈیوڈ شا نہ صرف عیار و مکار ہے بلکہ اس کے پاس ایسے ایسے اسلحے ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''آپ کا حکم ہے تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔ یہ بتائیں ہمیں کرنا کیا ہوگا؟''

''آج رات جاگنا ہے۔ اس لیے کہ یہ رات اہم

ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دشمن رات کی خاموشی کا فائدہ اٹھا کر حملہ کردے۔ جس طرح سامیرا کے سپاہی فتح کی خوشی میں ہر جانب سے بے پروا ہو گئے ہیں یہ ان کے لیے نقصان کا باعث ہے۔"

"جو حکم۔" وسیم نے سر کو خم کر کے کہا۔ وسیم اور سفیر کو کسی مہم کے بعد کوئی دیکھے تو یہی سمجھے کہ یہ دونوں کھلنڈرے نوجوان ہیں۔ ہنسنا ہنسانا ان کا کام ہے لیکن جب کسی مہم میں اپنا کام دکھاتے ہیں تو سمجھ آتی ہے کہ یہ کیسے جی دار ہیں۔ ان کی بہادری فلک بوس پہاڑ کو بھی لرزا دے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے جتنے بھی دوست دیئے سب کے سب بے لوث اور بہادر۔ خاص کر میرے لیے تو سب کے سب جان کی بازی لگانے والے ثابت ہوئے ہیں۔ یہ دوستی ہی کی ڈور ہے جس سے بندھے یہ لوگ اس تاریک وادی تک چلے آئے ہیں جہاں سے اب ہم باہر جا بھی سکیں گے یا نہیں اس بارے میں ابھی کچھ یقین سے کہا نہیں جا سکتا تھا۔ یوں بھی ہم نے ابھی تک وادی سے باہر جانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ کیونکہ جب تک سامیرا کو تاج و تخت نہیں مل جاتا ہم باہر جانے کی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ ابھی ڈیو ڈشا زندہ تھا۔ اسے کس طرح تلاش کروں میں یہی سوچ رہا تھا کہ میری نظر سپاہیوں کے اس غول پر پڑی جو میدان میں بکھرے ہتھیاروں کو جمع کر رہا تھا۔ ان کے ساتھ ایک چھکڑا ٹائپ گاڑی تھی جس پر وہ تیر تلوار نیزے اکٹھا کر کے رکھتے جا رہے تھے۔

میں ابھی ان کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ ان سے کچھ فاصلے پر روبیر نظر آ گئی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ شاید اس کی تلاش کا محور میں تھا۔ یہ لڑکی واقعی پیر تسمہ پا بن گئی تھی۔ میں اس سے جتنا دور بھاگتا ہوں یہ اتنا ہی قریب آنے کی کوشش کرتی ہے۔

ابھی میں اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ وسیم کی آواز آئی۔ "سنبھالیئے جناب۔ آپ پر جان و جگر نثار کرنے والی دم بہ دم قریب آتی جا رہی ہے۔"

میں نے گردن موڑ کر اس کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھا پھر کہا "تم تو اپنی چونچ بند ہی رکھو۔ اسے بلانا نہیں۔ ابھی کچھ دیر بھٹکنے دو۔"

یوں بھی اس وقت میں اس سے مغز پچی کرنے پر تیار نہ تھا۔ رات میں جب میرا ٹکراؤ ایک دستے سے ہوا تھا اور اس دستے کے ایک سپاہی نے اپنے گوپھن سے میری پیٹھ پر وار کیا تھا اس وقت تو جوش کا عالم تھا اس لیے درد محسوس نہیں کیا تھا لیکن اب اس کی دکھن محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ میں کوئی فولاد کا بنا ہوا تو تھا نہیں۔ ایک عام سا انسان تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میری قوت ارادی دوسروں سے زیادہ ہے اس لیے میں اپنے دکھ تکلیف کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ اس وقت بھی یہی دل چاہ رہا تھا کہ میں کسی آرام دہ بستر پر لیٹ جاؤں اور کوئی اس دکھتی ہوئی جگہ پر گرم کپڑے سے سنکائی کردے۔

انسان سوچنے پر آتا ہے تو بہت کچھ سوچنے لگتا ہے لیکن یہ سوچ زیادہ دیر قائم نہیں رہتی۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ میں ابھی اپنی سوچ میں گم تھا کہ روبیر کسی آندھی طوفان کی طرح وارد ہوئی اور مجھ سے کسی امر بیل کی طرح لپٹ گئی۔

اس جارحانہ پیش قدمی نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ اس لیے کہ میں دیکھ رہا تھا کہ وسیم، سفیر اور عبداللہ نزدیک ہیں جو سر جھکا کر ہنس رہے ہیں۔ ان کے لیے یہ ایک ہاٹ ٹاپک تھا۔ مستقبل میں مجھے چھیڑنے کے لیے وہ اسے آزماتے رہیں گے۔

روبیر بلند آواز میں رو رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل تمام اسے الگ کیا۔ وہ الگ ہو کر بھی بین کیے جا رہی تھی۔ اس کے رونے کی آواز سن کر اِدھر اُدھر بکھرے سپاہی مڑ مڑ کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ اس کے رونے سے مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ لیکن خدا کا شکر تھا کہ اس نے بے ساختگی میں کوئی اوّل جلول حرکت نہیں کی تھی۔ اگر وہ اس حرکت کی مرتکب ہو جاتی تو میں اپنی ہی نظروں میں گر جاتا۔ اس لیے کہ دو دن پہلے ہی وہ معبد کے سامنے ایک گری ہوئی حرکت کرنے کی کوشش کر چکی تھی۔ پھر بھی میں پریشان تھا کہ اسے خاموش کیسے کروں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ سامیرا کا خصوصی ہرکارہ آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا "آپ کو بلایا جا رہا ہے۔"

سامیرا کا یہ ہرکارہ میرے لیے نعمت غیر مترقبہ بن کر حاضر ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اچھا میں ابھی آ رہا ہوں۔" پھر روبیر کی طرف مڑ کر بولا "تم چلو گی؟"

سامیرا کا سامنا کرنا اس کے لیے آسان نہ تھا اس لیے وہ بولی "آپ جاؤ لیکن جلدی آ جانا۔ اگر دیر کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

اس کے اس حکمیہ انداز پر سفیر نے قہقہہ لگایا اور اردو

میں بولا "چلو چھٹی ہوئی۔ کاش اس وقت موبائل میرے پاس ہوتا تو میں کلپ بنالیتا۔"

"کیوں؟" میں نے آنکھیں تریری۔

"تاکہ سویرا کی خدمت میں پیش کرسکوں کہ حضور والا کے یہ لچھن ہیں۔"

"اور میں جواب میں تمہارا سر توڑ دیتا۔" کہہ کر میں آگے بڑھ گیا کیونکہ میں جتنی دیر وہاں رہتا سفیر چھیڑتا رہتا۔ وسیم تو پھر بھی ایک حد میں رہتا تھا لیکن سفیر مذاق اڑانے پر آتا تو پھر اسے قابو میں کرنا آسان نہ تھا۔

سامیرا نے اپنا خیمہ اسی اونچے ٹیلے پر لگایا تھا۔ میں اس ٹیلے کی طرف بڑھتا جارہا تھا کہ یکایک داہنی جانب سے ریبک دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے آتے ہی مجھے اس طرح بانہوں میں بھر لیا جیسے ہم برسوں کے بچھڑے آج ملے ہوں۔ اس نے دھڑادھڑ مجھے چومنا بھی شروع کردیا تھا۔ وہ اب بین بھی کرنے لگا تھا۔ اس کی آواز دور تک جارہی تھی اور لوگ مڑ مڑ کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک ہی بات کی رٹ لگائے ہوئے تھا کہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اسے بھلا دیا ہے۔ وہ میرے بغیر جی نہیں سکتا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے الگ کیا اور پوچھا "باقی لوگوں کا حال کیا ہے؟ وہ سب کہاں ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ سب آپ کے حکم سے اپنی اپنی جگہ مستعد تھے۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ فتح ہماری ہوگی اور بالآخر ہمیں فتح مل گئی۔ ظالم و جابر، غاصب ریناٹ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

"تو پھر خوشیاں مناؤ، رونا دھونا کیوں کررہے ہو؟"

"ہمیں فتح تو ملی لیکن اتنے سارے لوگوں کا خون بہانے کے بعد۔ آرگون میں جتنے لوگ ہیں سب ایک دوسرے کے رشتے دار ہیں اور ان کی موت کا ہمیں بھی دکھ ہے۔ اتنے لوگوں کی جان گئی ہے۔ اس کا دکھ تو ہونا ہی چاہیے۔"

"ہاں... میں سمجھتا ہوں... لیکن اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ ریناٹ یوں تو تخت سے دست بردار ہو نہیں سکتا تھا۔ یہ جنگ خود اس نے چھیڑی تھی۔ سامیرا نے نہیں۔ اب سامیرا کو اس کا حق مل گیا ہے۔ اس لیے خوشیاں مناؤ۔"

"لیکن ایک غم ہم سب کو کھائے جارہا ہے کہ آپ اب اپنی دنیا میں چلے جائیں گے۔"

"یہ بعد کی بات ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "اچھا یہ بتاؤ۔ ایرٹ کہاں ہے؟"

"ایرٹ اپنے ان رشتے داروں کی لاشیں تلاش کررہا ہے جو ریناٹ کی طرف سے لڑنے آئے تھے۔"

"اس سے ملاقات ہو تو میرا پیغام دے دینا کہ وہ آکر مل لے۔"

"وہ آپ سے ناراض ہے۔" کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا "اس کا کہنا ہے کہ آپ کی وجہ سے روبیر اس کی جانب مائل نہیں ہورہی۔"

میں نے بھی جوابی قہقہہ لگایا پھر کہا "اس کو سمجھاؤ کہ مجھے روبیر سے کیا لینا دینا۔ میں آج ہوں کل نہیں رہوں گا۔ روبیر اس کی ہے اسی کی رہے گی بلکہ میں جانے سے پہلے سامیرا سے کہہ کر ان دونوں کو ایک کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔"

"لیکن روبیر نہیں مانے گی۔ اس کی آنکھیں بتایا کرتی تھیں کہ وہ آپ کو پسند کرنے لگی ہے۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کو ہی اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے پسند کا ساتھی منتخب کریں۔ لڑکے کو اختیار نہیں ہوتا۔"

"میں روبیر کو قائل کروں گا۔"

"کوئی فائدہ نہیں اس لیے مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ ایرٹ خوبصورت ہے اور اپنے ہاں کا ہے پھر تم اسے نظرانداز کیوں کررہی ہو تو اس نے جواب دیا تھا کہ شہباز میں بے شمار خوبیاں ہیں ایرٹ میں ایک بھی نہیں۔"

"یہ اس کی بھول ہے.... میں اسے قائل کروں گا۔ اب تم آرام کرو میں ذرا سامیرا سے مل آؤں کیونکہ ابھی ایک خطرہ باقی ہے۔ بڑا پجاری زندہ ہے اور پتا نہیں کہاں چھپ کر بیٹھا ہے۔ کل صبح ہم سب شہر میں داخل ہوں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی شرارت کرے کیونکہ ہمارا ایک اور دشمن ڈیوڈ شا بھی اب تک نظر نہیں آیا ہے۔ وہ انسان کی شکل میں مجسم شیطان ہے۔ اس کے پاس کیسے کیسے ہتھیار ہیں یہ تم بھی دیکھ چکے ہو۔"

"ارے۔ وہ بدمعاش اب تک گرفتار نہیں ہوا ہے۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کا بھی قلعہ قمع ہوگیا ہے...... یہ تو بہت بری خبر ہے۔" ریبک کے چہرے پر فکر رقصاں ہوگئی پھر وہ بولا "آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔ سامیرا نے بلایا ہے تو جائیں اور میری بھی سفارش کردیں گے۔ میں نے آزادی کے لیے بہت قربانیاں دی،

ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے چچازاد کا خون بہایا ہے۔ اس لیے بھی مجھے وہ نہ بھولے اور کوئی اچھا سا مقام ضرور دے۔"

"تم بے فکر رہو..... میرے ساتھ جتنے بھی لوگ رہے ہیں ان سب کو اعلیٰ مقام دیا جائے گا۔"

"جی بہت بہتر... میں رات ہی میں آپ کے خیمہ میں آؤں گا۔" کہہ کر وہ ایک جانب چلا گیا۔ یہاں والوں کی معصومیت۔ سادگی اور اپنا پن نے مجھے گرویدہ کر رکھا تھا۔ یہاں سے جانے کے بعد بھی میں ان لوگوں کو نہیں بھول پاؤں گا۔ یہی کچھ سوچتا ہوا میں سامیرا کے شاہی خیمہ کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

سامیرا کے خیمہ کے پاس پہنچا تو پہلے سے زیادہ پہرے دار موجود تھے۔ لیکن ان میں سے زیادہ تر مجھے پہچانتے تھے اس لیے سب نے مجھے دیکھتے ہی سر جھکا کر تعظیم دی۔ میں نے ایک سپاہی سے کہا کہ وہ سامیرا کو خبر دے کہ میں اس سے ملنے آیا ہوں۔ اس سے پہلے کہ وہ اندر خبر دیتا سامیرا خود ہی دروازے پر آ گئی۔ اس نے کہا "تمہیں اندر آنے کی اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں، اندر آ جاؤ۔"

میں اس کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ خیمے میں زیادہ تر آرائشی سامان ریناٹ کے خیمے کا بچا ہوا تھا۔ اب وہ خیمہ کسی ملکہ کا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک مسند سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے مجھے سامنے بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھنے کا اشارہ دیا۔

میں خیمے کا جائزہ لیتے ہوئے بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی کہ میں نے کہا "آپ کو فتح مبارک۔"

"یہ فتح میری نہیں ہمارے عوام کی ہے۔ ان دبے کچلے عوام کی جو عرصہ دراز سے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اور اس فتح کے لیے ہم سب تمہارے ممنون ہیں۔ اگر تم لوگوں کی مدد نہ ہوتی تو شاید یہ فتح اتنی آسانی سے حاصل نہ ہوتی۔" سامیرا نے سنجیدہ لہجے میں اقرار کیا۔

"ہمارا مذہب ہمیں بتاتا ہے کہ مالک کل جو چاہتا ہے وہی ہوتا۔ اس دنیا کے مالک نے آپ کو فتح دلانا چاہی اور فتح مل گئی۔ ہم تو صرف ایک ذریعہ بنے۔ آپ کے سپاہیوں نے بھی جس طرح قربانیاں دی ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ بے شک بہادروں کی ملکہ ہیں۔"

"ان باتوں کو چھوڑو میں نے کس لیے بلایا ہے وہ بتا دوں۔" کہہ کر اس نے ایک کاغذ اٹھایا اور دکھاتے ہوئے کہا "میرے ایک خاص مخبر نے خبر دی ہے کہ پجاری آئی

کانگڑی

کانگڑی۔ کشمیری زبان میں مخصوص بناوٹ کی انگیٹھی کو کہتے ہیں جو صرف کشمیریوں میں ہی مستعمل ہے۔ برصغیر میں کشمیر اور کشمیریوں کا حسن اپنی مثال آپ ہے۔ یہ خطہ اپنے قدرتی حسن کے ساتھ ساتھ چند مصنوعات میں بھی انفرادیت رکھتا ہے۔ جن میں کانگڑی بھی شامل ہے۔ پکی اور مضبوط مٹی سے بنا ہوا گملے یا پیالے کی طرح ہلکا پھلکا برتن ہوتا ہے۔ جس پر مضبوط تیلیوں کا بنا غلاف سا چڑھا ہوتا ہے۔ یہ غلاف لکڑی کی ٹوکری کے انداز میں بنا جاتا ہے۔ کانگڑی میں پختہ لکڑی کے دہکتے ہوئے انگارے ڈالے جاتے ہیں۔ یہ پختہ لکڑی کشمیر میں عام ملتی ہے۔ اس کے ٹھوس انگاروں کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ایک تو یہ چنگاریاں نہیں چھوڑتے۔ دوسرا یہ دیر تک گھنٹوں دہکتے رہتے اور گرمی پہنچاتے رہتے ہیں۔ اہل کشمیر خصوصاً غریب اور نادار لوگ اسے سردی میں ہمہ وقت ساتھ رکھتے ہیں کہیں بیٹھے ہیں تو کانگڑی گھٹنوں، رانوں یا جھولی میں دبائے، خود پر موٹا کمبل یا چادر اوڑھے۔ باتوں میں مصروف ہیں۔ راہ چلتے گرم کانگڑی کمبل یا چادر کے نیچے چھپائے۔ ہاتھ میں پکڑے یا گلے میں لٹکائے جا رہے ہیں۔ لکڑی کی تیلیوں سے بنا ٹوکری نما غلاف مٹی کے گرم برتن سے بچائے رکھتا ہے۔ کشمیری اگر کہیں آپس میں الجھ پڑیں اور نوبت ہاتھا پائی، مار کٹائی تک جا پہنچے تو لڑائی جھگڑے میں یہی راحت بخش، دل آرام گرم کانگڑی، خطرناک آتشیں ہتھیار بن کر مقابل پر گرتی ہے۔ فریقین کی غصے کی آگ اور گرم کانگڑی کے دہکتے انگاروں کی تیز آنچ، مضبوط ٹوکری نما غلاف، یہ سب مل کر خطرناک ہتھیار بنتے ہیں۔ کانگڑی کو اردو، ہندی، زبان میں انگیٹھی، جھجھری، پوربی میں، برسی، ڈھواں را، مارواڑی میں سگڑی، فارسی میں آتش دان، گل خن اور عربی میں مجمر کہا جاتا ہے۔ پنجابی زبان کا اپنا ایک دلچسپ لہجہ اور رنگ ڈھنگ ہے لہٰذا پنجابی زبان میں لفظ 'کانگڑی' کے معنی کمزور، دبلا پتلا، مریل، سوکھا کے ہیں۔ کمزور آدمی یا لڑکے کو طنزیہ کانگڑی پہلوان کہا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا، کانگڑی کا رواج صرف کشمیر میں ہی ہے جو کہ کشمیریوں کی زندگی کا اٹوٹ انگ ہے۔

اقتباس: "یادوں کی بستی" از محمد ایاز راہی

مرسلہ: نوشین گل۔ پشاور

زور ایک گھر میں چھپا بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ دو باہر کے آدمی بھی ہیں۔"

"ہمیں فوراً اس کے خلاف کوئی قدم اٹھالینا چاہیے ورنہ آگے چل کر وہ ہمارے لیے خطرہ ثابت ہوگا۔"

"بہت بہتر لیکن ہم کون سا قدم اٹھائیں؟" سامیرا نے سوال کیا "اس لیے کہ ہمارے مخبر نے خبر دی ہے کہ وہ ایک کمرے میں بند ہو گیا ہے۔ باہر سے اس کا کوئی رابطہ بھی نہیں ہے۔"

"ہوسکتا ہے وہ کسی امداد کا منتظر ہو۔ صبح ہونے میں اب دیر بھی نہیں ہے۔ آپ نے آرگون میں داخلے کا کیا سوچا ہے؟"

"پو پھٹنے کے ساتھ ہم کوچ کریں گے۔ سورج کی پہلی کرن ہم آرگون میں دیکھیں گے۔"

"تو پھر آپ سپاہیوں کو تیاری کا حکم دے دیں۔"

"حکم جاری ہو چکا ہے۔ آرگون میں داخلے کے وقت تم میرے ساتھ رہو گے۔"

"جی بہتر۔" میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا اور کھڑا ہو گیا "اب ذرا میں اپنے ساتھیوں کو بھی یہ خبر دے دوں کہ وہ چلنے کی تیاری کرلیں۔"

سامیرا کے خیمے سے نکلا تو سپاہیوں میں وہی تازگی، فتح کی سرشاری محسوس کی۔ سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ لاشیں اب تک جمع کی جارہی تھیں۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا اس طرف بڑھتا جارہا تھا جہاں میں نے وسیم سفیر اور عبداللہ کو چھوڑا تھا۔

وہ سب اب تک اسی طرح زمین پر بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سفیر نے چوٹ کی "لو جناب لیڈی کلر تشریف لے آئے۔ ذرا اپنی دنیا میں پہنچتے تو دو۔ یہ ساری رپورٹ میں نے سویرا باجی کو نہ دی تو کہنا..... بہت پھنے خاں بنتے ہیں نا۔"

میں نے ان کے نزدیک پہنچ کر کہا "یہ ساری باتیں بعد میں کرلینا لیکن اب تیاری کرلو۔ ہمیں پو پھٹنے سے پہلے آرگون میں داخل ہونا ہے اور وہاں ہمارا دشمن ہماری تاک میں بیٹھا ہے۔"

"کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہنی ہیں۔"

"کیا ڈیوڈ شا کا سراغ مل گیا؟" وسیم نے پوچھا۔

"ڈیوڈ شا کا نہیں لیکن بڑے پجاری آئی زور کا سراغ مل گیا ہے۔ وہ ایک گھر میں چھپا بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی ہیں جن کے بارے میں اطلاع دینے والے نے کہا ہے کہ وہ باہر کے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ڈیوڈ شا ہو۔ کیونکہ وہی پجاری کے ساتھ معبد سے نکلا تھا۔"

"پھر دیر کس بات کی ہے... چلو دو دو ہاتھ کر لیتے ہیں۔" وسیم نے آستینیں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"میرا ارادہ بھی یہی تھا لیکن سامیرا کا کہنا ہے کہ پہلے آرگون پر حکومت حاصل کرلی جائے۔ اگر ابھی چھیڑا تو کوئی پریشانی بھی کھڑی ہوسکتی ہے۔ جب وہ کچھ کرتے ہیں تو سنبھال لیا جائے گا۔ پہلے انہیں چھیڑنا مناسب نہیں۔"

"جو حکم ہم تو تعبیدار ہیں۔" وسیم نے سر خم کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔

آسمان پر صبح کاذب کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ سپاہیوں میں جوش و خروش صاف نظر آرہا تھا جب کہ ابھی وہ ایک خونی جنگ سے فارغ ہوئے تھے۔ کتنے ہی ان کے ساتھی جان کی بازی ہار چکے تھے۔ کتنے ہی ساتھی زخمی پڑے تھے لیکن آرگون پر اپنا پرچم لہرانے کی للک میں وہ سب خوشی سے سرشار تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں اندر داخل ہوتے ہی ایک اور جنگ نہ شروع ہو جائے اس لیے کہ شہر کی گلیوں میں صرف چھاپا مار جنگ ہوسکتی ہے۔ پجاری آئی زور کم سپاہیوں سے بھی چھاپا مار جنگ لڑسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ڈیوڈ شا ہے۔ وہ ایسی ہی شیطانی حرکت بتا سکتا ہے۔ شاید اسی لیے پجاری آرام سے بیٹھا ہے۔ ایسے ہی خیالات میں گھرا میں سامیرا کی فوج کو صف بندی کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے۔ اتنے چپ چپ کیوں ہو... کوئی خاص خطرہ محسوس کر رہے ہو کیا؟" سفیر کی نظروں سے میری خاموشی چھپ نہ سکی۔

"میں سوچ رہا ہوں کہیں شہر کے اندر چھاپا مار جنگ نہ شروع ہو جائے۔ اس سے ناحق لوگ مارے جائیں گے۔"

"ایسا ہوسکتا ہے۔ ڈیوڈ شا جیسا شاطر جب شہر میں موجود ہو تو ایسا ہونا بعید نہیں۔ وہ ایسا ہی چاہے گا کہ عوام کو ڈھال بنا کر کامیابی حاصل کرلے۔" سفیر بھی فکر میں ڈوب گیا۔ "اس کا ایک ہی علاج ہے کہ ہم ان کے داخلے سے پہلے شہر میں داخل ہو جائیں۔"

"لیکن سامیرا نے منع کیا ہے۔ اگر ہم اس کے گ

مشورے کو ٹھکرا کر شہر میں داخل ہوتے ہیں تو وہ برا مان سکتی ہے۔"

"اور اگر وہاں کوئی ایسی بات ہوگئی۔ بے قصور شہری لپیٹ میں آتے ہیں تو ان کا خون کس کی گردن پر ہو گا؟" سفیر نے پتے کی بات کی۔

شہر میں جیسے ہی سامیرا کی فوج داخل ہوتی ہے اور عوام اس کے استقبال کے لیے گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آتے ہیں، اسی وقت ڈیوڈشا کوئی حرکت کرے گا تو بے حساب لوگ مارے جائیں گے۔ کیونکہ ڈیوڈشا کے پاس آتشی ہتھیار ہے۔ گولا بارود کا ذخیرہ ہے۔ بھیڑ میں ایک بھی گولا پھٹا یا کسی نے مشین گن چلا دیا تو سینکڑوں کی تعداد میں لوگ مارے جائیں گے۔ اب میں کچھ زیادہ ہی ایکسائٹیڈ ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ سامیرا کی بات مانوں یا سفیر کے کہے پر عمل کروں۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ دور سے بگل پھونکنے کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ سامیرا نے قدم بڑھا دیے ہیں۔ میں نے سفیر کی طرف دیکھا اور پھر عبداللہ کا ہاتھ پکڑ کر وسیم سے کہا "انشا جی اٹھو اب کوچ کرو۔"

"بڑے شعر یاد آرہے ہیں۔ ہاں ہاں کیوں نہ یاد آئیں گے۔ جانے کا وقت جو آرہا ہے۔ جنّی سے کیا وعدہ جو نبھانا ہے۔" سفیر نے اپنی گن اٹھاتے ہوئے کہا اور قدم بڑھا دیے۔

سفیدیٔ سحر نمودار ہو چکی تھی۔ اس ہلکی روشنی میں دور تک پھیلی سامیرا کی فوج نظر آرہی تھی۔ اب ان لوگوں نے بڑے بڑے پرچم بھی پھیلا لیے تھے۔ آگے آگے سوار دستہ تھا اس کے پیچھے سامیرا کی سواری اور اس کے پیچھے پیدل دستے۔ سب کے سب نہایت نظم و نسق کے ساتھ بڑھتے چلے جارہے تھے۔ ہم تینوں بھی اس فوج کا حصہ بن کر آگے بڑھنے لگے۔ تبھی میری نظر ایک ایسے دستے پر پڑی جس میں کئی چہرے شناسا نظر آئے۔ سب سے آگے ایزارٹ تھا۔ اس کی داہنی جانب شاٹ اور ایمار تھے۔ پیچھے مارٹ اور رائیون، ساتھ میں ایرٹ بھی تھا۔ گویا وہ تمام لوگ جو میرے ساتھ شہر میں خدمت انجام دے رہے تھے لگتا تھا کہ سب کے سب جنگ کے میدان میں آگئے تھے۔ میں ان کی جانب بڑھا۔ جیسے ہی ان کی نظریں مجھ پر پڑیں ان کے قدم ردھم سے الگ ہوگئے۔ میں نے اشارے سے ان کو اپنے قریب آنے کو کہا۔

ایک ایک کر کے وہ سب دستے سے باہر آگئے۔ میں نے ایرٹ سے پوچھا۔ "اب تک کہاں تھے؟"

"میرے کچھ اپنے بھی وطن کے نام پر مارے گئے ہیں۔ میں ان کو الگ کر رہا تھا۔ بھلے ہی وہ دشمن بن کر آئے تھے مگر میرے اپنے تھے۔ اس لیے ان کی لاشوں کو بے حرمتی سے بچا لیا۔" اس کی آواز میں ایک کسک تھی۔ وہ غمگین تھا۔ لیکن اپنے حصے کی جنگ میں وہ پیچھے نہیں رہا تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "روبیر سے ملاقات ہوئی؟"

"ہاں اسے دیکھا تھا لیکن بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

"میں سامیرا سے بات کروں گا۔ وہ تم دونوں کو اہم منصب دے کر اپنے قریب رکھے گی۔"

"اب ملکہ عالیہ ہمیں اس قابل سمجھیں گی؟ کیا وہ ہماری قربانیوں کو یاد رکھیں گی؟" ایرٹ کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"کیوں نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "وہ تم دونوں کو عزیز رکھتی ہیں۔"

"آپ کی ان سے اس معاملے میں کوئی بات ہوئی ہے؟"

میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے اور اسے حوصلہ دینے کے لیے کہا "ہاں ہاں ہوئی ہے۔ میں اپنی دنیا میں جانے سے قبل تم دونوں کو ایک کر دوں گا تا کہ تم لوگ ہنسی خوشی زندگی گزارتے رہو۔"

"کیا روبیر راضی ہوگی؟" ایرٹ کے چہرے پر ایک خوشی کی جھلک آگئی۔ یہ تو اس کے دل کی بات تھی جو میں نے کہی تھی۔

"سامیرا کا حکم وہ کیسے ٹال سکتی ہے۔ میں نے سامیرا سے کہہ دیا ہے کہ وہ روبیر کو راضی کرے۔"

"اگر ایسا ہو گیا تو میں زندگی بھر آپ کا ممنون رہوں گا۔ روبیر میرے لیے بہت اہم ہے۔ میں اس سے کتنا پیار کرنے لگا ہوں یہ میں آپ کو کیسے بتاؤں۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ہماری باتوں میں اب تک کسی نے دخل نہیں دیا تھا۔ میرے ساتھی تو اس اجنبی زبان کو سمجھ نہیں رہے تھے اس لیے خاموش تھے لیکن باقی سب اس لیے چپ تھے کہ حد

ادب کا سوال تھا۔ میرے خاموش ہونے کے کافی دیر تک کسی نے کچھ نہیں کہا لیکن جب میں ایک قدم آگے بڑھا تو رائیون نے ایرٹ کو چھیڑا "ایسی خوشی کی خبر سن کر بھی تم غمگین ہو۔ آرگون پہنچ کر دعوت کرنی ہوگی۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں...... اگر شہباز صاحب نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا تو میں سب کی دعوت ہی نہیں ہو سب کے لباس کا بھی وعدہ ہے۔"

"لباس کی اب کسے فکر۔" رائیون بولا "میں تو ملکہ عالیہ سے کہہ کر شعبہ ملبوسات کا افسر بن جاؤں گا۔"

"مجھے بھی یہی امید ہے کہ ملکہ عالیہ ہم سب کو اپنی اپنی پسند کا شعبہ دیں گی۔ میں فوج کی افسری کو ترجیح دوں گا۔" مارٹ نے گفتگو میں حصہ لیا۔

وہ سب اپنی اپنی باتوں میں مشغول تھے۔ میں نے دخل دینا مناسب نہیں سمجھا اور سفیر کی طرف دیکھ کر پوچھا "تم کیوں اس طرح سے منہ پھاڑے دیکھ رہے ہو۔"

"میں سوچ رہا ہوں تم کتنی زبانیں جانتے ہو۔ انگلش، فرنچ، جرمن۔ عربی تھوڑا بہت نیپالی اور یہ والی گٹ گٹ غٹاک...... ایسا لگتا ہے جیسے کسی ٹین کے ڈبے میں کنکریاں بھر کر بجایا جا رہا ہے۔ یہ کتنے دنوں میں سیکھی؟"

"یقین کرو صرف ایک دن میں آگئی تھی۔"

"واہ...... ایسا کون سا استاد مل گیا تھا جس نے اتنی مشکل زبان ایک دن میں سکھا دی۔"

"اس استاد کا نام برف والا ہے۔ یقین کرو جب میں اس وادی میں آیا تو ایک لفظ بھی نہیں سمجھ رہا تھا کہ برف والے نے اپنی کارسازی سے میرے دماغ میں الفاظ بھر دیے اور میں ان کی باتیں سمجھنے لگا لیکن بول اب بھی نہیں پاتا جس طرح میں ان کی بات سمجھ لیتا ہوں اسی طرح ان میں سے کچھ کو یہ قوت ملی ہے کہ وہ میری باتیں سمجھ لیتے ہیں اور ایسے کتنی کے لوگ ہیں۔"

ابھی میں نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ ایک سپاہی میرے قریب آیا اور بولا۔ "آرگون میں تمہارے لیے ایک بڑی خوش خبری منتظر ہے۔"

"کون سی خوش خبری۔" میں نے پوچھا۔

"مجھ سے کچھ کہا؟ کون سی خوش خبری۔" اس سپاہی نے تعجب بھرے انداز میں پوچھا۔

اب حیرت کا جھٹکا مجھے لگنا تھا کہ ابھی اس نے خود ہی کہا کہ آرگون میں میرے لیے خوش خبری ہے پھر خود ہی کہہ رہا ہے کہ کون سی خوش خبری؟ میں جھلا کر کوئی جواب دیتا کہ میرے ذہن میں ایک نام گونجا 'برف والا'۔ اس سے پہلے بھی تو وہ اپنا پیغام کسی نہ کسی ذریعہ سے بھیج دیا کرتا تھا۔ کبھی کسی بچے سے اور کبھی ساتھ کھڑے کسی بندے کی زبان سے کہلوا چکا تھا۔ میں سمجھ گیا اس لیے اسے دستے کے اندر جانے کا اشارہ کر کے سفیر کی طرف مڑ گیا۔

"سپاہی کیا کہہ رہا تھا کہ تمہارے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی؟" سفیر نے پوچھا۔

"یہ برف والا بھی نا، عجیب ہے۔ اپنا پیغام ایسے بھیجتا ہے کہ عقل حیران رہ جائے۔ اسی کا پیغام تھا کہ آرگون میں ہمارے لیے ایک خوش خبری منتظر ہے۔"

"اگر وہ ایسا ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ سچ بول رہا ہو۔ کوئی خوش خبری منتظر ہو۔"

"یہ بات تو ہے کہ اب تک اس کی ایک بات بھی غلط نہیں ہوئی ہے۔ اب اس بات کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

باتوں کے درمیان وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا اور ہم آرگون کے مرکزی گیٹ پر پہنچ گئے تھے۔ فصیل میں بنے اس دروازے سے اب تک ہم ایک بار بھی نہیں گزرے تھے۔ اس سے قبل جتنی بار بھی داخل ہوئے تھے تو چور دروازے سے اور باہر بھی آئے تھے تو دوسرے دروازے سے۔ اس دروازے پر پہرا زیادہ ہوتا تھا۔ لیکن آج یہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دروازے کے سامنے اور اندر تک سامیرا کے سپاہی مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ میدان سے فرار ہونے والے بہت سے سپاہی شہر میں پناہ گزین ہیں۔ میں نے سامیرا کی طرف بڑھنا چاہا تھا کہ اسے ہدایت دے سکوں لیکن اس سے پہلے ہی سامیرا کا نقارچی بڑے سے بھونپو سے اعلان کرتا نظر آیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اب اس شہر کی ملکہ سامیرا ہے۔ آرگون کے تخت کی اصل وارث۔ اس نے ایک طویل جدوجہد کے بعد، بے مثال قربانیوں کے بعد اس سرزمین سے ظلم و جبر کا نام و نشان کلی طور پر مٹا دیا۔ اب ہر ایک کا فرض ہے کہ نئی ملکہ کو خوش آمدید کہے۔ اس کی کوششوں کو سراہے۔ امن و امان قائم کرنے میں اس کا ہاتھ بٹائے لیکن جو لوگ اس سے جنگ کر چکے ہیں ان کے لیے بھی ایک پیغام ہے۔ وہ خوفزدہ نہ ہوں۔ وہ سب بھی اسی سرزمین کے بیٹے ہیں۔ ہم سب ایک باپ کی اولاد ہیں۔ اس لیے ان کو عام معافی دی جاتی

ہے۔ ان کے لیے اعلان ہے کہ وہ بھی ملک وملت کی ترقی و خوشحالی کے لیے کوشاں ہو جائیں۔ ان سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔

اس اعلان کا اثر بہت بہتر ثابت ہوا۔ وہ دروازہ جو ادھ کھلا تھا پوری طرح کھل گیا۔ ہم سب اندر داخل ہوئے۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ایک عجب منظر نظر آیا۔ سڑک کے دونوں جانب شکست خوردہ سپاہی ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ان کے پیروں کے پاس ان کے ہتھیار پڑے ہوئے تھے۔ سامیرا نے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ان پر پھول پھینک کر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا جس کا خاطر خواہ فائدہ نظر آیا۔ اب وہ بھی سامیرا کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ ہم ان کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔

اب ہم محل کے سامنے تھے۔ یہ وہی محل تھا جہاں کسی عام آدمی کو آنے نہیں دیا جاتا تھا۔ محل تو محل امرا کے علاقے میں بھی کسی عام آدمی کو آنے کی اجازت نہیں تھی اور آج اسی علاقے میں ہر کوئی آجا رہا تھا۔ اور ہر کوئی خوش تھا۔ شاد تھا۔ کسی چہرے پر خوف نہ تھا۔

سامیرا کی سواری محل کے دروازے پر رکی تھی کہ وہ اترتے اترتے رک گئی۔ میں اس کے نزدیک ہی تھا۔ میری نظر اس پر پڑی تو میں بھی چونک گیا۔ اس کے چہرے پر غصے کی سرخی تھی اور وہ محل کی سیڑھیوں کے نزدیک سر جھکائے بیٹھے ایک نوجوان کو بغور دیکھ رہی تھی۔

"کون ہے یہ؟" میں نے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔

"یہ ریناٹ کا بیٹا ہے۔ اناس نام ہے۔" سامیرا نے سانس لے کر کہا "اس نے مجھے بہت ستایا ہے۔"

"لیکن آپ نے تو عام معافی کا اعلان کر دیا ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اسی لیے میں خاموش ہوں ورنہ اسے ابھی قتل کروا دیتی۔"

"اب کیا چاہتی ہیں۔ یہ تو خود سر جھکائے بیٹھا ہے۔"

"لیکن اس کے چہرے پر غصے کی جھلک ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

"اس سے پوچھو وہ کچھ کہنا چاہتا ہے تو بلا جھجک کہہ دے۔"

"کچھ کہنا ہے؟" سامیرا نے اسے مخاطب کیا۔

اب تک میں خود ہی تمام فیصلے کرتا رہا تھا۔ اپنی مرضی سے چل رہا تھا لیکن جب سے سامیرا نے فتح حاصل کی تھی میں نے خود کو اپنے تک محدود کر لیا تھا۔ کوئی بھی فیصلہ نہیں کر رہا تھا۔ میں نہیں چاہ رہا تھا کہ سامیرا کی کسی بات سے اختلاف کروں یا اس پر اپنا فیصلہ تھوپوں۔ اسی لیے میں اسے صرف مشورہ دے رہا تھا۔ اس وقت بھی میں نے اسے بات کرنے کا مشورہ دیا اور لاتعلق ہو گیا۔ میں مڑنے ہی والا تھا کہ رک گیا۔ اس نوجوان کا لہجہ عجیب سا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "سامیرا تم... تم جو ہمارے ٹکڑوں پر پلتی رہی۔ یہ میرے والد کی غلطی تھی کہ اس نے تمہیں صرف شہر بدر کیا۔ گردن نہیں ماری۔ اسی لیے وہ اپنی جان سے چلا گیا۔ اب بولو مجھ سے کیسا سلوک کرو گی؟"

"اناس تمہارے لیے بھی معافی کا اعلان ہے۔" سامیرا نے شاہی تمکنت سے جواب دیا۔ "اب ریناٹ کا دور ختم ہو چکا ہے۔ ہر کوئی آزاد ہے۔ تم بھی آزاد ہو۔ دوسروں کی طرح تم بھی اپنے وطن کی خدمت کر و اس کی ترقی اور خوش حالی کے لیے اپنی ذمے داری نبھاؤ۔"

"میں کوئی بھکاری نہیں ہوں جو بھیک میں اپنا سر بچا لوں۔ میں ایک بہادر باپ کا بہادر بیٹا ہوں۔ تم یہ بھی جانتی ہو گی کہ شاہی خاندان کے لوگ زندہ گرفتار نہیں ہوتے۔ میدان جنگ میں لڑتے ہوئے جان دے دیتے ہیں۔" اناس نے غرور بھرے انداز میں جواب دیا۔

"لیکن جنگ تو اب ختم ہو چکی ہے۔ لڑنے کا اتنا ہی شوق تھا تو میدان جنگ سے فرار کیوں ہوئے؟"

"مجھے میدان جنگ میں جانے کی اجازت ہی نہیں ملی تھی۔ مجھے بابا نے شہر کا نظم ونسق سنبھالنے کو کہا تھا۔ میں اپنا فرض انجام دے رہا تھا۔ لیکن اب جب جنگ ختم ہو گئی اور میرے خاندان کو تخت سے محروم ہونا پڑا تو میرا فرض بنتا ہے کہ میں موت سے جنگ کروں اور اس کا ایک طریقہ ہے جس کی خبر تمہیں بھی ہو گی۔"

"تو کیا تم مجھ سے لڑنا چاہتے ہو؟ مگر میں بتا دوں کہ میں اب ملکہ ہوں۔ اس ملک کی مالک۔ اور ملکہ یا بادشاہ بھی کسی ایک آدمی سے نہیں لڑتے۔ وہ صرف جنگ کے میدان میں لڑتے ہیں۔"

"میں ایک بہادر باپ کا بہادر بیٹا ہوں اس کا ثبوت میں خود دوں گا کہ بہادر کس طرح موت کو گلے لگاتے ہیں۔ یہ سورج جو ہمارا تمہارا آقا ہے، جو آہستہ آہستہ طلوع

ہو رہا ہے، یہ بھی آج اپنے اس غلام کی بہادری دیکھے گا۔ میں دکھاؤں گا کہ بہادر کسے کہتے ہیں۔ میں لڑتے ہوئے اپنی جان دوں گا۔ تم ایک کے بعد ایک اپنے بہادر سپاہی کو بھیجو میں اس سے اس وقت تک لڑتا رہوں گا جب تک میں مر نہیں جاتا۔ اگر خود لڑنا نہیں چاہتی تو کسی کو میرے مقابلے میں بھیجو۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے قدموں میں ایک نیزہ رکھا ہوا تھا۔ اسے اس نے اٹھا لیا پھر بولا۔ ''میرا یہ نیزہ بہت سے لوگوں کا خون پی چکا ہے لیکن کئی ماہ سے پیاسا ہے۔ جس کو تم بہادر سمجھتی ہو اسے بھیجو۔ اس میدان میں کسی نہ کسی کا خون بہنا ہے۔ یہ خون تمہاری تاج پوشی پر قربانی ہے۔''

''نہیں تم منتخب کرو کہ کس افسر یا سپاہی سے لڑنا چاہتے ہو۔ تمہاری خواہش پر ہی میں چلوں گی۔ جلدی بولو۔''

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامیرا کی سواری کے ساتھ تمام بڑے افسر چل رہے تھے۔ ہر دستے کے سردار تھے۔ وہ ان سرداروں کو نظروں سے تول رہا تھا۔ کئی ایک بار نظریں گھمانے کے بعد اس کی نظر ییناٹ پر ٹھہر گئی۔ اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''یہ.... اس سے میں اپنا پرانا حساب بھی چکانا چاہتا ہوں۔ اسے اپنے نیزہ زنی پر بہت ناز ہے نا۔ آج میرے نیزہ کا بھی یہ کمال دیکھ لے۔ اب کوئی ایک بچے گا۔ میں یا یہ... اسے میرے مقابلے میں بھیجو۔''

''تم خود ہی مرنا چاہتے ہو تو بات دیگر ہے، میں پھر منع کروں گی کہ اس سے الجھنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ نیزہ زنی میں ماہر ہے۔ اگر کوئی پرانی دشمنی ہے تو میں اسے دوستی میں بدلنے کی پیش کش کرتی ہوں۔''

''میں نے کہا نا کہ میں فقیر نہیں ہوں اور نہ مجھے خیرات میں ملی ہوئی زندگی چاہیے۔ اس نے دو سال پہلے آرگون میں چوروں کی طرح داخل ہو کر میری پسندیدہ لڑکی سے شادی کی اور اسے فرار کرا کے لے گیا۔ اب اس لڑکی کو بیوہ کرنے کی ذمے داری میری ہے۔''

سامیرا کچھ کہتی کہ ییناٹ نے آگے بڑھ کر سر جھکا کر سامیرا کو تعظیم دی پھر بولا ''ملکہ عالیہ' یہ عیاش و مکار میری حمیت پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا اس لیے میں اسے سبق دینے کی خاطر ایک رات چھپ کر آرگون میں داخل ہوا اور اپنی عزت کو باحفاظت لے کر آ گیا۔ اب یہ پھر میری غیرت کو للکار رہا ہے تو اس کو سبق سکھانے کی اجازت مجھے دی جائے۔ میں ابھی اس بڑبولے کو خاموش کر دیتا ہوں۔''

سامیرا نے اس کی طرف حوصلہ افزا نظروں سے دیکھا۔ ییناٹ کے ہاتھ میں اس وقت بھی میرا بنایا ہوا کلہاڑا تھا۔ اس نے کلہاڑے کو گردش دیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا پھر سامیرا سے التجایہ انداز میں کہا'' مجھے اجازت دی جائے۔ میں زندگی بھر ممنون رہوں گا۔''

''اجازت ہے کیونکہ یہ اسی کی خواہش ہے۔ جب یہ مرنے کا خواہشمند ہو چکا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں پھر بھی اس سے یہی کہوں گی کہ ابھی بھی موقع ہے یہ سوچ لے۔''

''میں ایک بہادر باپ کا بہادر بیٹا ہوں اور اس جنگ میں مرنے کے لیے لڑنا چاہتا ہوں۔'' اس نے اپنے نیزہ کو ہاتھوں میں تول کر کہا۔

ان دونوں کے درمیان مقابلہ ہوگا یہ خبر پوری فوج میں پھیل گئی تھی۔ ہر کوئی اس جنگ کو دیکھنے کے لیے بے تاب نظر آنے لگا تھا۔ وہ سپاہی جو بہت پیچھے تھے وہ آگے آنے کی کوشش میں تھے۔ اگر سامیرا کی سواری وہاں نہ ہوتی تو اب تک دھکم دھکا شروع ہو چکی ہوتی۔ میں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر تمام سپاہیوں کو یہ مقابلہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا تو ہڑبونگ بچ سکتی ہے۔ اس لیے میں نے سامیرا سے کہا۔ ''پہلے تمام سپاہیوں کو میدان میں بیٹھ جانے کے لیے حکم دو تاکہ ہر کوئی بہ آسانی مقابلہ دیکھ سکے۔ درمیان میں کافی سارا حصہ خالی چھوڑ دیا جائے تاکہ یہ دونوں آرام سے مقابلہ کر سکیں۔ دونوں ہی سپاہانہ رموز سے آگاہ ہیں اس لیے آگے پیچھے ہٹیں گے۔ کوئی اور زد میں نہ آ جائے اس لیے جگہ چھوڑنے کے لیے کہا ہے۔''

سامیرا نے حکم جاری کر دیا۔ تمام سپاہی اس وسیع و عریض میدان میں پھیل کر بیٹھ گئے۔ کئی کئی قطاروں میں سپاہی بیٹھے تھے۔ ایک ڈیڑھ میل قطر کا یہ میدان لوگوں سے بھر گیا تھا۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آ رہا تھا۔ عقب میں کئی قطاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ سامیرا نے ییناٹ کو اشارہ دیا۔ وہ اپنا کلہاڑا لہراتا ہوا میدان کے درمیان جا کھڑا ہوا۔

''کیا تم اس کھلونے سے میرے نیزہ کا مقابلہ کرو گے۔ نیزہ لے کر آؤ۔'' انا اس نے چیخ کر کہا۔ کلہاڑا اس کے لیے نیا ہتھیار تھا اسی لیے وہ اس کی ہلاکت خیزی کے بارے میں زیادہ جانتا نہیں تھا۔

''یہ بھی نیزہ سے کم نہیں۔ یہ میرے اس دوست کا تحفہ ہے جس کو برف والے نے ہماری مدد کے لیے بھیجا ہے۔ یہ اسی کی بہادری کا نتیجہ ہے کہ تم آج ذلیل و خوار ہو کر

میرے سامنے کھڑے ہو اور اب اس کے اسی تختہ سے میں تمہیں موت کی وادی میں دھکیلوں گا۔" ریناٹ نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

دونوں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہو گئے تھے اور ایک دوسرے کو اس طرح سے گھور رہے تھے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں سے کھا جائیں گے۔ یہ مقابلہ نہیں پرانی دشمنی کا شاخسانہ تھا۔ دوسروں کی طرح میں بھی پوری طرح متوجہ تھا۔ اناس نے اپنا نیزہ بلند کیا اور پھر ایک زوردار نعرہ لگا کر ریناٹ پر حملہ آور ہوا۔ ریناٹ پوری طرح ہوشیار تھا اس نے داہنے جانب کھسک کر اس کا وار روکا۔ اناس اپنی رفتار کو روک نہ پایا اور دوڑتا ہوا کافی آگے چلا گیا۔ پھر وہ پلٹا اور اس نے دوبارہ وار کیا۔ اس کی پھرتی قابلِ داد تھی۔ وہ جس تیزی سے پینترا بدل رہا تھا یہ اس کی مہارت کا ثبوت تھا۔ ریناٹ نے اب تک ایک بھی وار نہیں کیا تھا۔ وہ صرف خود کو بچا رہا تھا۔ اناس کی پھرتی دیکھ کر میں فکر میں پڑ گیا تھا کہ یہ جس طرح وار پر وار کر رہا ہے اور ریناٹ کو موقع نہیں دے رہا ہے۔ کہیں یہ اپنے کہے کو سچ نہ کر دکھائے اور ریناٹ کی بیوی بیوہ ہو جائے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کھٹاک کی تیز آواز گونجی اور اناس کا نیزہ دو ٹکڑے ہو گیا۔ ریناٹ نے پہلی بار کلہاڑا چلایا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نیزہ دو ٹکڑے ہو گیا۔ اناس نے اپنے ہاتھ میں رہ گئے نیزے کے ڈنڈے کو پھینک کر دو حصوں میں بٹ گئے نیزے کے اس ٹکڑے کو اٹھا لیا جس کے سرے پر تیز انی تھی۔ اب اس نے داہنے ہاتھ میں اس ٹکڑے کو تھام لیا اور بائیں ہاتھ میں کمر سے بندھے ننگی چاقو کو پکڑ لیا۔ مقابلہ کچھ ایسا بن چکا تھا کہ دیکھنے والے سانس لینا بھی بھول گئے تھے۔ وہ بڑھ بڑھ کر حملہ کر رہا تھا اور دیکھنے والے چیخ رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ ایسا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اناس پر گویا پاگل پن چھا گیا تھا۔ وہ وار پر وار کر رہا تھا مگر دور رہ کر۔ وہ بار بار ریناٹ کو نشانہ بنانا چاہتا تھا کہ ریناٹ نے پیچھے ہٹ کر کلہاڑا بلند کیا اور پھر اسے گردش دیتا ہوا پھرکی کی طرح گھومتا ہوا اناس سے دو ہاتھ کے فاصلے پر آیا اور پھر اس نے کلہاڑا چلا دیا۔ پھر جو ایک شور بپا ہوا کہ الاماں الحفیظ۔ میں نے ریناٹ پر نظر ڈالی۔ وہ کلہاڑا دونوں ہاتھوں سے بلند کیے کھڑا ہوا تھا اور اس کے قدموں میں اناس کا بے سر والا جسم پڑا تھا۔ بڑبولا اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا بلکہ خود اس نے اپنی موت کو دعوت دے دی تھی۔ وہ مرنا چاہتا تھا، مر گیا۔ اب

میدان میں ریناٹ کی واہ وا ہو رہی تھی۔ لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر اس کے نام کا نعرہ لگا رہے تھے۔ سامیرا نے ریناٹ کو فتح یاب دیکھ کر اس کی طرف ایک پھول پھینکا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ انعام کا حقدار ہے۔

سامیرا اب سواری سے نیچے اتر آئی تھی۔ اس نے محل کی سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھا دیے تھے۔ اس کے ساتھ میں بھی اندر کی جانب بڑھا اور پھر ہم سب اس ہال تک جا پہنچے جہاں کبھی ریناٹ کا دربار سجا کرتا تھا۔ سامیرا نے اس تخت کو جس پر ریناٹ بیٹھ کر فیصلے کیا کرتا تھا ایک ٹھوکر ماری پھر اونچی آواز میں بولی "یہ وہی تخت ہے جس پر بیٹھ کر اس ظالم نے ہمارے بھائی بندوں کو کیسی کیسی سزائیں دی ہیں۔ کتنے بے قصور اس کی ہوس کے بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔ اس لیے آج سے یہ تخت یہاں نہیں رہے گا۔ میں خود آپ لوگوں تک، اپنے عوام تک خود چل کر جاؤں گی اور اگر کوئی فیصلہ کرنا ہوگا تو وہیں اسی مقام پر کر دیا کروں گی۔ اب ہم سب صرف اور صرف تعمیر اور ترقی کا سوچیں گے۔"

اس کی یہ تقریر خواص کے سامنے تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ کچھ ہی دیر میں یہ باتیں عوام تک پہنچ جائیں گی اور عوام پوری طرح سامیرا کے حق میں ہو جائیں گے۔

"یہ تو پوری سیاست داں ہے۔" مجھ سے ترجمہ سن کر عبداللہ نے سرگوشی میں کہا تو میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ سب خاموش تھے اس لیے اس کی سرگوشی دور تک سنائی دے سکتی تھی۔ سامیرا ہماری زبان جانتی تھی اس لیے وہ سن اور سمجھ سکتی تھی۔ میں اسے کچھ کہتا کہ باہر ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ محل کی دیواریں تک لرز گئیں۔ میں باہر کی طرف بھاگا۔ میرے ساتھ سفیر اور وسیم و عبداللہ بھی دوڑے تھے۔ میں... یہی سمجھا تھا کہ ڈیوڈ شا نے حملہ کر دیا ہے۔ دوڑتے ہوئے میں نے گن کو ہاتھ میں سنبھال لیا تھا۔

محل سے باہر نکل کر دیکھا۔ لوگ افراتفری میں ادھر سے ادھر بھاگ رہے ہیں۔ وہی سپاہی جو کچھ دیر پہلے تک نہایت نظم و نسق سے صف بنائے ہوئے تھے اس وقت پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے راستہ بنا رہے تھے۔ میں نے برامدے میں کھڑے ہو کر اطراف کا جائزہ لیا مگر میدان میں کہیں سے دھواں اٹھتا ہوا نظر نہیں آیا۔ اب میں اس بھیڑ میں کسی شناسا چہرے کو دیکھ رہا تھا کہ مجھے راشون نظر آ گیا۔ میں اس کی طرف دوڑا اور اسے روکتے

جھونپڑی سے کافی دور ایک بڑے سے پیڑ کے نیچے ایک شخص لیٹا ہوا نظر آیا۔ اس کا لبادہ بتا رہا تھا کہ وہ مقامی ہے۔ میں اس کی طرف بڑھا تھا کہ رک جانا پڑا۔ میں تو اس بندے کی طرف بڑھ رہا تھا اور رائیون اس جھونپڑی کو قریب سے دیکھنے کے لیے بڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی "رک جاؤ... ہوسکتا ہے کوئی گولا یا بارود سے بنی کوئی چیز ابھی آگ سے محفوظ ہو اور وہ پھٹ جائے۔ ابھی ادھر نہ جاؤ۔"

میری ہدایت پر وہ رک گیا۔ اس نے الٹے پیر پیچھے ہٹنا شروع کر دیا تھا۔ میرے قریب آ کر بولا "آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

"حقیقت بتائی ہے۔ پتا نہیں اس جھونپڑی میں کون ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے پاس کتنا آتشی اسلحہ تھا۔ کس کس قسم کے ہتھیار تھے۔ سنا تو یہی ہے کہ ڈیوڈ شا اپنے ساتھ بہت سارا اسلحہ لے کر آیا ہے پھر اس نے ہوائی جہاز کے ذریعہ بھی گولا بارود منگوایا ہے۔ اس نے جن لوگوں کو بلایا ہے ان میں بارود ایکسپرٹ بھی ہوں گے۔ لگتا ہے انہیں میں سے کوئی یہاں ٹھہرا ہوا تھا اور کچھ تیار کر رہا ہوگا کہ بارود میں آگ لگ گئی۔"

"اس جھونپڑی میں کون رہ رہا تھا اس کا پتا ابھی چل جاتا ہے۔" اس نے بھی اس زخمی شخص کو دیکھ لیا تھا جو پیڑ کے نیچے پڑا تھا۔

اس شخص کے نزدیک پہنچ کر میں نے اس کی نبض دیکھی۔ وہ چل رہی تھی۔ لیکن وہ بری طرح زخمی تھا۔ اس کے جسم میں جا بجا زخم تھے۔ وہ چھلنی ہو رہا تھا۔ جہاں پر وہ گرا ہوا تھا وہ جگہ خون سے بھر گئی تھی۔ گویا اس کے جسم سے کافی سارا خون بہہ چکا ہے۔ گو کہ زخم چھوٹے چھوٹے تھے مگر بہت سارے تھے۔ میں نے رائیون سے کہا "دیکھو اگر کہیں سے پانی مل سکے تو اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کروں۔"

"وہ رہا اس کا چھاگل۔" رائیون نے قریب کی جھاڑیوں میں گرے ہوئے چھوٹے مشکیزے کی طرف اشارہ کیا۔ یقیناً یہ چھاگل اسی کا ہوگا جو چھٹک کر دور جا پڑا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اس کے منہ پر بندھا تسمہ کھول کر چلو میں پانی نکالا اور اس کے منہ پر چھینٹے مارے۔

دو تین بار کی کوشش سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ رائیون نے سوال کیا "کیا تم اس جگہ پر تعینات ہو؟"

"ہاں یہاں کی حفاظت کرنا میرے فرض میں شامل ہے۔ میں مزدوروں کا حساب رکھتا ہوں۔" اس نے کراہتے ہوئے رک رک کر جواب دیا۔

"اس جھونپڑی میں کون رہ رہا تھا؟"

"اس میں میمار کا ایک دوست اپنے ساتھیوں کے ساتھ کل سے ٹھہرا ہوا تھا۔ میمار نے بتایا تھا کہ یہ ریناٹ کا خاص دوست ہے جو وادی کے باہر سے آیا ہے، اس کے پاس ریناٹ کی خاص مہر بھی تھی جس کی وجہ سے ہم اس کی خاطر داری کرنے پر مجبور تھے تا کہ ہمارا بادشاہ ہم سے خوش رہے۔"

"یہ میمار کون ہے۔ یہ نام تو پہلی بار سن رہا ہوں۔" میں نے رائیون سے پوچھا۔

"میمار وزیر کا بیٹا تھا جو شر پسندی میں کسی سے کم نہ تھا۔" پھر وہ زخمی کی طرف مڑ کر بولا "تمہیں علم ہے ریناٹ کو شکست ہو گئی ہے اور سامیرا کو حکومت مل گئی ہے۔"

"سنا تھا کہ جنگ کے لیے ریناٹ میدان میں جا پہنچا ہے اور جلد ہی سامیرا کو شکست دے کر فتنہ کو ختم کر دے گا۔"

"وہ مارا گیا۔ اس کی فوج پسپا ہو گئی ہے۔ زیادہ تر سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اب وہ سامیرا کو تخت پر بٹھانے والے ہیں۔"

"اگر ایسا ہو گیا ہے تو بہت اچھا ہے کہ سامیرا اپنے باپ کی طرح لوگوں کی خدمت کرے گی۔ ظلم وستم کے دن ختم ہو جائیں گے۔"

"اس سے یہ پوچھو کہ یہاں جو رہ رہا تھا وہ کیسا تھا۔" میں نے رائیون سے کہا۔ اس نے میرا سوال دہرایا تو زخمی نے جواب دیا:

"ایک شخص بہت موٹا اور طاقتور تھا۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ کھلی رہتی تھیں۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ ہاسو کے بارے میں بتا رہا ہے۔ اگر وہ یہاں تھا تو اس کے معنی ہیں کہ ڈیوڈ شا بھی یہیں کہیں روپوش ہوگا۔ "اور کون کون تھا۔" میں نے پوچھا۔

"اس طاقتور کے ساتھ ایک گنجا بھی تھا اور ایک نوجوان۔ لیکن رات میں ایک دوہرے بدن کا خوب گورا سا آدمی آیا جسے دیکھ کر سب کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر مجھے وہاں سے ہٹا دیا کہ تم باہر جا کر بیٹھو۔ میں ساری رات یہیں بیٹھا تھا کہ صبح کے وقت زوردار آواز ہوئی پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔ آپ نے پانی چھینٹا تو آنکھ کھلی۔"

ہوئے پوچھا کہ یہ دھماکا ہوا کہاں ہے؟

"مجھے خود پتا نہیں ہے۔ ہم سب محل کے باہر جمع تھے اور ملکہ عالیہ کا حکم سننے کے منتظر تھے کہ یہ خوفناک آواز سنائی دی۔ اتنی خوفناک آواز میں نے اپنی زندگی میں نہیں سنی ہے۔" اس کی آواز تک کانپ رہی تھی۔ دھماکا ان لوگوں کے لیے بالکل نئی چیز تھی اس لیے خوفزدہ ہونا تعجب خیز بات نہ تھی۔

"یہ بتاؤ وہ آواز آئی کس طرف سے تھی؟" میں نے پوچھا۔

"اس طرف سے جہاں تاجروں کے گھر ہیں۔" رائیٹون نے اشارے سے بتایا۔

اس کا اشارہ شہر کی جانب تھا۔ میں نے اس سے کہا "خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرے دشمن کی کارستانی ہے۔ اگر چاہو تو میرے ساتھ چلو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ دھماکا کہاں ہوا ہے۔"

رائیٹون کو کچھ حوصلہ ملا تو وہ مطمئن ہو گیا اور میرے ساتھ شہر کی جانب دوڑنے لگا۔ میرے تینوں ساتھی اپنی اپنی گن سنبھالے میرے ساتھ تھے۔

ہم سب دوڑتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ شہر میں بھی خوف کا سایہ پھیلا ہوا تھا۔ لوگ گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آ گئے تھے۔ عورتیں اور بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ میں نے رائیٹون سے کہا کہ وہ ان سے پوچھے کہ آواز کہاں سے آئی تھی۔

رائیٹون نے ایک کے بعد ایک کئی آدمیوں سے پوچھا مگر کوئی بھی صحیح جگہ کی نشاندہی نہ کر سکا۔ سب نے صرف آواز سنی تھی۔ اتنے سویرے عام طور سے لوگ گھروں سے باہر نہیں نکلتے پھر ریناٹ کی شکست اور سامیرا کی آمد کی وجہ سے وہ پُرجوش تھے اور محل کے سامنے پہنچ گئے تھے اور جو عام سے لوگ تھے وہ گھروں میں سو رہے تھے اسی وجہ سے کوئی بتا نہیں پا رہا تھا کہ آواز کہاں سے آئی تھی۔

ہم بڑھتے بڑھتے فصیل تک آ پہنچے تھے کہ میری نظر فصیل پر کھڑے سپاہی کی طرف گئی۔ وہ ہتھیلی کا چھجا بنائے مغرب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے رائیٹون سے کہا "تم اوپر جا کر پوچھو، وہ کیا دیکھ رہا ہے؟"

"یہ تو سانایا ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ ابھی پتا کر کے آتا ہوں۔" رائیٹون دوڑتا ہوا سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ وہاں بھی ایک سپاہی کھڑا تھا۔ اس سے وہ کچھ بولا اور پھر سیڑھیوں سے اوپر چلا گیا۔

میں نیچے کھڑا اس سپاہی کو ہی دیکھ رہا تھا کہ اس کے برابر آ کر رائیٹون کھڑا ہو گیا۔ اس نے سپاہی سے کچھ پوچھا پھر مغرب کی طرف دیکھنے لگا۔ ادھر اسے کوئی اہم بات نظر آئی تھی کیونکہ اس نے جھک کر مجھے اوپر آنے کا اشارہ کیا اور خود بھی شاید نیچے آنے کے لیے مڑ گیا۔

میں نے سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھا دیے۔ وہاں کھڑا سپاہی سامیرا کی فوج کا تھا اس لیے اس نے مجھے دیکھتے ہی سر جھکا کر تعظیم دی۔ میں نے بھی جواباً سر جھکا دیا۔ پھر اوپر کی جانب بڑھنے لگا۔ ابھی آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ رائیٹون اوپر سے اترتا ہوا آ گیا۔ اس نے قریب پہنچتے ہی کہا "دھماکے کی جگہ نظر آ گئی ہے۔ پہلے باغ میں دھماکا ہوا ہے۔ وہاں سے اب تک دھواں اٹھ رہا ہے۔"

"تو پھر اوپر جانے کا فائدہ۔ ایسا کرو وہیں چلتے ہیں۔" کہہ کر میں نے سیڑھیاں اترنا شروع کر دیا۔ وہ بھی میرے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگا۔

فصیل سے باہر آ کر ہم تیز تیز قدموں سے باغ کی جانب چلنے لگے۔ وہ باغ شہر سے کافی فاصلے پر تھا۔ ہم اسی جانب چل رہے تھے۔ عام دنوں میں یقیناً اس وقت تک مزدور اپنے کام پر جانے کے لیے نکل جاتے ہوں گے لیکن حالات کی وجہ سے اس وقت اور باہر جانے والا راستہ سنسان پڑا تھا۔ راستے کے دونوں جانب جھاڑیاں تھیں۔ ان میں کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن ہم بے خطر آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جیسے جیسے باغ نزدیک آ رہا تھا ہوا میں پھیلی بارود کی بو تیز ہوتی جا رہی تھی۔ دھواں اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ پیڑوں کی آڑ ہونے کی وجہ سے میں مقام کا صحیح اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا۔ تباہی کس قدر ہوئی ہے یہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

آہستہ آہستہ ہم اس باغ کے قریب پہنچ ہی گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ مقام نظر آ گیا جہاں پر دھماکا ہوا تھا۔ وہ ایک جھونپڑی تھی۔ کافی بڑی جھونپڑی جو یقیناً پہرے داروں کے تصرف میں رہتی ہو گی۔ آگ کی لپیٹ میں آ کر راکھ کا ڈھیر بن چلی تھی۔ آس پاس کے پیڑ بھی جھلس گئے تھے۔ کافی دور تک تباہی کے آثار پھیلے ہوئے تھے۔ کئی بلند اور تناور درخت بھی جھلسے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہاں بارود کا ذخیرہ تھا جس میں کسی طرح آگ لگ گئی تھی۔ میں کچھ اور نزدیک پہنچا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ اس جلی ہوئی جھ

اس کی باتوں سے میں الجھ گیا تھا۔ اگر اس کی بات سچ تھی تو ڈیوڈ شا بھی رات اسی جھونپڑی میں تھا۔ اسے شاید خبر ہوگئی تھی کہ رینانٹ کو شکست ہو چکی ہے اسی لیے وہ بڑے حملے کی تیاری کر رہا ہوگا۔ گولا بارود تیار کر رہا ہوگا یا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر رہا ہوگا کہ دھماکا ہو گیا۔ اگر یہ بات صحیح تھی تو دوسروں کے لیے دنیا کو جہنم بنانے والا اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ انسان بھی کتنا بھولا ہے کہ وہ اپنی موت کو ٹال نہیں سکتا اور دنیا سنوارنے میں لگا رہتا ہے۔ جھونپڑی کی آگ بہت حد تک ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے ان کے باقیات کی تلاش شروع کردی۔ میں ایک بڑی سی لکڑی سے راکھ کو اِدھر اُدھر کر رہا تھا کہ میری نظر سامنے والی جھاڑیوں پر پڑی۔ وہاں بھی کسی کا جسم نظر آرہا تھا۔ قریب جا کر دیکھا۔ وہ لاش باسو کی تھی۔ گو کہ اس جسم پر سر نہیں تھا پھر بھی جسم سے اندازہ ہو گیا کہ وہ لاش اسی کی ہے۔ اب مجھے ڈیوڈ شا کی تلاش تھی۔ جب وہ یہاں تھا تو یقینی طور پر ڈیوڈ شا بھی یہیں ہوگا۔ اس کی تلاش میں میں خطرے میں کود گیا۔ اس جھونپڑی کے اندر پہنچ گیا۔ اندر چار لوگوں کی ٹکڑوں میں بٹی سوختہ لاش نظر آگئی۔ لیکن ان میں ڈیوڈ شا کی لاش نہیں تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ دھماکے سے کچھ دیر قبل عقبی طرف سے باہر نکل گیا ہو۔ وہ قسمت کا بہت تیز تھا۔ ہر بار موت کو بہ آسانی شکست دے دیتا تھا۔ شاید اس بار بھی ایسا ہی ہوا ہو۔ یوں بھی شیطان کے پجاریوں کو برائی کے دیوتاؤں کو اللہ تعالیٰ کچھ زیادہ ہی چھوٹ دے دیتا ہے۔ اس لیے کہ جہنم میں ہر کوئی اپنے حصے کی آگ لے کر جائے گا۔ جو جتنے برے کاموں میں ڈوبا ہوا ہوگا اس کی آگ بھی تیز ہو گی۔ وہ اچھی طرح جل سکے اسی کا یہ انتظام ہے۔

میں فکر میں ڈوبا ہوا راکھ کے ڈھیر کو پھلانگتا ہوا باہر آیا۔ رائیون کھڑا میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچ کر بولا" لگتا ہے ڈیوڈ شا فرار ہو گیا۔ اب یہی ڈر ہے کہ کہیں وہ آئی زور سے نہ مل جائے۔"

"سامیرا کی فتح کے بعد آئی زور کی مسند باقی نہیں رہی۔ اگر سامیرا ہی اسے اس کا منصب دے دے تو بات دیگر ہے۔"

"میں نے غور کیا ہے کہ معبد کے بڑے پجاری یعنی آئی زور کے اختیارات رینانٹ سے زیادہ تھے۔"

"یہ بات غلط نہیں ہے لیکن یہاں کے قانون کے مطابق اگر کوئی شہنشاہ کو شکست دے دے تو معبد میں تبدیلی کا اسے اختیار ہوگا۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے باغ کے دروازے پر پہنچے تھے کہ قریب کی جھاڑیوں میں مجھے ایک کٹا ہوا سر نظر آیا اور میں تیزی سے اس کے قریب پہنچا۔ وہ سر ڈیوڈ شا کا تھا۔ لگتا ہے کہ وہ دھماکے کے وقت قریب ہی تھا اس لیے اس کا سر اچھل کر دور جا گرا۔ میں نے کبھی کسی کی لاش کی بے حرمتی نہیں کی لیکن اس شخص کو دیکھ کر بھی مجھے رحم نہ آیا۔ اس نے کس طرح سازشوں کا جال پھیلا رکھا ہے۔ یہ میں بھولا نہیں تھا۔ اس شخص کو بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا۔ میں بے حس سا بنا وہاں سے نکل پڑا۔ اب مجھے جانے کی جلدی پڑ گئی تھی۔ میرے تقریباً تمام کام انجام پا گئے تھے۔ اب صرف اپنے ساتھیوں کو اور راجا صاحب کو ساتھ لینا تھا اور پھر پاکستان پہنچ کر اپنے اولین دشمن سے دو دو ہاتھ کرنا تھا جس کی وجہ سے میری زندگی سے چین و سکون ختم ہوا تھا۔

وہاں سے ہم فصیل کے پاس آئے تو سفیر اور وسیم کو منتظر پایا۔

"کہاں چلے گئے تھے۔ ہم کب سے آپ لوگوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔" وسیم نے شکوہ کیا۔

"اپنے سب سے بڑے دشمن کا آخری دیدار کرنے گیا تھا۔"

"کیا مرشد یہاں بھی پہنچ گیا۔ کیونکہ ڈیوڈ شا تو پہلے سے ہی موجود ہے۔"

"مرشد نہیں... ڈیوڈ شا۔ اس نے ہمارا کام آسان کر دیا ہے۔ اس کی لاش دیکھ کر آرہا ہوں۔"

"ارے واہ... اس کی لاش کہاں ہے۔ میں اس کے سر سے فٹ بال کھیلوں گا۔"

"دشمن مرے تے خوشی نہ کریئے' ہوئے، بجناوی مرجانا۔ مرنے کے بعد کسی کو برا نہ کہو۔ وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اگر زندہ ہوتا تو ہزار قسم کی سازشیں رچتا۔ ان معصوم لوگوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتا۔ اس لیے جو ہوا اچھا ہوا۔ اب چلو سامیرا سے مل کر راجا صاحب کے پاس چلتے ہیں۔ اب ہمیں اپنا وطن بہت یاد آرہا ہے۔"

"وطن یا سویرا کی یاد ستا رہی ہے۔" سفیر نے چٹکی لی۔

"اچھا سمجھ گیا تم میرے منہ سے کہلوانا چاہو گے کہ میں مونا سے کہوں کہ اس اندھیری وادی میں بھی یہ تمہیں یاد کرتا رہا۔"

''میں ساوی سے گواہی دلا دوں گا کہ بات سچ ہے۔'' وسیم نے خود ہی اپنا نام یاد دلا دیا۔

سفیر جواب میں کچھ کہتا کہ میں نے روک دیا ''ابھی ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ مذاق بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی یہاں سے نکلنے کا ذہن بناؤ... آتے وقت کن دشواریوں سے آئے ہو گے یاد کرو۔ اب پھر وہی سفر درپیش ہے۔''

''آپ ساتھ ہیں تو ہمیں فکر کی ضرورت کیا ہے۔ بعد کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔'' وسیم نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

باتوں کے درمیان پتا بھی نہیں چلا اور ہم محل کے سامنے پہنچ گئے۔ اب تک وہاں اسی طرح لوگ جمع تھے۔ ہنسی ٹھٹھول ہو رہا تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔ میں ان کے درمیان سے ہوتا ہوا اندر کی جانب بڑھا۔ دروازے پر پہرے دار موجود تھے۔ ان سپاہیوں کے ہاتھوں میں نیزے بھی تھے اور ترکش و کمان بھی لیکن انہوں نے مجھے یا میرے ساتھیوں سے کچھ نہ کہا اور نہ روکنے کی کوشش کی بلکہ سر جھکا کر تعظیم دی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ہمیں پہچانتے تھے۔

ہم اندر داخل ہوئے۔ بڑے ہال نما کمرے سے گزر کر دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھے یہاں کا ایک ایک کمرا یاد تھا اس لیے میں بلا جھجک اندر بڑھتا جا رہا تھا۔ بالآخر میں اس کمرے میں جا پہنچا جہاں سامیرا اپنی فوج کے افسران کے ساتھ بیٹھی مشاورت کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی ''آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

''جی ہاں۔ اگر اجازت ہو تو میں قلعہ تک جانا چاہتا ہوں۔ راجا صاحب سے ملنا ضروری ہے۔''

''ڈیوڈ شا کا کیا بنا؟''

''ڈیوڈ شا اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ اس کی لاش ٹکڑوں میں دیکھ آیا ہوں۔ کچھ دیر پہلے جو دھما کا سنا گیا تھا وہ اس جگہ ہوا تھا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔''

''اوہ... یہ کیسے ہوا؟''

''شاید وہ بارودی ہتھیار اِدھر اُدھر کر رہا ہوگا جو آپس میں ٹکرا گئے یا گرمی سے پھٹ گئے۔ وہ جگہ گڑھے میں بدل گئی ہے۔ جھونپڑی راکھ کا ڈھیر بن گئی ہے۔ اس کے جتنے بھی ساتھی تھے سب کے چیتھڑے اڑ گئے۔ میں نے چار لاشیں گنی ہیں۔''

''گویا اب ایسا کوئی دشمن بچا نہیں ہے جو خطرہ بنے؟''

''نہیں ابھی معبد کا بڑا پجاری آئی زور...... اس کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ایک گھر میں محصور ہو کر بیٹھا ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا؟''

''آپ ہی نے بتایا تھا کہ خبر مصدقہ ہے۔''

''یوں بھی اب میں یہاں کی ملکہ ہوں۔ میں نے ملک فتح کر لیا ہے۔ ہمارا قانون ہے کہ فاتح اپنی مرضی کا پجاری رکھ سکتا ہے۔ یعنی میں اسے اس کے عہدے سے ہٹا سکتی ہوں۔''

''یہ بعد کی بات ہے میں قلعہ کی طرف جانا چاہتا ہوں کیونکہ راجا صاحب سے ملاقات کرنا ضروری ہو گیا ہے۔''

''اگر ابھی جانا چاہتے ہو تو میں سواری کا انتظام کر دیتی ہوں لیکن تم تھکے ہوئے ہو اتنا فاصلہ کیسے طے کرو گے۔'' پھر کچھ سوچ کر بولی ''شام تک میں بھی قلعہ پہنچ رہی ہوں۔ بس کچھ انتظامات کرنے ہیں۔ اگر رک جاؤ تو ساتھ چلتے ہیں۔''

''نہیں، اب مجھ سے راجا صاحب سے دوری برداشت نہیں ہو رہی۔ پھر ان سے چند اہم امور پر تبادلۂ خیال بھی کرنا ہے۔''

''میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔'' کہہ کر سامیرا نے اپنے قریب بیٹھے ایک آدمی سے کچھ کہا اور وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ تب وہ مجھ سے بولی ''وہ سواری کا انتظام کرنے گیا ہے۔ اپنے ساتھیوں کو جمع کر لو۔''

''سب ساتھ ہیں۔'' پھر میں نے تعظیمی انداز میں سر جھکا کر کہا ''مجھے اجازت دیں۔ میں باہر کھڑا ہوں۔''

''رات میں ملاقات ہو گی۔''

اجازت ملتے ہی میں باہر نکل گیا۔ سفیر، وسیم اور عبداللہ کو ساتھ لے کر میں اس جانب بڑھا جہاں شاہی سواریاں کھڑی کی جاتی تھیں۔

میرا اندازہ صحیح نکلا۔ سامیرا نے جسے بھیجا تھا وہ وہاں کھڑا ایک رتھ نما گاڑی کو تیار کرا رہا تھا۔ میں نے اس کے نزدیک پہنچ کر پوچھا ''کیا اسی پر جانا ہے؟''

''جی ہاں بس یہ ابھی تیار ہو جائے گی۔''

اس نے صحیح کہا تھا بمشکل آدھے گھنٹے میں وہ سواری تیار ہو گئی۔ کوچوان نے ہمیں اندر بیٹھنے کا اشارہ دیا اور ہم سب قلعہ کی جانب چل پڑے۔ یہ وہی شہر تھا جس میں ہم

چوروں کی طرح خفیہ دروازے سے داخل ہوئے تھے اور آج عزت کے ساتھ شاہی سواری پر ہم اس شہر سے باہر نکل رہے تھے۔ سواری تیز رفتاری سے قلعہ کی جانب بڑھتی جا رہی تھی۔ باغوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے ہم اس جانب بڑھتے جا رہے تھے جہاں کبھی ہرے بھرے کھیت ہوا کرتے تھے اور سامیرا کی حفاظت کے لیے میں نے اس کھڑی فصل کو آگ لگوادی تھی۔ وہ اب میدان سا نظر آ رہا تھا۔ ہم اس کے درمیان سے گزرتے ہوئے قلعہ کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔ فاصلہ سمٹتا جا رہا تھا۔ پھر وہ میدان آ گیا جہاں گزشتہ دن خون کی ہولی کھیلی گئی تھی۔ اس میدان جنگ کو عبور کر کے ہم قلعہ کے بہت نزدیک پہنچ گئے۔

قلعہ کا علاقہ ویران سا نظر آ رہا تھا اس لیے کہ یہاں کے زیادہ ترکمین آرگون گئے ہوئے تھے۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے، یہاں رہ رہے لوگ اصل میں وہیں کے رہائشی تھے جو رینالٹ کے ظلم و ستم سے گھبرا کر یہاں چلے آئے تھے اور ان کے لیے شہر کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ یہاں کا کوئی فرد اگر وہاں پکڑا جاتا تو اسے سزا دی جاتی تھی اس لیے کوئی ادھر جاتا ہی نہیں تھا۔ جتنے بھی لوگ یہاں تھے ان سب کے رشتے دار وہاں تھے۔ اب موقع ملا تو وہ سب دوڑے چلے گئے تھے۔ ایک وقت تھا کہ مجھے بھی قلعہ سے زبردستی باہر نکال دیا گیا تھا۔ مجھ پر پابندی لگا دی گئی تھی کہ میں یہاں لوٹ کر نہیں آسکتا ہوں۔ وہ دن وہ مصائب یاد آئے تو ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی کہ دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔

ابھی میں خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ سواری رک گئی۔ میرے اترنے سے پہلے دوسری جانب سے سفیر اترا پھر وسیم۔ میرے بعد میری طرف سے عبداللہ اترا۔ ہم سب خاموشی سے اندر کی طرف بڑھے۔ اتنے دنوں بعد راجا صاحب سے ملاقات ہونی تھی۔ ان سے کیا کہوں گا؟ ان کے محل سے مجھے جس طرح نکالا گیا اس کا گلہ بھی تو میں نہیں کرسکتا تھا کیونکہ مجھے پتا چل گیا تھا کہ وہ کچھ راجا صاحب کے حکم سے نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی میں انہیں شرمندگی سے بچانا چاہتا تھا کہ یقیناً وہ باتیں ان کے علم میں بھی آچکی ہوں گی۔

''شہباز تم.... آخر ہماری یاد آ ہی گئی۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی یہ پہلی آواز تھی جو میں نے سنی۔

میں نے جھکی ہوئی نظروں کو اٹھا کر اس بیڈ کی طرف دیکھا جس پر راجا صاحب لیٹے ہوئے تھے۔

''جب سے میں نے سنا ہے کہ آپ آچکے ہیں میں ملنے کے لیے بے تاب تھا۔ اب جا کر فرصت ملی تو حاضری دے دی۔''

''سامیرا ابھی تک اپنے جھمیلوں میں پھنسی ہوئی ہو گی؟''

''وہ شام تک آجائیں گی۔'' میں نے ان کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ سفیر اور وسیم سامنے والی کرسیوں پر قبضہ جما چکے تھے لیکن عبداللہ احتراماً کھڑا تھا۔ راجا صاحب نے اس کی طرف دیکھ کر کہا:

''تم بھی بیٹھ جاؤ۔'' پھر میری طرف مخاطب ہوئے ''اب کیا ارادہ ہے؟''

''اچھا کیا کہ آپ نے یہ بات چھیڑ دی۔ میں یہاں اپنی مرضی سے آیا نہیں، زبردستی بھیجا گیا تھا لیکن یہاں آکر جو کام نمٹانے تھے وہ نمٹا لیے۔ سب سے اہم بات یہ کہ ڈیوڈ شا کی لاش دیکھ لی۔''

''اسے تم نے مار دیا؟''

''نہیں جناب میں نے نہیں اس کی قسمت نے اسے دھوکا دیا ہے۔ وہ اپنے ہی بارود کا شکار ہو گیا۔''

''تو اب یہاں سے نکلنا چاہتے ہو؟''

''جی ہاں.. پاکستان میں بہت سے کام پینڈنگ پڑے ہیں۔ ان کو نمٹانا چاہتا ہوں۔''

''لیکن یہاں سے نکلو گے کیسے۔ باہر جانے کا راستہ یاد ہے؟''

''نہیں راستہ تو آپ بتائیں گے۔''

''مجھے خود علم نہیں ہے۔ گزشتہ بار تو مجھے یہاں سے زبردستی نکال باہر کیا گیا تھا۔ اس راستے کا علم صرف برف والے کو ہے۔ وہی تمہیں یہاں سے نکال سکتا ہے۔''

''تو کیا آپ کا ارادہ نہیں ہے؟ آپ نہیں جائیں گے؟''

''تم میرے بیٹے جیسے ہو، تم سے کیا چھپانا۔ میں نے ایک لمبی زندگی گزار دی ہے۔ اپنے حصے کے تمام کام نمٹا دیئے ہیں۔ پھر مجھے جس موذی بیماری نے گھیر لیا ہے اس کا صحیح علاج ہمارے ہاں کہاں ہے۔ مجھے تو کہا گیا تھا کہ اب صرف ایک ہفتہ باقی ہے لیکن یہاں آنے کے بعد یہاں کے حکیم نے ایسی جڑی بوٹیاں استعمال کرائیں کہ اب لگتا ہی نہیں ہے کہ میں بیمار ہوں۔ رگ رگ میں اس نے قوت بھر دی ہے۔''

''گویا اب آپ باقی زندگی یہیں گزارنا چاہتے!

ہیں۔"

"صحیح کہا.... اب میں یہیں رہوں گا۔ وہاں میری اولادیں ہیں۔ ان سے میرا نام چلتا رہے گا۔"

راجا صاحب کی باتوں نے مجھے الجھا دیا تھا۔ برف والے سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اب ہم باہر نکلیں تو کیسے نکلیں؟

"ایسا کرو کہ کچھ دیر آرام کرلو۔ سامیرا آجائے تو وہی کوئی راستہ نکالے گی۔" راجا صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اب وہاں رہنا فضول تھا میں اٹھ گیا۔ مجھے کھڑے ہوتے دیکھ کر راجا صاحب نے عبداللہ سے کہا "شہباز کا بستر برابر والے کمرے میں لگانے کا کہہ دو۔"

میں عبداللہ کے ساتھ اس کمرے میں آگیا۔ کافی بڑا کمرا تھا۔ دو بڑے بڑے تخت بچھے ہوئے تھے۔ ایک پر میں دوسرے پر وسیم اور سفیر لیٹ گئے۔

میں لیٹا تھا کہ پُرسکون ہو کر لائحہ عمل بناؤں گا مگر گزشتہ رات جاگتے ہوئے گزری تھی اور گزشتہ دن میدان جنگ کی تھکن سے بھرا تھا اس لیے خود بخود آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ میں بے خبری کی نیند میں ڈوب گیا۔

میری آنکھ کھلی بھی عبداللہ کی پکار پر، وہ آوازیں دے رہا تھا۔ آنکھیں جھپکاتا ہوا میں اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں مشعل کی روشنی پھیل رہی تھی گویا رات اتر آئی تھی۔

"آپ کو سامیرا نے یاد کیا ہے۔ راجا صاحب بھی موجود ہیں۔" عبداللہ کے کہنے پر میں پھرتی سے بستر سے اترا اور چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر باہر کی طرف بڑھتے ہوئے وسیم پر نظر ڈالی، وہ دونوں اب تک سو رہے تھے۔

اس کمرے سے نکل کر میں راجا صاحب والے کمرے میں پہنچا۔ راجا صاحب بستر پر نیم دراز تھے اور سامیرا سامنے والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا "شہباز یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ تم واپس جانے کی بات کررہے ہو؟"

"جی ہاں... میں کافی عرصے سے اپنوں سے دور ہوں۔ اب دل کررہا ہے کہ ان سے ملوں۔"

"ہم بھی تو اپنے ہیں... ہمیں چھوڑ کر جانا چاہتے ہو۔ ابھی تو میری تاج پوشی بھی نہیں ہوئی۔" سامیرا نے مسکرا کر کہا۔

"آپ میرے لیے محترم ہیں، عزیز ہیں لیکن کیا کروں وہاں میرے والدین ہیں اور میں اب ان کی جدائی برداشت نہیں کر پا رہا۔ پھر وہاں ایسے کئی کام ہیں جن کو پورا کرنا ضروری ہے۔"

"میری تو یہی خواہش تھی کہ تم کہیں، نہ جاتے۔ میرے ہی پاس رہتے لیکن کیا کروں۔ تم نے والدین کا نام لے کر مجبور کردیا ہے۔ اس لیے میں روک نہیں سکتی لیکن یہ بتادوں کہ یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ مجھے بھی پتا نہیں۔ اس سلسلے میں اگر کچھ کرسکتے ہیں تو وہ برف کے ہاتھ والے ہیں۔ ان سے گزارش کرو شاید وہ التجا سن لیں۔"

اُترآنچل

بھارت کی 27 ویں ریاست۔ اس کا قیام بھارت کے سب سے بڑے صوبے اتر پردیش کی تقسیم کے نتیجے میں نومبر 2000ء کو عمل میں آیا۔ قبل ازیں یہ زیریں ہمالیاتی صوبہ (Lower Himalayan Province) کہلاتا تھا۔ اس نئے صوبے میں بھارت کے پسماندہ قبائل غالب اکثریت میں ہیں۔ ایک عرصہ سے مقامی آبادی اُتر کھنڈ کے نام سے الگ صوبے کا مطالبہ کررہی تھی۔ ستمبر 1994ء میں مسوری میں زبردست ہنگامے اور مظاہرے بھی ہوئے تھے۔ پولیس نے ہنگاموں پر قابو پانے کے لیے فائرنگ کردی۔ جس سے سات افراد اور اکتوبر 1994ء میں مظفر نگر میں 12 افراد ہلاک ہوگئے۔ اس کے شمال مشرق میں چین، مشرق میں نیپال، جنوب مغرب میں اتر پردیش، مغرب میں ہریانہ اور شمال مغرب میں ہماچل پردیش کے علاقے شامل ہیں۔ رقبہ 23157 مربع کلومیٹر ہے۔ لوگ ہندی اور کماؤنی زبانیں بولتے ہیں۔ ڈیرہ دون ریاست کا صدر مقام ہے۔ چونے کا پتھر، جپسم، خام لوہا، گریفائٹ اور تانبا اہم معدنی پیداوار اور سیاحت، پھلوں کو ڈبیانا اہم صنعتی پیداوار ہیں۔ تقریباً پچاس فیصد لوگ زراعت پیشہ ہیں۔ 70 فیصد رقبے پر جنگلات پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں نینی تال، مسوری اور گنگوتری جیسے تفریحی مقامات بھی ہیں۔ گنگوتری میں ہر سال یاتریوں کا میلہ لگتا ہے۔ ڈیرہ دون، مسوری، ہردواز، رجاجی، نیشنل پارک رشی کیش، ضلع اتر کاشی اور کوربٹ نیشنل پارک دیگر قابل ذکر مقامات ہیں۔

مرسلہ: ایم اسلم فاروقی۔ لاہور

"جب سے آیا ہوں ان سے ملاقات کہاں ہوئی۔"
"وہ وادی میں اترتے نہیں ہیں۔ وہ پہرے دار ہیں اس لیے وہیں اپنے برف کے گھر میں رہتے ہیں لیکن سنتے سب کی ہیں۔ ان تک ہم جب کوئی بات پہنچانا چاہتے ہیں تو ایک خاص مقام ہے وہاں جا کر التجا کرتے ہیں۔ وہ جگہ عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہے۔"
"پھر میں کیسے وہاں پہنچوں؟"
"میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی اس لیے کہ وہ مقام کسی کو دکھا نہیں سکتی اور نہ اس مقام کی اہمیت کے بارے میں کسی کو بتا سکتی ہوں۔ مجھے بابا نے اپنی آخری رات بتائی تھی۔"
"تو کب لے چل رہی ہیں۔"
"وہ مقام زیادہ دور نہیں ہے۔ کچھ اندھیرا پھیل جائے تو سب کی نظر بچا کر ہم چل دیں گے۔"
"یہ میری بھی خواہش ہے کہ شہباز اپنے ادھورے کام کو جا کر پورا کر لے۔ اس لیے کہ وہ کام بھی بہت اہم ہے۔ وہ کام نمٹا کر اس کے گھر والے سکون کی سانس لیں گے ورنہ زندگی بھر الجھے رہیں گے۔" راجا صاحب نے سامیرا سے میری سفارش کی۔
"آپ کہہ رہے ہیں تو میں ابھی لے کر چلتی ہوں۔" سامیرا اسی وقت راضی ہوگئی۔
میں نے بھی سکون کی سانس لی کہ میں جتنی جلد ممکن ہو یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ہم دونوں باہر آئے۔ سفیر وغیرہ کو وہیں رکنے کا کہہ کر میں سامیرا کے ساتھ چل پڑا تھا۔
ہم دونوں جب آبادی سے نکلنے لگے تو کچھ سپاہیوں نے ساتھ چلنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن سامیرا نے منع کر دیا اور میرا ہاتھ تھام کر پہاڑ کی جانب بڑھنے لگی۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ دوڑ رہی ہو۔ میں بھی تیز تیز چل رہا تھا۔ ہم دونوں جلد ہی پہاڑ کی ترائی میں پہنچ گئے۔
سامیرا نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر ایک غار کے اندر داخل ہوگئی۔ اس کی تقلید کرتے ہوئے میں بھی اندر داخل ہو گیا۔ وہ غار اندر سے صاف ستھرا تھا ایسا لگتا تھا جیسے اس کی صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ سامیرا ایک کونے کی طرف بڑھی پھر اس نے مجھے اشارے سے بلایا۔ بالکل خاموش تھی۔ زبان پر گویا مہر لگا لی تھی۔ اس کے اشارے پر میں آگے بڑھا۔ اس نے اشارے سے کونے کی طرف رخ کر کے کھڑے ہونے کو کہا پھر سرگوشی کے انداز میں بولی "اب تم برف والے کو پکارو۔ اپنی بات کہو۔ اس کا جواب آجائے گا۔"
میں نے اس کے کہے پر عمل کیا اور نسبتاً اونچی آواز میں برف والے کو پکارنا شروع کیا۔ ایک بار، دو بار، کئی بار پکارا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اب مجھ پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی تھی۔ میں مزید پکارنے پر روک لگانے ہی والا تھا کہ میرے دماغ میں ایک گونج سی ہوئی اور برف والے کی مانوس آواز بازگشت کی طرح سنائی دی۔ اس نے پوچھا تھا "تم جانا چاہتے ہو؟"
"جی ہاں۔" بے اختیار میں نے جواب دیا۔
"کب جانا چاہتے ہو؟"
"اب مجھ سے ایک لمحہ بھی یہاں رکا نہیں جا رہا ہے۔" میرے دل کی بات زبان پر آگئی "اپنے حصے کا کام میں نے کر دیا اب مجھے اجازت دی جائے۔"
"صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے یہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ آجانا۔ میں یہاں سے نکلنے کا راستہ بتا دوں گا۔"
"جی بہتر۔ میں صبح آجاؤں گا۔" کہہ کر میں نے بند آنکھیں کھول دیں۔ سامیرا غار کے دہانے پر کھڑی تھی۔ اس نے مجھے چہرہ گھماتے دیکھ کر پوچھا:
"بات ہوگئی؟"
"جی ہاں۔" کہہ کر میں نے اپنے قدم بڑھا دیے۔
ہم اس غار سے نکل کر قلعہ کی جانب چلنے لگے۔ اب سامیرا معمول کے مطابق قدم اٹھا رہی تھی۔ جلد بازی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن خاموشی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب بھی چپ چاپ چل رہی تھی۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے قلعہ تک پہنچے۔
اندر داخل ہوئے تو راجا صاحب منتظر تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی پوچھا "کیا رہا؟ برف والے سے بات ہوئی؟"
"جی ہاں ہوئی۔ ہمیں سورج نکلنے سے پہلے اس علاقے سے نکل جانا ہے۔ اب یہ بتائیں کہ عبداللہ کو چھوڑ جاؤں یا ساتھ لے جاؤں۔"
"ابھی میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ اس سے پوچھ لو اگر وہ رہنا چاہتا ہے تو بتا دینا کہ تمام عمر یہیں گزارنی ہوگی۔ تمہیں برف والے نے خود بلایا تھا۔ تمہارا سہارا لے کر میں بھی آگیا۔ لیکن اب کوئی اور نہ یہاں آسکے

سکا اور نہ باہر جاسکے گا۔"

"جی میں بتادوں گا۔ ویسے یہ بتادوں وہاں کوئی اس کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ ایک لڑکی جس سے اس نے خاموش زبان سے شادی کا وعدہ کیا ہے۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ تب تو اسے ہر حال میں چلے جانا چاہیے۔" راجا صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔

"اچھا تو مجھے اجازت دیں۔ میں وسیم وغیرہ کو بھی خوش خبری سنادوں۔"

"ٹھیک ہے جاؤ لیکن جانے سے قبل مجھ سے مل ضرور لینا۔"

"جی اچھا۔" کہہ کر میں باہر آ گیا۔ اور سیدھا اس کمرے میں پہنچا جہاں سفیر، وسیم اور عبداللہ سو رہے تھے۔

اس کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ میرا اندازہ صحیح تھا۔ تینوں بے خبر سو رہے تھے۔ شاید یہ تھکن کا نتیجہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے عبداللہ کو اٹھایا۔

"ہم رات کے آخری پہر میں یہاں سے نکل رہے ہیں۔ راجا صاحب اب یہیں رہیں گے وہ ہمارے ساتھ نہیں جارہے۔ اب وہ تاعمر یہیں رہیں گے۔ تم اپنا ارادہ بتاؤ کہ تم یہاں رہو گے یا ساتھ چلو گے؟"

"راجا صاحب کو چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں۔"

"ان کا ارادہ میں نے بتا دیا۔ اب اگر یہاں ٹھہرو گے تو پھر کبھی بھی اپنی دنیا میں جا نہیں پاؤ گے۔ اچھی طرح غور کرلو۔"

"راجا صاحب کا کیا کہنا ہے؟"

"انہوں نے فیصلے کا کلی اختیار تمہیں دیا ہے۔ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ زندگی بھر کے لیے یہاں رہو گے یا میرے ساتھ چلو گے۔"

عبداللہ سوچ میں ڈوب گیا۔ شاید وہ فیصلہ نہیں کر پارہا تھا کہ وسیم جو نہ جانے کب بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے چٹکی لی" یہ بھی یاد رکھنا کہ کوئی تمہارے انتظار میں وہاں بیٹھا گھڑیاں گن رہا ہے۔ پھر گانے کے انداز میں بولا۔" دلواں دلواں میں گنوں کب آئیں گے سانوریا۔ پھر آنکھ دبا کر کہا یہ گانا بھی کوئی گارہا ہوگا۔"

"ہاں میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا لیکن ایک بار راجا صاحب سے میں خود بھی پوچھ لوں۔"

"بالکل جاؤ... وہ تمہارا ہی انتظار کررہے ہیں۔"

عبداللہ کمرے سے نکل گیا۔ میں نے وسیم سے کہا" اب تم بھی تیاری کرلو۔ آج اگر ہم یہاں سے نہیں نکلے تو پھر یہیں زندگی گزارنی پڑے گی۔"

"بھائی میاں میں اپنی اکلوتی بیوی کا اکلوتا شوہر ہوں۔ تمہاری محبت میں اس پُراسرار وادی میں آیا تھا۔ میرا بس چلے تو ابھی جا کر ساوی سے کہوں کہ یہ تمہارے شہباز بھائی نے مجھے تم سے دور کررکھا تھا۔" وسیم چہکا۔

"کچھ تیاری کرنا ہے کیا؟"

"تیاری کیا کروں گا؟ یہاں کی ایسی کوئی مٹھائی ہے نہیں جو بطور تحفہ لے جاؤں۔ تم نے ہارن بھی لینے نہیں دیا ورنہ میرا ارادہ تو تھا کہ ایک دو ہارن لے جاؤں گا۔"

"ہارن کی ابھی خون آشامی دیکھی نہیں ہے نا۔ وہ انسان کو درمیان سے چیر دیتا ہے۔ کاغذ کی طرح پھاڑ کر ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے۔"

"ڈراؤ نہیں۔ اب تو یوں بھی وہ ملنے سے رہا اس لیے خوشگوار یادیں ہی رہنے دو۔"

"خوشگوار یادوں کا بستہ لپیٹو اور چلنے کی تیاری کرو۔" کہہ کر میں نے سفیر کی جانب دیکھا۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے کہا" لیکن یہاں سے نکلا کیسے جائے گا؟"

"اس کا انتظام کرلیا ہے۔"

"کیا اسی بے ہنگم جانور کی پیٹھ پر بیٹھ کر چلنا ہے؟" سفیر نے انگڑائی لے کر کہا۔

"جی نہیں... اللہ تعالیٰ نے دو پیر دیئے ہیں اسی کے سہارے چلتے ہوئے اپنی دنیا میں جائیں گے۔"

"اف یار آتے وقت جتنی پریشانیاں جھیلی ہیں ان سب کو تم نے یاد کرا دیا۔" سفیر نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کسی بوڑھی بیوہ کے لہجے میں جواب دیا۔

"تو پھر ایک کام کرو۔ تم یہیں ٹھہر جاؤ میں وہاں پہنچ کر مونا سے کہہ دوں گا کہ وہ حضرت ایک لڑکی کے ساتھ چہل قدمی میں مصروف تھے۔ میں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"پھر کیا ہوگا جانتے ہو۔ وہ کے ٹو پر جا کر کھڑی ہو جائے گی اور اتنی زور سے آواز دے گی کہ تمام گلیشیر پھٹ کر وادی کا راستہ دکھادیں گے۔ اور وہ وادی میں اترنے کے ساتھ ساتھ سامیرا کے ساتھ تمام خواتین کو گولی مار دے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں کی افزائش نسل رک جائے اس لیے الرر

جیسا تم کہو ہمیں تیار پاؤ گے۔"
"تو پھر تیاری شروع کر دو۔" کہہ کر میں کمرے سے باہر آ گیا۔
باہر نکل کر دیکھا کہ ایرٹ۔ ربیک، ایزارٹ، ایمار، ...رائیلون اور روبیر جمع ہیں۔ ان سب کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا" کیا بات ہے۔ تم لوگ اس طرح افسردہ کیوں کھڑے ہو؟"
روبیر آگے بڑھی اور پھر وہ کسی امر بیل کی طرح مجھ سے چمٹ گئی۔ اس نے زور زور سے رونا بھی شروع کر دیا تھا۔ میں نے گھبرا کر اسے الگ کیا پھر پوچھا" کیا ہوا؟ اس طرح رو کیوں رہی ہو؟"
"ملکہ عالیہ کا ایک ہرکارہ آیا تھا اس نے ہر ایک کو یہ خبر سنائی ہے۔ ہم سب جو بھی جہاں تھا دوڑتا چلا آیا ہے۔"
"ایسی کون سی خبر سنا دی؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔
"اس نے بتایا ہے کہ.... کہ آپ جا رہے ہیں۔" اس نے پھر رونا شروع کر دیا تھا۔
"عقل سے کام لو روبیر... میری دنیا اور ہے۔ میرا ایک گھر ہے۔ میرے ماں باپ ہیں۔ بھائی بہن ہیں۔ میں ان سب کو چھوڑ کر یہاں کیسے رہ سکتا ہوں۔ اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ میرے ساتھی کیوں آئے۔ دراصل میرے دل میں اپنوں کی یاد جگانے کے لیے ہی برف والے نے ان کو بلایا ہے۔ تبھی تو برف والے نے اتنی جلدی واپس جانے کا انتظام کر دیا۔" میں نے دانستہ برف والے کا نام لیا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ برف والے کا نام آنے کے بعد کوئی بھی کچھ نہیں بولے گا اس لیے کہ وہ سب جانتے ہیں کہ اگر برف والے کے کسی کام میں مداخلت کی گئی تو گناہ عظیم ہو گا۔ انہیں غیب سے سزا ملے گی۔ وہ اسی لیے کچھ نہ بولے لیکن ان کی اداسی کم نہ ہوئی۔ میں نے ایک نظر سب پر ڈالی پھر روبیر سے کہا" تم میری ایک بات مانو گی؟"
"بولیں، ضرور مانوں گی۔"
"ایرٹ بہت اچھا لڑکا ہے۔ اسے اپنا لو۔"
ایرٹ نے اپنی جھکی ہوئی نم آنکھیں اٹھا کر روبیر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں امید کی شمع جل اٹھی تھی۔ اسی وقت روبیر نے اسے دیکھا اور دو قدم آگے بڑھی پھر اس نے ایرٹ کا ہاتھ تھام لیا۔ روبیر کے اس فیصلے نے مجھے خوش کر دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا" ہمارے ہاں اسی طرح سے دعا دی جاتی ہے۔ تم تاعمر خوش رہو۔ میں تمہیں کبھی بھی بھول نہ سکوں گا۔"
روبیر اب بھی سسک رہی تھی میں نے اس کے آنسو پونچھ کر کہا" اب اگر روئی تو مجھے چوٹ پہنچے گی۔ میں ایک ہوا کا جھونکا تھا جو آیا اور چلا گیا۔ اب یہ تم لوگوں کی زندگی ہے اسے ہنسی خوشی گزارو۔ میں جانتا ہوں تم لوگوں کو بھول نہیں پاؤں گا لیکن مجبوری ہے اس لیے جانا ہی پڑے گا۔"
ان سب کو الوداع کر کے میں راجا صاحب کے پاس آیا۔ انہوں نے ایک چیک بک مجھے دے کر کہا" یہ میں لے کر آیا تھا لیکن اب میرے لیے بیکار ہے۔ اس اکاؤنٹ میں کروڑ سے زیادہ کی رقم ہے۔ مجھے امید ہے اسے تم اچھی جگہ خرچ کرو گے۔ تمام چیک پر دستخط کر دیے ہیں، تم تھوڑا تھوڑا کر کے نکال لینا لیکن یہ کام جلد کرنا ایسا نہ ہو کہ میرے غائب ہونے کی خبر پھیلے اور بینک اکاؤنٹ سیز کر دے۔"
میں نے چیک لے لیا۔ سامیرا نے دو قیمتی ہیرے دیئے کہ اسے تم میری طرف سے اپنی دلہن کو دینا۔ اس سے کہنا ایک اجنبی دنیا میں تمہیں یاد کرنے والی کوئی ہے۔" وہ منہ پھیر کر رونے لگی۔ وہ لاکھ بہادر سہی پوری وادی کی ملکہ سہی مگر عورت کی اپنی فطرت ہوتی ہے۔ ذرا سی ٹھیس پر بلک اٹھتی ہے۔ میں اس سے نظر ملائے بغیر باہر نکل آیا۔
سفیر وغیرہ تیار ہو کر کھڑے تھے۔ ہم چاروں اسی غار کی طرف چلنے لگے۔ راستے بھر ہم سب خاموش رہے۔ اگر میں بولنا بھی چاہتا تو بول نہیں پاتا۔ قدم کہیں اٹھ رہے تھے ذہن کہیں تھا۔ ان معصوم لوگوں کی محبت کا سرمایہ میرے ساتھ تھا۔ ان سب کے چہرے نظروں میں تھے۔ ان سب کو یاد کرتا ہوا میں اس غار کے نزدیک پہنچ گیا۔ پھر غار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا" یہی وہ راستہ ہے جس سے گزر کر ہمیں اپنی دنیا میں جانا ہے لیکن کیسے یہ مجھے بھی پتا نہیں۔"
وہ سب بھی میرے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ ابھی رات کا پہلا پہر ختم ہوا تھا۔ برف والے نے کہا تھا کہ پچھلے پہر آنا۔ ہم آ گئے تھے اس لیے ان سب کے ساتھ اس غار کے صاف ستھرے فرش پر بیٹھ گئے۔
"ہم تو آگے جانے کے لیے آئے ہیں اور تم بیٹھ گئے۔ یہ بات سمجھ نہیں آ گئی؟" سفیر نے کہا۔
"ہمیں آگے جانا ہے اور راستہ یہیں سے ہے لیکن اس غار میں کہاں ہے یہ مجھے پتا نہیں۔ اس لیے ہمیں یہاں سر

بیٹھ کر انتظار کرنا ہے۔‘‘

’’کس کا؟‘‘ سفیر نے دوسرا سوال کیا۔ عبداللہ اپنی عادت کے مطابق خاموش تھا۔

میں نے عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ’’اب ہمارا مددگار برف والا ہے۔ اس پُراسرار وادی سے نکلنے کا راستہ وہی بتائے گا۔ اس نے کہا تھا کہ رات کے آخری پہر میں آنا اور ہم بہت پہلے آ گئے ہیں۔ اس لیے آرام کر لیتے ہیں۔‘‘ کہہ کر میں دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ باقی دوستوں نے بھی فوراً اپنے اپنے تھکے ہوئے جسم کو زمین پر ڈال دیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ ابھی میں نیم دراز ہوا ہی تھا کہ آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں سو گیا۔

پتا نہیں کتنا وقت گزرا تھا کہ مجھے سردی کا احساس ہوا اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے آنکھیں پٹپٹائیں اور پھر پوری طرح کھول دیں۔ سفیر، وسیم اور عبداللہ بے خبر سو رہے تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ وہ غار نہیں تھا جہاں ہم سوئے تھے۔ یہ غار کسی برفیلے علاقے کا تھا اس لیے کہ زبردست سردی محسوس ہو رہی تھی۔ ہوا جسم کو چھید رہی تھی۔ غار صاف ستھرا ضرور تھا لیکن ویسا نہیں جیسا ہم دیکھ آئے تھے۔ حیرت کی ایک بات اور تھی۔ ایک کونے میں کپڑے کا ایک بڑا سا ڈھیر تھا۔ میں اس ڈھیر کی طرف بڑھا۔ نزدیک پہنچتے ہی حیرت دوچند ہو گئی اس لیے کہ یہ میرے وہ کپڑے تھے جو میں ڈیوڈشا کے ساتھ آتے ہوئے کھو بیٹھا تھا۔ کپڑوں کے نیچے میرا موبائل اور اسلحہ بھی تھا۔ کچھ اور کپڑے بھی تھے۔ میں نے ان سب کا جائزہ لے کر گرم جیکٹ اور شوز پہن لیے۔ اسلحہ اور موبائل قبضے میں لیا پھر جا کر سفیر کو اٹھایا۔ اٹھتے ہی اس کی حالت بھی میرے جیسی تھی۔ وسیم کو اٹھایا تو وہ بھی ایسے ہی حیرت کا اظہار کرنے لگا۔ ہوا کا سرد جھونکا آیا تو میں نے ان سے کہا ’’اس کونے میں کپڑے ہیں۔ وہ پہن لو ورنہ سردی مزاج پوچھنے لگے گی۔‘‘

’’پوچھے گی... وہ پوچھ رہی ہے کہ یہاں کیوں آ گئے۔ اب آ ہی گئے ہو تو سردی کا مقابلہ کرو۔‘‘ سفیر نے کپڑے پہنتے ہوئے کہا۔

’’مجھے کیا پتھر کا سمجھ لیا ہے۔ میرے کپڑے کہاں ہیں... یہ والا کوٹ ادھر بڑھاؤ... یہ تو وہی کوٹ ہے جو ہم جاتے ہوئے پہنے ہوئے تھے۔‘‘ وسیم نے سردی سے کانپتے ہوئے کہا۔

’’کپڑے پہن کر باہر کا جائزہ لو۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہم کہاں ہیں۔‘‘ میں نے ان لوگوں سے کہا اور باہر کی سمت بڑھا۔

باہر نکل کر دیکھا۔ دور دور تک برف کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ حد نگاہ تک برف پوش پہاڑ تھے۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے یہ علاقہ پہچانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ ایسی کوئی نشانی نظر نہیں آ رہی تھی جس سے پتا چلتا کہ یہ علاقہ کون سا ہے اس لیے کہ برف پوش پہاڑوں پر ہر جگہ ایک سا منظر رہتا ہے۔ اس سے پہلے بھی میں ایسے علاقوں سے گزر چکا ہوں۔ نیپال سے چین میں داخل ہوا تھا۔ وہ ابھی ایسے ہی پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ انڈیا سے جب واپس پاکستان آ رہا تھا اس وقت بھی ایسے ہی پہاڑوں سے ہو کر گزرا تھا۔ ڈیوڈشا کے ساتھ جب اس سفر پر آ رہا تھا تو بھی ایسے ہی علاقوں سے ہو کر آیا تھا' اس لیے کہا نہیں جاسکتا تھا کہ یہ کون سا علاقہ ہے۔ ابھی میں باہر کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ سفیر بھی اندر سے نکل کر باہر آ گیا۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ’’واہ کیا کہنے تمہارا برف والا تو کمال کا جادوگر ہے۔ ایک رات میں ہمیں پاکستان پہنچا دیا۔‘‘

’’تم نے کیسے پہچانا کہ یہ پاکستانی علاقہ ہے۔ یہاں ایسی کوئی نشانی بھی نہیں ہے کہ اس سے سمجھ لیا جائے کہ یہ پاکستانی علاقہ ہے۔‘‘

’’میرا دعویٰ ہے کہ یہ بلتستان کا علاقہ ہے۔ جاتے وقت ہم اسی راستے سے گئے تھے۔ ادھر دیکھو وہ دور تین پہاڑ پاس پاس نظر آ رہے ہیں نا یہ تینوں تبت کے علاقے میں ہیں۔ یہ بات راجا صاحب نے بتائی تھی۔ ان پہاڑوں کی شکل کچھ ایسی ہے کہ یاد رہ گئی۔‘‘ سفیر نے کہا۔

’’ہاں مجھے بھی یاد آ رہا ہے کہ یہ تین پہاڑ میں نے بھی دیکھے تھے۔‘‘ عقب سے وسیم کی آواز آئی تو میں نے مڑ کر دیکھا۔ وسیم اور عبداللہ بھی اسکیمو کوٹ میں لپٹے کھڑے تھے۔

’’میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ برف والا ہے کیا چیز... اس کا ہر کام منفرد ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی بہت پہنچا ہوا بابا ہے۔ اس کے قبضہ میں کوئی جن بھوت ہے... کاش میں اس سے کوئی تعویذ لے لیتا۔‘‘ سفیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’واقعی میں خود بھی سمجھ نہیں پایا کہ وہ ہے کیا چیز۔ اللہ کے بھید اللہ ہی جانے۔ کس بھیس میں کون ہے کوئی نہیں جانتا... ہماری دنیا میں بھی ایسے بہت سے کردار ملیں گے جو عام

اپنے آپ میں الجھا ہوا سوال ہوتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ ایسی ایسی کرامت والی ہستیاں ہوتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جائے۔"

"آپ کے خیال میں وہ برف والا کیا چیز ہے؟ کوئی اولیا اللہ یا کوئی جادوگر؟"

"اس بارے میں، میں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ جس کا علم نہ ہو اس پر میں بحث نہیں کرتا۔" کہہ کر میں نے بات ختم کر دی۔

"اگر حضور والا اس لایعنی بحث سے فارغ ہو چکے ہیں تو اب اس بات پر بھی غور کر لیں کہ ہمیں آگے بھی جانا ہے۔ اگر ہم یہاں سے نکلتے ہیں تو کس رخ پر آگے بڑھنا ہے۔ اس لیے کہ یہاں سے وہاں تک صرف میدان ہی میدان نظر آ رہا ہے اور کون سی سمت میں ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ یہ میرا ہمزاد نہیں بتانے والا۔" وسیم نے دخل دیا۔

"وسیم صاحب کی بات میں دم ہے۔" عبداللہ بولا "ہمارا خیال ہے کہ ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ یہاں بیٹھے رہنے سے فائدہ کچھ نہیں۔"

"عبداللہ کی بات صحیح ہے۔ سورج نکلنے ہی والا ہے۔ ہمیں آگے چل دینا چاہیے۔" میں نے عبداللہ کی تائید کر دی۔

"تو پھر اپنا سامان اٹھا لوں..؟" وسیم نے پوچھا۔

"سامان کی تلاشی لے لو۔ ہمارے خیال سے اس میں رسی، آنکسی، ہتھوڑے وغیرہ بھی ہوں گے۔" میں نے کہا تو اس نے سامان کی تلاشی لی۔ واقعی وہ تمام چیزیں موجود تھیں جو میں اپنے ساتھ لے کر چلا تھا۔ ڈیوڈ شا نے ہی وہ چیزیں دی تھیں۔ میں نے سیاہ شیشے کی عینک لگا کر دوسری سفیر کی طرف بڑھا دی۔

"محترم جناب یہ گوگلز میرے سامان میں بھی ہونی چاہیے۔" کہہ کر وسیم نے اپنے بیگ کو ٹٹولا۔ اس میں سے عینک نکال کر پہنتے ہوئے عبداللہ سے بولا "تم بھی اپنے بیگ میں دیکھ لو... یہ برف والا ایماندار ثابت ہوا ہے۔ ہمارے بیگ کی ایک ایک چیز لوٹا دی۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ بیگ کھو گئے ہیں لیکن وہ کھوئے نہیں تھے انہیں برف والے نے امانتاً رکھ لیے تھے۔"

عبداللہ نے اپنے بیگ سے ضروری چیزیں نکالیں پھر رسی کا گچھا نکال کر بولا "ہم آتے وقت اس رسی سے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ اب بھی آگے بڑھنے کے لیے ان کا سہارا لینا ضروری ہے۔"

"تمہاری بات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں قدم قدم پر کھائی اور غار ہیں جو برف تلے دبے ہوئے ہیں۔ وزن سے اس پر جمی برف ٹوٹتی ہے تو موت اپنے پنجے بڑھا دیتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اب کرنا کیا ہے؟" وسیم نے پوچھا۔

"عبداللہ کی بات پر عمل کرنا ہے۔ آگے بڑھتے ہیں، کوئی نہ کوئی بستی تو مل ہی جائے گی۔" میں نے کہا اور عبداللہ کے ہاتھ سے رسی کا گچھا لے کر ایک سرا اپنی کمر میں باندھا اسی سے سفیر نے خود کو منسلک کیا، سفیر کے بعد عبداللہ نے اپنے بلٹ کو رسی سے جوڑ دیا۔ آخر میں وسیم نے خود کو اس رسی سے جوڑا گویا ہم سب ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے تھے۔ سب نے اپنے اپنے ہاتھوں میں کلہاڑی پکڑ لی تھی۔ ہم نے بیگ سے آہنی میخیں بھی نکال لیں تھی۔ ہم سب نے اپنے درمیان چار چار فٹ کا فاصلہ رکھا تھا۔ اپنے اپنے بیگ سب نے پیٹھ پر لاد لیے تھے اس طرح ہم سب آگے پیچھے سیدھ میں بڑھنے لگے گویا اس طرح ہمارا نیا سفر شروع ہوا۔

برف نرم اور بھربھری تھی۔ بوٹ بار بار برف کے ذرات والی زمین میں دھنس رہے تھے۔ ہم سب اسی حالت میں آگے بڑھے۔ سب سے آگے میں تھا اس لیے خطرہ بھی مجھے زیادہ تھا کہ جگہ جگہ برف تلے گڑھے ہو سکتے تھے جس پر پیر پڑتے ہی برف کی تہہ ٹوٹتی اور اس میں دفن ہو سکتا تھا۔ اس لیے ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھا رہا تھا۔ ہم نے دور نظر آنے والے تین پہاڑوں کی چوٹیوں کو نظروں میں رکھ کر سفر کا آغاز کیا تھا تاکہ ہم اس کے داہنے جانب بڑھتے رہیں اس طرح ہم پامیر تک پہنچ سکتے تھے۔ لیکن یہ راستہ اس لیے بھی خطرناک تھا کہ آئس سلائڈنگ کا خطرہ بنا ہوا تھا۔ کسی بھی وقت برف کا طوفان ... اٹھ سکتا تھا۔ ہم سب آگے پیچھے قطار میں آگے بڑھتے جا رہے تھے کہ ایک جگہ مجھے برف کچھ زیادہ ہی نرم نظر آئی اور میں نے جلدی سے قدم آگے بڑھا دیا۔ ساتھ ہی ساتھ سب کو ہوشیار کیا کہ یہاں کوئی کھائی یا غار کا دہانہ ہے لیکن دیر ہو چکی تھی۔ سفیر تو پار کر گیا لیکن وسیم لڑکھڑایا۔ ہم کچھ سمجھتے کہ کیا ہوا ہے اس سے پہلے ہی اس کے کمرے میں لگی بیلٹ ٹوٹی۔ رسی ڈھیلی پڑی اور وہ برف میں دھنستا چلا گیا۔

جاری ہے

(سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا کا جواب)

اشفاق حسین میمن..........سکھر

نرم دھاگے کو مسلتا ہے کوئی چٹکی میں
سخت ہو جائے تو موتی میں پرویا جائے

آغا عنایت..........کوئٹہ

نیتوں کا بھید تو کھلتا ہے منزل کے قریب
ورنہ آغاز سفر میں راہزن کوئی نہیں

ساجد فاروق..........سرگودھا

نادانی اور مجبوری میں یارو کچھ تو فرق کرو
اک بے بس انسان کرے کیا ٹوٹ کے دل آجائے تو

(عبدالحکیم شمر کراچی کا جواب)

زاہد علی..........کراچی

یہ دل کبھی تھا رشکِ پری خانہ دوستو
وہ آج حسرتوں کا ہے ویرانہ دوستو

نزہت اکرام..........کراچی

یہ تنہائی کی تاریکی تو بڑھتی اور بھی ہمدم
غنیمت ہے کہ یادوں سے چراغاں کرلیا میں نے

ناصر خان..........کوئٹہ

یہ قوم کی خدمت کا صلہ ہے سردست
گر اس پر قناعت کا ارادہ ہے تو آؤ

(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

زرین مجید بٹ..........لاہور

یہ ہم ہی تھے جن کے لباس پر سرِراہ سیاہی لکھ گئی
یہ داغ تھے جو سجا کے ہم سرِبزم یار چلے تھے

فہیم الدین شیخ..........سیالکوٹ

یادوں کے حاشیے بھی بہت اہم ہیں محسن
دیمک لگی کتاب کو آہستہ کھولیے

آصف جاوید..........فیصل آباد

یوں نہ بدلیں ذوقِ اظہارِ عقیدت کے اصول
مقبروں پر لوگ لے جانے لگے کاغذ کے پھول

(تبریز عارف کا جواب)

نجمی رحمٰن..........بریٹ لیٹ، یو ایس اے

مت سہل اسے جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

(نسرین نکہت کراچی کا جواب)

محمد احمد رضا انصاری..........کوٹ ادو

زندگی تیرا بھی احسان کیوں نہ رہ جائے
تو بھی لے جا اس خاک سے حصہ اپنا

(آفتاب قزلباش اسلام آباد کا جواب)

عنایت مسیح..........کراچی

اس درجہ بے رخی پر پشیماں نہ ہو کوئی
خود مجھ کو احترامِ شعورِ وفا کہاں

احمد طارق بٹ..........لاہور

آتا نہیں یقین مگر ہے یہ واقعہ
شیشے کے گھر سے آئے ہیں پتھر کبھی کبھی

(اظہر بخاری ملتان کا جواب)

سید امتیاز حسین بخاری..........سرگودھا

یادوں کے حسیں نقش مٹائے نہیں جاتے
گزرے ہوئے لمحات بھلائے نہیں جاتے

(ہادیہ ایمان ماہا ایمان ہارون آباد کا جواب)

کلیم اللہ..........پشاور

یہ بجا میں کسی نایاب کے قابل ہی نہ تھا
میرے حصے میں یہ کمیاب تو آسکتے تھے

فرحین جاوید..........ملتان

یہ زندگی کا جہنم یہ گرم و تند ہوا
تمہیں سے اس میں بھی شب بھر کی ایک جنت دو

اسرار احمد..........لاہور

یہی تو درد ہے دل کو جو دھڑکاتا ہے سینے میں
یہی تو ایک دولت ہے جو انسانوں کے ہاتھ آئی

فرخندہ لودھی..........کراچی

خندہ لبی ایک اعجاز ہے
یقینِ وفا دل کو آجائے ہے

اشرف الدین.........ساہیوال
یہ آتی جاتی سانس بھی
مالک ترا انعام ہے
(ناعمہ تحریم کراچی کا جواب)

نوشین عارف.........حیدر آباد
نہ میرے قلم سے لکھی گئی نہ میری زباں سے ادا ہوئی
جو نظر سے کہنے کی بات ہے کسی حرف میں نہ سمائے گی
(سیف اللہ ملک وال کا جواب)

احمد ذیشان.........کراچی
اشرافیہ سے چھن گئے آداب رہبری
اب تاجروں نے ساری سیاست خرید لی

فرحت ندیم.........کراچی
اس تخیل میں وہ رہتے تھے ہمیشہ اظہر
اب تو خوابوں میں بھی عنقا ہے وہ ملتا ہی نہیں

وصی اللہ زرولی.........پشاور
آزردگی کا اس کی ذرا مجھ کو پاس تھا
میں ورنہ آج اس سے زیادہ اداس تھا
(عبدالجبار رومی لاہور کا جواب)

فرحت اللہ.........پشاور
یہ محبت کی کہانی نہیں مرتی لیکن
لوگ کردار نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

مہوش صدیقی.........آزاد کشمیر
یہ عجب کھیل ہے عشق کا میں نے آپ دیکھا یہ معجزہ
وہ جو لفظ میرے گماں میں تھے وہ تری زبان پر آگئے
(انجم اسماعیل کا جواب)

نجمی رحمان.........برٹ لیٹ یو ایس اے
نہ گنوا ؤ ناوکِ نیم شب دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا
(عباس علی سکرنڈ کا جواب)

رانا محمود الحسن.........جہلم
ماتھے جھکے ہزار خداؤں کے سامنے
جز داغ اور کوئی نشانی نہ پا سکے

فدا حسین طوری.........پاراچنار
میں عبث اس کو کہیں ڈھونڈا کیا
میرے ہی سینے میں تھا میرا خدا

(سلمیٰ شاہین فیصل آباد کا جواب)

عبدالحکیم ثمر.........کراچی
آج تو ہم کو پاگل کہہ لو پتھر پھینکو طنز کرو
عشق کی بازی کھیل نہیں ہے کھیلو گے تو ہارو گے
(نوشین حجاب کا جواب)

قاضی شرف معروف حیدی.........کراچی
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
(نجمی عزیز میئے وہاڑی کا جواب)

ہما اختر.........مظفر گڑھ
یہ جال الگ ہاتھ میں بنتی ہیں لکیریں
قسمت کے ستاروں کا وہ الجھاؤ الگ ہے

ندیم یامین.........کراچی
یہ لڑکی تو ان گلیوں میں روز ہی گھوما کرتی تھی
اس سے ان کو ملنا تھا تو اس کے لاکھ بہانے تھے

سعید احمد چاند.........کراچی
یہ ہم بھی جانتے ہیں زندگی اک خواب ہے افسر
مگر اس خواب کی آخر کوئی تعبیر بھی ہو گی
(ندیم یامین کراچی کا جواب)

حیات مرزا.........حیدر آباد
وہ شہر میں تھا تو اس کے لیے اوروں سے بھی ملنا پڑتا تھا
اب ایسے ویسے لوگوں کے میں ناز اٹھاؤں کس کے لیے

سلمیٰ شاہین.........فیصل آباد
وحشت کا عنوان ہماری ان میں سے جو نار بنی
دیکھیں گے تو لوگ کہیں گے انشاؔ جی دیوانے تھے

سیف اللہ.........ملک وال
وہ بال کھولے میت پر دیوانا وار آئے
اس کو موت کہتے ہیں تو یارب بار بار آئے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مد نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش
126
30 جون 2016ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 جون 2016ء تک علمی آزمائش 126 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کرلیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے)

86

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش۔ 126

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک علمی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 جون 2016ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1918ء میں برطانیہ کے ہومرٹن میں پیدا ہوا۔ وہ نسلاً انگریز تھا لیکن اردو سے عشق کرتا تھا۔ اس نے GHALIB LIFE & LETTERS جیسی کتاب تالیف کی یعنی خطوط غالب کا ترجمہ کر کے نئے انداز میں ڈھالا۔ وہ اردو میں انگریزی الفاظ کی آمیزش کا مخالف تھا۔ اسے برطانوی بابائے اردو کہا جاتا تھا، چند سال پہلے اس کا 90 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

علمی آزمائش 123 کا جواب

سید کمال نے فیض عام اسکول میرٹھ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر بمبئی چلا گیا اور چار فلموں میں اداکاری کی۔ راج کپور نے اپنی فلم ''جاگتے رہو'' میں اداکاری کے لیے منتخب کیا تھا کہ فسادات شروع ہو گئے۔ وہ پاکستان ہجرت کر آیا۔ کئی ایک فلمیں کیں لیکن صحیح کامیابی نہ ملی مگر 1962ء میں اس نے جس فلم میں اداکاری کی وہ سپرہٹ ثابت ہوئی اور وہ پاکستانی فلمی دنیا کا نامور اداکار بن گیا۔ اپنے منفرد انداز کی وجہ سے وہ منفرد ہیرو کہلاتا تھا۔

انعام یافتگان

1- عباس علی (فیصل آباد) 2- ذیشان مصطفیٰ (چنیوٹ) 3- زرینہ شیر خان (حب بلوچستان)

4- انیس بٹ (لاہور) 5- ظفر ایوبی (کراچی)

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے سید مسرت حسین رضوی، سعید احمد چاند، شاہد اقبال شاہد، وجاہت وکیل عثمان خان، خادم حسین، محمد یامین، ایم ناصر، خالدہ یوسف، اکبر حیات، شجاع رضوی، سندس حیات، دانش قریشی، سید عباس مرزا، سلیم اللہ، صالح محمود، توقیر ناصر،

منیبہ حبیب، طیب خان، عزیز الدین، ارباب حسن، سید فرخ محمود، محمد اختر، دانش قریشی، سلطان خان، طیب الحسن، راغب الحسن، عباس خان، علیم ذکائی، ناصر بیگ، اشفاق محمد، منیر الحسن۔ لاہور سے عبدالخالق، شیخ محمد، چوہدری فضل اللہ، شیخ محمد اکرام، سرور جاوید، نوید اصغر، برکات اللہ۔ ملتان سے محمد منیب چشتی، لبنیٰ ارشاد، امام بخش ملک، اویس۔ ملمان، محمد معین چشتی، نازش فاروقی، محمد شفیق، خضر حیات بھٹی، اسماعیل آفاق، آصف محمد، اقبال انصاری، شیخ نہال احمد، اقبال حسن خان، توقیر عباس۔ پشاور سے وحیدہ خان، گل مست خان (ارحم پایاں)۔ کوئٹہ سے سرور حسن، ذیشان خان، پنجتن چنگیزی، محمد ہارون، آصف جاہ، لبنیٰ احمد، ظاہر شاہ۔ حیدرآباد سے شکیل اشرف، نہال حسن، ساجد فاروق، زوفی انصاری، فرحت عثمان، کلیم اللہ جان۔ میرپور خاص سے طاہر الدین بیگ، جویریہ احسن، حافظ محمد محسن، تانیہ عطاری، ذوفشاں فاطمہ، عابد علی شیخ، رخسانہ اکمل۔ راولپنڈی سے ملک محمد احسن، اقرار الحسن، نوید بھٹی، کاظم علی خان، پرویز سلطان، فرحت اللہ، مرزا الطاف حسین، غفران، نواز علی، اطہر احمد قریشی، بابر حسن خان، حلیم خان، تانیہ زیدی، مجید الرحمن، آفاق سعید، نسرین مجتبیٰ، فاروق حسن۔ اسلام آباد سے صغراں بیگم، سلیم اختر ملک، اشفاق محمد، نذر علی، ابن حسن، کلیم اللہ، فتح اللہ بابر خان، عجب خان نیازی، فراست حسن کاظمی، کائنات، اشرف عباس۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک، زاہد علی خان، ملک جاوید، ابرار احمد، پروین ضیا، نعمان اشرف، حدیقہ اشرف، خالد علی، منظر علی خاں۔ ملتان سے: بیگم احمد دین، توفیق سلطان، مناف سید، فضل الحق، جمیل ملک، بہادر خان، کوکب جہاں، فہیم اللہ، ابرار بشیر، محمد معین چشتی، نیاز احمد ملتانی، جنید ارشد، ندا یونس، اشرف علی شیروانی، عزادار حسین، زبیر شاہ، مہوش، وزیر ولی خان ڈرائیور، نگار سلطانہ، نشاط جہاں، زاہد خان، زینب چوہان، قدوس بخش، اللہ دتہ، فاضل خان اچکزئی، قدرت اللہ، نثار احمد، اختر علی سعید۔ جہلم سے: نذر کلیم چغتائی، سلطان بخش، عثمان علی شاہ، شاور ترمذی، فصاحت حسین، نعیم الحسن زیدی، ندیمہ امتیاز۔ چکوال سے: فرحانہ سعید قاسمی، نصرت جاوید، فرید احمد، اقبال حسن، صدر الدین، زریاب خان، کمال احسن کمال، ملک شفاعت، اجمل شاہین۔ کوئٹہ سے: ممتاز احسن، نذر خان، تقی چنگیزی، نصرت چنگیزی، راؤ رشید، خاقان اعوان، فصاحت حسین۔ سرگودھا سے: محمد نعیم ظفر، نزہت پروین، منور ساجد منیر، سلیم اللہ خان، خلیق حق، خضر حیات، عظمیٰ اکمل ٹوانہ، فصیح الزماں، محمد بلال احمد۔ شجاع آباد سے: زوار حسین زیدی، ارباخان۔ حیدرآباد سے: امتیاز حسن، جمیہ سلطان، فتح شیر خان، نواز عثمان آبادی، آمنہ قائم خانی، عبدالقیوم، حسن خان، فصاحت اللہ، انور علی زبیری، کاشان خان، مرزا افرحال بیگ۔ حاصل پور سے: اختر عباس، خالد ماجد، مہوش ملک، شیخ فخر الدین، انجم فراز، نرگس خیال۔ ڈی جی خان سے: فرحت اللہ شیرازی، نعمت خان، گل شیر میو۔ ڈی آئی خان سے: نصیر الدین نصیر، فتح یاب خان، رانا وجدان، محمد سہیل انجم، سیماب عائشہ نواز۔ رحیم یار خان سے: آصف اقبال، محمد فیصل بخاری، فرحت اللہ لغاری، نسیم سلطان، کلیم اثر، زاہد طوری بخش، اسلم توفیق، ساجد حسن، نثار علی، فرزانہ رفیق، قیصر ملک، انجم صدیق، فہد احمد، عثمان راہی۔ کھاناں سے: سلیم کامریڈ۔ بہاولپور سے: نازش کریم، شمیم وٹو، فہیم شیخ، میثم حسن، مسرت اسلم، حمیرا کوکب واسطی، ساغر تسنیم۔ بہاولنگر سے: نبیل احمد، نصیر جاوید، فرزند احمد، یعقوب افتخار، نزہت فردوس، بابا رونی۔ کمالیہ سے: فرحت شاہ، نواب شاہ، محمد الطاف فاروق، اصغر حسین خان، سلطنت خان۔ جہانیاں سے: زبیر خان، مختیر خان، عبدالشکور اختر (غریب آباد) ممتاز وحید۔ کوٹ ادو سے: اطہر حسین سید، نبیل اشرف ملک۔ ابوذر زیدی، فردوس ابریز۔ گوجرانوالہ کینٹ سے محمد اسلم کھوکھر، اسلم گھنگھوری، جلال الدین، مشاہد اللہ، اللہ دتہ چوہدری۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ)، رفاقت حسین (شاہ مردان)، توقیر جمال، امام بخش۔ بہاولپور سے شاہ رخ ہاشمی، بشریٰ اصغر، فرزانہ مصطفیٰ، محمد معین، فرید الدین۔ ڈگری سندھ سے نسیم اختر۔ ننکانہ صاحب سے جمیل الدین چیمہ۔ کمالیہ سے سعدیہ گل۔ کوٹری سے مدیحہ ناز، حلہ گنگ سے محمد اشرف۔ لالہ موسیٰ سے فوزیہ اطہر قریشی، رخسانہ یاسین، محمد ذکائی، محسن اختر۔ بہاولنگر سے محمد ارشد ظفر، شاہ رخ، وجاہت صدیقی، اسد محمد، عبدالرؤف۔ کوٹلی آزاد کشمیر سے لیاقت حسن، ابوتراب، ناصر آرزو۔ جعفرآباد سے فاروق فہیم۔ خوشاب سے محمد اسماعیل، محمد عزیز۔ خوشاب سے سخاوت عباس، محمد عزیز۔ ہالا سے قاضی امجد۔ لاڑکانہ سے افتخار حسین۔ منڈی بہاؤالدین سے سلطانہ جبیں۔ خانیوال سے محمد رحمن۔ صادق آباد سے جاوید چنہ۔ جہانیاں سے جاوید اظہر۔ کبیروالا سے فاروق محسن۔ وزیرآباد سے ہاشم نعیمی، نہال اصغر۔ چمن آباد سے تحی سلطان ڈرائیور۔ مظفر گڑھ سے سرفراز اشرف، عمر حیات، راحیل ندیم، ارشاد حسین۔ صوابی سے تحسین احمد۔

ممالک غیر سے: محمد سلطان (مسقط اومان)، لانس نائیک شمیم احمد (مکہ مکرمہ)، احسن کلیم (ٹورنٹو کینیڈا)، زاہد شیخ (بیڈفورڈ یو کے)۔

رشتے

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
ندرت پر جو گزری سو گزری لیکن اس کی سرگزشت میں جو پیغام ہے یہ میں قارئین تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ رشتے کی اہمیت کو سمجھیں اسے پامال نہ کریں ورنہ حشر اجمل جیسا ہی ہو گا۔

آصفہ ضیاء احمد
(حیدر آباد)

انسانی رشتے بھی ہتھیلیوں کی لکیروں کی طرح ہوتے ہیں۔ الجھے الجھے آڑے ترچھے اور پیچیدہ عقل سے بالاتر اور ناقابلِ فہم ان رشتے ناتوں کے درمیان انسان ساری عمر معلق رہتا ہے۔ رشتوں کے پھندے اور ڈوریاں بظاہر تو بڑے مضبوط اور اٹوٹ لگتے ہیں لیکن کبھی کبھی وقت ان رشتوں پر ایسا کاری وار کرتا ہے کہ سب کچھ بکھر جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ معراج الدین کے ساتھ ہوا تھا۔ معراج الدین اپنی چھوٹی بہن ندرت کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ انہوں نے کبھی بہن کا دل نہیں دکھایا۔ اپنی بیوی عاقلہ سے انہوں نے پہلی ہی رات یہ وعدہ لیا تھا کہ ندرت کو وہ کبھی نند کی نظر سے نہیں دیکھے گی۔ عاقلہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ ”آپ اطمینان رکھیے میں ندرت کو اپنی بہن بنا کر رکھوں گی اور اس سے پہلے کہ وہ اور کچھ کہتیں معراج الدین نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے ٹھوس اور مستحکم لہجے میں کہا۔ ”میرے والدین میری کمسنی میں ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ندرت تب اتنی چھوٹی تھی کہ اسے نہ امی کا چہرہ یاد ہے نہ ابو کا۔ خاندان کے کئی لوگ اس کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار تھے لیکن میرے دل نے یہ گوارا نہیں کیا کہ میں اپنی بہن کو کسی اور کی جھولی میں ڈال کر خود چین کی بانسری بجاؤں۔ شب و روز کی محنت اور لگن کے ساتھ بذاتِ خود میں نے اپنی بہن کی پرورش کی ہے۔ اسے ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا اور تم یقین کرو مجھے اپنی بہن سے ایسی محبت ہے جیسے ایک باپ اپنی بیٹی سے کرتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ندرت کو تم اپنی دوست اور بہن مت سمجھنا بلکہ بیٹیوں کی طرح اس کے ناز نخرے اٹھانا۔ میں اگر اس کا باپ ہوں تو تم اس کی ماں ہو یہ بات گرہ میں باندھ لو۔“

عاقلہ نے شوہر کے حکم کو سر آنکھوں پر رکھا۔ ندرت کو نہایت ناز و نعم کے ساتھ پال پوس کر بڑا کیا۔ اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اسی اثناء میں ان دونوں کو اللہ نے ایک بیٹے سے نوازا۔ بیٹے کا نام انہوں نے فیضان رکھا۔ فیضان کی آمد کے بعد بھی ندرت کے لاڈ و پیار میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ انجان اجنبی لوگ یہی سمجھتے کہ ندرت پہلوٹھی کی اولاد ہے اور کافی طویل عرصے بعد اس گھر میں بیٹے کا اضافہ ہوا ہے۔

ندرت کی شادی بھی معراج الدین نے کافی چھان پھٹک کے بعد ایک اچھے گھرانے میں طے کی۔ لڑکا محکمہ پولیس میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا۔ جوڑی بھی ایسی بچلی تھی کہ جو دیکھتا بے اختیار کہہ اٹھتا، ہائے کیسی چاند سورج کی جوڑی ہے۔

شادی کے بعد ندرت اور فیصل کے لیے خوشیاں برس رہی تھیں اور دونوں سرشاری کے عالم میں ان خوشیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس روز تو ان دونوں کی خوشیوں میں اور اضافہ ہو گیا جس روز لیڈی ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ وہ عنقریب ماں بننے والی ہے اس روز فیصل کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ندرت کو اپنی بانہوں میں لے کر باقاعدہ وہ ناچنے لگا۔ اسی دوران اس کے موبائل نے اپنی مخصوص دھن بجائی۔ اس مداخلت پر اسے طیش تو بہت آیا لیکن موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ اس لیے دل پر جبر کر کے موبائل پر ہیلو کہا۔

اس کا فرض اسے پکار رہا تھا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر پستول کھونٹی سے اتار کر ہاتھ میں لیا۔ مواصلاتی ذریعے سے احتیاط کی خاص تاکید کی گئی تھی۔ اس لیے دروازہ کھول کر باہر کا جائزہ لیا لیکن دھند میں شناخت نہیں کر سکا۔ وہ گھر سے رخصت ہوتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ عام سے جرائم پیشہ لوگ ہوں گے۔ یہی اس کی خام خیالی تھی کہ وہ دشمن کو بے وقوف اور کمزور سمجھ بیٹھا تھا جب کہ مقابلہ ایک منظم اور طاقتور دہشت گرد گروہ سے تھا۔ جن کی دہشت گردی نے شہر کو دہلا رکھا تھا۔ جیسے ہی تھانے سے ان کی موبائل نکلی تھی کہ ایک دھماکا ہوا تھا اور سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

ندرت کے سامنے جب فیصل کی ڈیڈ باڈی لائی گئی تو آخری بار اس نے شوہر کے چہرے پر نظر ڈالی پھر اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا جب کہ سارا گھر آنسو، آہوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ میت میں شرکت کرنے والے لاؤنج میں رکھے ٹی وی کی اسکرین پر زندگی اور موت کا وہ معرکہ دکھایا جا رہا تھا جس میں فیصل اور اس کے ساتھیوں نے جان کی بازی ہاری تھی۔ جب فیصل کا جنازہ اٹھا تب ندرت نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں۔ وہ عالم بے ہوشی سے ہوش و حواس کی دنیا میں آچکی تھی۔ وہ بے تحاشا میت کے پیچھے بھاگی۔ گھر کی خواتین نے سختی سے اسے پکڑ لیا۔ وہ سخت مزاحمت کر رہی تھی۔ ڈاکٹر کے کہنے پر اس کے بازو میں انجکشن لگا دیا گیا۔

اس کی مزاحمت دم توڑ گئی اور وہ دوبارہ اپنے ماحول سے بے خبر ہو گئی۔ کئی گھنٹوں کے بعد جب اسے ہوش آیا تو اسے وہ سب کچھ یاد آگیا جسے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ تلخ حقائق اژدھے کی طرح منہ کھولے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اس کٹھن وقت میں معراج الدین اور عاقلہ نے اسے سمجھایا کہ موت زندگی سے بڑی حقیقت ہے۔ اس سے نظریں چرانا دانشمندی نہیں۔ قدرت نے اگر کچھ لیا ہے تو ریٹرن میں کچھ دے رہا ہے۔ ایک نیا مہمان تمہاری زندگی میں آرہا ہے۔ تمہیں اس کے لیے جینا ہے۔ اس آنے والی ننھی جان کا خیال کرنا ہے۔ ورنہ تمہارا یہ رنج والم یہ حزن و ملال اس بچے کے لیے کہیں نئے مسائل نہ کھڑے کر دیں۔

بھائی بھاوج کی محبت خلوص اور ہمدردی نے ندرت

کی منجمد حسیات کو بیدار کر دیا۔ جمود ٹوٹنے لگا۔ کبھی جب شوہر کی یاد ستاتی تو اس کے پسندیدہ پرفیوم کا اسپرے کر کے فیصل کی خوشبو محسوس کرتی۔ گھر کے ہر کمرے میں چل پھر کر شوہر کے قدموں کی آہٹ تلاش کرتی۔ معراج الدین اور عاقلہ نے بہت چاہا کہ وہ ان کے ساتھ رہے لیکن اس نے صاف کہہ دیا کہ اس گھر میں اس کے ساتھ اس کا جیون ساتھی ہے۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے تعزیتی ریفرنس میں بھی اس نے نہایت ہمت حوصلے کے ساتھ شرکت کی۔ مقررین کی جذباتی تقاریر پر بے اختیار اس کی آنکھیں نم بھی ہوئیں اور اس وقت اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کیا کہ جب بھی فیصل کی نشانی اس کی گود میں آئے گی اور اگر وہ بیٹے کی شکل میں ہوئی تو وہ اپنے بیٹے کو بھی پولیس آفیسر بنائے گی لیکن انسان سوچے اور وہ پورا ہو جائے ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ میٹرنٹی ہوم میں نرس نے اسے ننھی سی گڑیا کی نوید سنائی۔ بیٹی پر پہلی نظر ڈالتے ہی اسے فیصل یاد آ گیا۔ شوہر کی آخری تصویر اس کے ذہن میں ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے رک کر مڑنا، اسے دیکھ کر ہاتھ ہلانا، پولیس یونیفارم میں ملبوس طویل القامت گریس فل۔

آنکھوں کے سوتے پھوٹ پڑے اور نوزائیدہ بچی کا نرم و نازک جسم ماں کے آنسوؤں سے بھیگنے لگا۔ نرس نے اپنے طور پر سوچا یقیناً بیٹا نہ ہونے پر میڈم آنسو بہا رہی ہیں لیکن ندرت نے فوراً اس کی غلط فہمی دور کر دی۔ اسے فیصل کی یہ بیٹی ہزاروں بیٹوں سے زیادہ پیاری تھی۔ اس نے فوراً اسے اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ بہت دنوں کے بعد وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے مسکراتی نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا۔ اسی دوران معراج الدین، عاقلہ اور فیضان داخل ہوئے تینوں کے چہروں سے خوشی اور مسرت پھوٹ پڑ رہی تھی۔ ننھے فیضان نے اس چھوٹی سی گڑیا کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”پھپھو یہ گڑیا میری ہے۔“

اس کی اس معصومانہ ادا پر سب ہنس پڑے لیکن عاقلہ بیگم نے فوراً بات پکڑ لی اور ندرت سے کہا۔ ”ندرت بھتیجے نے پہلی بار تم سے کچھ مانگا ہے یاد رکھنا اسے ہم ہی اپنے گھر کی رونق بنائیں گے۔“

ندرت کے لیے یہ خوشگوار لمحات ایک طویل عرصے بعد آئے تھے اس لیے اس نے بھی کھل کر انجوائے کیا اور ہنستے ہوئے کہا۔ ”آپ کے اور بھائی کے علاوہ کوئی ہمت کر سکتا ہے میرے گھر تک آنے کی۔ فیضان اگر میرا ہے تو یہ......“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

معراج الدین نے بھانجی کو اپنی گود میں لے کر پیار کیا اور شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ ”یہ اتنی نازک، کومل اور حسین ہے جیسے کھلتے غنچوں کی ملاحت۔ بس بھئی اس کا نام میں نے تجویز کر دیا۔ ہم اسے ملاحت کہہ کر ہی پکاریں گے، تمہارے نام کے ہم وزن نام ہے۔ انہوں نے بیوی کی طرف تصدیق طلب نگاہوں سے دیکھا۔ عاقلہ بیگم نے بجائے جواب دینے کے شوہر کو سرزنش کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ بچی کا رشتہ میں نے طے کر دیا۔ نام رکھائی کی رسم آپ نے ادا کر دی اور مالکانہ حقوق کی مہر ہمارے بیٹے نے لگا دی۔ اب اس بے چاری کے پاس کیا رہ گیا۔

ندرت آج ان لمحات سے ساری خوشیاں کشید کرنا چاہتی تھی۔ اس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے عاقلہ سے مصنوعی خفگی کے ساتھ کہا۔ خبردار بھائی آج میرے بھیا کو کچھ نہ کہیں اگر آپ لوگوں نے ملاحت کو مجھ سے مانگا ہے تو بدلے میں فیضان جیسا بیٹا بھی تو میری گود میں ڈالا ہے۔ حساب برابر ہو گیا۔“

معراج الدین اور عاقلہ آج بہت مسرور اور خوش تھے کیونکہ کافی لمبے عرصے بعد ندرت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلے تھے۔

ندرت معاشی طور پر کبھی بھی پریشان نہیں رہی۔ اس کا اپنا بڑا سا گھر تھا جو معراج الدین کے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ یہ گھر فیصل نے بڑے ارمانوں سے بنوایا تھا لیکن اسے رہنا نصیب نہیں ہوا۔ اس گھر میں منتقل ہونے سے پہلے ہی یہ حادثہ ہو گیا تھا۔ بھائی بھاوج کے منع کرنے کے باوجود وہ اس گھر میں شفٹ ہو گئی۔ بھائی بھاوج اور بھتیجا وقفے وقفے سے اس کے گھر راؤنڈ لگاتے رہتے تاکہ کوئی تنہا سمجھ کر لقمہ تر نہ سمجھ بیٹھے۔ ایک ادھیڑ عمر کی دیانت دار خاتون کو اس نے اپنے پاس رکھ چھوڑا تھا۔ جن سے وہ گھریلو کام کاج تو نہیں کرواتی تھی صرف ساتھ رہنے کے لیے رکھا تھا... کیونکہ وہ عورت جس کا نام سلطانہ تھا ذرا دبنگ قسم کی تھی۔ سارے گھر کو بخوبی کنٹرول کرتی۔ گھر کے نوکر بھی اس کے انڈر میں تھے۔ فیضان اور ملاحت بھی سلطانہ سے بہت مانوس تھے۔ سلطانہ بھی ان دونوں کی نت نئی شرارتوں سے چڑھتی نہیں بلکہ خوب محظوظ ہوتی اور دیر تک ہنستی رہتی۔

دونوں اس کے ارد گرد کھیل کود کر جوانی کی سرحد میں قدم رکھ چکے تھے۔ فیضان تو لاابالی سا نوجوان تھا۔ جب

اس کی سماعت سے یہ الفاظ ٹکرائے کہ ملاحت اس کی منگیتر ہے تو نہ اس کے دل و دماغ میں کوئی ہلچل مچی اور نہ ہی ملاحت سے کوئی جذباتی وابستگی محسوس کی لیکن جب ملاحت کے کانوں میں یہ بات پڑی تو اس کی دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ماں اور ماموں کا یہ فیصلہ اسے بہت اچھا لگا۔ اسے یقین تھا کہ حصولِ تعلیم کے بعد ان دونوں کو فوراً شادی کے بندھن میں باندھ دیا جائے گا۔ وہ چشم تصور سے یہ خواب بارہا دیکھ چکی تھی لیکن اس کا برسوں کا خواب اس روز چکنا چور ہو گیا۔ جب اس نے ایک لڑکی کو فیضان کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھے دیکھا۔ دونوں کے چہروں پر مسرت کی کرنیں جگمگا رہی تھیں۔ پہلی بار دیکھ کر اس نے اپنے دل کو طفل تسلی دی کہ یونیورسٹی میں تو لڑکے لڑکیاں ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ یقیناً فیضان کی کوئی کلاس فیلو ہوگی اور گھر دور ہوگا تو لفٹ مانگی ہو گی۔ وہ خیالی گھوڑے دوڑاتی رہی اور پھر بالآخر اپنے نصاب کی کتابیں سمیٹ کر ایک طرف رکھیں اور بستر پر آ کر اپنے آپ سے الجھتی رہی۔ نیند آج اس سے کوسوں دور تھی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے تھک گئی تو دوبارہ ٹیبل لیمپ روشن کر کے اسٹڈی میں مشغول ہو گئی کیونکہ امتحانات قریب تھے اور ٹاپ کرنے کا بھوت اس پر بچپن سے سوار تھا جب کہ فیضان اس کے برعکس تھا۔ وہ بس اتنی پڑھائی کرتا کہ ہر سمسٹر کلیئر ہو جائے۔ پڑھائی، امتحان، محنت اور پیپرز، ان چیزوں کو اس نے جان کا روگ نہیں بنایا تھا۔ ہنس مکھ بشاش اور کھیلنے کودنے والا نوجوان تھا۔ معراج الدین ہمیشہ اس کے سامنے ملاحت کی مثال پیش کرتے اور فیضان باپ کی نصیحت اور ملاحت کی تعریف کو یوں ہوا میں اڑا دیتا۔ جیسے تیز آندھی تنکوں کو اڑا دیتی ہے۔ آج کل وہ بیرونِ ملک جانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ گرتے پڑتے ایم بی اے کر چکا تھا اور عاقلہ بیگم کے گوش گزار یہ بات کر چکا تھا کہ باہر جا کر ہاتھ پیر مارے گا اور ذریعہ معاش تلاش کرے گا۔ جب معراج الدین نے یہ بات سنی تو انہوں نے دوبدو بیٹے کو بٹھایا اور بات کی۔ بیٹے کو باہر جانے کی اجازت تو دے دی لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھی کہ وہ شادی کر کے باہر کے لیے اڑان بھرے۔ فیضان نے خوشی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ابو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ پھر میں کوشش کر کے شہابی کو بعد میں بلوا لوں گا۔“

معراج الدین شہابی کے نام پر اچھل پڑے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے انہوں نے ننگا برقی تار چھو لیا ہو۔ عاقلہ بیگم کا چہرہ فق ہو گیا بدحواسی میں وہ یوں بھاگیں کہ پیروں میں چپل ڈالنا بھول گئیں۔ معراج الدین دہاڑے۔ ”کون ہے یہ شہابی؟ کیا قصہ ہے؟“

فیضان تو اٹھ کر رفو چکر ہو گیا اور عاقلہ نے لڑکھڑاتی زبان سے اٹک اٹک کر ساری روداد کو مختصراً یوں بیان کیا کہ فیضان کی کلاس فیلو ہے اور دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔

معراج الدین غصے میں انگارے چبا رہے تھے۔ ان کا غیظ و غضب دیکھنے کے قابل تھا۔ بات زیادہ دن تک پوشیدہ نہ رہی کیونکہ اس قسم کی باتیں جس تیز رفتاری سے سفر کرتی ہیں اس کا اندازہ آج تک کوئی نہیں کر سکا۔ ندرت اور ملاحت نے سب کچھ خاموشی اور صبر کے ساتھ سن تو لیا لیکن اس پر کوئی تبصرہ کیا اور نہ معراج الدین کے گھر جا کر ان سے کوئی باز پرس کی۔

بظاہر دونوں ماں بیٹی ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہتیں۔ روٹین کے مطابق تمام کام انجام دیتیں لیکن تنہائی میں آنکھیں یوں چھما چھم برستیں جیسے ساون کی برسات۔ اب دونوں ماں بیٹی بہت کم معراج الدین کے گھر کا رخ کرتیں۔ معراج الدین اور عاقلہ بخوبی سمجھ رہے تھے کہ یہ سکوت یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

ایک دن جب دونوں میاں بیوی ندرت اور ملاحت سے ملنے کے لیے ان کے گھر پہنچے تو دونوں ماں بیٹی نے نہایت خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔ پہلے تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں لیکن بہت جلد وہ موضوع آ گیا جس پر بات کرنے سے سب ابھی تک گریز کر رہے تھے۔ معراج الدین کا دل تو لہولہو ہو رہا تھا لیکن عاقلہ بیگم نے حواس اور ہمت کو مجتمع کر کے بات کا آغاز کیا اور سارے معاملے کو قسمت کا عمل دخل کہہ کر بات ختم کرنی چاہی لیکن آج ندرت کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ ملاحت تو اپنی نشست چھوڑ کر وہاں سے پہلے ہی فرار ہو چکی تھی جو آتش فشاں پچھلے کئی دنوں سے ندرت کے دل میں دہک رہا تھا آج وہ باہر ابل پڑا۔ اس نے اشتعال انگیز لہجے میں کہا۔ ”جس طرح کے کربناک اور اذیت ناک شب و روز میں اور میری بیٹی گزار رہے ہیں خدا کرے ایسے ہی شب و روز آپ کے بیٹے کا مقدر بنے۔“

معراج الدین اداس اور دکھی نگاہوں سے بہن کو دیکھتے رہے منہ سے ایک لفظ نہیں کہا لیکن عاقلہ بیگم نے

تڑپ کر زخم خوردہ لہجے میں کہا۔ "خدا کے لیے ندرت ایسی بددعا تو نہ دو۔"

ندرت نے تلخ اور تیز لہجے میں جواباً کہا۔ "میں بھی دیکھوں گی وہ کس طرح خوش رہتا ہے۔"

آج کے اس واقعے کے بعد خون اور محبت کے رشتے اس طرح ہوا میں تحلیل ہو گئے جیسے چلچلاتی دھوپ میں پانی کے قطرے...... سارے رشتے اور تعلقات پل ہی پل میں بھسم ہو گئے تھے۔ فیضان کو بھی چچی کے گھر ہونے والی مشاورت کی خبر مل چکی تھی۔ باپ اور چچی کا دل توڑ کر خوش وہ بھی نہیں تھا۔ اپنے چاہنے والوں کو دکھی کر کے وہ خود بھی دکھی تھا لیکن اپنے دل کو کیا کرتا اس میں تو شہابی کی تصویر سما گئی تھی۔

☆......☆

کچھ اسی طرح رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ اور تخریب کاری کا عمل ممتاز منزل میں بھی جاری تھا۔ سیٹھ ممتاز اپنی وفات سے پہلے اپنی ساری جائداد اپنی دونوں بیٹیوں ناصرہ اور رابعہ میں مساوی طور پر تقسیم کر چکے تھے۔ سیٹھ ممتاز کی جائے رہائش پر بھی دونوں بیٹیوں کا برابر کا حق تھا۔ اس لیے اس وسیع و عریض محل نما کوٹھی کو پارٹیشن کر کے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا اور دونوں بہنیں اپنی اپنی فیملی سمیت اپنے اپنے حصے میں رہائش پذیر ہو گئیں۔ بچپن سے ہی دونوں بہنوں میں ایسی محبت و الفت تھی کہ دونوں کو ایک پل کی جدائی بھی شاق گزرتی۔ شادیوں کے بعد بھی دونوں کا ملنا جلنا اور پیار و محبت اسی طرح برقرار رہا۔ البتہ دونوں کے شوہروں میں بس علیک سلیک تک ہی رشتے داری قائم تھی لیکن دونوں نے اپنی بیوی بچوں کو ملنے سے کبھی نہیں روکا۔ ناصرہ کے شوہر افضل چوہدری کچھ زیادہ پڑھے لکھے تو نہیں تھے لیکن صاحب جائداد اور زمانہ ساز انسان تھے۔ خود بھی اپنے والدین کے اکلوتے تھے اور خیر سے ان کے اور ناصرہ کے وہاں بھی اکلوتی اولاد اجمل چوہدری تھا۔ اکلوتا نازوں کا پلا شہزادہ جس چیز پر نظر ڈالتا ماں باپ فوراً حاضر کر دیتے۔ اسی طرح رابعہ اور وجاہت اللہ کے گلشن میں ایک ہی کلی مسکرائی جس کا نام انہوں نے شہاب النساء رکھا۔ شہاب النساء عرف شہابی کا رنگ سانولا سلونا تھا لیکن نین نقش ایسے دلکش تھے کہ دیکھتے رہنے کو دل چاہتا۔ اجمل اور شہابی کا بچپن لڑکپن سب ساتھ گزرا۔ دونوں بہنیں اب خیر سے پڑوسنیں بھی بن گئی تھیں اس لیے زیادہ وقت ایک دوسرے کی معیت میں گزرنے لگا۔ دونوں بچوں کے لیے بھی سارا گھر ایک سمان تھا۔ دونوں ساری کوٹھی میں کھیلتے کودتے پھرتے۔ جب عالم شباب میں داخل ہوئے تو خود بہ خود فاصلے بڑھ گئے۔ دونوں کے مزاجوں اور عادات و اطوار میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اجمل نے انٹر پاس کرتے ہی علی الاعلان کہہ دیا کہ زندہ رہنے کے لیے اتنا ہی پڑھنا کافی ہے۔ اب تعلیم کا مزید بوجھ وہ نہیں اٹھا سکتا۔ اماں ابا ویسے ہی بیٹے پر سو جان سے نثار تھے۔ انہوں نے فوراً گلے لگا کر ماتھا چوما اور اس کے کانوں میں شہد ٹپکایا۔ "اجمل بیٹا تو ہماری جان ہے۔ پڑھائی میں سر کھپائے تیرے دشمن۔ تجھے تو دادا اور نانا اتنا کچھ دے کر مرے ہیں کہ اگر ساری زندگی بھی بیٹھ کر کھائے تو کم ہے۔"

اجمل نہال ہو گیا۔ اب اجمل تھا اور اس کے لیل و نہار تھے۔ اس کے ہم مزاج دوست اسے ہیرو کہہ کر پکارتے اور اجمل کی چھاتی فخر سے چوڑی ہو جاتی۔ ویسے تو وہ نہایت چرب زبان اور لفظوں سے کھیلنے والا بندہ تھا لیکن شہابی کے سامنے آتے ہی وہ اپنے آپ کو ہونق تصور کرنے لگتا۔ بولنا کچھ چاہتا اور زبان سے نکلتا کچھ اور۔ اور شہابی اس کی باتوں پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی اور وہ اپنی خفت و شرمندگی مٹانے کے لیے باہر کی راہ لے لیتا۔

شہابی کو فقط اس کی ایک عادت بہت پسند تھی۔ وہ سحر خیزی کا عادی تھا اور مارننگ واک اور ورزش پر بہت زیادہ توجہ دیتا۔ قدرتاً خوش شکل بھی تھا۔ جم کلب کا باقاعدہ ممبر تھا۔ اس کی کڑیل اور بانکی سجیلی جوانی کو لڑکیاں پسندیدہ نظروں سے دیکھتیں لیکن وہ ہر گلی کی خاک چھاننے کی بجائے خالہ کے گھر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ شہابی اسے بچپن سے ہی پسند تھی لیکن اب تو وہ اسے گھاس بھی نہیں ڈالتی تھی۔ تعلیم یافتہ باپ کی اولاد تھی۔ وجاہت اللہ ایکسائز انسپکٹر تھے۔ ان کے والدین بیٹے کے لیے لاکھوں کروڑوں کی دولت چھوڑ کر تو نہیں مرے تھے لیکن بیٹے کو پڑھا لکھا کر اس قابل کر دیا تھا کہ وہ اپنے بل بوتے پر باعزت زندگی گزار سکے۔ انتہائی سوجھ بوجھ والا سمجھ دار انسان تھا۔ اس لیے بیٹی کی تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجہ دی۔ فطری طور پر شہابی بھی علم کی شیدائی اور پڑھنے لکھنے کی شوقین تھی۔ ذہانت بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

جب شہابی نے یونیورسٹی میں قدم رکھا تو خالو افضل چودھری اور خالہ زاد بھائی اجمل نے دبی دبی زبان سے مخالفت بھی کی لیکن رابعہ اور وجاہت اللہ نے تعلیم کی

افادیت پر ایک لیکچر دیا تو دونوں باپ بیٹے یوں دم دبا کر بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور اس طرح شہابی کی تعلیم جاری و ساری رہی۔ دورانِ تعلیم ہی اس کی ملاقات فیضان سے ہوئی۔ دونوں کے درمیان پیار بھری مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور یہی مسکراہٹیں ان کے درمیان محبت کی اساس بن گئی۔

شہابی نے اور فیضان نے ابھی تک حالِ دل کسی پر آشکار انہیں کیا تھا۔ فیضان چونکہ ماں سے زیادہ قریب تھا اس لیے صورتِ حال سے اس نے ماں کو باخبر کر دیا۔ شہابی ماں کی بہ نسبت باپ سے ہر بات شیئر کرتی تھی۔ وہ کھل کر ہر بات باپ کو بتانے ہی والی تھی کہ اسی اثناء میں وجاہت اللہ کو ایک دفتری کام کے سلسلے میں کراچی سے اسلام آباد جانا پڑا اور قضائے الٰہی سے یہ ہوائی سفر ان کی زندگانی کا آخری سفر ثابت ہوا۔ پلین ایک ہولناک حادثے کا شکار ہوا اور وہ رابعہ اور شہابی کو اکیلا چھوڑ گئے۔

دونوں ماں بیٹی پر ایک عرصے تک دیوانگی کی سی کیفیت طاری رہی۔ گزرتے ہوئے وقت نے جب زخموں کو مندمل کیا تب ہوش آیا۔ وجاہت اللہ کی موت نے دونوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ رفتہ رفتہ جب دونوں نارمل لائف گزارنے کے قابل ہوئیں تو ناصرہ نے مناسب موقع محل دیکھ کر اپنے لائق فائق بیٹے کے لیے بات چلائی تو رابعہ نے صاف انکار کر دیا۔ اس انکار سے ناصرہ کے گھر میں بھونچال آ گیا۔ افضل چودھری اور اجمل چودھری تو آج کل کی تعلیم اور لڑکیوں کی بے پردگی پر دھواں دھار تقاریر کر رہے تھے۔ دونوں باپ بیٹے رابعہ اور شہابی سے ڈرتے بھی تھے۔ اس لیے گھر میں بیٹھ کر غبار ہلکا کرتے رہے لیکن ناصرہ نے زمین آسمان ایک کر دیے۔ میاں اور بیٹے کو ساتھ لے کر وہ رابعہ کے گھر میں داخل ہوئی اور تیز و تند لہجے میں بولی۔ ”رابعہ کیا تم بالکل ہی بھول گئیں کہ شہابی اجمل کی منگ ہے۔“

رابعہ نے تمام ادب و احترام بالائے طاق رکھا اور دبنگ آواز میں بولی۔ ”آپ ہوش و حواس میں رہ کر بھی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہیں۔“

ناصرہ سینہ کوبی کرتے ہوئے بولی۔ ”اے بی تمہارے مرحوم شوہر نے ایک بار نہیں بلکہ سیکڑوں بار خود کہا کہ میں اجمل کو اپنا داماد بناؤں گا۔“

پھر وہ خونخوار نظروں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم بھی تو کچھ کہو۔ کب تک گونگے کا گڑ کھائے بیٹھے رہو گے۔ کچھ تو بولو کیا یادداشت پر بالکل ہی پتھر پڑ گئے۔“

افضل چودھری تھوڑے سے جز بز ہوئے اور پھر تھوڑا سا کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا اور بولے۔ ”ارے بھئی! اب آپ دونوں بہنوں کے معاملے میں ہم کیا ٹانگ اڑائیں ہم اس لیے خاموش ہیں کہ دونوں بہنیں خود ہی سارا معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹا لیں گی۔“

پھر ایک سرد آہ بھر کر بات آگے بڑھائی۔ ”بہشت نصیب وجاہت اللہ کی آخری خواہش یہی تھی کہ شہابی ہمارے گھر کی عزت بنے۔ مرنے سے چند لمحے پہلے انہوں نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ بھائی افضل میری بیٹی تمہاری امانت ہے۔ اگر اجمل اور شہابی کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس کی بے چین روح کو قرار آ جائے گا۔“

رابعہ نے ایک استہزائیہ ہنسی ہنستے ہوئے ترش لہجے میں کہا۔ ”آخری لمحات میں میرا شوہر آپ کو کہاں مل گیا تھا۔ ان کی موت تو ہوائی حادثے میں ہوئی۔ آپا سچ کہہ رہی ہیں افضل بھائی آپ کی یادداشت منوں پتھروں دب کر دم توڑ گئی ہے۔“

افضل چودھری بری طرح بھنا گئے۔ ناصرہ کی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان کو بھی بریک لگ گیا۔ وہ بھی بری طرح گڑبڑا گئی۔ شوہر کی حماقت آمیز باتوں پر انہیں گھور کر دیکھا اور بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اسی اثناء میں شہابی گھر میں داخل ہوئی۔ خالہ خالو اور خالہ زاد کو دیکھ کر اس نے چہکتے ہوئے کہا۔ ”ارے واہ! آج تو خالہ بی کا سارا گھرانا ہمارے گھر میں موجود ہے۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟“

شہابی کو دیکھ کر سب نے چپ سادھ لی۔ شہابی نے فوراً تاڑ لیا کہ اس کی آمد سے پہلے کسی خاص ایجنڈے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اسے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تو وہ کرسی کھینچ کر اجمل کے قریب بیٹھ گئی اور نہایت دوستانہ انداز میں اجمل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اجمل بھائی! یہ سارے بزرگ ہیں ناں گھر کے ہر معاملے کو پوشیدہ رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ نئی جنریشن کو کسی بات کی ہوا نہیں لگنے دیتے لیکن آپ تو میرے بہت اچھے بھائی بھی ہیں دوست بھی ہیں، بچپن کے ساتھی ہیں۔ آپ مجھے بتایئے کہ یہ ساری میٹنگ کس سلسلے میں ہے۔“

شہابی کی باتوں پر اجمل بری طرح سٹپٹا گیا۔ ویسے

بھی شہابی کے سامنے اس کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔ گھبرا کر ماں باپ کی طرف دیکھا۔ ماں نے اسے چلنے کا اشارہ کیا اور وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

شہابی حیران کن نظروں سے ناصرہ کے خاندان کو جاتا دیکھتی رہی۔ ان کے جاتے ہی وہ ماں کی طرف پلٹی اور پُرتجس نگاہوں سے ماں کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "امی کیا بات ہے یہ لوگ مجھے دیکھتے ہی کیوں اٹھ کھڑے ہوئے؟"

رابعہ نے آج بیٹی سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ ساری گفت وشنید جو بیٹی کے آنے سے پہلے ہو رہی تھی بیٹی کے گوش گزار کردیا۔ شہابی نے ماں کی تمام باتیں بغور سنیں اور پھر ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "امی آپ نے بہت اچھا کیا جو ٹکا سا جواب دے دیا۔ آپ اگر مجھ سے بھی مشورہ کرتیں تو میرا جواب بھی انکار میں ہوتا اور...... اور مجھے آپ سے ایک خاص بات کہنی ہے۔"

اس کے بتانے پر رابعہ کے کان کھڑے ہوئے۔ ایک جوان بیٹی کی ماں تھی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ماں کے کریدنے پر بیٹی نے من وعن اپنے اور فیضان کے بارے میں مکمل کر سب کچھ بتا دیا۔ سب کچھ سننے کے بعد رابعہ نے ایک دبی ہوئی سانس خارج کی اور تفکر آمیز لہجے میں بولی۔ "شہابی میری بچی آج مجھے تیرے ابو کی کمی بہت محسوس ہو رہی ہے۔ کون لوگ ہیں کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں، بہرحال تم فیضان سے کہنا کہ اس کے والدین مجھ سے آکر ملیں۔ اسی طرح بات آگے بڑھے گی لیکن بس میری تم سے ایک درخواست ہے کہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا کہ ہماری جگ ہنسائی ہو۔" یہ کہتے ہوئے رابعہ کی آواز بھرا گئی۔ شہابی کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اس نے فوراً ماں کی گود میں منہ چھپا لیا۔ رابعہ محبت سے اس کا سر سہلاتی رہی اور شہابی مستقبل کے خواب بنتی رہی۔

☆......☆

عاقلہ بیگم شوہر کی منت سماجت کرتی رہیں کہ بحیثیت باپ ان کا جانا بے حد ضروری ہے۔ ورنہ لڑکی والے کیا کہیں گے لیکن معراج الدین نے معذرت کرکے فوراً اپنے کمرے کی راہ لی اور ایک دھماکے دار آواز کے ساتھ کمرے کا دروازہ بند ہوگیا۔ عاقلہ بیگم اداس نظروں سے بند دروازے کو گھورتی رہیں۔ چاروناچار دونوں ماں بیٹا تیار ہو کر شہابی کے گھر پہنچے۔

بہادر شاہ ظفر

آخری مغل فرماں روا بہادر شاہ ظفر بنیادی طور پر شاعرانہ مزاج کے آدمی تھے۔ مغلیہ سلطنت سکڑتے سکڑتے صرف لال قلعہ دہلی تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ جس کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر تھے۔ گلشن بابری کا یہ نرگسی پھول جاتی بہار کی علامت کے طور پر رہ گیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر گو نام کا ہی سہی مگر بادشاہ ضرور تھا۔ اس کی شب بسری کے لیے کنیز دل آرام اور روئے دل آرام ایک دو نہیں بے شمار تھیں۔ یہ منتخب اور چنیدہ چہرے ہوتے تھے جو بادشاہ کے وقار اور شان کا سبب ہوتا تھا۔ اردو ادب میں بہادر شاہ ظفر مستند اور معروف شاعر ہیں۔ جو پہلے شیخ ابراہم ذوق اور پھر غالب سے اصلاح لیتے رہے۔ بہادر شاہ ظفر اردو کے غالباً واحد شاعر ہیں جنہوں نے صنف عکس میں بھی شعر کہے۔ یہ صنف قدیم فارسی شعراء کے ہاں البتہ ملتی ہے۔ پہلے مصرعے کے لفظوں کو الٹ پلٹ کر دوسرا مصرع بنایا جاتا ہے۔ بدائع کی اصطلاح میں اسے عکس کہتے ہیں جیسے۔

بادہ چہ کنی پنہاں
پنہاں چہ کنی بادہ

اقتباس: "یادوں کی بستی" از محمد ایاز راہی
مرسلہ: نوشین گل۔ پشاور

❖❖❖

عاقلہ بیگم کو بیٹے کی پسند، پسند تو آئی لیکن دل میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکیں کہ ملاحت کے ملکوتی حسن کے سامنے تو یہ کچھ بھی نہیں ہے لیکن بیٹے کی ہٹ دھرمی اور ضد دیکھ کر انہوں نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ شہابی کو دیکھنے کے بعد انہوں نے آناً فاناً انگوٹھی پہنانے کی رسم بھی کرلی تھی۔

گھر آنے کے بعد بس انہیں یہ دکھ کھائے جارہا تھا کہ شوہر اور نند کو کس طرح راضی کرے۔ اسی کشمکش و پیچ میں جلا تھیں کہ اچانک ملاحت گھر میں داخل ہوئیں۔ اس کی آمد پر وہ پھول کی طرح کھل اٹھیں۔ آگے بڑھ کر ملاحت کو گلے لگایا۔ اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولیں۔ ''آج اتنے عرصے بعد تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر مجھے جو خوشی ہوئی ہے اسے میں بیان نہیں کرسکتی۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

ملاحت نے اپنی ہتھیلی سے ان کے آنسوؤں کو صاف کیا اور کہا۔ ''شادی کے سارے کام آپ تن تنہا انجام دے رہی ہیں۔ کوئی ہاتھ بٹانے والا بھی نہیں ہے۔ اسی لیے امی سے اجازت لے کر آئی ہوں۔ اب میں شادی تک آپ کے پاس ہی قیام کروں گی۔''

اس کی بات سن کر عاقلہ بیگم نے تڑپ کر دوبارہ اسے گلے سے لگایا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میری بچی۔'' اسی دوران فیضان بھی آگیا۔ ملاحت کو دیکھ کر اسے تقویت ہوئی کہ وہ ضرور روٹھے ہوؤں کو منالے گی۔ اسے یہ سمجھنے میں بھی دیر نہیں لگی کہ ملاحت کو ندرت نے یہاں آنے کے لیے خوشی سے اجازت نہیں دی۔ بلکہ اسے یہاں آنے کے لیے ایک پل صراط سے گزرنا پڑا ہوگا۔ عاقلہ بیگم کے وہاں سے ہٹتے ہی اس نے ملاحت سے سب کچھ اگلوالیا اور اس نے بہت آسانی سے بتادیا کہ وہ ماں کے ساتھ ایک جنگ لڑ کر آرہی ہے۔ ویسے دونوں ماں بیٹا اس کے بہت مشکور تھے۔ اس نے کئی کاموں کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھالیا تھا۔ شادی میں شمولیت کے لیے بھی اس نے ماں اور ماموں کے سامنے بھوک ہڑتال کی دھمکی دی تو معراج الدین اور ندرت کے چھکے چھوٹ گئے۔ کیونکہ وہ ویسے ہی دھان پان اور نازک اندام تھی اور دونوں کی لاڈلی بھی تھی۔ اس لیے دونوں نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ حالانکہ ندرت اب اس گھر میں قدم بھی نہیں رکھنا چاہتی تھی لیکن بیٹی کی ضدی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ معراج الدین کو بھی اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ وہ جو کہتی ہے کرتی ضرور

ہے۔ اس لیے انہوں نے بھی بھانجی کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا۔ عاقلہ بیگم اور فیضان نے سکون کا سانس لیا۔ دونوں ملاحت کے احسان مند تھے۔

☆......☆

دوسری جانب ممتاز منزل میں بھی یہ صورتِ حال تھی۔ ناصرہ اور افضل چودھری نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ نہ تو شہابی کی شادی میں شرکت کریں گے اور نہ ہی رابعہ سے کسی قسم کا کوئی تعلق یا رابطہ رکھیں گے لیکن اجمل نے ماں باپ کو یہ کہہ کر منالیا کہ شہابی کے علاوہ بھی دنیا میں بہت سی لڑکیاں ہیں۔ میں کسی اور لڑکی سے شادی کرلوں گا لیکن بیوہ خالہ اور ان کی بن باپ کی بیٹی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ شادی کا موقع ہے اور اس وقت ان کی مدد کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔

افضل چودھری نے بیٹے کی بات پر فوراً لبیک کہا لیکن ناصرہ اپنی ضد پر اڑی رہیں۔ اس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر اجمل نے بھی فوراً منہ پھلا لیا اور ماں سے بول چال بند کردی۔ اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ ناصرہ بیٹے کی خفگی برداشت نہیں کرسکیں اور جلد ہی مان گئیں۔ اجمل نے شادی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ناصرہ اور افضل چودھری بھی اپنے دل کا درد چھپا کر ہنستے مسکراتے رہے اور خوشی خوشی دعاؤں کے سائے میں شہابی کو رخصت کیا۔ سسرال میں بھی شہابی کا استقبال پورے جوش و خروش سے کیا گیا۔ ندرت اور ملاحت نے اپنے دل کا درد اس خوب صورتی سے چھپایا تھا کہ کسی کو گمان بھی نہیں گزرا کہ ان پر کیا بیت رہی ہے۔ البتہ معراج الدین کا موڈ ان دنوں ہمہ وقت خفا خفا سا رہا۔ کسی نہ کسی بہانے عاقلہ بیگم ان کے عتاب کا شکار بنتی رہیں۔

جب شادی کی تمام تقریبات اختتام پذیر ہوئیں تو موقع محل دیکھ کر ندرت نے نہایت پیار محبت کے ساتھ بیٹی کو سمجھایا کہ اب وہ ماموں کے گھر اپنی آمد و رفت کم کریں۔ کیونکہ حالات اب دوسرا رخ اختیار کرچکے ہیں اگر اللہ نہ کرے کل کلاں کو کچھ ہوتا ہے تو گرفت میں تم بھی آؤ گی۔

ملاحت نے تعجب انگیز نگاہوں سے ماں کی جانب دیکھا اور متفکر ہوئی۔ ''میں سمجھی نہیں مما کل کلاں کو کیا ہوگا۔''

ندرت نے اپنے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ''تمہاری تو مت ماری گئی ہے۔ پتا نہیں کب تک تم ننھی نادان بنی رہوگی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ساس بہو والا گھر ہے اور دنیا میں آج تک کسی ساس کی بہو سے بنی نہیں ہے۔ یہاں بھی اگر گھر میں کسی بات پر تلخ کلامی

یا تو تم میں ہوتی ہے تو جھگڑے میں تم بھی ملوث ہو سکتی ہو۔ اس لیے چند قدم کا فاصلہ رہے تو بہتر ہے۔"

ملاحت نے سب کچھ سننے کے بعد برا سا منہ بنایا اور روہانسی آواز میں بولی۔ "مما ایک ہی تو ماموں ہیں میرے آپ ان کے گھر جانے پر بھی پابندی لگا رہی ہیں۔"

ندرت اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ چپ چاپ غصے میں ہونٹ چباتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ملاحت نے ملاحت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھانے کی کوشش کی تو ندرت نے اپنے ہاتھ کھینچتے ہوئے ترش لہجے میں کہا۔ "ہر وقت اپنی من مانی کرتی ہو۔ دیکھنا ایک دن نقصان اٹھاؤ گی۔"

ملاحت نے فوراً اٹھ کر ماں کے گلے میں اپنی بانہوں کا ہار ڈال دیا۔ شدید غصے کے باوجود ندرت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

☆......☆

ندرت کے پند و نصائح پر عمل کرتے ہوئے ملاحت نے اپنے پیر ضرور روک لیے لیکن وقتاً فوقتاً وہ معراج الدین اور عاقلہ بیگم کی خیریت دریافت کرنے ضرور جا دھمکتی۔ شہابی کو بھی اِدھر اُدھر سے ساری سن گن مل چکی تھی۔ سب کچھ سننے کے بعد وہ اپنے آپ کو ملاحت کا مجرم تصور کرنے لگی تھی کیونکہ محض اس کی وجہ سے ملاحت کے ساتھ یہ ٹریجڈی ہوئی تھی۔ ایک دن ملاحت کے سامنے اس نے اس بات کا اعتراف بھی کر لیا لیکن ملاحت نے نہایت خوب صورتی سے اس کی غلط فہمی یہ کہہ کر دور کر دی کہ "خدائے ذوالجلال کی تقسیم میں ہمیشہ حکمت اور مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے جو ہمیں فی الوقت سمجھ میں نہیں آتی لیکن گزرتا ہوا وقت جب سارے پردے آنکھوں کے سامنے سے ہٹاتا ہے تو بے اختیار زبان سے نکلتا ہے۔ "اے رب تو نے جو کیا بہتر کیا۔"

اس کی خیال آرائی پر شہابی نے ایک تسکین بھری سانس لی۔ معاً اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اس دن کے بعد سے دونوں میں گاڑھی چھننے لگی تھی۔ کبھی شہابی اس سے ملنے چلی جاتی اور کبھی وہ آجاتی۔ ندرت نے بھی اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔ معراج الدین نے بھی وقت کے ساتھ ساتھ خود کو کافی تبدیل کر لیا تھا لیکن ابھی بھی شہابی کو وہ بہو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ شہابی کے سلام کا جواب تو دے دیتے لیکن کلام کی ابھی تک نوبت نہیں آئی تھی۔ بیوی اور بیٹے کے ساتھ بھی درشت رویہ تھا۔

فیضان اب ملک سے باہر جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اس کی تمام تیاریاں مکمل تھیں لیکن ان ہی دنوں شہابی کا پیر بھاری ہوا اور طبیعت اَن منی سی رہنے لگی۔ فیضان نے فی الفور اپنا سفر مؤخر کر دیا۔ خیر سے شہابی نے جب ایک گول مٹول تندرست بچے کو جنم دیا تو سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد فیضان نے اپنا رختِ سفر باندھا اور عازمِ سفر ہوا۔

شہابی اپنے بیٹے فواد کے ساتھ ساس سسر کے ساتھ ہی رہ رہی تھی۔ مواصلاتی ذرائع کی وجہ سے یہ سہولت تھی کہ دونوں میاں بیوی روزانہ ہی ایک دوسرے سے بات چیت کر لیتے تھے۔ فیضان کی دفتری تعطیل سال میں ایک بار ہوتی اور وہ اس موقع پر پاکستان آکر ماں باپ بیوی اور بچے کے ساتھ یہ چھٹیاں گزارتا۔ دوستوں اور عزیز و اقارب سے بھی مل ملا کر رخصت ہوتا۔ پاکستان میں گزارے ہوئے ایک ایک لمحے کو کیمرے میں قید کرتا تاکہ پردیس میں انہیں دیکھ کر تنہائی کا احساس کم کر سکے۔

شہابی کو کبھی کبھی ماں کی بہت یاد ستاتی تو بیٹے کو لے کر رابعہ سے ملنے چلی جاتی۔ ناصرہ، افضل چودھری اور اجمل بھی اس کی آمد پر بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے۔ ناصرہ کا سارا گھرانا اس سے اس قدر پیار و محبت سے ملتا کہ اسے اپنے پہلے والے رویے پر شرمندگی محسوس ہوتی۔ اب وہ اجمل کو کھامڑ سمجھ کر اسے چٹکیوں میں نہیں اڑاتی۔ بلکہ اس کے ساتھ اس کا رویہ مؤدبانہ ہو گیا تھا۔ اس کی ملاقات جب بھی ناصرہ سے ہوتی وہ اسے اجمل کی شادی کا مشورہ ضرور دیتی۔ اب وہ دل سے رشتوں کی قدر کرنے لگی تھی۔ اس کے بیٹے کو بھی سب ہاتھوں ہاتھ رکھتے۔ وہ تھا بھی بہت پیارا بالکل چینی کا گڈا اور یہ چینی کا گڈا ملاحت کو بھی بہت پیارا تھا۔ اسے اس نے اپنی آنکھوں کا تارا بنا رکھا تھا۔ فواد بھی اس سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ ملاحت کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی اور اپنی بانہیں پسارے وہ ہمکنے لگتا۔

فواد کی وجہ سے ملاحت کا آنا جانا زیادہ بڑھ گیا تھا۔ جب کہ ندرت اس کی اس حرکت پر متعدد بار سرزنش کر چکی تھی لیکن ملاحت کو فواد کے بغیر قرار نہیں تھا۔ ندرت کی روک ٹوک پر وہ چند دن تو رک جاتی پھر اس کے بعد وہی رفتار بے ڈھنگی۔ اسی اثناء میں ملاحت کے لیے کئی رشتے آئے۔ ندرت کو ان میں سے دو ایک رشتے ایسے دل کو بھائے کہ وہ فوراً بیٹی کے سر ہو گئی کہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے

فوراً ہامی بھر لے لیکن ہمیشہ کی طرح اس کا ایک ہی جواب تھا۔ "میں تو ابھی پڑھ رہی ہوں۔" ندرت اس کا جواب سن کر آگ بگولہ ہو جاتی لیکن ملاحت فوراً اسے منا بھی لیتی۔ اس طرح شادی کا موضوع پس پشت چلا جاتا اور اناپ شناپ باتیں کر کے وہ ندرت کو دوسری باتوں میں الجھا لیتی۔ ندرت اس کی رگ رگ سے واقف تھی لیکن کرتی بھی کیا ملاحت اسے اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری تھی۔

☆......☆

فواد مکمل پانچ سال کا ہو چکا تھا۔ شہابی اور ملاحت پچھلے کئی دنوں سے اس کی سالگرہ کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ آج بھی دونوں صبح سے مصروف تھیں۔ کیونکہ اب صرف ایک دن بچا تھا اور سارے کام آج ہی نمٹانے تھے۔ ملاحت کے ذمے ساری شاپنگ تھی اور شہابی بذاتِ خود ملازمین کے ساتھ مل کر گھر کی صفائی ستھرائی اور سجاوٹ میں مشغول تھی۔ تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایکبار پھر ملازمین کو یاد دہانی کروائی کہ "کل سب کو جلدی آنا ہے۔ میں کسی قسم کا کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔" سبھوں نے اقرار میں سر ہلایا اور اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔

شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا لیکن ملاحت ابھی تک نہیں آئی تھی۔ شہابی نے وال کلاک پر نظر ڈالی اور خود کلامی کے انداز میں بولی۔ "ملاحت نے تو پورا دن ہی لگا دیا۔ ابھی تک نہیں آئی۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ وہاں فواد بیٹھا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ ماں کو دیکھتے ہی وہ سارے کھلونے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور شوخ لہجے میں بولا۔ "مما آپ اور میں آنکھ مچولی کھیلیں گے۔"

تھکان کے مارے شہابی کا سارا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اس لیے اس نے بیٹے کو ٹالنے کے لیے نیم دلی سے کہا۔ "اچھا تم جا کر چھپ جاؤ میں تمہیں ڈھونڈتی ہوں۔"

فواد کی آنکھیں خوشی سے جگمگانے لگیں۔ وہ چھلانگیں مارتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی شہابی صوفے پر نیم دراز ہو گئی اور آنکھیں موند لیں۔ فواد نے دادی کے بیڈ کے نیچے اپنے چھپنے کی جگہ تلاش کر لی۔ کیونکہ اس کے علم میں یہ بات تھی کہ دادا دادی اس کا گفٹ خریدنے بازار گئے ہوئے ہیں۔ اپنی جگہ بنا کر وہ چھپ گیا اور شرارتی آنکھوں کو دروازے پر مرکوز کر دیا۔ وہ بے چینی سے ماں کا منتظر تھا۔

تھکان کی وجہ سے شہابی پر غنودگی سی چھانے لگی۔

اچانک اپنے سرہانے اسے آہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے آنے والے پر ایک نظر ڈالی۔ ہونٹ کچھ کہنے کے لیے پھڑپھڑائے لیکن اس سے پہلے کہ الفاظ اس کی زبان سے پھسلتے آنے والے نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کر دیا اور دوسرے ہاتھ میں تھما ہوا سائیلنسر لگا پستول اس کی کنپٹی پر لگایا اور اپنا کام دکھا دیا۔ ہلکی سی کلک کی آواز آئی اور شہابی ایک کراہ کے ساتھ صوفے پر ہی لڑھک گئی۔ شہابی کا تڑپتا ہوا جسم اب ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ گھر میں ابھی بھی مکمل خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔

☆......☆

فواد جب ماں کا انتظار کرتے کرتے اکتا گیا تو آہستگی سے بیڈ کے نیچے سے نکل آیا۔ معاً اسے ایک دلخراش چیخ کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اس نے آہستہ سے اپنے آپ سے کہا۔ "ملاحت آنٹی کیوں چیخ رہی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ماں کے بیڈروم کی طرف دوڑ لگا دی۔

ملاحت کا چہرہ خوف اور دہشت سے زرد ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل چلا رہی تھی۔ فواد حیران کن نظروں سے کبھی ملاحت کو دیکھتا اور کبھی اپنی ماں کو اس کا معصوم ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اتنی چیخ پکار کے باوجود اس کی ماں کیوں نہیں اٹھ رہی ہے۔ مما مما کہتا ہوا وہ ماں پر جھک گیا لیکن پھر اس کی ساکت اور بے نور آنکھیں دیکھ کر فوراً خوفزدہ ہو کر ملاحت سے لپٹ کر رونے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں گھر میں افراتفری مچ گئی۔ گھر کے تمام افراد کی آنکھوں میں خوف اور دہشت کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ شہابی کے میکے والے بھی سب آ چکے تھے۔ گھر آہ و بکا سے گونج رہا تھا۔ پولیس نے اپنی تفتیش کا آغاز کر دیا تھا۔ کرائم برانچ انسپکٹر سعدی اپنے عملے کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ پولیس والے قیاس کے گھوڑے دوڑا رہے تھے لیکن ایسا لگتا تھا جیسے قاتل کوئی چھلاوہ تھا جو آیا شہابی کی جان لی اور غائب ہو گیا۔ دور دور تک کوئی کلیو نہیں تھا۔ انسپکٹر سعدی جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھ رہا تھا۔ کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ حالانکہ جائے واردات کا وہ نہایت باریک بینی سے معائنہ کر چکا تھا۔ معائنے کے بعد لاش کو سیل مہر کر کے پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا۔

یہ اندوہناک خبر ملتے ہی فیضان نے نہایت عجلت میں پاکستان کی راہ لی۔ اس کی آمد پر پھر کہرام مچا۔ حالات نے

اتنی تیزی سے کروٹ بدلی تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اچانک یہ سب کیا ہوگیا۔ انسپکٹر سعدی نے اپنی تفتیشی کارروائی شروع کی تو پوچھ گچھ کے دوران یہ بات بھی منظر عام پر آئی کہ فیضان کے علاوہ اس شادی کے سب ہی مخالف تھے۔ مزید چھان بین کی تو پتا چلا کہ معراج الدین نے تو بھی بحیثیت بہو شہابی کو قبول ہی نہیں کیا۔ پولیس کے لیے یہ گرین سگنل تھا۔ اسی نکتۂ نظر کو سامنے رکھ کر انہوں نے اپنا کام شروع کیا۔ معراج الدین نے بھانپ لیا کہ پولیس نہ صرف ان پر بلکہ ان کی بہن اور بھانجی پر بھی شک کررہی ہے۔

شہابی کی تدفین کے بعد بھی پولیس روزانہ تحقیقات کے لیے آدھمکتی اور معراج الدین ان لوگوں کو دیکھ کر سیخ پا ہو جاتے۔ ایک دن شدید اشتعال میں وہ انسپکٹر سعدی سے الجھ پڑے۔ تلخ لہجے میں کہا۔ ''کیا مشکوک لوگوں میں صرف ہمارا خاندان ہی نظر آرہا ہے آپ کو۔ آپ کا دائرۂ تفتیش ہمارے گرد ہی گھوم رہا ہے۔''

انسپکٹر نے ایک تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''مشکوک و شبہات کی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ہی ہم لوگ مجرم تک پہنچتے ہیں اور میں آپ کو ایک پتے کی بات بتاؤں، مشکوک لوگوں میں سرفہرست آپ ہی ہیں۔''

معراج الدین اضطراری انداز میں ہاتھ مسل رہے تھے۔ انسپکٹر کی بات سن کر وہ آپے سے باہر ہوگئے اور چلا کر کہا۔ ''واٹ نان سینس۔''

انسپکٹر نے ان کے چیخنے چلانے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ معراج الدین دانت کچکچا کر رہ گئے۔ اس کے بعد انسپکٹر دو پولیس اہلکاروں کے ساتھ ندرت کے گھر میں داخل ہوا۔ انسپکٹر ٹٹولنے والی نگاہوں سے گھر کا جائزہ لے رہا تھا۔ ندرت نے بڑھ کر پولیس والوں کا استقبال کیا اور انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ دل ہی دل میں وہ بھی پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب پھر سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوجائے گا اور انسپکٹر سعدی ملاحت کو ضرور لپیٹ میں لے گا۔ اس لیے اس نے انسپکٹر کے بیٹھتے ہی معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! ملاحت ذہنی طور پر بری طرح منتشر ہے۔ وہ شاید آپ سے بات نہ کرسکے اس لیے اگر آپ بعد میں تشریف لے آئیں تو مہربانی ہوگی۔ ہاں اگر مجھ سے کچھ پوچھنا ہے تو بندی......'' ابھی ندرت کا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ ملاحت کمرے میں داخل ہوگئی۔ اس کے یوں اچانک آنے پر سناٹے کی سی کیفیت ندرت پر طاری ہو گئی۔ ملاحت کے چہرے پر زردی اور نقاہت ضرور تھی لیکن وہ پوری طرح ہوش و حواس میں تھی۔ کچھ دیر قبل ہی نہا کر نکلی تھی اس لیے فریش اور کھلی کھلی سی لگ رہی تھی۔

انسپکٹر نے ایک طنزیہ تبسم کے ساتھ ندرت کو دیکھا تاہم بولا کچھ نہیں۔ پہل ملاحت نے ہی کی اس نے انتہائی ملائمت کے ساتھ کہا۔ ''انسپکٹر صاحب آپ لوگ قانون کے محافظ ہیں۔ ہم لوگوں کو آپ کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنا چاہیے۔ ہزاروں مسائل اور ہزاروں کام یقیناً آپ کے منتظر ہوں گے۔ مجھے علم ہے آپ لوگوں کا وقت کتنا قیمتی ہوتا ہے۔ مجرم کا سراغ لگا کر اسے کیفر کردار تک پہنچانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آپ مما کی باتوں کا اثر نہ لیں۔ آپ کو مجھ سے جو پوچھنا ہے پوچھیے میں برضا و رغبت آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گی اور میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ میری ہر بات سچ اور حقیقت پر مبنی ہوگی۔ اب آگے آپ کی مرضی آپ اسے جو بھی رنگ دینا چاہیں۔''

انسپکٹر سعدی اور دونوں اہلکار ملاحت سے کافی متاثر نظر آرہے تھے۔ ورنہ عموماً ایسے موقعوں پر لوگ تعاون دینا تو درکنار پولیس والوں کے سائے سے بھی ڈرتے ہیں۔ انسپکٹر نے نہایت مستعدی کے ساتھ اس سے سوال کرنا شروع کیے اور ملاحت نہایت تیے تلے انداز میں سوچ سمجھ کر ہر سوال کا جواب دیتی رہی۔ موقع واردات پر پہنچ کر اس نے کیا دیکھا۔ کس طرح تمام شاپنگ بیگز میز پر رکھے اور پھر بے اختیار شہابی کی لاش سے لپٹ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے تازہ گرم گرم خون میں تر کربیٹھی۔ ایک جھرجھری لے کر اس نے مزید کہا میرا دل و دماغ اس بری طرح ماؤف ہوئے کہ میرے منہ سے بے اختیار چیخیں نکلنے لگیں۔ گھر سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میری چیخیں سننے والا گھر میں صرف ایک بچہ تھا فواد۔ باقی تمام افراد گھر سے باہر تھے۔ ملازمین بھی کوئی نظر نہیں آئے۔ جہاں تک میرا اپنا خیال ہے شہابی ان کی چھٹی کرچکی تھی۔ بہتر ہوگا آپ ان لوگوں کا بھی بیان لیں کیونکہ میں گھر سے ساڑھے بارہ بجے نکل چکی تھی۔

انسپکٹر نے سر ہلاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''معراج الدین اور آپ کے یہاں کے تمام ملازمین کے بیانات میرا اسسٹنٹ لے چکا ہے۔ اب میں محترمہ سے بات کرنا چاہوں گا۔'' اس نے ندرت کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

ندرت نے بدحواسی کے عالم میں سانس لی اور

گڑبڑائے ہوئے بولی۔ ''مجھ سے...... مجھ سے آپ کو کون سی معلومات درکار ہیں......'' ایک لمحہ توقف کیا پھر بولی۔ ''جو کچھ ملاحت نے بتایا ہے کیا وہ آپ کی جانکاری کے لیے کافی نہیں۔''

صاف لگ رہا تھا کہ ندرت اس صورتِ حال پر بری طرح نروس ہو گئی ہے۔ انسپکٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ سے ذرا ذاتی اور مختلف نوعیت کے سوالات کروں گا اور یہ سب ہماری ڈیوٹی کا تقاضا ہے اور آپ کو ہر حال میں ہمیں تعاون دینا ہوگا۔ یہی ہم سب کے لیے بہتر ہے۔''

ملاحت نے تسلی آمیز انداز میں ماں کو تھپکی دی اور پُرسکون انداز میں بولی۔ ''امی ڈریے نہیں۔ جب ہم لوگوں نے کوئی غلط کام کیا ہی نہیں ہے تو آپ کیوں گھبرا رہی ہیں۔'' بیٹی نے حوصلہ دیا تو ندرت کی ہمت بندھی اور اس نے نحیف آواز میں کہا۔ ''انسپکٹر صاحب آپ اپنا کام کریں۔ میں تیار ہوں۔''

انسپکٹر نے پہلا ہی سوال ایسا داغا کہ ندرت کچھ لمحوں کے لیے سن ہو گئی۔ اس نے خود پر قابو پایا اور بولنا شروع کیا۔ ''آفیسر آپ نے جو کچھ سنا بالکل ٹھیک سنا۔ ملاحت، فیضان کی منگیتر تھی لیکن فیضان نے شہابی سے شادی کر لی۔ ہم لوگوں نے اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر درگزر کیا۔ بلکہ میری بیٹی نے دونوں خاندانوں کے درمیان پیدا ہونے والی رنجشوں اور بدگمانیوں کو ختم کروانے میں پیش قدمی کی۔ شہابی کو بھی ہم نے اپنا ہی سمجھا۔''

انسپکٹر نے گہری سانس لی اور کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن محترمہ مجھے تو یہ بھی رپورٹ ملی ہے کہ آپ نے اپنے بھائی اور بھابی کو چیلنج کیا تھا کہ میں بھی دیکھوں گی فیضان کیسے خوش رہتا ہے۔ اس کا مقدر تیرگی اور یاسیت میں ڈوب جائے یہ دعا بھی آپ نے مانگی تھی۔ ان حالات کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے آپ کچھ بھی کر سکتی ہیں۔''

''انسپکٹر منہ سنبھال کر بات کرو۔'' ندرت نے ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کہا۔

وہاں لڑنا اس کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔ ملاحت نے بھی اٹھنا چاہا لیکن انسپکٹر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا۔ ملاحت ٹھہر گئی لیکن خون اس کا بھی کھول رہا تھا۔ انسپکٹر سعدی نے اس کی ماں کے ساتھ جو ہتک آمیز رویہ اختیار کیا تھا وہ اسے ایک آنکھ نہیں بھایا۔ انتہائی تلخ لہجے میں اس نے استفسار کیا۔ ''اب کیا ہے۔ میرے خیال میں تو پوچھ گچھ کی انتہا ہو چکی ہے۔ اب ہمارے پاس بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔''

انسپکٹر معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''محترمہ سچ اگلوانے کے لیے میں نے ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا۔ میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ بہرحال ایک بات تو طے ہے کہ آپ اور آپ کی والدہ اس قتل میں ملوث نہیں ہیں لیکن اب آپ سے ایک استدعا ہے کہ آپ کو ہماری مدد کرنی ہوگی۔''

ملاحت نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''کیسی مدد، میں سمجھی نہیں۔''

انسپکٹر نے لمحاتی توقف کے بعد آہستگی سے کہا۔ ''دراصل میں نے ایک لائحۂ عمل مرتب کیا ہے اس کی ساری تفصیل میں آپ کو بعد میں سمجھا دوں گا۔ بس آپ کو ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔''

ملاحت حیران کن نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ جواباً اس نے کچھ نہیں کہا۔ انسپکٹر اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں اہلکار بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کے جانے کے بعد بھی ملاحت اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ وہ گہری سوچوں میں مستغرق تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر رقصاں تھا جب معراج الدین اور عاقلہ بیگم اس کی ماں سے محوِ گفتگو تھے اور فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر انتہائی طیش میں ندرت اپنی زبان سے یہ سخت الفاظ نکال بیٹھی تھی۔ حالانکہ تھوڑی ہی دیر بعد اس کا غصہ دودھ کے ابال کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ ملاحت نے ذرا سا اپنی یادداشت پر زور ڈالا تو اسے اچھی طرح یاد آ گیا کہ اس وقت کمرے میں سلطانہ کی بھی آوک جاوک جاری تھی۔ چند لمحوں کے لیے اسے سلطانہ پر بے تحاشا غصہ آیا۔ یہ بات اس پر روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ پولیس کو بیان اسی نے دیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ مشتعل ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی لیکن پھر اس کے اٹھے ہوئے قدم یکایک رک گئے۔ ایک لمحے کے لیے اس نے ٹھنڈے دل سے سوچا تو احساس ہوا کہ سلطانہ نے کچھ غلط نہیں کہا۔ پولیس کی وردی اچھے اچھوں کو خوفزدہ کر دیتی ہے۔ یقیناً انسپکٹر سعدی نے اسے آنکھیں دکھائی ہوں گی اور اس غریب نے لفظ بہ لفظ وہ سب کہہ دیا جو اس نے سنا اور دیکھا تھا۔ ایک سرد آہ کھینچ کر ملاحت بجائے سلطانہ کے اپنی ماں کی طرف بڑھ گئی اور ماں کے سرہانے

بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی۔ ندرت کی آنکھوں میں ابھی تک آنسو تھے۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ملاحت نے زبردستی اسے پانی پلایا اور ہولے ہولے اسے تھپکنے لگی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ندرت سو گئی۔ ملاحت کی آنکھوں میں تفکرات کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ وہ مسلسل سوچے جا رہی تھی۔

☆......☆

پچھلے دنوں ہونے والے واقعات معراج الدین اور ندرت کے لیے زہریلی کیلیں بن گئی تھیں۔ ستم بالائے ستم فواد، ماں کی وفات کے بعد صرف ملاحت کے قرب کا خواہش مند تھا۔ دادا، دادی، نانی اور باپ سب سے منحرف ہو کر وہ صرف ملاحت کو پکارتا۔ رات بھر خود بھی جاگتا اور گھر والوں کو جگائے رکھتا۔ وقتاً فوقتاً معراج الدین اور فیضان اسے ملاحت کے پاس چھوڑ جاتے۔ کیونکہ ندرت نے ملاحت کے باہر نکلنے پر خاص طور پر ماموں کے گھر جانے پر سخت پابندی عائد کر دی تھی۔

معراج الدین کا ٹوٹا ہوا افسردہ اور مایوس خاندان ایک بار پھر ندرت کی چوکھٹ پر سرنگوں ہوا۔ وقت پھر اپنے آپ کو دہرا رہا تھا۔ معراج الدین اور عاقلہ بیگم پھر ملاحت کے لیے سوالی بن کر دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے لیکن ندرت کسی قسم کی مفاہمت کے لیے تیار نہیں تھی۔ جب کہ فیضان پھپھی کے قدموں میں بیٹھ کر معافی مانگ چکا تھا لیکن ندرت نے ذرا سا بھی لچک کا مظاہرہ نہیں کیا۔ خیر سگالی کے آثار دور دور تک نہیں تھے لیکن اسی دوران فواد کو سخت بیماری نے آ گھیرا۔ اس کا نمونیا غلط تشخیص اور غلط علاج کی وجہ سے بگڑ گیا تھا۔ اس وقت ملاحت اپنے آپ کو نہ روک سکی۔ اس نے اپنی بے لوث خدمت اور محبت سے فواد کی بیماری کو شکست دے کر ماموں کے روبرو شادی کے لیے رضامندی دے ڈالی۔ ندرت نے بھی اپنی گھن گرج کا گلا گھونٹ ڈالا۔ کیونکہ فواد جب اپنی ترماہٹ بھری اور معصوم آواز میں اسے پکارتا تو پتھر دل بھی پانی ہو جاتا۔ ندرت تو خیر ایک ماں تھی ایک عورت تھی۔ انتہائی سادگی سے فیضان اور ملاحت کا نکاح انجام پایا۔ پہلی ہی رات میں ملاحت نے اپنی شعلہ بار آواز میں فیضان کو یہ جتا دیا کہ اس نے اسے اپنی گم گشتہ محبت سمجھ کر نہیں قبول کیا بلکہ وہ صرف فواد کی ماں بن کر اس گھر میں آئی ہے۔ فیضان نے ایک خفت بھری مسکراہٹ کے ساتھ جواباً کہا۔ ”ان نازک ترین حالات میں تم نے میرا جو ساتھ دیا ہے مجھے لگتا ہے یہ سب ہم دونوں کی زور محبت کا نتیجہ ہے۔“

اس کا لہجہ شبنم کی پھوار کی مانند تھا۔ انتہائی ٹھنڈا اور ملائمت بھرا۔ اس کی آواز میں رقت ہی رقت تھی۔ ملاحت نے صرف اس کے اور اس کے بچے کی خاطر اپنی ذات کی نفی کر دی تھی۔ وہ میٹھی اور پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ملاحت نے درشتی سے استفسار کیا۔ ”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو۔“

فیضان نے انتہائی گداز اور نرم لہجے میں کہا۔ ”میں سوچ رہا ہوں۔ میں کتنا غلط تھا آج سے پہلے تمہیں اتنے قریب سے اور غور سے کیوں نہیں دیکھا۔ تم اتنی حسین ہو یہ تو آج ہی مجھے محسوس ہوا۔“

ملاحت کے جارحانہ تیور بدستور برقرار تھے۔ اس نے سر جھٹک کر اس کی بات اڑا دی۔ شادی کے بعد وہ فواد کے واری صدقے جاتی لیکن فیضان سے دوریاں ابھی بھی دائم اور قائم تھیں جب کہ فیضان مثل پروانہ اس کے اردگرد طواف کرتا۔ جب فیضان کے باہر جانے کا وقت آیا تو اس وقت وہ اپنے آپ کو نہ روک سکی۔ آنکھوں میں ساون کی جھڑی لگی اور ان آنسوؤں نے دل کی ساری کہانیاں سنا کر رکھ دیں۔ برسوں کے فاصلے قربتوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ دونوں کی سانسیں ہم آہنگ ہو گئی تھیں۔

☆......☆

فواد کو اسکول روانہ کرنے کے بعد ملاحت نے ذرا سا سکون کا سانس لیا تھا کہ موبائل بول اٹھا۔ دوسری جانب انسپکٹر سعدی تھا۔ اس کا انداز گفتگو تحکمانہ تھا۔ اس لیے ملاحت نے فوراً پہچان لیا۔ انسپکٹر کی مدھم سی ہنسی کی آواز گونجی اور اس نے اپنی بھاری اور کھرکھراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ارے آپ تو واقعی بہت ذہین ہیں۔ فوراً مجھے پہچان لیا۔“

ملاحت نے اس کی تعریف کو نظر انداز کرتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”ویسے آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا اور آپ نے کس سلسلے میں مجھے یاد کیا؟“

انسپکٹر بغیر کسی تامل کے جواباً بولا۔ ”میڈم نمبر حاصل کرنے کے ہمارے اپنے ذرائع ہیں۔ اس پراسرار کا پردہ پڑا ہی رہے تو بہتر ہے کیونکہ یہ سب ہمارے پیشے اور کام کے لیے بہت ضروری ہے۔ دوسری اہم بات یہ کہ اگر آپ مجھے کچھ وقت دے سکتی ہیں تو مہربانی ہوگی۔ آپ کی معاونت سے ہی ہم شہابی کے قاتل تک پہنچ سکتے ہیں۔“

ملاحت کی آنکھوں میں حیرانگی اور خوف اتر آیا لیکن

اس نے محتاط لہجے میں ملاقات کا وقت دے دیا۔ انسپکٹر نے شکریہ ادا کر کے رابطہ منقطع کر دیا۔ ملاحت نے بھی دھڑکتے دل کے ساتھ اپنا موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور شہابی کے قتل کی پُراسرار گتھی کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ آنے والا وقت کیا دکھاتا ہے اس کے اندر ایک شور برپا تھا۔

☆......☆

اتوار کا دن تھا۔ اتفاق سے گھر کے سب افراد اِدھر اُدھر گئے ہوئے تھے۔ فواد بھی دادا دادی کے ساتھ ہی تھا۔ گھر میں ملاحت کے علاوہ صرف ایک ملازم تھا۔ ملاحت نے موقع غنیمت جان کر فوراً انسپکٹر سعدی کو کال کی۔ سعدی بھی اس کی کال کا منتظر تھا۔ اس نے آنے میں تاخیر نہیں کی۔ رسمی گفتگو کے بعد انسپکٹر نے ملاحت کو شادی کی مبارک باد دی اور پھر چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اب تو آپ کے ماموں کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی ہے۔ یقیناً آج کل وہ بہت خوش ہوں گے۔“

ملاحت ہکا بکا انسپکٹر کی صورت تکنے لگی۔ بمشکل اپنا غصہ قابو کیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”انسپکٹر صاحب آپ کی تفتیشی بجلی پہلے میری ماں پر گری تھی اور اب آپ نے ٹارگٹ میرے ماموں کو بنایا ہے۔ ابھی تک ہوا ہوایا تو کچھ نہیں۔ ہاں البتہ آپ کی قیاس آرائیاں ہم لوگوں کے لیے وبالِ جان ضرور بنی ہوئی ہیں۔“

انسپکٹر نے فوراً سنبھلتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ارے ارے محترمہ بخدا یہ بات نہیں۔ میں نے تو یونہی برسرِ تذکرہ ایک بات پوچھ لی تھی۔ شہابی مرڈر کیس پر کام جاری ہے۔ ہم لوگ غافل نہیں ہیں، انشاء اللہ بہت جلد رزلٹ آپ کے سامنے ہوگا۔ آج مجھے آپ کو کچھ ضروری ہدایات دینی ہیں۔ آپ اسے ذہن نشین کر لیں۔ وقت آنے پر آپ کو میرا پورا ساتھ دینا ہے۔“ انسپکٹر پُرسوچ انداز میں آہستہ آہستہ اسے کچھ سمجھاتا رہا۔ وہ بغور سنتی رہی اور ساتھ ہی ساتھ ہولے ہولے اپنا سر ہلاتی رہی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مشاورت کے بعد انسپکٹر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر عزم و ہمت کے آثار تھے۔ ملاحت بھی پُرسکون اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔

☆......☆

فواد کی چھٹی سالگرہ کا اہتمام ملاحت نے نہایت سادگی سے کیا تھا۔ بہت قریبی لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ اپنی ماں اور سلطانہ کے علاوہ فواد کے ننھیال والوں کو بلایا تھا۔ اس کے علاوہ چند ایک لوگ اور تھے۔ بہرحال زیادہ بھیڑ بڑکا سے گریز کیا گیا تھا۔ شام ہوتے ہی مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ رابعہ نے شہابی کی موت کے بعد دنیا ہی تیاگ دی تھی۔ ابھی بھی وہ حزن وملال کا پیکر بنی ہوئی تھی۔ کافی عرصہ بیمار بھی رہی تھیں۔ آج بھی اس کا آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن ملاحت اور فواد کے بے پناہ اصرار پر اسے اس تقریب میں شرکت کرنی پڑی۔ ناصرہ، افضل چودھری اور اجمل بھی ایک صوفے پر براجمان تھے۔ خوشی کی محفل تھی لیکن ماحول میں سوگواریت رچی بسی تھی۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ آج شدت سے سب کو شہابی یاد آ رہی تھی۔

معراج الدین نے ماحول بدلنے کے لیے ملاحت سے استفسار کیا۔ ”ارے بھئی اب کس کا انتظار ہے۔ فواد سے کہو کیک کاٹے۔“

ملاحت نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ماموں جان، فیضان کی خاص ہدایت تھی کہ فواد کی سالگرہ میں انسپکٹر سعدی کو ضرور مدعو کیا جائے اس لیے......“ ملاحت کی بات منہ کے منہ میں ہی رہ گئی۔ انسپکٹر سادہ لیکن نہایت ہی نفیس سوٹ میں ملبوس کمرے میں داخل ہوا اور بلند آواز میں حاضرین کو سلام کیا اور فواد کے گال تھپتھپاتے ہوئے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

معراج الدین نے اسے دیکھ کر اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ ان کا چہرہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ انسپکٹر سعدی کی آمد انہیں بالکل اچھی نہیں لگی تاہم خاموش رہے۔ ان کی بہن ندرت بھی خشمگیں نگاہوں سے انسپکٹر کو گھور رہی تھیں جب کہ ملاحت نے والہانہ انداز میں اس کا استقبال کیا تھا۔

فواد کے کیک کاٹتے ہی فوراً کھانا لگا دیا گیا۔ طرح طرح کی خوشبوؤں نے سب کی بھوک بڑھا دی تھی۔ انسپکٹر سعدی نے منہ میں لقمہ لیتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے ملاحت کو دیکھا اور سنجیدہ لہجے میں استفسار کیا۔ ”مسز فیضان آپ نے اس تقریب کی کوئی مووی وغیرہ نہیں بنوائی، حالانکہ بنوانا چاہیے تھی۔ فیضان کے لیے یہ ایک بہت بڑا گفٹ ہوتا۔“

ملاحت نے ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ”انسپکٹر صاحب فیضان اس معاملے میں بہت تیز ہیں۔ آپ کو تو یقیناً علم ہوگا کہ آج کل خفیہ کیمرے بہ آسانی دستیاب ہیں جنہیں کہیں بھی نصب کیا جا سکتا ہے۔ آپ ادھر دروازے پر دیکھیے اس نے اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔ ”آں ہاں...... ادھر نہیں ادھر ایک چھوٹا سا کیمرا لگا ہوا ہے جو ہم لوگوں کی تمام حرکات و سکنات کو کیچ کر رہا ہے بلکہ شہابی تو سالگرہ کی تیاریوں کے دوران ہی کیمرا فٹ کروالیتی تھی۔ تاکہ فیضان سالگرہ پر ہونے والی تیاریوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہو۔“

یہ جملہ سنتے ہی انسپکٹر نے اپنا کھانا روک دیا اور پلیٹ میز پر رکھ دی۔ وہ پُرتجسس نظروں سے ملاحت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک انجانی چمک تھی۔ وہاں پر موجود تمام مہمان یکلخت خاموش ہو کر دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔ صرف چمچے اور پلیٹوں کی کھنکنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ تقریباً سب ہی ان دونوں کی باتوں میں دلچسپی لے رہے تھے۔ انسپکٹر کا چہرہ اندرونی جوش و جذبے سے تمتما رہا تھا۔ انسپکٹر میں اچانک رونما ہونے والی تبدیلی کسی کی آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

ملاحت نے اپنی بات کو مزید بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”فواد کی سالگرہ کی تیاریاں اور تمام سرگرمیاں کیمرا ریکارڈ کرلیتا اور جب فیضان پاکستان آتے تو فیملی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھتے۔ انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے وہ خود بھی تقریب میں شامل ہیں۔“

انسپکٹر نے ملاحت کی ساری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تعجب بھی ہے اور افسوس بھی کہ پولیس اس کیمرے تک کیوں نہیں پہنچ پائی۔ بہرحال میں آج رات تو رنگ میں بھنگ ڈالنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ آج آپ کے بچے کی سالگرہ ہے۔ بہرحال کل خود آ کر تلاش کروں گا۔ وہ کیمرا اگر مل جائے تو مجھے یقین ہے کہ قاتل ہمارے ہاتھوں سے بچ نہیں پائے گا۔ کیمرے کا انکشاف آپ پہلے ہی کرتیں تو کیس ابھی تک حل ہو چکا ہوتا۔“ اسی اثناء میں سب طعام سے فارغ ہو چکے تھے۔ سب نے ایک دوسرے سے الوداعی مصافحے کیے اور اپنی اپنی راہ لی۔

☆......☆

معراج الدین کے گھر پر تاریکی اور خاموشی مسلط تھی۔ صرف ہواؤں کے جھکڑ چلنے سے شائیں شائیں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ایسے میں عمارت کی عقبی دیوار سے کوئی دھپ سے کودا۔ پھر دیوار کا سہارا لے کر اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہوا۔ عقابی نظروں سے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ لمبی چھلانگ لگائی تھی۔ چند لمحے سانس بحال کر کے ٹانگ سہلائی اور کلائی پر بندھی اپنی گھڑی دیکھنے کی

جبریت Determinism

وہ نقطہ جو کائنات کی تمام اشیاء اور مظاہر کو جبری قوانین یا علت و معلول کے رشتوں میں منسلک قرار دیتا ہے۔

جبریہ

وہ فرقہ جو انسان کو مجبور محض مانتا ہے اور کہتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ تقدیر الٰہی کے تحت ہوتا ہے۔ انسان خود کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ اس فرقے کی بنیاد جہم بن صفوان (المتوفی 128ھ) بخاریہ، قلابیہ اور بکریہ بھی جبریہ شمار ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں یعنی معتزلہ انسان کو مختار مطلق مانتے ہیں۔ وہ جو چاہے کرے، اسے پورا اختیار ہے۔ اشعری کہتے ہیں کہ انسان کچھ مختار ہے اور کچھ مجبور۔ معتزلہ اشاعرہ کو بھی جبریہ کہتے ہیں۔ فلاسفہ مغرب کا ایک گروہ بھی جبر کا قائل ہے۔ یونانی مفکر دیمقراطیس کا خیال تھا کہ کائنات کی ہر شے قانون قدرت کے ماتحت ہے اور اس سے انحراف نہیں کرسکتی۔ برطانوی فلسفی ہابس کا نظریہ تھا کہ کائنات اور انسان کی ہر حرکت قانون اسباب کے تحت ہے۔ نفسیات کے علماء کا خیال ہے کہ انسان اپنی مرضی کا مختار نہیں ہے بلکہ ذہنی اور جسمانی حالات اس کے ارادے اور عمل کو جس رخ چاہتے ہیں موڑ دیتے ہیں۔

مرسلہ: ارباز خان۔ لاہور

کوشش کی لیکن اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا پھر لنگڑاتا ہوا آہستہ آہستہ اس کمرے کی جانب بڑھنے لگا جہاں شہابی کا قتل ہوا تھا۔ کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی کھڑکی سے باہر آرہی تھی۔ اس روشنی میں اس نے وقت دیکھا اور خود کلامی کے انداز میں سرسراتی سرگوشی کی ”اف تین بج رہے ہیں۔ مجھے پھرتی سے کام کر کے یہاں سے نکلنا ہوگا۔“ جوں ہی آنے والے نے کمرے میں قدم رکھا۔ معاً کمرا روشنی میں نہا گیا۔ کمرے میں اجمل اور انسپکٹر سعدی آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اجمل بھونچکا اور ششدر کھڑا صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چہرے سے حد درجہ خوف اور دہشت مترشح تھی۔ اچانک غیر متوقع طور پر وہ ہو گیا جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ٹکٹکی لگائے انسپکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر کے ہونٹوں پر گہرا طنزیہ تبسم تھا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔

"میری موجودگی یقیناً اچھی نہیں لگی ہوگی لیکن کیا کرتا تمہیں خوش آمدید کہنے کے لیے میں اور میرا عملہ پوری تیاری سے آئے ہیں تم یقیناً کیمرے کے سراغ میں آئے ہو۔ میں بھی اسے ہی کھوج رہا ہوں لیکن کافی تلاش و بسیار کے باوجود مجھے تو ہاتھ نہیں لگا۔ اب تم بھی اپنی تسلی کرلو۔"

اجمل نے بڑا سا تھوک کا گولا نگلتے ہوئے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس افتاد ناگہانی سے وہ بری طرح گھبرا گیا تھا۔ وہ ہراساں نظروں سے ان پولیس اہلکاروں کو دیکھ رہا تھا جنہوں نے اسے نرغے میں لے رکھا تھا۔

گھر کی تمام روشنیاں آن کردی گئی تھیں۔ گھر کے تمام افراد بھی وہیں اکٹھا ہوگئے تھے۔ فرط حیرت سے سب کی زبانیں گنگ تھیں۔ معراج الدین نے اپنی حیرانگی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "انسپکٹر یہ...... یہ شہابی کا قاتل ہے۔ میں تو اسے ایک مرنجا مرنج شخص سمجھتا تھا لیکن یہ تو میری سوچ سے زیادہ تیز و طرار نکلا۔ شہابی اس کی سگی بہن نہیں سہی لیکن خالہ زاد تو تھی۔ کمبخت نے رشتے کا تقدس بھی پامال کردیا۔ آخر اسے کیا ملا یہ سب کرکے۔" ان کے لہجے میں بلا کی تلخی تھی۔

اجمل غیر یقینی کی حالت میں کھڑا سب کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ صدمے کی سی کیفیت میں تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ انسپکٹر نے اپنی فہم و فراست سے اس کے لیے جو جال بچھایا تھا اس میں وہ پوری طرح پھنس چکا ہے اور اب گلو خلاصی ممکن نہیں۔

انسپکٹر سعدی نے غراتے ہوئے کہا۔ "اے گھامڑ میں نے تجھے گرفت میں لینے کے لیے رسی پھینکی تھی لیکن تو اسے سانپ سمجھ بیٹھا۔ نہ کیمرا کبھی لگایا گیا تھا اور نہ آج کیمرا تصاویر کھینچ رہا تھا لیکن تیرا خوف تجھے یہاں تک کھینچ لایا۔ میں نے مسز فیضان کی مدد سے یہ سب کھیل رچایا تھا۔ بہرحال ہم لوگ اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور اب تیرے پاس اقبال جرم کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ بہتری اسی میں ہے کہ تو سب کچھ سچ سچ اگل دے۔"

اجمل نے انتہائی شکست خوردہ لہجے اور رقت آمیز آواز میں اپنا بیان دیا۔ سب کی سماعتیں اس کی آواز پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ہاں میں نے ہی شہابی کو جان سے مارا ہے۔ وہ ہمیشہ مجھے اجڈ گنوار سمجھتی رہی۔ سدا میرے ساتھ تحقیر آمیز رویہ رکھا۔ میرا انتقامانہ ذہن نت نئے منصوبے ترتیب دیتا لیکن پھر میں اپنے آپ پر قابو پالیتا لیکن جب اس نے مجھ سے شادی کے لیے انکار کیا تو میں اپنے آپ کو نہ روک سکا۔ کیونکہ فیضان سے شادی کی صورت میں مجھے اس دولت سے بھی ہاتھ دھونے پڑے جو شہابی میرے گھر لانے والی تھی۔ اپنے نانا کی بڑی ساری کوٹھی پر میں اکیلا قابض ہونا چاہتا تھا۔ اپنے حصے کی کافی دولت میں عیاشیوں کی نذر کر چکا تھا۔ شہابی میرے لیے سونے کی چڑیا تھی لیکن اس نے میرے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ میں اس کے بعد اس کے بچے کی تاک میں تھا اور اس کے لیے مناسب وقت کا انتظار کررہا تھا کیونکہ اس کے بعد خالہ کی ساری جائداد کا میں ہی تنہا وارث ہوتا لیکن...... لیکن۔" پھر دانت کچکچا کر وہ بولا۔ "کاش آج اس سالگرہ پارٹی میں، میں آیا نہ ہوتا پولیس کی شاطرانہ چال کو سمجھ پاتا۔ کاش...... کاش......!" یہ کہہ کر وہ بری طرح رو پڑا۔

اس وقت وہ کوئی سفاک قاتل نہیں بلکہ نہایت کمزور، دبو، ڈرپوک اور ٹوٹا ہوا انسان لگ رہا تھا۔ سعدی کے اشارے پر اسے حراست میں لے لیا گیا تھا۔

پولیس والے اجمل کو لے کر روانہ ہوچکے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ملاحت نے انسپکٹر سے استفسار کیا۔ "انسپکٹر صاحب آپ کو اجمل پر کس طرح شک ہوا؟"

انسپکٹر نے جواب دیا۔ "نہیں میم میں آخر تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ بس میں نے یہ ترپ کی چال چلی اور یہ سوچا کہ ہمارے فرضی کیمرے کو ڈھونڈتے ہوئے جو بھی جائے وقوعہ تک پہنچتا ہے سمجھو وہی قتل یا قاتل کا آلۂ کار ہے۔"

ملاحت نے زیر لب مسکراتے ہوئے پھر پوچھا۔ "اور اگر اجمل کسی وجہ سے آج رات یہاں نہیں آتا؟"

انسپکٹر نے فوراً قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "وہ احمق آج رات ہر مزاحمت ہر طوفان سے ٹکرا کر جائے واردات پر ضرور پہنچتا کیونکہ اسے یقین ہوگیا تھا کہ وہاں لگا ہوا کیمرا اس کی نشاندہی نہ کردے۔ یہی غلط فہمی اور ڈر اسے لے ڈوبا۔"

پو پھٹ چکی تھی۔ ایک نئی صبح طلوع ہورہی تھی۔ انسپکٹر سعدی بھی روانہ ہوچکا تھا اور ملاحت سوچ رہی تھی شہابی کے قتل سے کچھ رشتے بن گئے اور کچھ رشتے بکھر گئے۔ دراصل رشتوں کی سلامتی بھی انسانی رویوں میں پوشیدہ ہے۔ رویے کھوٹ سے پاک ہوں تو رشتے بنے رہتے ہیں ورنہ ایسے ٹوٹتے ہیں کہ کبھی جڑ نہیں پاتے۔

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
میں نہ تو قلم کار ہوں اور نہ کبھی کوئی کہانی لکھی۔ اس آپ بیتی کو لکھنے سے قبل سرگزشت کی پڑھی ہوئی سچ بیانیوں کو دوبارہ پڑھا اور اسی انداز میں اپنی سرگزشت لکھی ہے اگر پسند آجائے تو ہمیں بھی قلمکار کی فہرست میں شامل کرلیں کیونکہ یہ میرے دکھی دل کی آواز ہے۔

سبین
(کراچی)

کئی دن سے کوشش کررہی تھی کہ امی سے بات کروں مگر مناسب موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ ایک دوبار موقع ملا تو ان کے قریب جاکر حوصلہ ہار گئی اور اصل بات کی بجائے آئیں، بائیں، شائیں کہہ کر رہ گئی لیکن ایک بار ہمت کرکے کہہ ہی دیا۔

"امی! میں ایک لڑکے کو پسند کرتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اس سے میری شا...... دی...... ہوجائے۔"

امی نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔ مگر ان کے

چہرے پر ناراضگی یا خفگی کے آثار نہیں تھے۔ بڑے نرم لہجے میں بولیں۔

"کون ہے یہ لڑکا؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟"

مجھے امی کے سوال پر کچھ حوصلہ ہوا۔ "وہ آنرز میں بھی میرا کلاس فیلو تھا۔ پھر ماسٹر کی جماعت میں بھی ہم دونوں ساتھ ہی تھے۔"

"اب کہاں ملازمت کرتا ہے؟ کتنی تنخواہ ہے؟ اور رہائش کہاں ہے؟"

"ابھی تک اسے کوئی ملازمت نہیں ملی۔"

"اس کے والد کیا کرتے ہیں؟"

"والد حیات نہیں۔ بیوہ ماں اور دو تین چھوٹے بھائی بہنوں کی کفالت وہی کرتا ہے۔"

"اوہ! بیچارہ......!!" کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہیں پھر بولیں۔ "بڑا حوصلہ مند بچہ ہے۔ اپنی تعلیم بھی مکمل کی، ماں اور بھائی بہنوں کی کفالت بھی کرتا ہے مگر یہ سب کچھ وہ کیسے کرتا ہے؟"

"ٹیوشن کر کے......اور چھوٹی موٹی نوکری کر کے۔"

"بیٹھو......تم کھڑی کیوں ہو......" امی نے بڑی شفقت سے کہا۔ میں ان کے قریب بیٹھ گئی تو انہوں نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! شاید تم یہ نہ جانتی ہو کہ جس دن بیٹی پیدا ہوتی ہے ماں باپ اسی دن سے اس کے اچھے رشتے کے لیے فکر مند ہو جاتے ہیں۔ ہم بھی تمہاری کامیاب شادی اور بہتر مستقبل کے بارے میں سوچتے رہتے تھے اور پھر ہمیں ایک ایسا خاندان، گھر اور اس کا رشتہ پسند آ گیا۔ ان کے گھر والوں کو تم بھی پسند آ گئیں اور ہم دونوں خاندانوں نے یہ طے کر لیا کہ جیسے ہی تم فارغ التحصیل ہو جاؤ گی۔ تمہارے ہاتھ پیلے کر دیں گے۔ اس سلسلے میں اب ہم تمہیں بتانے ہی والے تھے کیوں کہ اب ادھر سے بھی یہ پوچھا جانے لگا ہے کہ اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا......؟"

امی کے منہ سے نکلنے والی آواز میری سماعت میں جیسے دھماکے کرنے لگی تھی۔ میری رگوں میں جیسے بجلی کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں چیختا چلانا شروع کر دوں۔ مگر نہ جانے کیوں میں نے ایسا نہیں کیا۔ دوسری طرف امی کا بیان جاری تھا۔ "ہم نے ان سے کہہ دیا ہے کہ ہم بھی اب مزید دیر نہیں کرنا چاہتے، ہماری بچی نے ماسٹر کر لیا ہے۔ جلد ہی ہم لوگ آپ لوگوں سے مل کر دن تاریخ مقرر کر لیں گے۔"

ابھی تک امی نے اپنے پسندیدہ لڑکے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میرا جی چاہا کہ ان سے کہہ دوں۔ "مجھے نہیں کرنی آپ لوگوں کے پسندیدہ لڑکے سے شادی۔ شادی میری ہے اس لیے میرے پسند کے لڑکے سے ہو گی۔"

مگر یہ کہنے سے پہلے امی بولیں۔ "ہمیں تو تم نے کبھی یہ بتایا نہیں تھا کہ تم کسی لڑکے کو پسند کرتی ہو۔ لہٰذا ہم نے یہی سمجھا کہ تم نے اچھی لڑکیوں کی طرح یہ ذمہ داری ماں باپ کو ہی سونپ دی ہے۔ اسی سوچ کے تحت جب نفیس کا رشتہ تمہارے لیے آیا تو ہم نے چھان پھٹک کے بعد اسے قبول کر لیا۔ لڑکے کا نام ہی نفیس نہیں، وہ خود بھی بہت نفیس طبیعت اور عادت و اطوار کا مالک ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ ایک بہت بڑی پرائیویٹ کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ بہت بڑی تنخواہ ہے۔ اس نوکری کے باوجود وہ باپ کے کاروبار کی بھی نگرانی کرتا ہے۔ اس کے والد انیس صاحب کی ایک منافع بخش فیکٹری ہے۔ ڈیفنس کے علاقے میں دو ہزار گز کا ایک محل نما بنگلا ہے۔ نوکر چاکر ہیں۔ گاڑیاں ہیں۔ زندگی کا سارا عیش و آرام انہیں حاصل ہے۔ یہ سب دیکھ کر ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ تم سسرال میں ہر طرح سے خوش رہو گی۔" وہ ذرا رکیں پھر پہلے کی طرح پُرسکون انداز میں بولیں۔ "اب تم بتا رہی ہو کہ تم نے بھی کوئی لڑکا پسند کر رکھا ہے۔ ہم تم پر کوئی دباؤ نہیں ڈالیں گے تم اپنی پسند اور ہماری پسند کے لڑکے کے بارے میں خوب اچھی طرح سوچو۔ غور و فکر کرو کہ کون تمہارے بہتر مستقبل کے لیے بہتر ہو گا۔ اس کے بعد ہمیں اپنے فیصلے سے مطلع کر دینا۔"

میرے دل و دماغ کی اس وقت کیا کیفیت تھی۔ میں بتا نہیں سکتی۔ امی کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ بستر پر کٹے ہوئے درخت کی طرح گر کر کچھ دیر روتی رہی۔

آنسوؤں کے سیلاب سے اندر کی آگ کچھ مدھم ہوئی تو سوچوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میرے خوابوں کے محل کو ریزہ ریزہ کرنے والے اپنی محبت کا سوانگ رچا کر مجھے بے وقوف بنانے چلے ہیں۔ میں ان کی کسی سازش کو کامیاب ہوتے نہیں دوں گی۔ وہ چال چلوں گی کہ ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے۔ یہ اور اسی قسم کی باتیں سوچتی رہی اور روتی رہی۔

اگلی صبح میں نے گلزار کو فون کیا۔ ''کہاں ہو؟ کس حال میں ہو؟''

''وہی حال ہے۔''

''یہ بتاؤ۔ کوئی نوکری ووکری ملی؟''

''سب کچھ وہی پرانے ہیں۔ کوئی نئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔''

''اوہ! یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔ دوسری طرف حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں۔''

''خیریت تو ہے......؟''

''نہیں۔ اسی لیے تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ آج ملو۔''

اور جب ملاقات ہوئی تو گلزار نے چھوٹتے ہی کہا۔

''کیا کسی سے لڑکر آئی ہو؟ تمہارے تیور اس قدر......''

''رات بھر روتی رہی ہوں اور یہ شعر پڑھتی رہی ہوں۔

کیا اس لیے تقدیر نے چنوائے تھے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

یہ کہتے کہتے میں رو پڑی۔ 'گلزار! ہماری محبت کا محل مسمار کرنے کی سازش کی جا رہی ہے۔''

گلزار نے مجھے غور سے دیکھا اور پُرخیال انداز میں کہا۔ ''آخر معاملہ کیا ہے کھل کر بتاؤ۔''

میں نے امی سے ہونے والی ساری باتیں اسے بتا دیں۔ بڑے پُرسکون انداز میں اس نے ساری باتیں سنیں۔ جب میں ساری باتیں کہہ چکی تو اس نے کہا۔ ''یہ جو تم نے کہا ہے کہ ہماری محبت کا محل مسمار کرنے کی سازش کی جا رہی ہے۔ اس میں مجھے تو سازش نظر نہیں آئی۔ تمہاری امی نے جو کچھ کہا ہے وہ صد فیصد حقیقت پر مبنی ہے۔ تمہارے والدین نے تمہارے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے وہ تمہارے بہتر مستقبل کے لیے کیا ہے۔ ہر ماں باپ یہی چاہتے ہیں کہ ان کی بیٹی سسرال میں ہمیشہ خوش رہے۔ عیش و آرام کی زندگی بسر کرے۔ انہوں نے یہ سوچ کر تمہارا رشتہ ایک ایسے لڑکے سے طے کیا جو ماشاء اللہ ہر طرح سے ایک کامیاب شوہر ثابت ہو سکتا ہے۔ ان کی بیٹی کو زندگی کی تمام خوشیاں دے سکتا ہے۔ ذرا سوچو، غور کرو، تمہارے والدین نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ جب تک ایک بے بی ڈول تھیں اس وقت سے لے کر اس وقت تک کس محبت اور شفقت سے تمہیں پالا پوسا، تعلیم و تربیت کی دولت سے مالا مال کر کے ایک باشعور انسان بنایا۔ ایسے ماں باپ کے لیے

جواب آں غزل

ایک اندھا پولیس میں بھرتی ہونے آیا تو پولیس آفیسر نے پوچھا۔ ''تمہیں کس لیے رکھیں؟''
اندھے نے جواب دیا۔ ''اندھا دھند فائرنگ کے لیے۔''

☆☆☆

ایک لڑکا بس اسٹاپ پہ لڑکی کو دیکھ کر بولا۔ ''تو تو میری جان ہے تو میرا ایمان ہے۔'' لڑکی نے جوتی اتاری تو لڑکا بولا۔
''میں بھی پاکستان ہوں، تو بھی پاکستان ہے۔''

☆☆☆

آپریشن سے پہلے ڈاکٹر نے پھولوں کا ہار منگوایا۔
مریض۔ ''یہ کس لیے ہیں؟''
ڈاکٹر۔ ''میرا یہ فرسٹ آپریشن ہے اگر کامیاب ہوا تو میرے لیے ورنہ تمہارے لیے۔''

مرسلہ: فہیم مغل، لیہ

اپنی زندگی بھر کی کمائی کو دوسرے کی جھولی میں ڈالنا کس قدر صبر آزما کام ہے۔ مگر لڑکی کے والدین دل پر صبر کا پتھر رکھ کر اپنی دولت اپنی دنیا دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس مجبوری کے عالم میں ان کی آخری خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی لڑکی کا ہاتھ جس لڑکے کے ہاتھ میں دیں وہ اسے ہمیشہ شاد اور آباد رکھے۔ اگر تمہارے والدین نے......''

''بند کرو اپنی تقریر۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''انہوں نے سارا فیصلہ تمہارے خلاف کیا ہے مگر تم انہی کے حق میں بات کر رہے ہو۔؟''

''جو بات حق ہے، سچ ہے، اس کے خلاف کیسے بات کی جا سکتی ہے۔''

''میں تمہارے پاس اس لیے آئی تھی کہ تم اپنی محبت کو برباد ہونے سے بچانے کی کوئی راہ تلاش کرو گے۔ میں تو یہ سوچ کر تمہارے پاس آئی تھی کہ تم کہو گے۔ تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو، ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو۔''

''یہ سب افسانوی باتیں ہیں سین! میں ایک حقیقت پسند انسان ہوں، میں ایسی غیر منطقی باتوں پر کیسے عمل کر سکتا ہوں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم بھی یہ چاہتے ہو کہ......''

اس نے تیز لہجے میں کہا۔

"ہاں سین! میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تمہاری امی نے تمہارے لیے جو کچھ کیا ہے وہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ تم اس لڑکے سے شادی کرلو، جسے ان لوگوں نے تمہارے لیے پسند کیا ہے۔"

"تو میں یہ سمجھ لوں کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ اتنے دنوں تک محض مجھ سے کھلواڑ کرتے رہے۔"

"نہیں ایسی بات نہیں۔ میں تم سے محبت کرتا تھا اور کل بھی کرتا رہوں گا۔"

"کیوں جھوٹ بول رہے ہو؟ محبت کرنے والے کیا اس طرح آسانی سے ہار مان لیتے ہیں؟"

"شاید تم یہ سمجھتی ہو کہ محبت کا دی اینڈ ہمیشہ خوشگوار ہو، ہپی اینڈ ہو؟ ایسی بات نہیں ہے ڈیئر! لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، سسی پنوں، شیریں فرہاد جتنی بھی مشہور محبت کی داستانیں ہیں سب کا اختتام ٹریجڈی پر ہوا۔"

"ان محبت کرنے والوں نے تو اپنی محبت کی کامیابی کے لیے جدوجہد کی تم کیا کررہے ہو؟ یہی کہ مجھے مشورہ دے رہے ہو کہ میں ماں باپ کی پسند کی جگہ شادی کرلوں۔"

"محبت میں ایک کردار قربانی کا بھی بڑا اہم ہوتا ہے۔ میں جو کچھ کررہا ہوں یا تمہیں کرنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ اس لیے کررہا ہوں کہ تم سے محبت کرتا ہوں، سچی محبت۔ اور ایک سچا عاشق ہونے کی وجہ سے چاہتا ہوں کہ وہ خوشیاں جو میں مستقبل میں تمہیں نہیں دے سکتا وہ کوئی اور دے۔"

"تم تو ظالم ہو، بے درد، اس لیے ایسا سوچ رہے ہو۔ کیا تم نے یہ سوچا ہے کہ تمہارے بغیر میں کسی اور کے ساتھ خوش رہ سکوں گی؟"

میں نے اس سے آگے کا سوچا ہے۔ شادی کے بعد جب عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے تو پیار محبت کے غبارے سے آہستہ آہستہ ہوا نکل جاتی ہے۔ زندگی کی حقیقتیں سامنے آتی ہیں تو قدم قدم پر ناخوشگوار باتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ چند مشہور ڈائیلاگ ہیں۔

"راشن ختم ہوگیا ہے۔"

"اتنی جلدی کیسے ختم ہوگیا؟"

"میں نے اپنے میکے والوں کو بلا کر کھلادیا۔"

"میں یہ کب کہہ رہا ہوں۔"

"کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ مزید راشن ڈلواؤ۔"

"کیسے مزید راشن ڈالواؤں۔ دکاندار ادھار سامان دیتا نہیں، دفتر سے ایڈوانس پیسے نہیں ملتے۔"

اس قسم کے حالات کا سامنا ہوتا ہے تو لڑکی سوچتی ہے کہ میں نے بھی کس ٹٹپونجیے سے محبت کی۔ شادی کے بعد کوئی سکون نہیں ملا۔ کوئی آرام نہیں ملا۔ دکھ اور درد محبت بن کر رہ گیا۔

"گلزار! مجھے پتا ہے کہ تم ایک اچھے مقرر ہو۔ اس لیے میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔"

"پھر کیا چاہتی ہو؟"

"میں یہ چاہتی ہوں کہ ہم گھر سے بھاگ کر کہیں جا کر شادی کرلیتے ہیں۔"

گلزار نے تالیاں بجائیں۔ "گڈ! بہت خوب۔ بڑا زبردست پروگرام ہے۔ تم جیسی پڑھی لکھی اور روشن خیال لڑکی ایسا ہی کرسکتی ہے۔ جس ماں باپ نے اپنی تمام تر محبت سے پال پوس کر اس مقام تک پہنچادیا، ان کے منہ پر کالک ملنے کا عزم و ارادہ تم ہی جیسے لڑکی کرسکتی ہے۔ تم نے کتنی آسانی سے گھر سے بھاگ کر شادی کرنے کی بات کی۔ کیا اس کے بعد تمہارے والدین کسی سے آنکھ ملا کر بات کرسکیں گے؟ تمہارے بہن بھائیوں کا کوئی رشتہ تمہارے گھر آئے گا؟"

"یعنی تم اس معاملے میں بھی میرا ساتھ نہیں دو گے؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ میں اتنا خودغرض نہیں ہوں کہ اپنے لیے کسی شریف خاندان کی عزت کو خاک میں ملادوں۔ میں ایسی محبت پر لعنت بھیجتا ہوں جو دوسروں کی عزت نفس کو مجروح کرے۔"

گلزار کی بات سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ "لعنت ہے تم جیسے بزدل آدمی پر۔" یہ کہتے ہوئے میں وہاں مزید نہیں رکی۔ پیر پٹختی ہوئی واپس آگئی۔ مجھے زبردست رونا آرہا تھا۔ جس کے لیے میں سب سے لڑنے پر تیار تھی۔ وہی میرا ساتھ دینے پر تیار نہیں۔ بزدل کہیں کا۔ بدمعاش۔ مجھے جتنی گالیاں یاد تھیں سب میں نے اسے دے دیں۔ میں تو یہ سوچ کر اس سے ملی تھی کہ وہ ہر طرح سے میرا ساتھ دے گا۔ مگر وہ تو......"

کئی دنوں تک میں انگاروں پر لوٹتی رہی۔ میرے اندر انتقام لینے کی آگ تیز تر ہوتی گئی۔ میں نے کتنی باتیں

سوچیں، کتنے منصوبے بنائے مگر کوئی جچا نہیں تھا۔ مناسب نہیں لگتا تھا۔ آخر ایک منصوبہ مجھے بہت پسند آیا۔ اس کے بعد میں ایک بار پھر گلزار سے ملی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ”لگتا ہے تم نے ایک اچھی بچی کی طرح میری باتوں پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔“

”نہیں۔ میں اس اُمید پر تمہارے پاس آئی ہوں کہ تم اس بار میرا ساتھ دو گے اور کوئی انکار نہیں کرو گے۔“

”کس طرح کا ساتھ؟“

”میں انتقام لینا چاہتی ہوں۔“

”کس سے انتقام لینا چاہتی ہو؟“

”اس سے جس کی وجہ سے میرے ارمانوں کی دنیا برباد ہورہی ہے۔“

”انتقام کے نام پر تم کیا کرنا چاہتی ہو؟“

”دیکھو۔ اس بار تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ تم میرا ساتھ دو گے نا؟“

”پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم انتقامی کارروائی کے نام پر کیا کرنا چاہتی ہو؟“

”پچھلے دنوں کیبل پر ایک فلم دیکھی تھی۔ ہیروئن کے ساتھ بھی ایسا ہی مسئلہ تھا اور اس نے انتقام لے لیا میں انتقاماً چاہتی ہوں کہ ہم میاں بیوی کے طور پر......“

”بس بس...... میں سمجھ گیا۔ اس کے آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مگر تم نے یہ گھناؤنی بات سوچی کیسے؟ اس طرح تم کس کو نقصان پہنچانا چاہتی ہو؟“

”اس نفیس کے بچے کی ساری نفاست کو غلاظت میں بدلنا چاہتی ہوں۔“

گلزار نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ عجیب نظروں سے کچھ دیر تک مجھے گھورتا رہا۔ پھر بولا۔ ”اس طرح تو تم خود اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کررہی ہو۔“

”مجھے کیا نقصان پہنچے گا؟“

”زندگی بھر تمہارا ضمیر بچھو کی طرح تمہیں ڈنک مارتا رہے گا کہ تم نے ایک غیر اخلاقی، غیر قانونی اور مذہب کے منافی اقدام ایک ناقابلِ معافی جرم کیا ہے۔ تم کہتی ہو کہ نفیس کی نفاست کو غلاظت میں بدلنا چاہتی ہو۔ نادان لڑکی! اس کی نفاست میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم خود اس غلاظت میں سر سے پیر تک لتھڑ جاؤ گی۔“

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ میرے اس منصوبے کو بھی اس کمینے نے مسترد کردیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس مٹی سے بنا ہے یہ شخص۔ اپنی محبت کی ناکامی میں تو اسے ہر طرح میرا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ مخالفین کی اینٹ سے اینٹ بجادینا چاہیے تھی۔ مگر وہ ہے کہ اخلاق و آداب کا قطب مینار بنا پھر رہا ہے۔ میں نے اس سے محبت کی تھی اسے میرا ساتھ دینا چاہیے تھا، مگر وہ میری بجائے میری محبت کے دشمنوں کا ساتھ دے رہا ہے۔ میں انہیں نقصان پہنچانے کا جو بھی منصوبہ بناتی ہوں وہ اس سے روک دیتا ہے۔ اپنی باتوں سے، اپنے دلائل سے اسے غلط، کمزور، ناقص اور قابلِ مذمت منصوبہ قرار دیتا ہے۔

بے پناہ خواہش کے باوجود میں اس کا منہ نہ نوچ سکی۔ کچھ بھی ہو، وہ میرا محبوب تھا۔ میری محبت تھا۔ پہلی اور آخری محبت۔ اپنی بے بسی پر میں نے رونا شروع کردیا۔ گلزار نے مجھے چپ نہیں کرایا۔ رونے سے روکا نہیں۔ میرے آنسو نہیں پونچھے۔ خاموشی سے مجھے روتا ہوا دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جب میرا جی کچھ ہلکا ہوا تو میں نے خود ہی رونا بند کردیا۔ کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اسے مخاطب کرکے بولی۔ ”گلزار! بتاؤ میں کیا کروں۔ تم نے مجھے منجدھار میں لاکر تنہا چھوڑ دیا ہے۔“

”میں کیا بتاؤں۔ بتانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ تم میری بات مانوں گی کب؟“

”بتاؤ۔ تمہارے تکلیف دہ برتاؤ کے باوجود میں تم سے محبت کرتی ہوں، شاید تمہاری بات مان جاؤں۔“

”سبین! یقین جانو میں تم سے محبت کرتا ہوں اور اسی محبت کا نتیجہ ہے کہ میں ہمیشہ تمہاری بہتری کے بارے میں سوچتا ہوں۔ میں تمہیں دل کی گہرائی سے محبت کرتا تھا۔ محبت کرتا ہوں اور محبت کرتا رہوں گا اور اسی محبت کی وجہ سے میں تم سے یہ کہوں گا کہ میں جو بات تم سے کہوں، اسے مان جاؤ۔“

میں نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ”سبین! تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم اپنے ماں باپ کے منتخب لڑکے سے شادی کرلو۔ شادی ایک دو دن کا مسئلہ نہیں ہوتا، زندگی بھر کا معاملہ ہوتا ہے۔ تم شادی کے بعد خوش رہو گی تو مجھے بھی اس بات کی خوشی ہوگی۔ اطمینان ہوگا کہ تمہاری زندگی خوشگوار گزر رہی ہے۔“

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا اور میرے کچھ بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر میرے پاس اب بولنے کے لیے بچا ہی کیا تھا۔ ذرا دیر بعد کچھ کہے بغیر میں واپس آگئی۔

اگلی صبح امی نے مجھے ٹوکا۔ ”سبین بیٹا! تم نے کیا فیصلہ

کیا؟"

"میرا وہی فیصلہ ہے جو آپ لوگوں کا ہے۔"

امی نے آگے بڑھ کر میری پیشانی چوم لی۔

اگلے مہینے میری شادی ہوگئی۔ سسرال آکر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہاں کی دنیا عجیب ہی تھی۔ دو ہزار گز پر بنا محل نما بنگلا، بنگلے میں نوکر نوکرانیوں کی فوج ظفر موج۔ گھر میں پہلے سے دو گاڑیاں موجود تھیں۔ میاں نے منہ دکھائی میں مجھے ایک نئے ماڈل کی گاڑی دی۔ سسر جی نے اپنا ایک فارم ہاؤس میرے نام کردیا تھا۔ ساس اور نندیں میرے آگے بچھی جاتی تھیں۔ گھر میں مہینے بھر تک جشن کا سماں رہا۔

میاں جی کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت دیدہ و دل فرش راہ کیے رہتے تھے۔ انہوں نے پہلی رات کہہ دیا تھا۔ "ہم کھل کر پیار کرنے والے لوگ ہیں دل کی گہرائیوں سے پیار کرتے ہیں۔ اس لیے دوسروں سے بھی اس بات کے متمنی ہوتے ہیں کہ وہ بھی ہم سے اسی طرح محبت کریں۔"

میں یہاں کیا سوچ کر آئی تھی۔ یہاں آکر تو میری سوچ ہی بدل گئی۔ میرا خیال تھا کہ میں سسرال میں خوش نہیں رہ سکوں گی نہ ہی کسی کو خوش رکھ سکوں گی۔ مگر یہاں کے ہر فرد کا پیار اس بات کا متقاضی تھا کہ میں بھی اسی جوش و خروش کے ساتھ ان کے پیار کا جواب دوں۔

شادی کے کچھ دنوں بعد ایک دن نفیس مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ "تمہاری کوئی بہن کہہ رہی تھی کہ آپی کسی اور سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر ان کی شادی آپ سے کرادی گئی۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "یہ چغل خور، افشین کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ آخر کیا ضرورت تھی یہ بات انہیں بتانے کی۔"

مجھے خاموش دیکھ کر انہوں نے ٹوکا۔ "آپ نے جواب نہیں دیا۔"

میں اپنے خیالات سے چونکی۔ "جی! کیا پوچھا تھا آپ نے؟"

انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

"جی ہاں، یہ بات درست ہے۔"

"کون تھا وہ؟"

وہ میرا کلاس فیلو تھا۔

"کیا آپ اسے بہت چاہتی تھیں؟"

"جی ہاں، بہت۔"

"اگر آپ یہ بات کسی طرح مجھے بتا دیتیں تو شاید میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا۔"

"آپ کو بتا کر بھی کیا فائدہ ہوتا۔ جس پر تکیہ تھا جب وہی ہوا دے رہا ہو تو نشیمن کو خاکستر ہونے سے کون روک سکتا ہے۔"

"کیا مطلب! میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"جب دوست ہی ناصح بن جائے تو آپ سوچ سکتے ہیں دوستی کی کیسی مٹی پلید ہوتی ہے۔"

اس کے بعد میں نے انہیں اپنی امی کی گفتگو اور اس کے بعد گلزار سے گفتگو اختصار کے ساتھ بتائی اور گلزار کا اس مسئلے پر جو موقف تھا بتایا تو نفیس بے ساختہ بول پڑے۔

"بہت خوب یہ تو کوئی بہت اعلیٰ اخلاق و اطوار کا بندہ معلوم ہوتا ہے۔"

"آپ اسے جو نام دیں۔ مگر اس نے تو میری ہی نہیں اپنی محبت کا بھی جی بھر کر مذاق اڑایا۔ میں نے اپنی محبت کے دشمنوں کو نقصان پہنچانے کا جو بھی منصوبہ بنایا اس شخص نے اسے مسترد کردیا۔ اپنے دلائل سے اسے میرے ہی حق میں نقصان دہ قرار دے دیا اور مجھے روکا، منع کیا کہ خبردار میں ایسا کوئی قدم نہ اٹھاؤں۔"

"آپ کو اس کی یہ بات یقیناً پسند نہیں آئی ہوگی۔ یہ ایک فطری عمل ہے مگر اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرتا کہ وہ ایک بلند ظرف انسان ہے۔"

"آپ جسے اس کی اعلیٰ ظرفی کہہ رہے ہیں میں اسے اس کی پست ہمتی، کمزوری اور بزدلی کا نام دیتی تھی۔"

اس کے بعد میں نے مسکراتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ "ایک بار میں نے اسے کہا چلو ہم لوگ گھر سے بھاگ کر کہیں شادی کرلیتے ہیں۔"

"اوہ! آپ نے تو...... پھر اس نے کیا کہا؟"

"میری ایسی کلاس لی کہ میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ اس نے پہلے تالیاں بجا کر میرا مذاق اڑایا۔ پھر بولا کہ تمہاری اس حرکت کے بعد تمہارے والدین کسی سے آنکھ ملا کر بات کرسکیں گے؟ تمہارے بھائی بہنوں کا کوئی رشتہ تمہارے گھر آئے گا؟"

"آپ جو بھی کہیں۔ آج کے دور کے کسی نوجوان کی یہ سوچ، اس بات کا ثبوت ہے کہ اچھی تعلیم انسان کو اچھا بناتی ہے۔ اس کے

ماں باپ نے بھی یقیناً اسے اچھی تربیت دی ہوگی۔"

"میں نے تو بس اسے دیکھا تھا، اسے چاہا تھا۔ اس کے خاندان کے بارے میں مجھے زیادہ جانکاری نہیں۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ اس کی ایک بیوہ ماں اور دو تین چھوٹے بہن بھائی ہیں جن کا وہی کفیل ہے۔"

"پھر تو وہ اور بھی ستائش اور تحسین کے قابل انسان ہے۔"

"اس کے لیے اپنے کچھ ایوارڈ بچا کر رکھیے۔ کیونکہ اس کے کارناموں میں ایک کا تو میں نے ابھی ذکر ہی نہیں کیا ہے۔"

"اچھا...... وہ کیا ہے؟"

"موصوف نے ہی مجھے بعد از اصرار شادی پر رضامند کیا تھا۔"

"کیسے۔ ذرا تفصیل سے بتاؤ یار۔"

"آخری ملاقات کے وقت اس نے کہا۔ یقین جانو میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ اور اسی محبت کا نتیجہ ہے کہ میں ہمیشہ تمہاری بہتری کے بارے میں سوچتا ہوں۔ اسی محبت کی وجہ سے میں تم سے یہ کہوں گا کہ تم اپنے ماں باپ کے منتخب لڑکے سے شادی کرلو۔ شادی زندگی بھر کا معاملہ ہوتا ہے۔ تم شادی کے بعد خوش رہوگی اور مجھے بھی خوشی ہوگی کہ تمہاری زندگی خوشگوار گزر رہی ہے۔"

"سوپرب!! سیمی جی! یہی تو عشق ہے۔ سچا عاشق ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو محبوب کی خوشیوں کے لیے اپنی ساری خوشیاں نچھاور کردیتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ہار نہیں ہوتی، جیت ہوتی ہے۔ اگر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔ میں اس کی محبت کی عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں۔"

وہ کچھ دیر پیشانی پر ہاتھ رکھے اسے سیلوٹ کرتے رہے۔ جب ہاتھ ہٹا کر میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔

"جب آپ کو میری زندگی کے اس داغ دار پہلو کا علم ہوگیا تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ آپ کو ابتداء سے انتہا تک ساری کہانی سنادوں۔

اس آگاہی کے باوجود کہ شوہر حضرات بیویوں کے ماضی کی ایسی باتوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ انہیں کمزور کریکٹر تصور کرتے ہیں اور ایسی کوتاہیوں کی بناء پر ازدواجی زندگی میں تلخیاں بڑھ جاتی ہیں۔"

"مگر میں ایسا شوہر نہیں ہوں۔ ایک حقیقت پسند انسان ہوں۔ پیار محبت کوئی جرم نہیں۔ عمر کے ایک خاص

ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال

پاکستانی ماہر قانون، ادیب، سابق چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ اور جج سپریم کورٹ آف پاکستان۔ حکیم الامت علامہ اقبال کے فرزند۔ لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی ابتداء اسکرڈ ہارٹ مشن ہائی اسکول لاہور سے کی۔ اس کے بعد سینٹ فرانسس سے مڈل کیا۔ پانچویں جماعت سے سینٹر ماڈل اسکول لاہور میں داخلہ لیا۔ ایک سال اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی گیٹ میں بھی پڑھتے رہے، وہیں سے میٹرک کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی اے پاس کرنے کے بعد 1954ء میں انگریزی اور فلاسفی میں ایم اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور طلائی تمغہ حاصل کیا۔ 1949ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور وہاں کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ 1945ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی اور 1965ء میں بار ایٹ لا ہوئے۔ 1956ء سے 1970ء تک پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں قانون کی تعلیم دیتے رہے۔ 1960ء میں آسٹریلیا کے شہر کینبرا میں "ایشیا میں آئین کا مستقبل" کے مذاکرے میں شرکت کی۔ تین مرتبہ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ 62-1961ء میں حکومت امریکا کی دعوت پر وہاں گئے اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں "اقوام متحدہ کا مستقبل" پر لیکچر دیے۔ 1965ء میں ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے نائب صدر اور 1971ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ 23 مارچ 1981ء سے 4 اکتوبر 1986ء تک لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہے۔ پھر انہیں سپریم کورٹ کا جج مقرر کیا گیا۔ متعدد انگریزی اور اردو کتابوں کے مصنف ہیں۔ ممتاز ادیب تنویر ظہور نے یادیں کے نام سے ان کی حالات زندگی تحریر کی۔

مرسلہ: ضیاء الاسلام۔ گجرات

جم

(27 صفر 864ھ /22 دسمبر 1459ء ۔ 29 جمادی الاوّل 900ھ /25 فروری 1495ء)

جم بن سلطان محمد ثانی۔ سلطنت عثمانیہ کا ایک سلطان۔ ماں کا نام چیچک خاتون تھا جو سلطان محمد ثانی کی ایک کنیز تھی جس کو سلطان نے اپنے حرم میں داخل کرلیا تھا۔ جم کا تعلق سربیا کے شاہی خاندان سے بتایا جاتا ہے۔ 873ھ /1469ء میں جم کو دو اتالیقوں کے ساتھ قسطمونی کے سنجاق کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ 879ھ 1474ء میں وہ اپنے متوفی بھائی مصطفیٰ کی جگہ قرہ مان قونیہ کا گورنر بنا۔ سلطان محمد ثانی کی وفات کے بعد قرہ مانی کے دشمنوں نے ینی چریوں کی مدد سے 886ھ /1481ء میں جم کی جگہ آکر بروسا پر قبضہ کرلیا۔ یہاں اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ بھی جاری کیا۔ بایزید نے اس کی تجویز کو کہ مملکت کو آپس میں تقسیم کرلیا جائے رد کردیا اور 886ھ /1481ء میں ینی شہر کے مقام پر بایزید نے جم کو شکست دی۔ شکست کے بعد جم قونیہ کی طرف نکل گیا اور طرسوس میں پناہ گزین ہوا۔ یہ علاقہ اس وقت مملوکوں کے زیر حکومت تھا۔ جب مملوکوں کے دارالسلطنت میں پہنچا تو سلطان قایت بائی نے اس کا بڑے جوش و خروش سے استقبال کیا۔ 887ھ /1482ء میں قرہ مانی مدعی حکومت قاسم بیگ اور انقرہ کے سنجاق بے محمد نے اسے اناطولیہ واپس جانے کی ترغیب دی۔ چنانچہ سلطان قایت بائی نے اسے اناطولیہ جانے کی اجازت دے دی۔ قاسم اور محمد بھی مملوکوں کے علاقے میں اس سے آملے اور قونیہ کا محاصرہ کرنے کے لیے آگے بڑھے تو محمد بیگ کو جو انقرہ کی طرف بڑھ گیا تھا، شکست ہوئی اور اسے چبق اووہ کے مقام پر قتل کردیا گیا۔ قاسم اور محمد محاصرے کا خیال چھوڑ کر انقرہ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے لیکن جب انہوں نے

جسے میں لڑکے لڑکیاں کسی کو پسند کرتے ہیں تو یہ ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ اس کو جرم قرار دینا ظلم ہے، زیادتی ہے۔"
میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپایا پھر بولے۔
"مجھے تو اس بات کا افسوس ہے کہ اتنا عالی ظرف انسان تمہارا شریک حیات نہ بن سکا۔ وہ جو خوشیاں تمہیں نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے اس نے تمہیں مجبور کیا کہ تم مجھ سے شادی کرلو۔"

"تو آپ نے میرا یہ جرم معاف کردیا؟"
"میں نے کہا ناں پیار کرنا کوئی جرم نہیں، کوئی قصور نہیں، کوئی غلط کام نہیں۔"
چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "آپ نے بھی کبھی کسی سے محبت کی؟"
"محبت کرنے کی کبھی مہلت ہی نہیں ملی۔"
"اسٹوڈنٹ لائف میں بھی؟"
"طالبعلمی کے دنوں میں بھی مجھے ابا جی کے کام میں ان کا ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ اس لیے کالج اور یونیورسٹی سے چھٹی ہوتے ہی بھاگم بھاگ فیکٹری جانا پڑتا تھا۔ سین جی!" نفیس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم کاروباری لوگ ہیں۔ ہماری محبت، ہمارا پیار اپنے کاروبار سے ہوتا ہے۔ ہم اگر کسی اور طرف دل لگائیں تو ہمارا کاروبار متاثر ہوتا ہے۔"
"تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے ملازمت کیوں کی۔ ابا جی کے کاروبار کو مکمل طور پر کیوں نہیں سنبھالا؟"

"ارادہ تو یہی تھا، مگر ایک بہت بڑے پرائیوٹ ادارے کی طرف سے ایک بڑے عہدے پر کام کرنے کی دعوت ملی تو ابا جی نے کہا یہ نوکری کرلو۔ ایک بڑا سرمایہ گھر آئے گا۔ فیکٹری تو میں چلا ہی رہا ہوں۔ اس طرح میں نے ملازمت کرلی اور تھوڑا بہت وقت فیکٹری کو بھی دینے لگا۔ مگر اب ابا جی کی صحت پہلے جیسی نہیں رہی ہے۔ اس لیے وہ بھرپور توجہ کاروبار پر نہیں دے پاتے۔ سارا کام ملازموں کے بل بوتے پر ہوتا ہے جو اطمینان بخش نہیں ہوتا۔"

میں نے بھی یہ محسوس کیا کہ ابا جی موجودہ صورت حال سے پریشان رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے فیکٹری جاتے ہیں تو وہاں سے فکرو تردد لیے واپس آتے ہیں۔ باپ بیٹوں کو اکثر اس طرح کی باتیں کرتے سنتی ہوں۔
"نوکر پھر نوکر ہی ہوتے ہیں۔ وہ ہماری طرح توجہ، لگن اور جانفشانی سے کیسے کام کرسکتے ہیں۔"
"یہ بات نہیں ابا جی! نوکر تو میں بھی ہوں۔ نوکری کا

یہ خبر سنی تو بایزید ثانی کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج بڑھی چلی آرہی ہے تو وہ دونوں واپس لوٹ آئے۔ جم نے تاش ایلی میں پناہ لی۔ یہاں پہنچ کر جم نے بایزید سے صلح کی بات چیت کی لیکن وہ تقریباً ناکام رہی۔ قاسم نے جو اپنا علاقہ دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جم کو سمندر کے راستے روم جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اس نے رودس میں گرینڈ ماسٹر پی ڈی ابیوسن سے عہد و پیما کرلیا۔ جم کے اس سے پہلے ہی سے تعلقات تھے جب وہ اپنے باپ کے زمانہ میں قرہ مان کا گورنر تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے جم کو رودس میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت مل گئی۔ پی ڈی ابیوسن نے پوپ کو لکھا کہ جم کو مملکت عثمانیہ کے تباہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ادھر جم کا خیال تھا کہ اب وہ اپنے بھائی بزید ثانی کو اس بات پر راضی کرلے گا کہ مملکت عثمانیہ آپس میں تقسیم کرلی جائے لیکن بایزید نے 887ھ/1482ء میں نائٹوں سے معاہدہ صلح کرلیا جس کے تحت یہ طے پایا کہ نائٹ جم کو پوری طرح قابو میں رکھیں گے اور وہ بایزید کو تنگ نہ کرسکے گا اور بایزید اس کام کے عوض انہیں پینتالیس ہزار سالانہ وینس کے طلائی سکے دیتا رہے گا۔ پی ڈی ابیوسن نے جم سے یہ وعدہ کیا کہ اسے براہ فرانس ہنگری پہنچا دیا جائے گا۔ جم کو فرانس میں سات سال نظر بند رکھا گیا۔ جم چونکہ ایک اہم سیاسی قیدی تھا۔ وہ جس کے پاس بھی رہتا تھا ایک تو اس کا سیاسی بھرم بڑھتا تھا۔ دوسرے اسے رقم بھی ملتی تھی۔ اس لیے ہر ایک اسے اپنے پاس رکھنے کا خواہش مند تھا۔ جب جم فرانس میں نظر بند تھا تو بایزید نے اس کے تین سالہ بچے اوغوز خان اور اپنی سلطنت کے سب سے طاقت ور فرد گدک احمد پاشا کو قتل کرادیا۔ 900ھ/1495ء میں شاہ فرانس جم کو بادشاہ نیپلز پر حملہ کرنے کے وقت اپنے ساتھ لے گیا لیکن جم راستے میں بیمار ہوگیا اور نیپلز پہنچ کر اس کا انتقال ہوگیا۔

مرسلہ: نعیم عطاری۔ کراچی

یہ مطلب نہیں کہ حرام کی تنخواہ لی جائے۔ مالک جو پیسے دیتا ہے اس کا حق ادا نہ کیا جائے۔"

"تو پھر کیا کروں؟ ان تمام حرام خوروں کو نکال کر فیکٹری بند کردوں؟ کیونکہ ان کی موجودگی میں تو ہماری لال بتی جل جائے گی۔"

"نہیں ابا جی! ہم اتنے بھی کمزور نہیں ہوئے کہ اپنے چلتے ہوئے کاروبار کو ختم کردیں۔"

"تم کیا کرو گے بیٹے......؟"

"کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔"

اور پھر یقیناً نفیس نے ہی کچھ کیا تھا۔ کیا کیا گھر کی خواتین کو اس کا علم نہیں تھا۔ مگر میں محسوس کررہی تھی کہ اب ابا جی کی فکر اور پریشانی میں روز بروز کمی ہوتی جارہی تھی۔ اب وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگے تھے۔

ایک دن میں نے نفیس سے کہا۔ "میں نے جو اتنا لکھا پڑھا ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ تو برباد ہورہی ہے۔ مجھے بھی کوئی کام دیجیے۔ کچھ نہیں تو فیکٹری کی نگرانی پر ہی مجھے لگا دیجیے۔"

"نہیں۔ اب فیکٹری کو ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ اسے ایک صحیح نگراں مل گیا ہے۔ جس نے دیمک کی طرح چاٹنے والے کارندوں کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا ہے۔ اور دیانتدار اور محنتی لوگوں کو بھرتی کرلیا ہے۔ فیکٹری اب ترقی کی راہ پر گامزن ہوگئی ہے۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔"

"یعنی میں صرف بچوں کی فیکٹری......"

"ہاں، یہ بھی بہت بڑا کام ہے، لگی رہو اس میں۔"

بڑے گھروں کی خواتین کا بھی عجیب مسئلہ ہوتا ہے۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ گھر کا سارا کام نوکر چاکر کرتے ہیں۔ خواتین سیر سپاٹے کرتی ہیں۔ شاپنگ کرتی ہیں یا کسی فلاحی کام میں تھوڑا وقت گزار لیتی ہیں۔

وقت گزرتا رہا اور میرا وقت بھی کسی نہ کسی طرح کٹتا رہا۔ جب میں کسی غریب عورت کو دیکھتی جو غربت اور افلاس کی وجہ سے حالات کی ماری نظر آتی تو ایک لمحہ کے لیے مجھے خیال آتا۔ اگر میں گلزار سے شادی کرلیتی تو شاید میری حالت بھی اس عورت سے ملتی جلتی ہوتی اور میں لرز کر رہ جاتی اور اپنے بڑے، بزرگوں اور گلزار کو دعائیں دیتی۔ جن کے مجبور کرنے پر آج رانی بن کر سسرال میں راج کررہی ہوں۔

شادی کے بعد اتنا عرصہ گزر گیا تھا۔ تین بچوں کی ماں

بن گئی تھی۔ زندگی ہر طرح سے عیش و عشرت میں گزر رہی تھی۔ شوہر کی محبت کا یہ عالم تھا کہ کبھی تیز لہجے میں بات نہیں کی۔ ساس سسر نے میرے پیدا کرنے والے ماں باپ سے زیادہ پیار دیا۔ میری مرضی اور رضا کے بغیر گھر کا کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ دونندوں کی شادی کا سارا بندوبست میری نگرانی میں ہوا۔ میرے لیے یہ گھر جنت سے کم نہیں تھا۔ مگر میں کبھی کبھی اپنے آپ کو ایک مجرم کی طرح محسوس کرتی تھی۔ جس شخص کی انتھک کوششوں نے مجھے اس جنت تک پہنچایا تھا۔ میں نے کبھی اس بارے میں یہ جاننے کی کوشش نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ یہ بڑی بے مروتی تھی۔ احسان فراموشی تھی۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ مجھے خود بھی اس کا پتا نہیں تھا شاید میرے دل کے کسی تہ خانے میں یہ خوف پوشیدہ تھا کہ اگر میں گلزار کے بارے میں کسی جانکاری کو آگے بڑھاؤں اور اس کی بھنک نفیس کو مل جائے تو اس کے دل میں یہ خلش کہیں کانٹا بن کر تکلیف کا سبب نہ بنے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور نہ ہو کہ میرا تعلق اب تک اپنے سابقہ محبوب سے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہی بات ہو، یہی خوف ہو یہی خدشہ ہو، کچھ بھی ہو میں اپنے آپ کو اپنی اس حرکت پر مجرم اور قصوروار سمجھتی تھی۔ یہ احساس مجھے اندر ہی اندر بچھو کی طرح ڈستا۔ میں کتنی بری ہوں۔ سب نے تو میرے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ بس اک میں ہی بری ہوں، باقی سب لوگ اچھے ہیں۔

اس گھر میں سب میرے چاہنے والے لوگ تھے مگر میں کسی سے اپنے دکھ، اس تکلیف کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ کیسی مجبوری تھی، وقت گزرتا رہا اور میں سوچتی رہی شاید میرے اس دکھ کا مداوا کبھی ہو جائے۔

ایک دن ایکسپو سینٹر میں منعقد ہونے والے کتابوں کے میلے میں گلزار سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی سسرالی جاننے والا تو مجھے نہیں دیکھ رہا ہے۔

''کیا ہوا۔ کسے دیکھ رہی ہو؟''

اس کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ ''یہ بچے تمہارے ہیں؟''

''ہاں۔''

''میں ان کی ماں کو ہی تلاش کر رہی تھی۔''

وہ ہنسا۔ ''نہیں...... وہ ہمارے ساتھ نہیں آئی ہے۔ ہوتی بھی تو تمہیں دیکھ کر......''

''چھوڑو اس بات کو۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہاں ہو، کیسے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ کب شادی کی؟''

''بہت طویل کہانی ہے پھر بھی اے دوست۔ مختصراً یہ کہ زندہ ہوں اس طرح کہ غم زندگی نہیں۔''

''اوہ! مجھے کھونے کے بعد بھی؟'' جانے یہ جملہ کیسے میرے منہ سے نکل گیا تھا۔

''ہاں، کبھی کبھی ہار بھی جیت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ تمہیں کھو کر خود کو پا گیا تھا۔ تمہیں ایک اچھے گھر اور ایک اچھے بر تک پہنچا کر مجھے جو خوشی حاصل ہوئی تھی میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔''

''تم نے یہ نہیں بتایا کہ اس دوران تم کیا کرتے رہے؟''

''مجھے کسی کالج میں کوئی ملازمت نہیں ملی تو میں ایک اسکول میں پڑھانے لگا۔ ایک دن ایک نیک دل آدمی نے مجھ سے کہا۔ ''کیا کسی حکیم نے نسخے میں لکھا ہے کہ پڑھانے کا ہی پیشہ اختیار کرو؟'' اس نے مجھے ایک ادارے میں لگا دیا جہاں معقول تنخواہ تھی۔ پھر کچھ عرصے بعد اس نے مجھے ایک بڑے ادارے میں لے جا کر ایک بڑے عہدے پر لگا دیا۔ یوں مجھو منیجر بنا دیا۔''

''اور تم نے وہاں جا کر آپریشن کلین اپ کر کے اس ادارے کو......''

''ہاں۔ بالکل ایسا ہی ہوا۔ مگر تمہیں کیسے معلوم؟''

''یہ تو تمہاری پرانی عادت ہے کہ دوسروں کو جہاں تک ممکن ہو فائدہ پہنچاؤ۔'' پھر بات بدلنے کے لیے میں ایک دم بول پڑی۔ ''تم نے تو کبھی پلٹ کر میری خبر نہیں لی کہ میں کس حال میں ہوں۔ کیسی ہوں۔؟'' یہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والی بات تھی۔

وہ مسکرایا۔ ''مجھے روزِ اوّل سے ہی اس بات کا اطمینان تھا کہ تم شاد ہو، آباد ہو۔''

اچانک مجھے خیال آیا کہ بچوں کو تو میں نے پیار ہی نہیں کیا۔ لہٰذا بیٹے سے پوچھا۔

''منا! کیا نام ہے تمہارا؟''

''مختار۔''

''اور گڑیا۔ تمہارا کیا نام ہے؟''

''سبین!''

میں حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی کہ اس نے محبت کو مرنے نہیں دیا ہے لیکن پھر میں نے اس سے ملنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

محسن قاتلہ

محترم مدیر
السلام علیکم
ایک دلچسپ سرگزشت ارسالِ خدمت ہے جس نے مجھے دہلا دیا ہے۔ لوگ کس طرح اپنی مفاد کی خاطر انسانیت کو بھی بھلا دیتے ہیں۔ اُمید ہے قارئین کو بھی میری کاوش پسند آئے گی۔
غزالہ جلیل رائو
(اوکاڑہ)

میں وکیل ہوں۔ میرا پیشہ بھی ڈاکٹروں جیسا ہے۔ لوگ اسپتالوں میں ڈاکٹروں کی بے حسی کے شاکی ہوتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ڈاکٹر بھی انسان ہوتے ہیں انسانیت کا دکھ دور کرنے کے خواہاں مگر ان کا واسطہ دن رات مریضوں سے رہتا ہے، وہ ان میں اُلجھے رہتے ہیں اور پھر ان کی اپنی اُلجھنیں بھی ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ کسی مریض پر انفرادی توجہ نہیں دے پاتے اور مریض ان سے نالاں ہو جاتے ہیں۔ وکیل کی کیفیت بھی ڈاکٹروں سے

مختلف نہیں ہوتی۔ جرم و سزا کے ایسے ایسے عبرتناک واقعات اس کے سامنے آتے ہیں کہ وہ کانپ جاتا ہے مگر آہستہ آہستہ یہ سب کچھ زندگی کا معمول بن جاتا ہے اندر بہت کچھ ہوتا ہے مگر باہر نہیں لایا جاسکتا البتہ کبھی کبھی خود پر قابو رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے اور اس وقت جو دل کی... حالت ہوتی ہے خدا جانتا ہے۔ان دنوں یہی کیفیت میری ہے۔ میں ایک مقدمہ قتل میں سرکاری وکیل کی حیثیت سے مقرر کیا گیا ہوں۔

مقتول ایک دولت مند اور بااثر آدمی، قاتل دو ماں بیٹیاں ہیں۔شازیہ ماں ہے ادیبہ بیٹی۔ شازیہ کی عمر تقریباً 37 سال ہے اور ادیبہ کی 19 سالہ ہے۔ شازیہ پُر وقار، پُر تمکنت، دراز قامت عورت ہے۔جس کے چہرے پر چھایا ہوا سکون ساکن سمندر کی مانند ہے جب کہ ادیبہ کے چہرے پر نوجوانی کی سرخی اور آنکھوں میں بچوں کی شوخی ہے۔ دونوں ہنستی مسکراتی عدالت میں آتی ہیں اور بڑے فخر سے کہتی ہیں کہ انہوں نے عمران حسن کو قتل کیا ہے۔ ادیبہ کہتی ہے۔"میں نے ایک ٹھوس لکڑی سے اس کی پنڈلیوں پر ضرب لگائی اور وہ نیچے گر پڑا۔"

ادیبہ کہتی۔"جب وہ نیچے گرا تو میں نے اپنے ناخن اس کی آنکھوں میں اتار دیے پھر میں نے وہ ٹھوس لکڑی اس کے سینے پر بار بار ماری اور اس کی پسلیاں ٹوٹنے کی آوازیں سنتی رہی۔"

دونوں ماں بیٹیاں بڑی شان سے اپنا یہ کارنامہ بیان کرتی ہیں۔ان کے چہرے پر فخر و غرور چھایا ہوتا ہے اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ ان کا یہ فخر یہ غرور بجا ہے۔ کاش اسی کیفیت میں لی تھی مگر قانون کی نگاہ کڑی ہے۔ وہ اس قتل میں وحشت خیزی دیکھ رہا ہے اور وہ اس وحشت خیزی کی سزا دے گا۔ میں جانتا ہوں کہ مقدس اور پاکیزہ چہرے والی یہ عورت سزا پائے گی۔ معصوم اور الھڑ تو خیز سی یہ لڑکی بھی بدترین سزا سے دوچار ہوگی۔ پھر بھی وہ پُرسکون نظر آتی ہیں اور ان کے اس سکون کے پیچھے ایک کہانی پوشیدہ ہے۔ یہ کہانی شازیہ نے ذرا مختلف طریقے سے کمرۂ عدالت میں سنائی تھی۔ میں اسے مکمل ترتیب سے شازیہ ہی کے الفاظ میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ آپ یہ سوچ کر سنیں کہ آپ ان دونوں مجرماؤں کے منصف ہیں۔شازیہ کہتی ہے۔

"میری ماں کا نام نسرین تھا۔ ہمارا گھرانا تین افراد پر مشتمل تھا میں ابو اور امی، گو ہم بہت بڑی حیثیت کے مالک نہیں تھے لیکن زندگی پُرسکون گزر رہی تھی۔ عزیز واقارب اور دوست گھر آتے رہتے تھے۔ ابو مہمان نواز تھے اور ہمیں سب ہی لوگوں کی محبتیں حاصل تھیں لیکن اس وقت تک جب تک ہمارا گھر اس بدترین حادثے سے دوچار نہ ہوا تھا۔

ابو بیمار ہوئے اور تین دن کے اندر چٹ پٹ ہو گئے۔ ہماری دنیا تاریک ہو گئی اور اس کے بعد صرف چند روز تک ابو کے گزرے وقت کی کہانی سنائی گئی اور اس کے بعد سب اپنے اپنے راستے جا لگے۔ اس دور میں رشتے داروں سے ملنے کی فرصت کسے ہوتی ہے، جینے کا وقت ہی مشکل سے ملتا ہے، چنانچہ ہم بھی عزیزوں کے ذہن سے نکل گئے۔ ذہن میں تو تب رہتے نا، جب ہم اچھی حیثیت کے مالک ہوتے،عزیزوں، رشتے داروں کا پیٹ بھر سکتے، جب اپنا پیٹ بھرنا مشکل ہو جائے تو عزیزوں کا پیٹ کیسے بھرتے؟ سو سارے عزیز آہستہ آہستہ دور ہوتے چلے گئے۔ میں میٹرک کر چکی تھی اور انٹر کے سال اوّل میں تھی لیکن اب میری تعلیم کے جاری رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ اخراجات کہاں سے پورے ہوتے؟ بس سر چھپانے کا ٹھکانا تھا سو سر چھپائے بیٹھے رہے۔ پڑوسیوں نے ابتدا میں خاص محبت کا سلوک کیا لیکن آہستہ آہستہ ان کی نگاہیں بھی بدل گئیں۔ بھلا روز روز کون ادھار دیتا ہے؟ سب اپنے اپنے حالات کا شکار تھے۔ تب میں نے بمشکل تمام اپنی ماں سے ملازمت کی اجازت حاصل کرلی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ میں خوب صورت ہوں، بہت حسین ہوں، اسی لیے مجھے فوراً ہی ملازمت مل گئی۔ معقول تنخواہ تھی، سارے دلدر دور ہو گئے۔ کیونکہ ہم صرف دو ہی افراد تھے۔ یہ تنخواہ ہمارے گھرانے کے لیے کافی تھی البتہ لوگوں کی زبانیں طرح طرح سے چلنے لگیں۔ شروع شروع میں تو میری والدہ ان باتوں سے خوفزدہ ہوئیں، پھر نڈر ہو گئیں۔ کتے بھونکتے ہیں بھونکتے رہیں، کون ہمیں دینے آئے گا، کون ہمارے پیٹ بھرے گا۔ سب ہی نے آنکھیں پھیر لی تھیں۔

"بیٹی بڑی احتیاط سے قدم بڑھانا، دنیا بہت بری ہے اور تم ابھی بہت ناسمجھ ہو۔" میری ماں نے ایک دن مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

میں ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔"جب تک باہر کی دنیا نہیں دیکھی تھی بہت عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔ اب لگ رہا ہے کہ خوامخواہ قیدی بن گئے تھے ہم لوگ۔ لاتعداد لڑکیاں نوکری کر رہی ہیں پھر ہم ہی کیوں خوف زدہ ہوں؟"

"پھر بھی بیٹی، یہ دنیا رنگ برنگے سانپوں سے بھری

پڑی ہے۔ان پر نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔‘‘
’’آپ فکر نہ کریں، میں اپنا اچھا برا سمجھتی ہوں امی۔‘‘ میں نے جواب دیا لیکن اماں کی پیشانی سے تردد کی لکیریں دور کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ حالانکہ میں نے آج تک اپنے گرد کوئی سانپ نہیں دیکھا۔ جس فرم میں میں ملازمت کرتی تھی وہاں تو فرشتے بستے تھے۔
علی رضا صاحب اکاؤنٹنٹ تھے۔ عمر رسیدہ آدمی تھے اور یہ نوکری بھی مجھے انہی کے توسط سے ملی تھی۔ کوئی خاص کام نہیں تھا بس فائلنگ کلرک کی حیثیت تھی اور علی رضا صاحب ہی کے کیبن میں میری سیٹ بھی لگی ہوئی تھی۔ علی رضا صاحب بہت نیک اور ہمدرد انسان تھے۔ ہر طرح سے میری مدد کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے ابتداء میں کسی بھی کام میں پریشان نہ ہونے دیا۔ ویسے بھی فطرتاً سادہ لوح تھے۔ دفتر میں سب ہی لوگ علی رضا صاحب کی عزت کرتے تھے۔ خود فرم کے مالک عمران حسن بھی علی رضا صاحب سے عزت سے پیش آیا کرتے تھے۔ ابھی تک میں نے صرف عمران حسن صاحب کا نام ہی سنا تھا۔ انہیں بھی دیکھا نہیں تھا کیونکہ ان کا کیبن فاصلے پر تھا۔ عمران صاحب عقبی دروازے سے اندر آتے تھے اور اسی سے واپس چلے جاتے تھے۔ البتہ مجھے ان کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو چکی تھیں۔ وہی اس فرم کے مالک تھے۔ پہلے وہ اس فرم میں مینیجر تھے لیکن مالک کے بیٹے تھے اس لیے اپنے باپ کی وفات کے بعد اس دفتر کے مالک بن گئے۔ فرم کے لوگ ان سے ناخوش نہیں تھے اور ان کی تعریفیں ہی کرتے تھے۔ کئی بار میرے دل میں اپنے باس کو دیکھنے کی خواہش بیدار ہوئی تھی لیکن کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ ویسے بھی ابھی مجھے اس فرم میں ملازمت کیے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ صرف ایک ہی ماہ ہوا تھا۔ ایک ہی تنخواہ ملی تھی۔
فرم میں میرے علاوہ مختلف کاموں کے لیے دوسری لڑکیاں بھی موجود تھیں اور ان سے آہستہ آہستہ میری شناسائی ہوتی جارہی تھی، فرم ہی کی ایک لڑکی نے ایک دن ایک کارڈ مجھے پیش کیا اور کہنے لگی۔ ’’یہ عام سی رسم ہے لیکن کسی کی خوشی میں شریک ہونا عبادت ہوتی ہے۔ آپ میری سالگرہ میں ضرور آئیے۔ میں نے دفتر کے تمام لوگوں کو مدعو کیا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے باس عمران حسن نے بھی میری سالگرہ میں شرکت کا وعدہ کیا ہے۔‘‘
’’ضرور میں بھی کوشش کروں گی۔‘‘ میں نے جواب دیا۔
’’صرف کوشش نہیں، آپ کو ضرور آنا ہے مس شازیہ۔‘‘
’’ٹھیک ہے ضرور آؤں گی۔‘‘ میں نے کہا۔ بڑی چاہت سے بلایا تھا اس لڑکی نے اس لیے انکار نہ کر سکی۔ میں نے اپنی والدہ سے اس کا تذکرہ کیا۔ کارڈ انہیں دکھایا تو وہ کہنے لگیں:
’’اکیلی جاؤ گی کیا؟‘‘
’’تو کیا دفتر اکیلی نہیں جاتی؟‘‘
’’مگر واپسی میں رات ہو جائے گی۔‘‘
’’مگر امی میں نے وعدہ کرلیا ہے۔ دن بھر ہمارا ساتھ رہتا ہے۔ زندگی اس طرح انسانوں سے دور رہ کر تو نہیں گزاری جاسکتی۔ میں ضرور جاؤں گی۔‘‘ میں نے کہا اور امی خاموش ہو گئیں۔ میں نے ایک چھوٹا سا تحفہ بھی خریدا تھا اور بالآخر اپنی اس کولیگ کے گھر پہنچ گئی۔
’’نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے سب سے زیادہ پُرتپاک استقبال میرا ہی کیا ہو۔‘‘
’’کافی دیر ہو گئی محترمہ آپ کو آنے میں۔‘‘ اس نے کہا۔
’’رکشا ملنے میں دیر ہو گئی تھی۔‘‘
’’بہرحال آپ آ گئیں۔ اب مجھے کوئی شکایت نہیں رہی۔‘‘
جب کیک کاٹا گیا تو دوسرے لوگوں کے ساتھ عمران حسن صاحب نے بھی دل کھول کر تالیاں بجائیں اور اپنی فرم کی ایک معمولی سی کلرک لڑکی کو مبارک باد دی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی انہوں نے ایک خوب صورت سا پیکٹ پیش کیا۔
کیا حسین ماحول تھا اور مکان کتنا خوب صورت تھا اس لڑکی کا، گو چھوٹا سا تھا لیکن تنگ و تاریک گلیوں سے دور، کشادہ سڑک کے کنارے سب لوگ کتنے خوش نظر آرہے تھے۔
’’آپ کیسی ہیں مس شازیہ؟‘‘ کسی کی گونجدار آواز نے پوچھا۔
ایک اجنبی مرد کے منہ سے اپنا نام سن کر میں دنگ رہ گئی۔ میں نے اس کے گہرے نیلے سوٹ میں لگے ہوئے خوب صورت بٹنوں کو دیکھا اور ان میں الجھ کر رہ گئی۔
’’عمران صاحب! تم سے بات کر رہے ہیں

شازیہ۔'' میری دوست نے کہا اور میں نے دیکھا، نیلے سوٹ میں کھلتا ہوا چہرہ بڑی بڑی آنکھیں، کسی قدر تنگ پیشانی لیکن بے حد خوب صورت بال، لمبا قد، غرض بھرپور شخصیت تھی ان کی۔

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ میں حیران بھی تھی کہ عمران حسن صاحب مجھے کس طرح پہچانتے ہیں۔

''کوئی تکلیف تو نہیں ہے آپ کو ہماری فرم میں؟''

''جی نہیں۔'' میں نے جواب دیا اور عمران صاحب کسی دوسرے شخص سے گفتگو کرنے لگے۔

تو یہ ہیں ہماری فرم کے مالک اچھے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ مالک اپنے ملازمین کی خوشیوں سے کب سروکار رکھتے ہیں اور پھر عمران صاحب کی تو کار بھی بہت خوب صورت تھی۔

بادل گھرے ہوئے تھے لیکن بارش کے آثار نہیں تھے۔ سالگرہ کی تقریب جاری تھی کہ بادلوں کی گھن گرج بڑھ گئی اور بارش شروع ہوگئی۔ سب ہی لوگ سالگرہ سے افراتفری کے عالم میں واپس پلٹے تھے اور میں بھی سہمے ہوئے انداز میں راستہ طے کرنے لگی۔ کشادہ سڑکوں سے رکشے، ٹیکسیاں غائب ہوگئی تھیں۔ تب ہی عمران صاحب کی خوب صورت کار میرے قریب آ کر رکی۔ انہوں نے کار کا دروازہ بڑے اعتماد سے کھولا تھا۔

''تکلف نہ کیجیے گا پہلے ہی بھیگ چکی ہیں۔ مزید بھیگنے سے بہتر ہے کہ کار میں آجایئے۔ میں آپ کو ڈراپ کردیتا ہوں۔ ویسے بھی سواری کا ملنا بے حد مشکل ہے۔'' عمران صاحب کا لہجہ نہایت پُرسکون اور پُراعتماد تھا۔

میں بادل نخواستہ کار میں بیٹھ گئی۔ زندگی میں پہلی بار اتنی خوب صورت کار میں بیٹھی تھی۔ عمران صاحب کی کار سڑک پر پھسلنے لگی۔ میں سہمی سکڑی بیٹھی ہوئی تھی۔ تب ہی عمران صاحب بولے۔ ''آپ تکلف کر رہی تھیں مس شازیہ؟''

''وہ مس...... سر آپ کو بہت زحمت ہوئی ہے۔'' میں ہچکچا کر بولی۔

''ٹھیک ہے یہ آپ کا خیال ہے میرا تو نہیں، میرے خیال کے مطابق مجھے کوئی زحمت نہیں ہوئی۔''

''سر آپ بہت اچھے انسان ہیں۔''

''شکریہ۔'' انہوں نے مختصراً کہا۔

''آپ کے بارے میں، میں نے سب لوگوں سے تعریفیں سنی تھیں۔ سر آپ واقعی بہت اچھے انسان ہیں۔'' میں نے کہا۔

عمران صاحب آہستہ سے ہنس پڑے۔ پھر بولے۔ ''نہیں بھئی، اچھا انسان ہوں یا نہیں لیکن اچھا بزنس مین ہوں، اس بارش میں اگر آپ سفر کرتیں تو بیمار ہوجاتیں پھر آپ کو چند روز کی چھٹیاں لینی پڑتیں اور مجھے نقصان ہوتا۔''

میں عمران صاحب کو دیکھنے لگی، جو کچھ وہ کہہ رہے تھے صرف مذاق ہی ہوسکتا ہے۔ ورنہ اتنے بڑے آدمی کو بھلا اتنی چھوٹی باتوں کا کیا احساس ہوگا۔ وہ پھر بولے۔ ''آپ اس انداز سے کیوں سوچتی ہیں مس شازیہ، آخر انسانیت کے بھی کچھ فرائض ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ کار میرے بجائے آپ کے پاس ہوتی اور میں بارش میں کھڑا کہیں بھیگ رہا ہوتا۔''

''سر آپ بے حد مہربان انسان ہیں۔ بے حد شریف، بے حد باوقار......'' میں نے پُرخلوص جذبے کے ساتھ کہا۔

''آپ کو اس بات کا یقین ہے؟'' عمران صاحب نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''جی سر مجھے پورا پورا یقین ہے۔''

''تب پھر وہ دیکھیے سامنے ایک ریستوران نظر آرہا ہے اور میرا دل کافی پینے کو چاہ رہا ہے، کیا آپ میرا ساتھ دیں گی؟ دیکھیے میں جانتا ہوں کہ وقت کافی ہوچکا ہے اور آپ کے گھر والے آپ کے لیے پریشان ہوں گے لیکن ہم زیادہ وقت نہیں ضائع کریں گے، کافی پی کر فوراً ہی اٹھ جائیں گے۔ آخر اتنی دیر آپ کو رکشا ٹیکسی کی تلاش میں بھی لگ ہی جاتی، کیا خیال ہے؟''

میں کچھ نہ بول سکی تھی۔ اتنی دیر میں عمران صاحب نے گاڑی اس ریستوران کے سامنے پارک کردی اور دروازہ کھول کر نیچے اتر آئے۔ مجھے کافی عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس سے قبل میں نے کسی ریسٹورنٹ کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''سر سنیے سر......''

''جی...... جی فرمایئے۔''

''میں اس سے پہلے کسی ریسٹورنٹ میں نہیں گئی۔ یہاں کے آداب مجھے نہیں معلوم۔''

''اوہ آیئے۔'' انہوں نے کہا اور اس ریسٹورنٹ کے چھوٹے سے خوب صورت ہال کے کونے کی ایک میز پر جا

بیٹھے۔ میز پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے کہا:
"آپ یقین کیجیے مس شازیہ! آپ کے ان چند الفاظ نے آپ کی عظمت میرے دل میں بڑھا دی ہے۔"
"جی کون سے الفاظ؟"
"معمولی سے دفتروں میں معمولی تنخواہ پانے والی پرانے لباس کو درست کر کے پہننے والی لڑکیاں بڑے بڑے ہوٹلوں کا ذکر کرتی ہیں۔ اعلیٰ سوسائٹی کی بات کرتی ہیں، آپ خود سوچیے مس شازیہ آخر وہ ان ہوٹلوں میں کیوں جاتی ہیں، ان کے ساتھ کون ہوتا ہے؟ کیا اس کے باوجود ان کے کردار پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ خود کو چھپانے کے لیے انسان بہت کرتا ہے۔ اگر آپ ریستوران میں نہیں آئیں تو خود کو چھپانے کے لیے تھوڑی سی محتاط ہو جاتیں اور کوئی ایسا کام نہ کرتیں جس سے آپ کی اس ماحول سے اجنبیت ظاہر ہوتی لیکن یہ ساری تکالیف اٹھانے کے بجائے آپ نے ایک سیدھی سی بات کہہ دی کہ آپ اس ماحول سے ناواقف ہیں۔ میرا خیال ہے یہ بے داغ چہرہ آپ کے بے داغ دل کی غمازی کرتا ہے۔" عمران صاحب کہتے رہے۔ اس دوران انہوں نے ویٹر کو کافی کا آرڈر دیا اور میں ان کے الفاظ میں کھوئی رہی۔ ویٹر کو آرڈر دینے کے بعد وہ بولے۔
"اب میں اتنا بڑا بزنس مین بھی نہیں ہوں کہ یہاں بیٹھ کر آپ سے کاروباری گفتگو شروع کر دوں۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیے کچھ میرے بارے میں پوچھیے کیا خیال ہے؟"
"جی۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔
"اچھا یوں گفتگو شروع کریں کہ میرے بارے میں آپ کے ذہن میں کوئی سوال ابھرتا ہے اور ابھرتا ہے تو کیا؟"
"میں حیران ہوں کہ آپ...... آپ نے مجھے میرے نام سے مخاطب کیسے کیا؟ آپ مجھے کیسے پہچان گئے جب کہ آپ نے مجھے کبھی نہیں دیکھا۔" میں نے نہ جانے کس طرح اتنی بے تکلفی سے یہ سوال کر ڈالا جب کہ مجھے یہ سب کچھ بے حد عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ قصے کہانیوں کی سی باتیں تھیں یہ سب۔
اس سوال میں بڑی معصومیت ہے۔ آپ میری فرم کی ایک رکن ہیں اور میں اپنی فرم کا نگران ہوں۔ ایک اچھے نگراں کو اپنے ساتھیوں کے بارے میں معلومات ہونی ہی چاہئیں۔ آپ سے براہِ راست ملاقات نہیں ہوئی یہ دوسری بات ہے۔
"جی...... جی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔
"اس کے علاوہ مس شازیہ میں لوگوں کے بارے میں معلومات بھی حاصل کرتا رہتا ہوں حالانکہ آپ کو ہمارے یہاں آئے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا لیکن مجھے معلوم ہے کہ آپ میرے دفتر میں کام کرنے والی دوسری لڑکیوں سے کافی مختلف طبیعت کی ہیں۔ دفتر میں آکر آپ صرف اپنا کام کرتی ہیں جب کہ دوسری لڑکیاں اسے تفریح گاہ بنانے کی کوششوں میں لگی رہتی ہیں۔"
میری کارکردگی کا اعتراف کیا جا رہا تھا اور مجھے دلی خوشی ہو رہی تھی۔ کافی ختم ہوئی اور عمران صاحب نے بل طلب کیا۔ بل ادا کر کے وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ "آئیے چلیں۔ آپ نے میری یہ دعوت قبول کر کے مجھے عزت بخشی ہے لیکن میں آپ کو زیادہ دیر تک روک کر آپ کی امی کو پریشان نہیں کروں گا۔"
بلاشبہ میں نے بھی سوچا تھا کہ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ بہت عظیم اتنے بڑے ادارے کے مالک لیکن غرور نام کو نہیں ہے۔ دوسروں کا احساس رکھتے ہیں۔
کار چلاتے ہوئے عمران صاحب نے کہا۔ "مس شازیہ آپ سے زیادہ باتیں نہیں ہو سکیں، آپ کے بارے میں مجھے کچھ بھی پتا نہیں چل سکا لیکن کوئی بات نہیں چونکہ وقت مختصر اور آپ کی پریشانی مجھے ان تمام باتوں سے زیادہ عزیز ہے۔ خیر آئندہ بھی فرصت ملے گی۔"
میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ درحقیقت میں امی کی وجہ سے پریشان تھی، وہ تو ویسے ہی میری وجہ سے الجھی رہتی تھیں۔ نہ جانے کیا کیا سوچ رہی ہوں گی اور اگر میں عمران صاحب کی اس مہربانی کے بارے میں انہیں بتا دوں تو وہ اپنے ذہن میں پوری کہانی تیار کر لیں گی۔ کیونکہ یہ ان کی عادت ہے۔ ہفتوں کے لیے نیند اڑ جائے گی۔ بہتر یہی ہے کہ جھوٹ بولا جائے۔ ہاں امی کی بہتری کے لیے میرا جھوٹ بولنا ہی مناسب ہوگا۔
پھر میرا گھر آگیا اور اشارے پر عمران صاحب نے کار روک دی۔ "بس سر مجھے یہیں اتار دیں۔" میں نے لجاجت سے کہا۔
"اوہ ہاں ٹھیک ہے، دل تو چاہتا تھا کہ آپ کو آپ کے گھر کے قریب اتاروں لیکن ان بستیوں میں تجسس بہت ہوتا ہے۔ یہاں سب ایک دوسرے کی کھوج میں رہتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ لوگ کسی طور آپ کی طرف کسی نگاہ

انہوں نے کہا۔ ''مس شازیہ ٹائپسٹ کی حیثیت سے آپ کی تنخواہ میں اضافہ ہوگیا ہے اور اب آپ کو دو ہزار روپے ماہوار ملا کریں گے۔''

جب میں گھر میں داخل ہوئی اور میں نے ماں کو تنخواہ بڑھ جانے کی خوش خبری سنائی تو ماں کے چہرے پر کوئی خوشی کی لکیر پیدا نہ ہوئی۔ ماں نے کہا۔ ''احتیاط سے اخراجات کرنا، تنخواہ بڑھ جانے کی خوشی میں پیسا پانی کی طرح بہانے مت لگ جانا۔''

میں حیران رہ گئی، میں نے کہا۔ ''آپ کو خوشی نہیں ہوئی امی؟''

''نہیں بیٹی، خدا کرے تو دنیا کی ساری خوشیاں دیکھے لیکن بیٹی ہمیں پیسے کی ضرورت ہے۔''

''آپ کیا کریں گی امی پیسے کا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں ان بدنصیب ماؤں میں سے ہوں شازیہ جو اپنی بیٹی کی کمائی سے اس کا جہیز تیار کرتی ہیں۔'' ماں نے کہا۔

میں خاموش ہوگئی۔ میرے اندر ایک عجیب سی کیفیت ابھر آئی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''نہیں امی میں شادی نہیں کروں گی میں کبھی آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ میرے بعد آپ کا کیا ہوگا؟''

''دیوانی! لڑکیوں کے والدین تو ہمیشہ سے تنہا ہوتے ہیں۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ بیٹی کو ہمیشہ اپنے ساتھ نہیں رکھا جاسکتا۔ اسے اس کے اصلی گھر بھیجنا ہی پڑتا ہے۔'' میں خاموش ہوگئی۔

وقت گزرتا رہا۔ میں عمران حسن صاحب کے دفتر میں محنت سے کام کرتی رہی۔ اس مہربان شخص کے لیے میرے دل میں بے پناہ عزت تھی۔ پھر میری زندگی میں ایک بھونچال آیا۔ اس دن میں نے ایک ایسا ہی منظر دیکھا جس نے میرا دل ہلا کر رکھ دیا۔ میری ماں باورچی خانے سے نکلی تھیں اس طرح خلا میں ہاتھ چلانے لگی تھیں جیسے خدانخواستہ وہ اندھی ہوگئی ہوں۔ میں بے اختیار ان کی جانب دوڑی۔

''کیا بات ہے امی، کیا ہوگیا، کیا بات ہے؟''

''مجھے سہارا دے کر اندر لے چلو شازیہ۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا۔'' انہوں نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا اور میں انہیں سہارا دے کر اندر لے گئی۔ وہ چارپائی پر لیٹ کر گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔

''کیا بات ہے امی، چکر آگیا کیا؟''

''ہاں چکر آگیا تھا۔'' ان کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے آنکھیں کھول کر میرا چہرہ دیکھا اور مجھے خود سے قریب گھسیٹ لیا اور پھر ہیجانی انداز میں میرے چہرے کو اپنی آنکھوں کے قریب لے آئیں ان کی آواز ابھری۔ ''آہ شازیہ میں تجھے جی بھر کے دیکھ لینا چاہتی ہوں ممکن ہے میں پھر تجھے نہ دیکھ سکوں شازیہ...... شازیہ۔''

میں بے قرار ہوگئی۔ ''کیا بات ہے امی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''بس یونہی جذباتی ہوگئی تھی بیٹی، کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' امی نے گہری گہری سانس لے کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئیں۔ تھوڑی دیر تک وہ مجھے اپنے سینے سے بھینچے رہیں پھر محبت بھرے لہجے میں بولیں۔ ''دفتر جانے کی تیاری کرو۔ تمہیں دیر ہورہی ہوگی۔''

''ہرگز نہیں، امی آپ کو بتانا پڑے گا کہ آپ ایسی باتیں کیوں کررہی ہیں؟ آپ کو میری جان کی قسم امی، مجھے بتایئے کیا بات ہے؟'' میں نے ضد کرتے ہوئے کہا اور امی نے کرب انگیز انداز میں آنکھیں بند کرلیں۔

''میری بینائی ختم ہوتی جارہی ہے شازیہ اور آج تو ہر چیز دھندلا گئی ہے، اب تو کچھ بھی صاف نظر نہیں آرہا۔'' وہ سسکتی ہوئی آواز میں بولیں اور میں دنگ رہ گئی۔

''کیسے امی، ایسا کیسے ہوا، کب ہوا؟''

''میں نہیں جانتی بس میری آنکھوں میں کئی ماہ سے درد تھا۔ سر میں بھی درد رہتا ہے اور بینائی کم ہوتی جارہی تھی اور شاید اب......'' ان کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔

''امی آپ نے زیادتی نہیں کی ہے میرے ساتھ؟ پہلے کیوں نہیں بتایا آپ نے، کیا آپ کا علاج نہیں ہوسکتا تھا؟''

''تو میرا بیٹا نہیں بیٹی ہے شازیہ۔ مائیں بیٹیوں کی کمائی پر ناز نہیں کرتیں، بیٹیوں کی کمائی تو قرض ہوتی ہے والدین پر، جسے وہ چکانے کے خواہش مند ہوتے ہیں مگر چکا نہیں سکتے۔ کیونکہ اگر وہ قرض چکا سکیں تو بیٹیوں کو باہر ہی کیوں جانے دیں۔''

''میں آپ کا علاج کراؤں گی امی، میں آپ کو آج ہی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گی۔''

''نہیں اگر تو ایسا کرے گی تو میں خودکشی کرلوں گی۔ میں مرجاؤں گی۔'' امی رو پڑیں اور میری لاکھ خوشامدوں

ڈالیں اس لیے خدا حافظ۔"

کار آگے بڑھ گئی۔ میرا دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ کیسے اچھے اچھے لوگ ہیں اس دنیا میں اور امی...... وہ تو بلاوجہ باہر کے ماحول سے خوفزدہ ہیں۔ میری بستی کے رہنے والے تو بلاوجہ ہی جہالت کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ کیسا اچھا انسان ہے، یہ کتنی اچھی باتیں کرتا ہے۔ اَن کہے جان جاتا ہے۔ کیسی باریک باتیں سوچ لیتا ہے۔ دوسروں کی عزت کا اسے کتنا خیال ہے۔ عام لوگ تو ایسے نہیں ہوتے۔ وہ عام لوگوں سے بالکل الگ ہے، گھر تک پہنچنے میں باقی وقت جھوٹ تراشنے میں صرف کیا تاکہ امی کو مطمئن کر سکوں۔ میں نے کہا کہ میں رکشا سے آئی ہوں۔ وہ واقعی میرے لیے پریشان تھیں۔

دوسرے دن پھر وہ ہی دفتر، وہی ماحول، وہی لوگ، میری نگاہیں بار بار اس جانب اٹھ جاتیں جدھر عمران حسن صاحب کا کیبن تھا لیکن کئی روز گزر گئے میں نے ان کی صورت نہیں دیکھی۔ بھلا میرے لیے معمول میں تبدیلی کیسے پیدا ہو سکتی تھی۔ آنے کے لیے وہی عقبی دروازہ اور اسی دروازے سے واپسی، میری آنکھیں اس دروازے کا طواف کرتیں اور اس کے بعد میں آہستہ آہستہ وہ سب کچھ بھول گئی۔ ویسے عمران حسن صاحب بھولنے کی چیز نہیں تھے۔ کئی بار جی چاہا انہیں دیکھنے کے لیے لیکن میں نے خود کو سنبھال لیا۔ یہ تو حماقت کی بات تھی۔ ظاہر ہے وہ باس تھے میرے۔ رحم و ہمدردی کے جذبات سے انہوں نے وہ سب کچھ کیا تھا۔ کوئی دوستی تھوڑی ہو گئی تھی ہماری۔ اسی دوران ایک دن احمد علی صاحب نے مجھے میری جگہ سے اٹھا کر دوسری میز پر بٹھا دیا اور کہنے لگے۔ "ٹائپنگ سیکھ لیجیے آپ، یہ مشین آپ کے لیے ہے۔ آپ یقیناً ٹائپ نہیں جانتی ہوں گی؟"

"جی...... جی نہیں۔"

اسی لیے کہہ رہا ہوں۔ مشق کر لیجیے۔ اس کے بعد روزانہ دو گھنٹے مجھے ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھنا پڑتا تھا۔ احمد رضا صاحب مجھے بہترین تربیت دے رہے تھے اور میرے تجربے میں ٹائپنگ کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

تقریباً بیس دن تک میں نے ٹائپ کیا اور اس کے بعد ایک دن احمد رضا صاحب نے میرا ٹیسٹ لیا۔ اچھی خاصی اسپیڈ ہو گئی تھی میری۔

"گڈ ویری گڈ۔ اب آپ اٹھ جائیے یہاں سے۔"

احمد رضا بولے اور میں اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

"آیئے میرے ساتھ۔" انہوں نے کہا۔

میں ان کے انداز پر کچھ متحیر سی تھی۔ بہرحال ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ اس تمام عرصے یہاں ملازمت کرنے میں پہلی بار میں عمران حسن صاحب کے دفتر میں داخل ہوئی۔ اس رات کے بعد سے آج تک عمران صاحب سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کئی بار بے اختیار دل چاہا تھا کہ ان سے ملوں لیکن مجھے اپنی حیثیت کا احساس تھا اور آج یہ موقع مل گیا تھا۔

دفتر میں داخل ہوئی، بہت شاندار دفتر تھا۔ کشادہ، برف کی طرح ٹھنڈا اور کسی حد تک نیم تاریک۔ جیسا مجھے یہ ماحول ہمیشہ سے پسند تھا۔ ایک ٹھنڈی سی روشنی عمران حسن صاحب کی میز پر لگی ہوئی تھی اور ان کی میز روشنی کے دائرے میں تھی۔ لمبی چوڑی میز جس پر ہر چیز سلیقے سے سجی ہوئی تھی۔ انہوں نے گردن اٹھا کر پہلے احمد رضا کی جانب اور پھر میری طرف دیکھا۔

"آیئے احمد رضا صاحب، خیریت؟ اوہ مس شازیہ کہیے کیسی ہیں آپ؟"

احمد رضا صاحب مجھے ساتھ لیے ہوئے ان کے نزدیک پہنچ گئے تو انہوں نے کہا۔ "تشریف رکھیے، خیریت کیا بات ہے؟"

"سر میں نے آپ کے لیے ٹائپسٹ کا بندوبست کر لیا ہے۔" احمد رضا صاحب بولے۔

"گڈ ویری گڈ، بہت اچھا کیا آپ نے۔ لیکن مس شازیہ کیا یہ ٹائپنگ جانتی ہیں؟"

"جی ہاں۔ انہوں نے ٹائپنگ سیکھ لی ہے یہیں ہمارے دفتر میں۔"

"ارے کیا واقعی؟" عمران حسن صاحب تعجب سے بولے میں نے ایک گہری سانس لی تھی۔

احمد صاحب ویسے بھی بہت اچھے انسان تھے اور اس وقت انہوں نے ایک عجیب کارنامہ انجام دیا تھا۔ عمران صاحب کہنے لگے۔

"یہ تو واقعی بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ بہت سا کام پڑا ہوا ہے۔" اور مجھے عمران صاحب ہی کے کیبن میں کونے میں لگی ہوئی ایک چھوٹی سی میز پر بٹھا دیا گیا جس پر ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا۔ عمران حسن صاحب نے مجھے کچھ کاغذات ٹائپ کرنے کے لیے دیے، شام میں جب میں وہاں سے اٹھی تو

کے باوجود وہ اپنے علاج کے لیے رضامند نہ ہوئیں۔ اس دن میں بہت اداس تھی اور عمران حسن صاحب نے شاید میری یہ کیفیت نوٹ کرلی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے رہے اور اس کے بعد انہوں نے کہا۔ ”مس شازیہ کیا بات ہے آپ کیوں پریشان ہیں؟“

”سر کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

”آپ مجھ سے تکلف برت رہی ہیں مس شازیہ، بتایئے کیا بات ہے؟“

”سر واقعی آپ یقین کیجیے۔“ میری آنکھیں بھر آئیں۔

عمران حسن صاحب مجھے دیکھتے رہے پھر بولے۔

”جی چاہتا ہے مس شازیہ کہ سارے جہان کی خوشیاں آپ کے قدموں میں ڈال دوں۔ آپ کی اس اداسی نے مجھے اتنا سلگا دیا ہے کہ میں یہ آگ ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مس شازیہ مجھے معاف کردیجیے گا۔“

میں حیران رہ گئی۔ وہ تو بڑی سنجیدہ اور متین فطرت کے انسان تھے۔ کبھی انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ وہ مجھے اور کسی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن آج یہ شیشہ کیسے ٹوٹ گیا۔

وہ کہنے لگے۔ ”مجھے بتایئے مس شازیہ، مجھے بتایئے کیا بات ہے؟“

”کوئی خاص بات نہیں ہے سر، میری والدہ کی بینائی جاتی رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ابھی میں اس طلسم سے نکل ہی نہیں پائی تھی کہ عمران صاحب بولے:

”تو آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔ میں ان کا علاج کراؤں گا۔ میں ان سے آج ہی ملوں گا۔“

”عمران صاحب میں نے اس لیے نہیں کہا تھا۔“

”مس شازیہ مجھے اس سعادت سے محروم نہ کریں خدا کے لیے مجھے اس سے منع نہ کریں۔“ وہ عاجزی سے بولے اور پھر انہوں نے اتنی ضد کی کہ میری زبان بند ہوگئی۔ وہ ویسے ہی بہت اچھے انسان مشہور تھے۔ اگر وہ یہ الفاظ نہ کہتے تو میں اس کوشش کو صرف ان کی محبت سمجھتی۔

ایک سمت تو امی کی بینائی چلے جانے کا دلدوز احساس اور دوسری سمت عمران حسن صاحب کے کہے ہوئے الفاظ میں کچھ اس طرح بے بس ہوگئی کہ کوئی فیصلہ ہی نہ کر پائی۔ عمران صاحب میرے گھر میں، میرے ساتھ داخل ہوئے اور اس طرح داخل ہوئے جیسے یہ ماحول ان کے لیے اجنبی نہ ہو۔ امی نے اپنی بینائی سے آخری بھیک مانگی اور انہیں دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر ایک بے بس مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہوگئیں، ان کے چہرے کی لکیروں نے ساری کہانی سنا دی تھی۔ عمران حسن صاحب نے کہا۔ ”میں آپ کی آنکھوں کا علاج کرانا چاہتا ہوں؟“

”نہیں بیٹے ہم قدرت سے جنگ نہیں کرسکتے۔ خدا نے مجھے روشنی دی تھی، واپس لے لی۔ اس نے مجھے زندگی دی ہے جب چاہے گا واپس لے لے گا۔ کیا تم ڈاکٹر سے مجھے نئی زندگی واپس دلا سکتے ہو؟ جب اس نے مجھے آنکھیں دی تھیں تو میں نے اس کا شکرانہ ادا کیا، لے لی ہیں تو ڈاکٹروں کا سہارا لے کر اس سے بغاوت نہیں کروں گی۔“

”اس انداز میں نہ سوچیں کہ ممکن ہے وہ آپ کو آنکھیں واپس کرنا چاہتا ہے۔“ عمران حسن صاحب نے کہا۔

”تب پھر اس کے رحم کا انتظار بہتر رہے گا۔“ میری ماں ناقابلِ تسخیر تھی۔ عمران حسن صاحب اپنی کوششوں میں ناکام ہوگئے واپس چلے گئے اور میں نے ماں کی شکل دیکھ کر خود کو جھوٹ بولنے پر آمادہ کرلیا۔

”بڑا نیک ہے یہ شخص، کیا تمہارے دفتر میں کام کرتا ہے؟“

”ہاں امی...... بہت شریف انسان ہیں یہ......“

”افسوس میں تو بے چارے کو دیکھ بھی نہیں سکی۔ کیا عمر ہوگی اس کی؟“

”ضعیف آدمی ہیں امی، آٹھ بچوں کے باپ ہیں۔“ میں نے امی کی شکل کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ امی کا چہرہ پُرسکون نظر آرہا تھا۔ دوسرے دن عمران حسن صاحب نے مجھ سے کہا۔

”شازیہ میں تمہیں اپنے آنگن کا گھنا پیڑ بنانا چاہتا ہوں تاکہ تپتی دھوپ چھاؤں بن جائے۔ میری خواہش ہے کہ میں تمہیں اپنی کوٹھی کے لان میں چہکتے ہوئے دیکھوں، مجھے بتاؤ شازیہ تمہارے حصول کے لیے میں کیا کروں؟“ اور میری آنکھیں فرطِ حیا سے بوجھل ہوگئیں۔ ناک کی نوک پر پسینے کے موتی چمکنے لگے تب عمران حسن صاحب نے کہا۔

”مجھے جواب دو شازیہ میں منتظر ہوں۔“

”لیکن ہم اس فرق کو کس طرح نظرانداز کریں گے جو ہم دونوں کے درمیان ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں شازیہ میں کوئی فلمی کردار نہیں ہوں۔ میری

ماں بچپن ہی میں مرگئی تھیں۔ میں نے باپ کے سایہ میں پرورش پائی اور یہ سب کچھ اپنی صلاحیتوں سے حاصل کیا ہے۔ میری زندگی میری اپنی ہے۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہے۔ تمہاری مراد کس فرق سے ہے۔"

"زندگی کے کسی حصے میں آپ کو یہ خیال نہیں آئے گا کہ آپ نے ایک ایسی لڑکی کو اپنایا جو آپ کے ہم پلہ نہیں تھی۔"

"میرے سوچنے کا انداز ذرا مختلف ہے شازیہ! میں انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھتا ہوں اگر یقین نہ آئے تو میری فرم کے کسی بھی شخص سے پوچھ لو۔"

"عمران صاحب مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیسے ممکن ہو سکے گا؟"

"میں اسے ممکن بنا لوں گا، احمد رضا صاحب میرا باقاعدہ پیغام لے کر آپ کی امی کے پاس جائیں گے لیکن پہلے آپ کی منظوری ضروری ہے۔"

میں عمران صاحب کے قدموں میں جھک گئی اور انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ مجھے ایک انوکھا سکون محسوس ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں آسمان میں جا بسی ہوں اور میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا ہے۔

عمران حسن صاحب نے مجھے اپنے وجود کا سارا اعتبار بخش دیا تھا۔ جو وقت عمران حسن صاحب سے دور گزرتا وہ مجھ پر بہت کٹھن ہوتا تھا۔ صبح کی روشنی پھوٹی تو میرے وجود میں کرنیں دوڑنے لگتی تھیں کہ وصال محبوب ہوگا۔ میں دفتر میں جاتی تو عمران میرا استقبال اس طرح کرتے ہیں کہ میں سرشار ہو جاتی لیکن ہم خود کو دنیا سے چھپائے ہوئے تھے۔ وہ کہتے شازیہ میں تمہیں دنیا کی ہر خوشی دینا چاہتا ہوں اور میں کہتی۔ "بس تھوڑا سا انتظار کریں تھوڑا سا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" وہ خاموش ہو جاتے لیکن اب صورت حال بہت مختلف ہو گئی تھی۔ میں ان کے دفتر میں رہتی۔ ہمارے درمیان بہت سے فیصلے ہو گئے تھے۔ ماں کی بینائی جا چکی تھی اور وہ میری بدلی ہوئی شکل دیکھنے سے قاصر تھی لیکن میرے اپنے وجود میں وہ ساری چیزیں بیدار ہو گئی تھیں جو کسی بھی مجھ جیسی لڑکی کے بدن میں اس وقت بیدار ہو جاتی ہیں جب اسے کوئی عمران حسن صاحب جیسا شخص مل جائے۔ میں بھی عمران حسن صاحب کے چنگل میں پھنس گئی۔ دفتر..... سے چھٹیاں ہوتیں اور ہم یہ لمحات ساحل سمندر پر گزارتے۔

عمران حسن صاحب نے مجھے بارہا قیمتی تحفے دینا چاہے مگر میں نے انہیں لینے سے انکار کر دیا۔ وہ میری ذات کے لیے اس کائنات کا سب سے قیمتی تحفہ تھے۔ میں نے اپنا سارا وجود ان پر نچھاور کر دیا۔ اپنے لیے ماں کے لیے کچھ نہیں چھوڑا احمد رضا صاحب چھٹی پر گئے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔ "عمران! ماں کے پاس کب جاؤ گے؟"

"جب تم کہو جانم۔"

"جلدی چلے جاؤ۔"

"ٹھیک ہے احمد رضا صاحب کا انتظار کیے لیتے ہیں۔ سمجھدار اور عمر رسیدہ آدمی ہیں۔ یہ کام آسانی سے کرلیں گے۔" میں خاموش ہو گئی۔ اب عمران حسن میرا مقصدِ حیات تھے۔ ان کی گرم آغوش میری زندگی مگر وہ امی کے پاس نہ گئے۔ احمد رضا علی صاحب نہ جانے کتنی لمبی چھٹی پر گئے تھے کافی دن گزر گئے پھر احمد رضا واپس آگئے۔ نجانے کیوں ان کا رویہ میرے ساتھ بہتر نہیں تھا۔

"احمد رضا صاحب آئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔" عمران صاحب عجیب سے لہجے میں بولے۔

"کیا بات ہے عمران کچھ الجھے الجھے سے ہو؟"

"ہاں۔"

"خیریت تو ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا ہو گیا؟"

"کاروبار میں کچھ گھپلا ہو رہا ہے۔"

"اوہ۔"

"مجھے ملک سے باہر جانا پڑے گا۔"

"کب؟"

"یہی فیصلہ کر رہا ہوں۔"

"جلدی جانا ہوگا؟"

"کچھ وقت تو لگے گا ہی۔"

"تو پھر کیوں نا؟"

"عجیب باتیں کرتی ہو۔ کروڑوں روپے کے خسارے کا خطرہ ہے اور ایسے وقت میں۔"

میں خاموش ہو گئی۔ عجیب سا لہجہ تھا عمران کا۔ اس نے کبھی اس لہجے میں مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ ساری رات

جاگتے گزری تھی۔ صبح ہونے کا بے چینی سے انتظار کررہی تھی۔ صبح ہوئی تیار ہوکر دفتر پہنچ گئی۔ وقت سے کچھ دیر پہلے آگئی تھی۔ عمران کا انتظار کرتی رہی۔ اپنی بے چینی رفع کرنا چاہتی تھی پوچھنا چاہتی تھی کیا وہ مجھ سے ناراض ہیں مگر عمران نہ آئے۔ گیارہ اور پھر بارہ بج گئے تو میں احمد رضا کے پاس پہنچ گئی۔

''عمران صاحب نہیں آئے؟''

''وہ رات کو چلے گئے۔''

''کہاں؟''

''سوئیڈن۔''

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ عمران چلے گئے مجھ سے ملے بغیر، مجھے بتائے بغیر، کیا میں اتنی غیر اہم ہو گئی۔

''میرے لیے کچھ کہہ گئے ہیں؟''

''ہاں۔''

''کیا؟''

''عمران صاحب کی واپسی کا کوئی یقین نہیں ہے۔ چھ سات ماہ بھی لگ سکتے ہیں، سال دو سال بھی۔ کاروبار وہیں سے ہوتا ہے۔ انہیں وہاں کا بگڑا انتظام سنبھالنا ہے۔ آپ کے لیے کہہ گئے ہیں کہ آپ کو کسی دوسری سیٹ پر بٹھا دیا جائے۔ آپ آصفہ کی جگہ پر بیٹھ سکتی ہیں، وہ شاید اب نوکری پر نہ آئے۔'' احمد رضا نے بے رحم لہجے میں کہا۔

مجھے چکر آگیا۔ پاگلوں کی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ نوشتہ تقدیر سامنے آگیا تھا۔

''مجھے ایک ہفتے کی چھٹی دے دیں۔''

''درخواست لکھ دیں۔''

''ایک ہفتے چھٹی کی۔'' قدرت کے کام عجیب ہیں۔ ماں سے بینائی اس لیے چھن گئی تھی تاکہ وہ میری حالت نہ دیکھ سکے۔ ہر گوشے میں، میں روتی پھرتی تھی۔ کسی کل چین نہ ملتا تھا۔ لمحہ لمحہ موت آرہی تھی ہر لمحہ موت کا پیغام دیتا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد دفتر پہنچی۔ اپنی ہی سیٹ پر جا بیٹھی تھی۔ احمد رضا آگئے۔ ''کیسی ہیں مس شازیہ؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''کام شروع کرنا چاہیں تو......''

''عمران صاحب کی کوئی خیریت ملی؟''

''ٹھیک ہیں۔ ان کے پیغامات آتے رہتے ہیں۔ واپسی کا کوئی تعین نہیں ہے۔'' احمد رضا میرے سامنے بیٹھ گئے۔ غور سے میرے چہرے کو دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''ہمت نہیں پڑ رہی مگر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''جی۔''

''تم ان کا انتظار کررہی ہو؟''

''جی۔'' میں گھبرا گئی۔

''بے کار ہے، اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وہ واپس آئیں گے تو تمہیں بھول چکے ہوں گے۔''

''جی۔'' میری لرزتی آواز ابھری۔

''سمجھ نہیں آتا کہ کیا کہوں کیا نہ کہوں۔ تم جیسی بے وقوف لڑکیاں گردن جھکائے بھیڑیوں کے غول میں کیوں گھس آتی ہیں؟ تمہارے سرپرست اتنے احمق کیوں ہوتے ہیں؟ وہ کیوں نہیں دیکھتے کہ جہاں تم جارہی ہو وہاں کون ہے۔ وہاں کیا ہوتا ہے اور پھر تم یہ روشنی کی طرف دوڑ پڑنے والی، چاہے وہ آگ ہی کیوں نہ ہو جو تمہیں جلا کر راکھ کردے۔ ضرورتیں دوسری طرح بھی تو پوری کی جاسکتی ہیں۔ ان کے لیے سب کچھ گنوا دینا تو ضروری نہیں ہوتا۔''

''احمد رضا صاحب......!''

''اگر تم اپنا وقار کھو چکی ہو تو سب کچھ بھول جاؤ، اپنے مستقبل کی فکر کرو، تم پہلی لڑکی نہیں ہو۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

می لارڈ۔ میں نے سب کچھ سمجھ لیا۔ سب کچھ جان لیا نہ جانے کیسے؟ حالانکہ مجھے اس کا تجربہ نہیں تھا اور اس کے بعد میرے پچھتانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے آفس جانا چھوڑ دیا۔ ماں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے نہ جانے کیا کہہ دیا۔ میں نے انہیں جھڑک دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئیں۔

وقت گزرتا رہا۔ ماں خاموش ہوگئی تھیں۔ اس طرح چند ماہ گزر گئے اور پھر پڑوسیوں نے ماں سے کچھ کہا۔ ماں نے مجھے ٹٹول کر دیکھا۔ ایک دلدوز چیخ ماری اور چکرا کر ایسی گریں کہ پھر نہ اٹھ سکیں۔

اس کے بعد ہر نگاہ میں میرے لیے نفرت پیدا ہوگئی۔ یہاں تک کہ میں اس نفرت نگر کو چھوڑ کر وہاں سے نکل آئی۔ خودکشی کرنے نہیں می لارڈ۔ جینے اپنے تجربوں کے ساتھ۔ اور یہ اس دنیا میں آگئی۔ میرے وجود کا ایک ٹکڑا جسے میں نے بہت سنبھال کر پروان چڑھایا۔ اسے دنیا کے سرد و گرم سے بچایا۔ تعلیم دلائی، دنیا دکھائی پھر ایک شام اس نے مجھ سے کہا۔ ''امی میری ایک بات مان لیں گی؟''

''کہو۔''

"میں ملازمت کرلوں؟"
"کیا دماغ خراب ہوگیا ہے۔"
"امی اجازت دے دیں۔"
"آخر کیوں؟"
"مجھے ایک بہت اچھی ملازمت مل رہی ہے۔"
"کہاں؟"
"ایک پرائیویٹ فرم میں۔ فرم کے مالک نے خود مجھے آفر کی ہے۔ آپ ایک بار عمران حسن صاحب سے مل کر تو دیکھیں اتنے نفیس اتنے ہمدرد اتنے سادہ مزاج انسان ہیں کہ بس کیا بتاؤں۔"
"کون؟" میں نے چونک کر پوچھا۔
"عمران حسن! ایک پارٹی میں ملاقات ہوئی تھی ان سے......" ادیبہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی، میں نے نہیں سنا لیکن میرے گرد جہنم جل اٹھا تھا۔ میں آتش فشاں بن گئی تھی۔ میں نے اجازت دے دی۔ ادیبہ مسرت سے جھوم اٹھی تھی مگر میں، میں اس کا تعاقب کرنے لگی۔ می لارڈ میں نے عمران حسن کو دیکھا۔ وقت اس پر ساکت تھا وہ اتنا ہی وجیہہ، اتنا شکیل، اتنا ہی خونخوار تھا میں اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ اس کے ایک ایک روپ سے واقف تھی۔ میں نے ادیبہ کو اپنی کہانی سنائی۔ اپنے لٹنے کی داستان سنائی تو وہ کانپ گئی۔
"کون تھا امی وہ مردود...... کون تھا وہ بے غیرت انسان؟"
"آہ! میں خود اس کی تلاش میں ہوں۔"
"کاش وہ مل جائے۔" ادیبہ نے غراتے ہوئے کہا۔
"کیا کرے گی تو اس کا؟"
"خدائے بزرگ و برتر کی قسم آپ کی قسم۔ امی میں اسے سنگسار کردوں گی۔ میں اسے کچل کچل کر ہلاک کروں گی۔ امی میں اسے اس طرح ماروں گی کہ کائنات میں اتنا وحشیانہ قتل کسی نے نہ کیا ہوگا۔"
مجھے سکون ہوگیا۔ میں نے ادیبہ کی اس طرح پرورش کی تھی یہی مزاج بنایا تھا اس کا۔ ایک ایک لمحہ می لارڈ ایک ایک لمحہ میں نے ادیبہ کی نگرانی کی اور اس وقت بھی ادیبہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھی جب وہ اسے اپنی کار میں لے جارہا تھا۔ اس وقت بھی میں ان سے زیادہ دور نہیں تھی جب وہ ادیبہ سے کہہ رہا تھا۔ "ادیبہ میری عمر یونہی گزر گئی۔ میں نے کبھی دل کا سکون نہیں پایا۔ ادیبہ تم میری زندگی ہو، بہار کا وہ فرحت بخش جھونکا ہو جس نے مجھے زندگی سے دلچسپی سکھادی ہے۔ میں تمہیں اپنے آنگن کا درخت بنانا چاہتا ہوں مس ادیبہ۔"
"سر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ سر میں تو آپ پر بے حد اعتماد کرتی ہوں، سر میں......"
"مجھے زندگی کی اس پہلی اور آخری خوشی سے محروم نہ کرو ادیبہ۔ تمہارے بغیر اب جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔" بہت کچھ کہا اس نے ادیبہ سے اور بہت کچھ مگر ادیبہ مجھ سے مختلف تھی وہ زیر نہ ہوئی تب اس نے کہا۔
"یہ میرا گھر ہے ادیبہ اور یہاں تم اپنی مرضی سے آئی ہو جو کچھ ہوگا اس میں تمہاری رضا بھی جائے گی میرا کچھ نہیں بگڑے گا مگر تم بدنام ہو جاؤ گی۔ آخر تم یہاں کیوں آئی ہو۔"
"سر آپ مجھے کچھ ضروری خط پوسٹ کروانے لائے ہیں۔"
"بکواس، یہ کون کہے گا۔" وہ ہنس پڑا۔ تب میں اندر داخل ہوگئی میں نے کہا۔
"ادیبہ یہی وہ شخص ہے جس کی کہانی میں نے تمہیں سنائی تھی۔ یہی ہے ادیبہ، وحدہ لاشریک کی قسم یہی ہے وہ بھیڑیا۔"
وہ مجھے دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "اور یہ تیری بیٹی ہے عمران، یہ تیرا گناہ ہے۔ اور پھر می لارڈ ہم دونوں مصروف ہوگئے۔ ادیبہ نے اپنا قول نبھایا۔ میں نے انتقام لیا۔ ہم نے ایک شیطان کو فنا کردیا اور اب ہم جزا کے طالب ہیں۔"
"یہ میری زندگی کا سب سے سنگین کیس ہے، میں سخت کشمکش کا شکار ہوں کمرۂ عدالت میں مجھے سرکاری وکیل کی حیثیت سے ان دونوں ماں بیٹیوں کو ایک سنگین جرم کا حامل قرار دینا پڑے گا۔ ان کے خلاف بہت کچھ کہنا پڑے گا، قانونی داؤ پیچ استعمال کرنا پڑیں گے۔ ان کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کرنا پڑے گا مگر...... کرسکوں گا میں یہ سب کچھ؟ کیسے آخر کیسے؟ خدا میری مدد کر......!"
مگر میری زبان گونگی ہوچکی تھی۔ ایک لفظ بھی، نہ اس کی حمایت میں اور نہ مخالفت میں بول سکا تھا۔ جو کچھ بھی کیا وہ قانون نے کیا۔ میں خاموش تماشائی بنا جیل کے قیدیوں کی گاڑی میں اسے بیٹھتا دیکھتا رہ گیا تھا۔

گمان

محترم ایڈیٹر
السلام علیکم
پہلی بار سرگزشت میں کوئی تحریر بھیجی ہے۔ آپ کے ہاں سچی آپ بیتیاں جگ بیتیاں شائع ہوتی ہیں۔ سچ کڑوا لیکن سبق آموز ہوتا ہے۔ اب سپاہی بلند خان اور ذاکر خان کا واقعہ لے لیں۔ اس نے کیا کرنا چاہا تھا اور چودھری رب نواز کے گمان میں کیا بات سمائی۔ اُمید ہے قارئین کو بھی یہ چھوٹی سی سرگزشت پسند آئے گی۔

کے ایم خالد
(اسلام آباد)

وہ دونوں ابھی ایک کھوکھے سے چائے پی کر نکلے تھے۔ رات کے دو بجے کا عمل تھا۔ نیند ان پر غلبہ پانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ نیند سے چھٹکارے کے لیے چار گھنٹوں میں تقریباً چار بار چائے پی چکے تھے۔ کھوکھے سے تھوڑی ہی دوران کا ناکہ تھا اور وہ اپنے ساتھیوں سے چائے کا کہہ کر نکلے تھے۔ ”بلند خان! دنیا کتنی بے حس ہوتی جارہی ہے۔“ ذاکر نے بندوق اور وائرلیس کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے ذاکر بھائی۔“ بلند خان نے موٹر سائیکل کو کک لگاتے ہوئے کہا۔

”نفسانفسی کا دور ہے، ڈکیت ہم نے پکڑا تھا انعام اوپر والوں نے لے لیا، یقین کرو مہنگائی اتنی بڑھتی جارہی ہے باوجود اس کے کہ ہمیں کچھ اوپر سے بھی کمائی ہو جاتی ہے۔ میں اس دفعہ اپنے بچوں کے سردیوں کے کپڑے نہیں خرید سکا۔“

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔“ بلند خان نے سگریٹ کو

ہونٹوں میں دباتے ہوئے کہا۔

”کھانستا رہتا ہے سگریٹ نہیں چھوڑتا۔“ ذاکر نے موٹر سائیکل کے پیچھے دھوئیں کے مرغولے سے بچتے ہوئے کہا۔

علی پور کا بس اسٹاپ آچکا تھا۔ اس سے کچھ دور ان کے تھانے کا ناکہ تھا۔ رات کو عموماً اس روڈ پر ٹریفک بند رہتی تھی۔ اکا دکا کسی کمپنی کی گاڑی چلتی نظر آجاتی تھی۔ انہوں نے دیکھا دور سے کسی گاڑی کی لائیٹیں نظر آرہی تھیں۔ گاڑی کی رفتار بہت تیز محسوس ہورہی تھی۔ اچانک بریکوں کی چرچراہٹ ہوئی اور کسی انسانی چیخ کی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ محتاط ہوگئے۔ بس انتہائی تیز رفتاری سے ان کو سائیڈ کراتے ہوئے گزر گئی۔ بلند خان نے موٹر سائیکل کچے میں اتار لی تھی۔

سڑک پر ایک بندہ تڑپ رہا تھا۔ شاید کوئی مسافر بس سے اترتے ہوئے گاڑی کے پچھلے ٹائروں تلے آگیا تھا۔ ”ذاکر وائرلیس پر کنٹرول روم کو حادثہ کی اطلاع دو۔“

”ٹھہرو، یہ حادثہ تو اپنے علاقے میں معلوم ہوتا ہے۔ تمہیں پتا ہے پچھلے حادثے پر ایس ایچ او نے کتنی ڈانٹ پلائی تھی۔“

”یہ جو برجی ہے۔ یہاں تک ہمارے تھانے کا علاقہ ہے اور برجی کے اندر حادثہ ہوا ہے۔“ ذاکر نے کہا۔

”اگر اس کو کسی طرح فرید کوٹ تھانے کی حدود میں ڈال دیں؟ یہاں کون دیکھ رہا ہے۔ شاید اندر کھاتے کچھ انعام ہی مل جائے۔“ ذاکر نے آگے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

چاندنی کی روشنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ بے چارہ مسافر بری طرح کچلا گیا تھا۔ حلیے سے وہ کوئی دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ ابھی بلند خان اور ذاکر نے اس کی ٹانگوں کو ہاتھ ہی لگایا تھا کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ دونوں ڈر گئے۔ ”کیا کرنے لگے ہو؟“ اس نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں، حادثہ دیکھ کر رک گئے تھے۔“

”بس ڈرائیور کو نہ جانے کیا جلدی تھی۔ میرا پاؤں دروازے میں پھنس گیا۔ یہ میرا شناختی کارڈ ہے میرے گھر اطلاع کردو۔“ اس نے جیب کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”وہ بھی کردیں گے۔ کچھ ضابطے کی کارروائی تو مکمل کرنے دیں۔“ ٹانگیں بری طرح کچلی گئی تھیں۔ خون زیادہ بہنے کی وجہ سے اس پر نقاہت طاری تھی۔ مگر شاید وہ دیہاتی کچھ زیادہ ہی قوت ارادی کا مالک تھا۔ وہ بولے جارہا تھا۔

”میری بیٹی کی اگلے ہفتے شادی ہے۔ میں اس کے جہیز کی خریداری کے لیے شہر گیا تھا۔ مقدر میں شاید یہ حادثہ لکھا تھا۔ میری بیٹی نے مجھ سے بہت کہا ابا صبح آجانا۔ مگر تمہیں تو پتا ہی ہے بیٹیوں کی شادی کے بہت کام ہوتے ہیں۔ کل سارا جہیز ٹرک پر آجائے گا۔“

”ذاکر! تمہیں اچھی طرح یاد ہے ناں برجی کے آگے فرید کوٹ کا علاقہ ہے۔“ بلند خان نے ذاکر کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں“۔ ذاکر خان نے اثبات میں سرہلادیا۔

”بزرگو! آپ کو یہاں سے کچھ آگے نہ لے جائیں وہاں گھاس بھی نرم ہے۔ آپ کو یہاں تکلیف ہورہی ہو گی۔ سڑک کنارے بجری بھی چبھتی ہے اور کوئی گاڑی بھی آسکتی ہے۔ پھر اس کے بعد ہم اپنے ہیڈ کواٹر کو حادثے کی اطلاع دیں گے۔“

”ٹھیک ہے، مگر تھوڑا سا پانی مل جائے گا، حلق خشک ہو گیا ہے۔“

”ہاں، کیوں نہیں۔ بلند خان اس کو پانی پلاؤ۔“ ذاکر نے موٹر سائیکل کے ساتھ لٹکے ہوئے تھرموس سے اس کو پانی پلایا۔

ذاکر نے اس کے بازوؤں میں ہاتھ ڈالا۔ بلند خان نے دیہاتی کی چادر لے کر ٹانگیں اس میں ڈالیں۔ دونوں نے اس کو تھوڑی دور ایک درخت کے ساتھ بٹھادیا۔

”بزرگو! اب کچھ سکون محسوس ہوا“ بلند خان نے پوچھا۔

دیہاتی نے آنکھیں کھولیں اور دھیرے سے مسکراتے ہوئے ”ہاں“ کہہ کر آنکھیں موندلیں۔

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اس سے کچھ دور ہٹ آئے۔ ”اب ٹھیک ہے کم از کم یہ مدعا تو فرید کوٹ والوں کے کھاتے میں تو پڑے۔“ ذاکر نے وائرلیس کو سیدھا کرتے ہو ہوئے کہا۔

دیکھ لو ذاکر ابھی بھی کمی بیشی ہے تو وہ نکال سکتے ہیں۔ بلند خان نے اس سے کہا۔

”نہیں یار مجھے پکا یاد ہے۔“ ذاکر نے وائرلیس پر ہیلو ہیلو کرتے ہوئے کہا۔

”جناب ذاکر علی بول رہا ہوں ہیڈ کانسٹیبل تھانہ علی پور۔ فرید کوٹ تھانے کے علاقے میں حادثہ ہوگیا ہے۔ گاڑی نے بندہ کچل دیا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد وائرلیس آپریٹر کی آواز وائرلیس سے بلند ہو رہی تھی۔ "تھانہ فرید کوٹ کے علاقے میں گاڑی نے بندہ کچل دیا ہے۔ رپورٹ اوور۔"

انہوں نے ناکے سے اپنے دوسرے ساتھی بھی بلا لیے۔ انہیں بھی اصل صورتِ حال سے غافل رکھا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد تھانہ فرید کوٹ کی گاڑی وہاں آکر رکی۔ اس میں اے ایس آئی واجد اور ایک سپاہی ریاض برآمد ہوئے۔ اے ایس آئی نے ذاکر علی سے پوچھا "کیا ہوا؟"

"جی ایک بندہ ایک بس نے کچل دیا ہے۔" بلند خان نے دیہاتی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"زندہ ہے یا مر گیا۔" اے ایس آئی نے پوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتے، زیادہ خون بہنے سے شاید مر ہی نہ گیا ہو۔"

"سر جی! یہ تو ان کا علاقہ ہے۔" فرید کوٹ تھانے سے آنے والے سپاہی نے کہا "مجھے اچھی طرح یاد ہے برجی کے اس طرف دو سو میٹر تک تھانہ علی پور کی حد ہے۔ یہ حادثہ تھانہ علی پور کے علاقے میں ہوا ہے آپ بے شک پیمائی کروا لیں۔"

"حدود کی پیمائی والا کام تو اب صبح ہی ہوگا وقوعہ کا جائزہ لو اور لاش کو اسپتال بھجوانے کا بندوبست کرو۔ اگر ان کا علاقہ ہوا تو بھی ذمہ دار ہوں گے۔"

جواب میں بلند خان اور ذاکر نے کہا "بالکل، بالکل۔"

قریبی گاؤں کی مسجد سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہو رہی تھی جب ایمبولینس نے دیہاتی کو اٹھایا۔ جائے وقوعہ پر تھانہ فرید کوٹ اور تھانہ علی پور کا عملہ الرٹ کھڑا تھا۔ صبح کے وقت دونوں تھانوں میں تھرتھلی مچی ہوئی تھی۔ بڑے دفتر سے تھانوں کے حدود اربع کا نقشہ آچکا تھا۔ ایک پٹواری جو اس علاقے کو اچھی طرح جانتا تھا اس کی خدمات حاصل کی گئیں۔ وہ علی پور کی برجی پر آکر رک گیا۔ اس نے اپنے ملازم سے فیتا نکالنے کے لیے کہا۔ بلند خان اور ذاکر کے دل دھڑک رہے تھے۔ پٹواری اپنے ملازم کے ساتھ پیمائش کرتے ہوئے بلند خان اور ذاکر کے بنائے ہوئے جائے وقوعہ سے آگے نکل گیا۔ پٹواری نے فیتے کو اکٹھا کرتے ہوئے پاؤں سے نشان لگاتے ہوئے کہا۔ "یہاں تک علی پور تھانے کی حد ہے اس سے آگے فرید کوٹ کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔"

تھانہ علی پور کا ایس ایچ او قہر آلود نگاہوں سے بلند خان اور ذاکر علی کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ دونوں اپنے خلاف ہونے والی کارروائی سے خوف زدہ تھے۔ فرید کوٹ کے عملے نے سکھ کا سانس لیا۔

بلند خان اور ذاکر علی کو فرائض میں غفلت کے جرم میں نہ صرف تنزلی کے احکامات جاری کیے گئے بلکہ ان کی ڈیوٹی بھی مستقل تھانے میں لگا دی گئی۔ حادثے کے تقریباً دو ماہ بعد ایک دن وہ تھانے کے لان میں گھاس پر بیٹھے وہ ان سنہری باتوں کو یاد کر رہے تھے جو ان کی کمائی کا ذریعہ بنے تھے۔ ڈاکیا کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے۔ تھانے میں کبھی ان کے نام چٹھی نہیں آئی تھی۔ ڈاکیے نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "ذاکر علی اور بلند خان۔"

"جی، جی۔" وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔

"یہ آپ کے نام خط ہے۔" ڈاکیے نے خط ان کو پکڑا دیا۔

وہ حیرانی سے خط پکڑے بیٹھے تھے۔ بھیجنے والے نے اپنا نام چوہدری رب نواز لکھا تھا۔ مگر وہ دونوں کسی رب نواز کو نہیں جانتے تھے۔ ذاکر علی نے خط کھولا اس میں ایک خط کے ساتھ ایک ایک لاکھ روپے کے دو چیک تھے جو کہ ان دونوں کے نام تھے۔ بلند خان نے اس کے ہاتھ سے خط لے کر پڑھنا شروع کر دیا۔

عزیزم بلند خان اور ذاکر علی

السلام علیکم!

آپ سوچ رہے ہوں گے میں کون ہوں جو آپ سے مخاطب ہوں۔ عزیزم کچھ عرصہ قبل ایک رات ایکسیڈنٹ میں گاڑی نے مجھے بری طرح کچل دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرشتہ بنا کر بھیج دیا۔ آپ لوگوں نے مجھے پانی پلایا جس طرح چبھتی ہوئی بجری اور سڑک سے ہٹا کر نخلی گھاس پر لٹایا اور مجھے اسپتال پہنچایا۔ میں آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھول سکتا۔ ڈاکٹروں نے میری دونوں ٹانگیں کاٹ دی تھیں مگر شکر ہے میری زندگی بچ گئی۔ میری بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ آپ جیسے فرشتہ صفت انسانوں سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ بھی آپ کو اپنا بھائی سمجھتی ہے۔ میں تو شاید اسی رات ختم ہو جاتا اگر آپ لوگ نہ ہوتے۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کو آپ جیسے فرض شناس جوانوں کی ضرورت ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے آپ لوگوں کا ایڈریس تلاش کیا۔ اس کے ساتھ کچھ رقم کے چیک ہیں یہ آپ کے احسان کا بدلہ تو نہیں مگر اس میں میری خوشی ہے۔

احسان مند

چودھری رب نواز

اور دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی رم جھم جاری تھی۔

بلے والی خالہ

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم
یہ واقعہ جو میں ارسال کررہا ہوں یہ میری جوانی کا ہے۔ ملیر کے بہت سے لوگ اب بھی اس خالہ کو بھولے نہیں ہوں گے۔ میں تو چاہ کر بھی انہیں بھلا نہیں پایا ہوں۔ میں کوئی کہانی کار نہیں اس لیے سیدھے سیدھے الفاظ میں یہ کہانی لکھی ہے۔ اگر کسی کہانی لکھنے والے سے اسے دوبارہ لکھوا لیں تو بہتر ہے۔
سلیم
(ملیر کراچی)

شاید ہی کسی کو اس کا نام معلوم ہو۔ بس اسے بلے والی خالہ کہا جاتا تھا۔ تب میں ملیر میں رہتا تھا۔ یہ کہانی اسی علاقے کی ہے۔ چھوٹے چھوٹے کوارٹر بنے ہوئے تھے جن میں صرف ایک کمرا ہوتا تھا۔ ایک دالان ہوتا تھا اور ایک اسٹور کا کمرا۔ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اور ایک باتھ روم۔ (یہ تو میں بہت مہذب بنا کر لکھ رہا ہوں)۔

ان کوارٹرز کی یہی کائنات تھی اور کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک گلی ہوتی تھی اس گلی میں اس قسم کے چوبیس کوارٹرز ہوتے

تھے۔

ان میں طرح طرح کے لوگ رہا کرتے۔ غربت زدہ لٹے پٹے ہوئے لوگ۔ چھوٹے چھوٹے کام کرنے والے۔ مزدور، نائی، قصاب، چھوٹے دکاندار وغیرہ۔

بلّے والی خالہ ایسے ہی ایک کوارٹر میں رہا کرتی تھی۔ اس کی عمر میرے اندازے کے مطابق پچاس سے اوپر ہی ہو گی۔ اکیلی رہتی تھی۔ گزر بسر کے لیے اس نے نہ جانے کیا بندوبست کر رکھا تھا۔ بہرحال میں نے اسے کہیں ہاتھ پھیلاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

بلّے والی خالہ اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس کے پاس ایک بلا ہوتا تھا۔ وہ اسے نہلاتی، اس کو کنگھی کرتی اور اس سے نہ جانے کیا کیا باتیں کرتی رہتی۔

وہ بلا بھی اس سے بے انتہا مانوس تھا۔ اس کی ایک آواز پر دوڑا ہوا چلا آتا اور خرخر کرتا ہوا اس کے چاروں طرف چکر لگاتا رہتا۔

بلّے والی خالہ کی آوازیں میں ان کے کوارٹر کے باہر ہی سنا کرتا۔ وہ بلّے کو اس طرح بلایا کرتی جیسے کوئی بہت محترم شخصیت ہو۔

"ارے کہاں ہیں آپ، ذرا سی دیر میں کہاں چلے جاتے ہیں۔ سارا دودھ اسی طرح رکھا ہوا ہے۔" یا پھر جب مجھ سے سامنا ہوتا تو بلّے کی شکایت بھی کیا کرتی۔ "کبھی کبھی تو بہت تنگ کرنے لگتے ہیں۔ اب دیکھو بیٹا وہ دوپہر سے غائب ہیں۔ میں تو اس بات سے ڈرتی ہوں کہ باہر جا کر کوئی الٹی سیدھی چیز نہ کھالیں۔"

یہ انداز تھا بلّے کے لیے باتیں کرنے کا۔

یہ کہا جا سکتا تھا کہ ان کی چونکہ کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے انہوں نے بلّے کو سب کچھ سمجھ رکھا تھا۔

ایک بار ایک عجیب واقعہ ہوا۔ محلے میں میرا ایک دوست تھا رشید، لاابالی سا نوجوان۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اسے محلے کی دائی کہا جاتا تھا۔

ہر گھر کا حال اسے معلوم تھا۔ کون کیا ہے۔ کس کی کیا حیثیت ہے۔ کس لڑکی کا معاشقہ کس کے ساتھ ہے۔ یہ سب اسے معلوم ہوتا تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کی اکثر خبریں درست بھی ہوا کرتیں۔

یہ ہمارا دستور تھا کہ ہم شام کے وقت حکیم جان کے ہوٹل میں جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ پھر بہت دیر تک گپ شپ ہوتی رہتی۔

اس شام میں رشید کے ساتھ ہوٹل ہی کی طرف جا رہا تھا۔ بلّے والی خالہ کے مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اچانک رشید نے زور زور سے لاحول پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے گالوں پر تھپڑ بھی مارتا جا رہا تھا۔

"ابے رشید کیا ہو گیا ہے تجھے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہاں سے تیزی سے گزر بھائی۔" اس نے کہا۔ "اس مکان میں جادوگرنی رہتی ہے۔"

"کیا پاگل ہو گیا ہے۔ یہ مکان تو بلّے والی خالہ کا ہے۔"

"ہاں ہاں میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ کالا جادو کرتی ہے۔ سفلی علم سمجھتا ہے ناں۔ تو یہ بلّے والی خالہ اس کی ماہر ہے۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے یار، وہ تو ایک سیدھی سادی عورت ہے۔" میں نے کہا۔

اس دوران ہم ہوٹل تک پہنچ چکے تھے۔

"چل بیٹھ جا۔ چائے منگواتے ہیں۔ پھر تجھے بتاتا ہوں کہ کیسے معلوم ہوا۔"

ہم بیٹھ گئے۔ چائے منگوائی گئی۔ پھر اس نے بتانا شروع کیا۔ "یار کئی بار میں اسے اپنے بلّے کو قبرستان میں دفن کرتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔"

"قبرستان میں دفن کرتے ہوئے؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا کہہ رہا ہے یار اس کا بلا تو زندہ ہے۔"

"یہ اس کا آٹھواں بلا ہے۔" اس نے بتایا۔ "تو تو جانتا ہے یار کہ میں ہر جمعرات کو اپنے باپ کی قبر پر ضرور جاتا ہوں۔ آندھی ہو یا طوفان۔"

"ہاں جانتا ہوں میں۔"

"تو میں کئی بار اسے بلّے کو دفن کرتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "وہ باقاعدہ گڑھا کھود کر دفن کرتی ہے۔ اس کے بعد اس قبر پر پھول چڑھا کر واپس چلی جاتی ہے۔"

"بھائی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"دیکھ میں نے کبھی غلط خبر نہیں سنائی ہو گی۔" اس نے کہا۔ "تو یہ بھی سچ ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے یار لیکن بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ میں جب بھی دیکھتا ہوں وہ بلّے کو پیار کر رہی ہوتی ہے۔ اس کی خدمت میں لگی رہتی ہے۔"

"میں بھی یہی دیکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ بلّے کو پالتی ہے۔ اس سے پیار کرتی ہے۔ اس کی خدمت کرتی ہے۔ پھر اس کو مار ڈالتی ہے۔"

"کیوں؟"

"میرا خیال ہے کہ وہی کالا جادو۔" اس نے کہا۔ "میں نے پڑھا ہے کہ جو اس قسم کا عمل کرتے ہیں وہ جانوروں کی قربانیاں دیتے ہیں۔ خاص طور پر بلّے بلیوں کی۔"

"یہ تو تو نے عجیب بات بتا دی۔ لیکن میں نے اس میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔ میں تو کبھی کبھی اس کے گھر بھی چلا جاتا ہوں۔ وہ مجھ سے دنیا بھر کی باتیں بھی کرتی ہے لیکن اس نے کبھی جادو وغیرہ کی بات نہیں کی۔"

"ظاہر ہے۔ وہ تجھ سے تو نہیں کہے گی نا، محلے کا معاملہ ہے۔" رشید نے کہا۔ "اس کے علاوہ ایک بات اور ہے۔ ذرا اس پر دھیان کر۔ اس کا خرچ کہاں سے چلتا ہے۔ اس کے آگے پیچھے تو کوئی نہیں ہے اور نہ تو اس کا کوئی کام ہے۔ پھر کہاں سے پیسے آتے ہیں۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" میں نے پُرخیال انداز میں گردن ہلائی۔ "تیرا کیا خیال ہے، کون پیسے دیتا ہوگا۔"

"اس کے کلائنٹس۔" رشید نے بتایا۔

"کلائنٹس!"

"ہاں یار، وہ لوگ جو اس کے پاس جادو کروانے آتے ہوں گے۔"

"لیکن ہم نے تو آج تک کسی کو نہیں دیکھا۔"

"بہت چالاک اور پُراسرار عورت ہے۔" رشید نے کہا۔ "وہ ایسے لوگوں کو محلے سے دور بلواتی ہوگی۔ وہاں معاملات طے کرتی ہوگی۔ اس کے محلے والوں کو ہوا بھی نہیں لگتی ہے۔"

"چل یار مان لیا۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ وہ سفلی عمل کر رہی ہے۔ تو اس میں ہمارا کیا نقصان ہے۔ محلے والوں کو تو وہ کچھ نہیں کہہ رہی۔"

"ہاں ابھی تو کچھ نہیں کہہ رہی لیکن کسی وقت بھی اس کے جادو کا رخ کسی کے بھی طرف ہو سکتا ہے۔ یار ایسے لوگ کبھی کبھی بہت خطرناک ہو جاتے ہیں۔"

"تو پھر بتا کیا کیا جائے۔"

"یار! وہ تجھ سے باتیں کرتی ہے۔ تو نے خود بتایا کہ تو کبھی کبھی اس کے گھر بھی چلا جاتا ہے۔ تو ذرا اپنے طور پر معلوم کرنے کی کوشش تو کر۔"

"اب تو تو نے ایک ایسی کہانی سنا دی ہے کہ معلوم کیے بغیر سکون نہیں ملے گا۔" میں نے کہا۔ "میں اسے کریدنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دیکھوں تو میں، کیسا ہے اس کا جادو۔"

"اور اس میں تیرا بھی تو فائدہ ہے۔"

"میرا کیا فائدہ؟"

"ابے تجھے ایک زبردست کہانی کا پلاٹ مل جائے گا۔ یہ فائدہ کیا کم ہے۔"

ہم اس وقت چائے پی کر ہوٹل سے باہر آ گئے۔ رشید نے یہ سب یوں ہی نہیں کہا ہوگا۔ ہم لوگ کئی بار اسے آزما چکے تھے۔ اس کی لائی ہوئی خبریں درست ہی ہوتی تھیں۔ اس بار تو وہ بہت زبردست اسٹوری نکال کر لایا تھا۔ بلّے والی خالہ کی کہانی۔

اس نے میرے دل میں ایک تجسس تو بیدار کر ہی دیا تھا۔ اس لیے میں اس کے بعد بہانے بہانے سے بلّے والی خالہ کی طرف سے گزرنے بھی لگا اور اگر وہ نظر آ جاتیں تو سلام دعا بھی کر لیتا۔ اس موقع پر اس کا وہ لاڈلا بلا اس کے پاس ہی ہوتا۔

اس کے پیروں کے گرد چکر کاٹتا ہوا اور خالہ میری طرف دیکھ کر بلّے کے بارے میں بتاتی۔ "یہ تو میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ پچھلے دنوں بہت بیمار ہو گئے تھے۔ بڑی مشکلوں سے ٹھیک ہوئے ہیں۔" اس عزت اور احترام کے ساتھ جس طرح کسی انسان کی عزت اور اس کا احترام کیا جاتا ہے۔

ایک دن میں نے بلّے والی خالہ کو ایک ہندو یوگی یا سادھو سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ عام طور پر اس حلیے کے لوگ یہاں نہیں دکھائی دیتے۔ البتہ ہندوستان میں بہت ہوا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے جب ایسا کوئی شخص دکھائی دے جائے تو حیرت تو ہوتی ہی ہے۔

وہ ایک بوڑھا شخص تھا۔ لمبی داڑھی، ماتھے پر تلک لگائے، لنگوٹی باندھے۔ گردن میں موٹے سکوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ ایسا شخص بلّے والی خالہ سے باتیں کر رہا تھا۔

میں نے ان دونوں کو اپنے محلے میں نہیں بلکہ محلے سے بہت فاصلے پر ایک دوسرے علاقے میں دیکھا تھا۔ خدا جانے بلّے والی خالہ یہاں کیا کر رہی تھی اور اس سادھو سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ رشید کی باتیں مجھے سچ لگنے لگی تھیں۔ اس نے ہی تو یہی بتایا تھا۔

اس سادھو نے کچھ دیر خالہ سے باتیں کیں۔ پھر وہ پرنام کر کے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ جب کہ خالہ بھی ایک

دکان کی طرف بڑھ گئیں۔ میں یہ سب فاصلے سے دیکھ رہا تھا۔
اب میرا ارادہ پختہ ہو گیا تھا کہ مجھے خالہ کو کریدنا تھا۔ رشید کی باتوں میں صداقت نظر آرہی تھی۔ اگر خالہ واقعی جادو گرنی تھیں تو محلے والوں کے لیے یہ خطرناک ہو سکتا تھا۔
میں موقع نکال کر ایک دن خالہ کے پاس پہنچ گیا اور اس دن جو کچھ میں نے دیکھا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔
میں نے خالہ کے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے دوبارہ دستک دی۔ اس بار میرے ہاتھ کے دباؤ سے دروازہ اندر کی طرف کھل گیا تھا۔ یعنی خالہ نے دروازے کو بند نہیں کیا تھا۔
اس کے ساتھ ہی کسی کی سسکیاں سنائی دیں۔ کوئی رو رہا تھا۔ روئے جا رہا تھا۔ یہ ایک نئی بات تھی۔
میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔
اندر صحن میں خالہ اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب بلّے کی لاش پڑی ہوئی تھی اور وہ لاش سے باتیں کرتے ہوئے روئے جا رہی تھیں۔
”تم بھی چلے گئے نا، ساتھ دینے کی بات کی تھی کہاں ساتھ دیا۔ چھوڑ کے چلے گئے۔“
میری آہٹ سن کر اس نے گردن اٹھائی۔ میری طرف دیکھا۔ کچھ حیران سی ہوئی۔
”خالہ میں بہت دیر سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”پھر جب تمہارے رونے کی آواز سنی تو اندر آ گیا۔“
”دیکھو، یہ بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔“ خالہ نے کہا۔ ”یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے کہ سب اس طرح چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ بتاؤ میں نے ان کے لیے کیا کچھ نہیں کیا لیکن کیا فائدہ ہوا۔“
”خالہ! یہ کس طرح ہو گیا۔ کیا کسی نے مارا ہے اس کو۔“
”کون مارے گا؟ کس میں اتنی ہمت ہے کہ میری اولاد کو مار سکے۔“ خالہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ ”اسے میں نے خود ہی مارا ہے۔ خود زہر پلا دیا تھا اس کو۔“
”وہ کیوں خالہ؟“
”اس لیے کہ یہ مجھ سے بہت پیار کرنے لگا تھا۔“ خالہ نے کہا۔ ”بہت پیار کرتا تھا، میرے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ اس لیے مار دیا اس کو۔“
”خالہ تمہاری یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ میں اسے کریدتا جا رہا تھا اور وہ آہستہ آہستہ کھلتی جا رہی تھی۔
”یہ آٹھواں تھا، آٹھواں۔“ خالہ بتا رہی تھی۔ ”سات کو پہلے مار چکی ہوں۔ وہ سات بھی اسی طرح مجھ سے پیار کرنے لگے تھے۔“
اس نے پھر رونا شروع کر دیا تھا۔ شاید وہ اس طرح اپنے آپ کو ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ بہت دیر بعد اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ”ایک بات بتاؤ، کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری یہ بلّے والی خالہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟“
”نہیں خالہ۔ یہ تو شاید کسی کو بھی نہیں معلوم۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ تم اس محلے میں رہتی ہو۔“
”میرا نام پھول وتی ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”آج پہلی بار کسی کو اپنے بارے میں بتا رہی ہوں۔ پھول وتی نام ہے میرا۔“
”لیکن خالہ اس طرح کے نام تو ہندوؤں کے ہوتے ہیں۔“
”ہاں میں بھی ایک ہندو عورت ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”میرا پورا خاندان ہندو ہے۔ میرا باپ ایک ہندو سادھو ہے۔“
اب سمجھ میں آ گیا تھا کہ میں نے اس دن جب اسے ایک ہندو سادھو سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا تو وہ اس کا باپ ہی ہو گا۔
”بہت ہی کمینہ ہے وہ۔“ خالہ نے کہا۔ ”ایک نمبر کا کمینہ، وہ بہت دولت چاہتا ہے۔ بہت طاقت چاہتا ہے۔ وہ شیطان کا چیلا بن گیا ہے۔ شکتی حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن میں اسے کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ پریشان کر دوں گی اس کو برباد کر دوں گی جس طرح اس نے مجھے برباد کیا ہے۔“
”خالہ کیا تم اپنے بارے میں سب کچھ نہیں بتاؤ گی۔“
”ہاں سب کچھ بتاؤں گی۔ اس لیے تو تمہیں اپنی کہانی سنا رہی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میں تو بہت اچھی لڑکی تھی۔ اپنے کام سے کام رکھنے والی۔ پوجا پاٹ کرنے والی، گھریلو قسم کی۔ جس طرح لاکھوں کروڑوں ہوا کرتی ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں تھی مجھ میں۔ میرا تو بیاہ ہی نہیں ہوا تھا۔ ماں مر چکی تھی۔ صرف میرا باپ تھا۔ نہ جانے کہاں سے میرے باپ کو شکتی مان بننے کا بھوت سوار ہو گیا۔ اس کو کسی نے بتا دیا کہ وہ منتر وغیرہ کا جاپ کر کے بہت طاقت ور اور مہان بن سکتا

ہے۔"

"اس طرح کے انسان ہر جگہ ہوتے ہیں خالہ۔" میں نے کہا۔ "ہمارے یہاں بھی بہت سے لوگ وظیفوں وغیرہ کے چکر میں پڑ کر برباد ہو جاتے ہیں۔"

"میرے باپ کو ایک شیطان قسم کا سادھو مل گیا تھا۔ اس نے میرے باپ کو بہکا بہکا کر برباد کر دیا۔ اس نے میرے ابا کو یہ بتایا تھا کہ اگر وہ کسی بچے کی بھینٹ دے دے تو سب کچھ بدل جائے گا۔ اس کے پاس ہیروں کی طاقت آجائے گی۔ دولت آجائے گی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ بچہ نازوں کا پالا ہوا ہو۔ بلکہ خود اس کی پرورش کی جائے۔ خوب اس کے لاڈ اٹھائے جائیں اور جب وہ تین چار سال کا ہو جائے تو پھر اس کو بھینٹ چڑھا جائے۔"

"یہ تو بہت شیطانی اور گھناؤنا منصوبہ تھا خالہ۔"

"ہاں۔" خالہ کی نگاہیں جیسے افق کے پار دیکھ رہی تھیں۔ "بہت گھناؤنا، نفرت کے قابل، لیکن میرے باپ پر اس کی دھن سوار ہو گئی تھی۔"

"تم نے سمجھانے کی کوشش تو کی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"ایک دو بار نہیں درجنوں بار۔" خالہ نے کہا۔ "لیکن وہ تو پاگل ہو رہا تھا۔ میری بات وہ کہاں مانتا۔ اب سوال یہ تھا کہ ایسا بچہ کہاں سے آئے۔ ویسے بچے تو بہت سے مل جاتے ہیں۔ کسی سے خرید لو۔ کسی اسپتال سے چوری کر لو یا گلی میں کھیلتے ہوئے کو اٹھا لو۔ یہ سب ہو جاتا ہے۔ لیکن شرط تو یہی تھی کہ بہت لاڈ و پیار سے اس کی پرورش کی جائے۔ اس کے ناز اٹھائے جائیں۔ اس کو بہت پیار دیا جائے اور جب وہ بہت پیار کرنے لگے تو پھر اس کو بھینٹ چڑھا دیا جائے۔"

"کمال ہے خالہ۔ انسان کتنا بے رحم ہے۔"

"بہت زیادہ۔" خالہ نے ایک گہری سانس لی۔ "شیطان بھی اس کے سامنے کچھ نہیں ہے۔ ایسا بچہ کہاں سے آتا۔ اس کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ ایسا بچہ خود ہی پیدا کروں۔"

"میرے خدا، یہ تم کیا کہہ رہی ہو خالہ۔"

"ہاں بیٹا۔ یہی ہوا میرے ساتھ۔ مجھ سے تو کچھ نہیں کہا گیا۔ یعنی یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کا منصوبہ کیا ہے۔ بس میرا بیاہ کر دیا گیا۔ موہن نام تھا اس کا اور وہ کم بخت بھی میرے باپ اور اس سادھو کی اس سازش میں شریک تھا۔ اس کو بھی لالچ آ گئی تھی۔ وہ بھی یہ سوچ رہا تھا کہ اس کے پاس بہت دولت آجائے گی۔ اس نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا اور میرا بیاہ ہو گیا۔ شادی کے ایک سال بعد میرا بیٹا آکاش پیدا ہوا۔"

خالہ نے پھر رونا شروع کر دیا۔ میں دم سادھے اس کی کہانی سنے جا رہا تھا۔

بہت دیر تک رو لینے کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "آکاش بہت خوب صورت تھا۔ اس غریب کو کیا معلوم تھا کہ اس کی زندگی کے دن بہت کم ہیں۔ اسے بہت جلد آکاش کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ میں اس کی پرورش کرتی رہی۔ میں بہت پیار کرتی تھی اس سے۔ میرا باپ اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتا کہ اس نے ہاتھ پاؤں نکال لیے تھے۔ پھر جب وہ چار سال کا ہوا تو وہی ہوا جو اس کے مقدر میں تھا۔"

"یعنی اس بے چارے کو بھینٹ چڑھا دیا گیا۔"

"ہاں مار دیا اس کو۔ اس دن میں نے اسے خوب سنوارا، اس کے بالوں میں کنگھی کی تھی۔ آنکھوں میں کاجل لگایا تھا۔ وہ مجھے ماں ماں کہتا رہا تھا۔ پھر میرا باپ اسے مجھ سے چھین کر لے گیا اور نہ جانے کہاں لے جا کر مار دیا اس کو۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ایک ماں کا کلیجہ پھٹ پڑا تھا۔

"بہت بے رحم ہو تم لوگ۔" میں نے کہا۔ "تمہارے میاں نے کچھ نہیں کہا۔"

"وہ کیا کہتا۔ وہ تو خود اس درندگی میں میرے باپ کا ساتھ دے رہا تھا۔ کیونکہ دولت اور طاقت تو اسے بھی چاہیے تھی۔ پھر وہ کیوں بولتا۔ میرا خیال ہے کہ باپ کے کہنے پر میرے آکاش کا خون بھی اسی نے کیا ہوگا۔"

''اف خدا، یہ کیسی کہانی ہے۔ دنیا میں کیسے لوگ ہوتے ہیں۔''

''یہ جو لالچ ہے نا یہ بہت برا ہوتا ہے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے۔ پہچان ختم کردیتا ہے۔ انسان کو حیوان بنا دیتا ہے۔ اس نے حیوان بنا دیا میرے باپ کو اور میرے میاں کو۔ دونوں انسان نہیں رہے۔ آکاش کے جانے کے بعد میں پاگل ہوگئی تھی۔ خیال میں آکاش میرے سامنے ہوتا اور میں اس سے باتیں کرتی رہتی۔ دیکھنے والے یہ سمجھتے کہ میں پاگل ہوں۔''

''اور ان دونوں کا کیا ہوا؟ کیا طاقت اور دولت ملی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، کچھ بھی نہیں ملا۔ میرے باپ نے کہا کہ بس ایک منتر کی کمی رہ گئی تھی۔ اس کی وجہ سے عمل نے کام نہیں دکھایا۔ ان کا خیال تھا کہ میں ایک بچہ اور پیدا کروں لیکن میں نے صاف انکار کردیا۔ میں نے کہا کہ میں اس لیے نہیں رہ گئی کہ اپنا خون جگر پیدا کروں، اس سے پیار کروں اور جب وہ ماں ماں پکارنے لگے تو مارنے کے لیے تمہارے حوالے کردوں۔ میں اب ایسا بھی نہیں کروں گی۔ میں کسی اور آکاش کو جنم نہیں دوں گی۔ اس کے بعد میں نے وہ گھر چھوڑ دیا اور بھٹکتی ہوئی تمہارے محلے میں آکر آباد ہوگئی۔''

''اور یہ بلّوں کی کیا کہانی ہے۔''

''ان کی وہی کہانی ہے۔ یہ سب میرے آکاش تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس سادھو نے ان لوگوں کو یہ بتایا کہ اگر بچہ بھینٹ کے لیے نہیں ملتا ہے تو کسی بلّے کو بھینٹ دو کم از کم سات بلّے۔ ان کو پالو۔ ان کی پرورش کرو اور جب وہ ایک سال کا ہوجائے تو پھر اسے بھینٹ چڑھا دو۔ ہر سال یہی تماشا ہوتا ہے۔ وہ دونوں ہر سال ایک بلّے کا بچہ میرے حوالے کرتے ہیں۔ میں ان کو پالتی ہوں اور جب وہ ایک سال کا ہو جاتا ہے تو وہ لوگ اسے آکر لے جاتے ہیں اور کہیں جنگل میں جاکر مار دیتے ہیں اس کو اور اس کے خون سے پتا نہیں کیا کیا لکھتے رہتے ہیں۔''

''لیکن خالہ یہ جو آخری تھا اس کو تو تم نے خود مارا ہے۔'' میں نے کہا۔

خالہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''کیا یہ بات تم کو معلوم ہے یا کسی نے بتایا؟''

''یہ رہنے دو خالہ۔ بس معلوم ہوگیا تھا۔''

''ہاں اسے میں نے خود مارا ہے۔ اپنے ہاتھوں۔''

''وہ کیوں خالہ!''

''وہ اس لیے کہ یہ میرا سب سے چہیتا تھا۔'' خالہ نے بتایا۔

''ہاں خالہ۔'' میں نے تائید کی۔ ''میں نے دیکھا ہے کہ تم اس کا بہت لاڈ کرتی تھیں۔''

''وہ بھی تو میرا لاڈ کرتا تھا۔'' خالہ کے چہرے کے تاثرات بہت عجیب ہوگئے تھے۔ ''بہت پیار کرتا تھا مجھ سے۔ میں جہاں جاتی میرے پیچھے پیچھے رہتا۔ شاید انسان کا بچہ بھی اتنا پیار نہ کرتا ہو۔ جتنا پیار وہ کرتا تھا۔''

''وہ تو میں نے بھی دیکھا ہے خالہ لیکن میرا سوال تو وہی ہے کہ تم نے اس بے چارے کو اپنے ہاتھوں سے کیوں مار دیا۔''

''اس لیے کہ اس کو تو ہر حال میں مرنا تھا۔ چاہے میں مارتی یا میرا وہ بے رحم باپ یا میرا میاں مارتا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ لوگ ایسے جانوروں کو کتنے دکھ اور کتنی اذیت سے مارتے ہیں۔ تڑپا تڑپا کر۔ اس کے بدن میں چیرا لگاتے ہیں تاکہ آہستہ آہستہ خون رستا رہے۔ خود سوچو کیا میں اپنے آکاش کو ایسی موت دینے پر راضی ہو جاتی۔ خود سوچو۔ اس لیے میں نے اس کو بہت آرام والی موت دے دی۔''

''خالہ مجھے یہ پتا چلا تھا کہ اپنے ہر بلّے کو تم خود ہی قبرستان میں دفن کر آتی ہو۔''

''ہاں اس کو مارنے کے بعد اس کی لاش وہ میرے حوالے کردیتے تھے۔ میری تسلی کے لیے تاکہ مجھ کو بلّے کی موت کا یقین آجائے اور میں رو پیٹ کر چپ ہوجاؤں۔''

ایک تکلیف دہ خاموشی، اذیت پہنچاتی ہوئی خاموشی چھا گئی۔ میں نے ایک ایسی کہانی سن لی تھی جس نے میرے ہوش اڑا دیے تھے۔

اس دنیا میں کیا کیا ہوتا رہتا ہے۔ کیسی کیسی کہانیاں جنم لیتی ہیں کیسے کیسے کردار سامنے آتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ انسان اپنی کامیابی کے لیے شارٹ کٹ کیوں تلاش کرتا ہے۔ پھر وہ لالچ میں آکر اتنا بے رحم ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے سب ایک جیسے ہوجاتے ہیں۔ چاہے وہ انسان کا بچہ ہو یا کسی جانور کا۔

بلّے والی خالہ پھر وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ کہاں گئی تھی۔ یہ آج تک کسی کو نہیں معلوم ہوسکا، ہوسکتا تھا کہ وہ کسی اور محلے میں اس وقت بھی کسی بلّے کی پرورش کررہی ہو۔

"میں نے کہا...... سن رہے ہیں آپ؟ کیوں نہ اس ایسٹر کی چھٹیوں میں ہم کورومنڈ کے تفریحی مقام پر جائیں سنا ہے...... وہاں گرم پانی کے چشمے ہیں۔" زارا نے کچن کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے ضمیر سے فرمائش کی جو اخبار بینی میں پوری طرح منہمک تھا زیرِلب مسکراتے ہوئے بولا۔

"گرم پانی کا چشمہ ہمارے باتھ روم میں بھی تو ہے وہیں لطف اٹھالو۔"

"ہاں، آپ کو تو بس میری باتوں کو چٹکیوں میں اڑانا آتا ہے۔" زارا الجھ گئی تھی۔ "لیکن اس مرتبہ آپ کی ایک نہیں چلے گی میں پہلے ہی سعیدہ بھابی سے بات کر چکی ہوں۔ ان کے بچے بھی جانے کو بے تاب ہیں۔ عرصے سے ہماری کوئی فیملی پکنک بھی نہیں ہوئی ہے۔ وہ مسلسل بول رہی تھی۔ میری دوست حمیرا بتا رہی تھی وہاں سمندر کا پانی اتنا ٹھنڈا ہے جیسے برف ڈال دی گئی ہو اور اس کے بالکل قریب گرم پانی کے چشمے ہیں ...... ہے نا خدا کی قدرت۔" زارا کو جتنا نئی نئی جگہوں کو مسخر کرنے کا شوق تھا۔

دھندلے سائے

جناب مدیر سرگزشت
السلام علیکم
ایک دلچسپ واقعہ جو ذرا ہٹ کر ہے آپ کی خدمت میں ارسال کررہی ہوں۔ ہم دور دیس میں بیٹھے لوگوں کو اردو رسائل جوڑتے ہیں اسی لیے یہ واقعہ اردو میں لکھا ہے یورپی علاقوں میں ایسے واقعات بہت ہوتے ہیں۔ پاکستان میں بھی ہوتے ہوں گے۔ اسی لیے بھجوا رہی ہوں۔

سلمیٰ جیلانی
(آکلینڈ/ نیوزی لینڈ)

ضمیر اتنا ہی سیر و تفریح سے دور بھاگتا تھا، زارا کی بات تو آئی گئی کر دیتا لیکن فیروز بھائی اور سعیدہ بھابی کے گھرانے کو وہ بالکل نظر انداز نہیں کر سکتا تھا، انہوں نے ملک چھوڑنے کے بعد یہاں آباد ہونے میں اس کا سگے بھائی بھابی کی طرح ساتھ دیا تھا۔ بس وہ کورومنڈ کے راستے سے تھوڑا گھبرا رہا تھا جو بہت اونچے اور تنگ پہاڑی راستوں پر مشتمل تھا۔

"زارا...... تمہیں بھی وہیں جانا ہے ہم لوگ روٹوروا چلے چلتے ہیں، وہ تو پورا شہر ہی گندھک کے چشموں سے بھرا ہوا ہے...... جی بھر کر گرم پانی سے محظوظ ہو لینا...... تم جانتی ہو گھومتے ہوئے راستوں سے مجھے متلی اور چکر آتے ہیں۔"

"ارے ...... آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں، ہم دوسرے راستے سے جائیں گے ٹیمز دریا کے راستے سے...... وہ بہت چھوٹا راستہ ہے اور پہاڑیوں سے بھی نہیں گزرنا پڑے گا۔ میں نے سب ریسرچ کر لی ہے۔" زارا پُرجوش آواز میں بولی، ضمیر کو اس کی یہ تجویز کچھ مناسب نہ لگی۔

"یہ کون سا راستہ ہے میں نے تو پہلے کبھی نہیں سنا۔"

"آپ جاتے ہی کہاں ہیں جو آپ کو کچھ پتا چلے، میں نے ایک ویب سائٹ پر دیکھا ہے، راستے میں بہت سے ہوٹل بھی ہیں۔ ہم ایک رات وہاں رک کر دوسرے دن کورومنڈ کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔"

"اوہو، تو یہ کہو تم نے تو سارا پلان میرے بغیر ہی بنا لیا پھر میری ضرورت بھی کیا ہے۔" وہ چڑ سا گیا۔

"میں نے تو آسانی کے لیے ایسا کیا، آپ میری بات کا غلط مطلب نہ لیں۔" زارا نے منہ پھلا لیا اور فریج کھول کر کھڑی ہو گئی گویا صفائی کرنے میں لگی ہو۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے، جو تمہارے جی میں آئے کرو۔ بس اپنا موڈ ٹھیک رکھو۔" ضمیر جیسے صلح جو انسان سے لاڈلی بیوی کی ناراضگی دیکھی نہ جا سکتی تھی۔ زارا نے جھٹ سے فریج کو جوں کا توں چھوڑا اور لیپ ٹاپ پر وہ بک مارک کی ہوئی ویب سائٹ کھولی جو اس نے رات دیکھی تھی اور ہوٹل کی بکنگ اور دوسرے معاملات کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

پانچ گھنٹے کے تھکا دینے والے سفر کے بعد وہ ایک پرانے سے ہوٹل کے سامنے کھڑے تھے جو ہوٹل کم اور زمانۂ قدیم کا قلعہ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ زارا کو اچنبھا سا ہوا ویب سائٹ پر تو کچھ اور دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ کیسا عجیب سا ہوٹل ہے۔ بہت ویرانی ہے یہاں۔" سعیدہ بھابی اور بچے بھی پریشان ہو گئے۔ ضمیر نے سارہ اور ثومی کو خوش کرنے کے لیے اپنے بیگ سے چاکلیٹس اور چپس کے پیکٹ نکالے لیکن بچوں پر کچھ خاص اثر دکھائی نہ دیا، وہ ہوٹل کے بے رنگ انداز کو دیکھ کر یا تھکن کی وجہ سے چپ چاپ کھڑے تھے۔ سعیدہ بھابی بولیں۔

"یہ جگہ کتنی سنسان ہے اور کتنا اندھیرا ہے۔ مجھے تو خوف محسوس ہو رہا ہے۔"

زارا نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے تسلی دی۔ "ایک ہی رات کی تو بات ہے بھابی! ہم لوگ صبح یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"چھوٹے قصبوں میں ایسا ہی منظر ہوتا ہے۔" فیروز بھائی آگے بڑھ کر بولے۔ "تم کبھی شہر سے نکلی تو ہو نہیں۔ یہاں پر زیادہ تر علاقے ایسے ہی ہیں۔"

"اور آپ نے تو جیسے دنیا گھوم لی ہے۔" سعیدہ بھی کہاں چپ رہنے والی تھیں، ان دونوں کی نوک جھونک جاری تھی کہ زارا کو ہوٹل کے مین گیٹ کے پاس رکھی ہوئی آرام کرسی ہلکورے لیتی ہوئی محسوس ہوئی...... جیسے کوئی وہاں بیٹھا ان کی گفتگو کا مزہ لے رہا ہو اس نے سر جھٹکا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے، یہ میرا وہم ہے۔" ہوٹل کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے زارا نے پیچھے مڑ کر دیکھا...... کرسی اب بھی ہل رہی تھی۔

☆☆☆

کاؤنٹر پر کوئی موجود نہ تھا۔ ضمیر نے بیل بجائی، استقبالیہ کمرے سے ایک بوڑھی عورت نکلی جس کی کمر تک جھکی ہوئی تھی، اسے دیکھ کر سارا ایکدم سہم گئی اور ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔ سب باتوں میں لگے تھے، کسی نے کوئی دھیان نہ دیا کہ وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ زارا نے بکنگ نمبر بتایا۔ جواب میں بوڑھی ریسپشنسٹ نے تیسری منزل کے دو کمروں کی چابیاں اور ایک ہدایت نامہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ زارا کو عورت کی خاموشی کچھ کھلی لیکن نظر انداز کرتے ہوئے چابیاں لے لیں۔ اسی دوران ایک عمر رسیدہ ملازم نے آ کر ان کا سامان جو دو چھوٹے چھوٹے سفری بیگز پر مشتمل تھا اٹھا لیا اور انہیں کمرے دکھانے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا ضمیر کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ "ارے ...... آپ لوگ تو اچھے خاصے مہمان نواز ہیں ورنہ یہاں تو سب کو اپنا سامان خود ہی اٹھانا

پڑتا ہے۔" ملازم نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے آگے آگے چلتا رہا۔

زارا نے سرگوشی کی۔ "کیا یہاں سب بوڑھے ہی کام کرتے ہیں؟ جوان چھٹی پر چلے گئے ہیں۔"

"ہاں ایسا ہی ہے۔ حال ہی میں، میں نے ایک آرٹیکل پڑھا یہاں کی چالیس فیصد سے زیادہ آبادی دوسرے ملکوں میں پیسا بنا رہی ہے اور یہ ملک ان محنتی لیکن چڑچڑے بوڑھوں کے دم سے چل رہا ہے۔"

"خیر چھوڑو اس بات کو۔" ضمیر نے گفتگو کو ادھورا چھوڑتے ہوئے دونوں بچوں کو اپنے آگے جانے کا اشارہ کیا۔

سعیدہ بھابی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بے حال ہوئی جا رہی تھیں چلتے چلتے بولیں۔ "ضمیر! یہ کیسا ہوٹل ہے جہاں کوئی لفٹ ہی نہیں۔"

"اف خدایا یہ سیڑھیاں ہیں یا شیطان کی آنت، ابھی دوسری منزل پر ہی پہنچے ہیں۔"

"بھابی اچھا ہے نا آپ کی کچھ ایکسر سائز ہو جائے گی۔" اس نے بظاہر خوش مزاجی سے جواب دیا لیکن دل میں وہ بھی حیران ہو رہا تھا۔ "اتنے بڑے ہوٹل میں کوئی لفٹ نہیں اور سیڑھیاں بھی کتنے قدیم انداز کی طویل، دائروں میں گھومتی ہوئی۔" اسے چکر سا آ گیا۔

دوسری منزل پر رک کر سب نے سانس لیا۔ بچے بھاگتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ تیسری منزل تک سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ان کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ تین منزل کے لیے اتنی سیڑھیاں راستہ جیسے ختم ہی ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ وہ سب ہی سوچ رہے تھے مگر خاموش تھے۔ ان کے کمرے طویل راہداری کے آخری سرے پر تھے۔ ملازم نے کمرے کے سامنے پہنچ کر سامان زمین پر رکھا اور خاموشی سے تالا کھولنے لگا جیسے ہی دروازہ کھلا۔ ایک چگادڑ اڑتی ہوئی کمرے سے نکلی اور سب کے سب اچھل پڑے۔

"اُف...... یہ کیا تھا۔"

سعیدہ نے پھولے ہوئے سانس کے درمیان خوف سے کپکپاتے ہوئے کہا۔ "فیروز میں نے تو ایک منٹ بھی یہاں نہیں رکنا بس ابھی واپس چلو ارے...... سارا اور نومی کہاں رہ گئے۔" فیروز بھائی بھی بدحواس ہو گئے تھے۔ زارا انہیں پکڑتی رہ گئی لیکن وہ نہ رکے اور نیچے بچوں کو دیکھنے چلے گئے ضمیر نے مایوس ہوتی ہوئی زارا کو کندھے سے تھاما اور کمرے میں لے آیا۔ "چھوڑو...... ہم کسی کو زبردستی تو نہیں روک سکتے۔"

ملازم ابھی بھی دروازے پر ہی کھڑا تھا ضمیر نے سوچا۔ "یہ شاید ٹپ کے انتظار میں ہے۔" اور جیب سے ریزگاری نکالنے لگا۔ اس نے منہ بنا کر پیسوں کی طرف اور پھر ضمیر کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ اسے اپنے اندر کپکپی محسوس ہونے لگی۔ ملازم سر کے اشارے سے منع کرتے ہوئے راہداری میں واپس مڑ گیا۔ "ارے رکو تو یہ کم ہیں تو اور دیے دیتا ہوں۔"

مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ راہداری خالی پڑی تھی۔ ضمیر حیرت زدہ ہاتھ میں پیسے لیے کھڑا تھا۔

"ضمیر! یہاں کیسی سیلن کی سی بُو ہے۔ تم نے محسوس کی۔" زارا کی آواز اسے ہوش کی دنیا میں واپس لے آئی۔

"مجھے تو سخت گھٹن ہو رہی ہے۔" اور وہ کمرے کے دوسری جانب بالکنی میں جا کھڑی ہوئی، جو دریا کی سمت کھلتی تھی۔

چاندنی چار سو چٹکی ہوئی تھی۔ اسے حیرت ہوئی۔

"ابھی جب ہم ہوٹل کی طرف آ رہے تھے تو کس قدر گہرا اندھیرا تھا۔ ہے نا ضمیر۔ یہاں کا موسم بھی کتنا عجیب ہے پل میں بدل جاتا ہے۔ اگر میں شاعر ہوتی تو کوئی غزل کہہ ڈالتی۔" اس نے خود کلامی کے انداز میں ضمیر کو مخاطب کیا۔

"ذرا باہر آ کر تو دیکھو کس قدر خوب صورت منظر ہے۔"

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ساری گھٹن مٹا دی تھی۔ جھینگروں کی آوازوں نے فضا میں جھنکار گھول دی۔ اف کس قدر سکون ہے یہاں اس نے دل میں سوچا اور اس حسین نظارے میں گم سی ہو گئی۔ سامنے پھیلا ہوا دھندلا منظر اب واضح ہونے لگا تھا۔ دودھیا روشنی میں سفید قبروں کی لمبی قطار دور تک جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"قبریں...... یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔" زارا نے آنکھیں ملتے ہوئے سوچا۔ "ابھی نیچے جا کر ریسپشن سے بات کرتی ہوں، بھلا بتاؤ ہمیں قبرستان کے سامنے والا کمرا دیا ہے۔" اسے غصہ آ گیا۔ رومانٹک موڈ غارت ہو کر رہ گیا تھا۔

ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ دفعتاً "روشنی کا جھماکا ہوا۔ قبروں کے درمیان تین چار سال کا بچہ دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ اسے جھٹکا سا لگا۔ یہ اتنا چھوٹا بچہ۔ آدھی رات کو اکیلا یہاں کیا کر رہا ہے۔ وہ ساکت کھڑی بچے کو تک رہی تھی۔ بچے نے ایکدم سر اٹھایا۔ اس کی نگاہیں زارا کی آنکھوں میں جیسے پیوست ہو گئیں۔ وہ گنگ سی ہو کر رہ گئی اس کی شعلہ بار نظریں سوئیوں کی طرح اندر تک پیوست ہوتی جا رہی تھیں۔

زارا کے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی ایک لمحے کو جیسے سب کچھ اس روشنی میں گم ہو گیا۔"

وہ خوف سے کانپنے لگی۔ کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اچھل پڑی۔ دل جیسے حلق میں اٹک گیا۔ "ارے...... میں ہوں زارا...... کیا ہوا۔"

وہ بے اختیار ضمیر سے لپٹ گئی۔ "ایسا کیا ہو گیا؟" اس نے زارا کو آہستگی سے علیحدہ کرتے ہوئے تسلی دی حالانکہ خود اس کی بھی بزلہ بجی ہوا ہو چکی تھی۔ زارا اب بھی بری طرح کپکپا رہی تھی منہ سے آواز نہ نکل رہی تھی۔ انگلی سے اس سمت میں اشارہ کیا جہاں وہ منظر دکھائی دیا مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ نہ وہ بچہ اور نہ کوئی قبر۔

"ضمیر...... واپس چلو یہ جگہ ضرور آسیب زدہ ہے۔"

"یہ سب تمہارا وہم ہے۔ یہاں آنے سے پہلے تم ڈراؤنی فلمیں بہت زیادہ دیکھ رہی تھیں۔"

"اسی کا اثر ہے۔" زارا نے سر ہلا کر جواب دیا۔

"تم سو جاؤ، میں جاگ رہا ہوں تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے ہوتے کوئی بھوت تمہیں نہیں ڈرا سکتا۔" ضمیر اسے تسلی تو دے رہا تھا مگر اسے معلوم نہ تھا اس کے الفاظ کتنے بے ربط ہو رہے تھے۔ فیروز بھائی نے جو ٹیکسٹ میسج بھیجا تھا وہ تو اس نے زارا کو بتایا بھی نہیں تھا۔ "ان کے بچوں نے دوسری منزل پر چھوٹے بچوں کی لاشیں رسیوں سے جھولتی ہوئی دیکھی تھیں۔" ویسے بھی اب اتنی رات ہو گئی ہے ہم اس وقت جائیں گے بھی کہاں۔ پیار سے زارا کا سر سہلاتے ہوئے خود اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔

☆☆☆

کوئی تین بجے کا پہر ہوگا زارا کی آنکھ کھل گئی، کھڑکی سے روشنی چھن کر آرہی تھی ضمیر اس پر جھکا ہوا تھا۔ "اف ضمیرا تمہارے چہرے پر کیچپ لگا ہوا ہے؟ یا کہیں سے کالک لگا لی ہے۔" چاند کی روشنی میں اس کا چہرہ پہلے سرخ پھر سیاہی میں ڈھلتا جا رہا تھا۔ اس نے ضمیر کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ضمیر نے کوئی جواب نہ دیا یکایک اس کا چہرہ لمبا ہونے لگا اور حلق سے خرخراہٹ کی آوازیں بلند ہونے لگیں اس کے لمبے استخوانی ہاتھ آگے بڑھے اور قریب تھا کہ زارا کا گلا دبوچ لیتے۔ زارا نے اسے پرے دھکیلنے کی ناکام کوشش کی۔ اس نے چلانا چاہا لیکن آواز جیسے گلے میں گھٹ کر رہ گئی اچانک چاروں طرف آگ ہی آگ پھیل گئی۔

☆☆☆

ضمیر بالکنی میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا زارا کی گھٹی گھٹی آوازوں نے اسے بری طرح چونکا دیا وہ بھاگ کر اندر آیا اور زارا کو جھنجوڑنے لگا۔ "کیا ہوا ہے۔ کوئی خواب دیکھ لیا ہے کیا۔"

زارا خوف زدہ نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ اس نے کمبل میں اپنا منہ چھپا لیا ضمیر کے چہرے کو دیکھنے کی ہمت نہ پا رہی تھی اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے، شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔

☆......☆

اگلی صبح...... وہ اتنے خوف زدہ تھے کہ آگے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا دونوں نے اپنا سامان اٹھایا اور خاموشی سے گھر کی راہ لی۔

☆......☆

زارا کچن میں فریج کھولے کھڑی تھی اور باقی ماندہ صفائی کا جائزہ لے رہی تھی۔ ضمیر حسب معمول اخبار بینی میں مصروف تھا کہ ایک آرٹیکل پر اس کی نظر پڑی۔ تھیمز دریا کے پل کے پار قدیم قلعہ میں مقامی لوگ چھوٹے بچوں کی قربانی دیا کرتے تھے اور ان کی لاشوں کو اس کے قریب میدان میں دفن کر دیا کرتے تھے بعد میں وہ قلعہ آسیب زدہ ہو گیا۔ لوگوں نے وہاں بچوں کو چیختے چلاتے بھاگتے ہوئے، کبھی ذبح ہوتے دیکھا تھا، یہ واقعات پے در پے رونما ہونے لگے۔ یہاں تک کہ اسے آگ کے حوالے کر دیا گیا۔ ضمیر کو جھرجھری آ گئی اس سے آگے پڑھا نہ گیا۔ ابھی وہ زارا کو آرٹیکل کے بارے میں بتانے ہی والا تھا کہ دروازے پر گھنٹی بجی زارا دروازے کی طرف بڑھی۔ "ٹھہرو تم رکو میں دیکھتا ہوں۔"

دروازے پر اس کا پڑوسی اور اخبار والا ہاتھ میں بل لیے آپس میں باتیں کر رہے تھے پڑوسی ٹام کہہ رہا تھا۔ "ہاں...... یہ لوگ کئی دن سے کہیں گئے ہوئے ہیں ان کے بھائی بھابی بھی آئے تھے اور کافی پریشان تھے پولیس میں ان کی گمشدگی کی اطلاع کرنے کو کہہ گئے ہیں۔"

زارا نے پرچے پر یہ باتیں لکھیں اور پھر ضمیر کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "میں نے پرچے میں لکھ دیا ہے۔ چلو ہم اسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔"

زارا کے بھائی بھاوج نے وہ پرچا پولیس اسٹیشن میں جمع کر دیا۔ پولیس آج تک ان دونوں کا پتا نہیں کر پائی ہے۔

تہی داماں

مکرمی مدیر سرگزشت
السلام علیکم
اس بار میں ایک ذرا منفرد انداز کی روداد کے ساتھ حاضر ہوا ہوں اگر سرگزشت کے معیار کی ہو تو اسے شامل کرلیں۔

ظہیر مرزا
(کراچی)

شور ہنگامے کی آوازیں سنتے ہی رخسانہ اپنے کمرے سے تیزی سے نکل کر دروازے تک آئی مگر مشتری بیگم کو دیکھتے ہی اس کے قدم وہیں رک گئے۔ ساتھ والے گھر سے فریدہ کے رونے کی دل خراش آوازوں سے اس کا دل پھٹنے لگا مگر وہ اس کے پاس جا نہیں سکتی تھی وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی مگر برآمدے میں تخت پر بیٹھی مشتری بیگم اس تمام جھگڑے فساد سے بے نیاز سبزی کاٹتی رہیں۔
چند ساعت رخسانہ وہیں بت کی طرح کھڑی رہی پھر

اس نے مشتری بیگم کے قریب آکر آہستہ سے پوچھا ''اماں کیا ہوا ہے؟ کیا آج پھر فریدہ کے ہاں......''

''رہنے دو...... یہ تو اب روز کا معمول ہے۔ اس فریدہ نے تو امیر کی زندگی اجیرن کردی ہے لاکھ دفعہ سمجھادیا مگر چار دن نہیں گزرتے سکون کے پھر وہی جھگڑے شروع ہوجاتے ہیں۔ تم اپنے کام سے کام رکھو بھی۔'' مشتری بیگم نے رخسانہ کی بات کاٹتے ہوئے سختی سے کہا اور سبزی اٹھا کر باورچی خانے میں چل دیں۔

''مگر اماں امیر بھائی کا بھی تو قصور ہے انہوں نے بھی تو فریدہ بے چاری کے ساتھ ساری زندگی کیا کیا ہے۔ بغیر پیسوں کے کوئی عورت کس طرح گھر چلا سکتی ہے۔'' رخسانہ نے فریدہ کی حمایت کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اکیلی دنیا میں صرف وہی ایسی عورت نہیں ہے، جس کے میاں کا کوئی روزگار نہ ہو ہزاروں عورتیں ہیں کسی نہ کسی طرح گزر بسر کرتی ہیں۔ برا اچھا وقت کاٹ ہی لیتی ہیں مگر ایسا فساد کوئی نہیں کرتا۔ توبہ ہے کیسی اوندھی کھوپڑی کی لڑکی ہے یہ بھی......'' مشتری بیگم نے اپنے مؤقف پر ڈٹے رہتے ہوئے کہا۔

''سات سال ہوگئے ہیں اس کی شادی ہوئے برا وقت کٹ کے ہی نہیں دے رہا۔ آخر کب تک وہ بھی برداشت کرے، کب تک گزارہ کرے'' رخسانہ نے دبی زبان سے کہنا چاہا۔

''اے ہے تو خود کون سارا جکماری ہے کسی ریاست کی، کسی محل سے اٹھ کر آئی ہے جو ایسا نخرہ ہے...... آخر جو کچھ لایا ہے اسی کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے اور کیا کرے......'' مشتری بیگم کو اس بار غصہ آگیا۔

''ہاں...... کبھی آیا تو گھی کا ڈبہ لے آیا، کبھی چاول کی بوری لادی، کبھی چائے، دودھ کے ڈبے لے آیا، کبھی آیا تو کچھ پیسے دے دیے اور کبھی نہیں بھی دیے۔'' رخسانہ نے مشتری بیگم کے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

''جب تک پیسا رہا خوب عیش کرائے اس نے...... اب غریب کی جیب خالی ہے تو یہ اسے گھر میں رکھنے کی بھی روادار نہیں ہیں۔'' مشتری بیگم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں فریدہ سے زیادہ اپنے ان بہن بھائیوں اور دوستوں کی دعوتوں میں پیسا اڑا جو اسے اب پوچھتے بھی نہیں ہیں۔'' رخسانہ نے فوراً جواب دیا۔

''اے ہے اگر ایسا ہی برا تھا تو شادی ہی کیوں کی اس سے، نہ کرتیں...... اس وقت ایسی کیا موت پڑی تھی جو سارے زمانے سے لڑ جھگڑ کر دونوں نے بیاہ کرلیا اور اب ایک دوسرے میں کیڑے نکالنے لگے ہیں۔'' مشتری بیگم نے جھلاتے ہوئے کہا۔

رخسانہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا وہ سر جھکائے خاموشی سے اپنے کمرے میں لوٹ گئی۔ دیر تک وہ فریدہ اور امیر کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے محبت سب سے ناپائیدار اور ناقابل اعتبار شے لگنے لگی۔ سارے زمانے کی مخالفت مول لے کر جنہوں نے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا اب ان کی زندگیاں کس قدر بے کیف ہیں اسے آنے والے وقت سے ڈر سا لگنے لگا کہیں اس کی اور شاکر کی زندگی بھی ایسی ہی بے رنگ نہ ہوجائے۔

محبت کا لفظ ساری زندگی اس کے لیے ایک پہیلی بنا رہا تھا۔ وہ کبھی بھی اسے پورے طور پر سمجھ نہ پائی تھی۔ وہ اپنی ذات پر دوسروں کا قرض اتنا محسوس کرتی تھی اور دوسروں کی مرضی کو اس قدر مقدم رکھتی تھی کہ اس نے اپنے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ کیا چاہتی ہے، اسے کیا اچھا لگتا ہے، وہ کس طرح رہنا چاہتی ہے، اب سب باتوں کی اس کی زندگی میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ مگر فریدہ سے مل کر اسے یوں لگا کہ وہ زندگی گزار رہی تھی زندگی جی نہیں رہی تھی۔ وہ جینا شروع کرنا چاہتی تھی۔ اپنی خواہشوں کی تکمیل چاہتی تھی، اپنی زندگی کے فیصلوں میں دوسروں کی تائید چاہتی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں فریدہ کا عکس دیکھنا چاہتی تھی اور اسی لیے مشتری بیگم رخسانہ پر فریدہ کی پرچھائی بھی پڑنے نہیں دینا چاہتی تھیں۔

رخسانہ کو وہ دن یاد آنے لگے جب وہ پہلی بار فریدہ سے ملی تھی۔ شاکر کا رشتہ لے کر مشتری بیگم اس کے گھر آئی تھیں تو فریدہ کو ساتھ لائی تھیں۔ مشتری بیگم رخسانہ کی پھپھی تھیں اور رخسانہ کی کم عمری میں ہی انہوں نے شاکر کے لیے اسے مانگ لیا تھا مگر منگنی کی باقاعدہ رسم بڑی دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھیں اس لیے جتنے ملنے والے میسر آسکے سب کو لائی تھیں۔ دراز قد، لمبے بالوں والی نٹ کھٹ سی فریدہ سب سے الگ لگ رہی تھی۔ جلد ہی فریدہ کی اس سے دوستی بھی ہوگئی۔

رخسانہ کی زندگی جس ڈگر پر چل رہی تھی وہ اس سے مطمئن تھی مگر فریدہ سے ملنے کے بعد اس کے سارے

تصورات گڈمڈ ہونے لگے تھے۔

رخسانہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ بمشکل دس گیارہ برس کی تھی جب رخسانہ کی ماں کا انتقال ہوگیا اور سوتیلی ماں کے سلوک کا سوچتے ہوئے رخسانہ کے باپ نے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ رخسانہ کی پھپھی مشتری بیگم رخسانہ کی طرف سے فکرمند تھیں انہوں نے اپنے بیٹے شاکر کے لیے رخسانہ کو مانگ لیا تھا۔ رخسانہ کے باپ کی کپڑے کی دکان تھی وہ اس رشتے پر بہت مطمئن اور خوش تھا۔ وہ اکثر کوئی نہ کوئی ضرورت کی چیز رخسانہ کے جہیز کے لیے لے آتا۔ جب بھی رخسانہ سے بات کرتا تو اسے یہی باور کرانے اور سمجھانے کی کوشش کرتا کہ اب اس کی زندگی پر صرف شاکر کا حق ہے۔ جو کہے، جیسا کہے اسے ویسا ہی کرنا ہوگا۔ رخسانہ بھی سعادت مندی سے سر جھکائے سنتی رہتی۔

اس کی سوچ کا محور و مرکز شاکر کی ذات تھی۔ وہ تعلیم مکمل کرلے، تو اس کی ملازمت پکی ہوجائے گی اور پھر اس کی شادی کردی جائے گی اور اسے ہمیشہ شاکر کی ہر بات کو ماننا ہے اور بس۔

جب بھی رخسانہ کو اپنی سہیلیوں سے معلوم ہوتا کہ ان کے ماں باپ انہیں آگے پڑھانا چاہتے ہیں یا وہ کسی ادارے سے کوئی کورس کررہی ہیں، وہ جاب کرنا چاہتی ہیں تو اسے یہ سب کسی اور دنیا کی باتیں لگتیں۔ وہ ان سب باتوں کی خواہش تو کرسکتی تھی مگر اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس کی کسی بات کو اہمیت نہیں دی جائے گی اس لیے اس نے اپنے دل سے ان خواہشوں کو نکال دیا تھا اور اپنی ذات کو وہیں تک محدود کرلیا تھا جہاں تک دوسروں نے خط کھینچا تھا۔

شادی کے بعد بھی اس کے حالات بدل گئے مگر زندگی انہی پابندیوں کے درمیان گھٹتی رہی۔

شاکر بھی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا مشتری بیگم کے ہاں اس سے پہلے دو بیٹے ہوئے تھے مگر بچ نہ سکے تھے۔ شاکر ان کی بڑی منتوں مرادوں والی اولاد تھا اس لیے اس کی ہر ضرورت کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔

گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر کی ملازمت ملتے ہی شاکر کی شادی کردی گئی۔ رخسانہ شاکر کی زندگی میں کوئی ایسا سحر تلاش کررہی تھی جو اسے اسیر کرلے مگر شاکر جیسا خشک مزاج اور سادہ طبیعت انسان رخسانہ کو سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ہر طرح سے رخسانہ کا خیال رکھتا، رخسانہ جو کہتی وہ اس کی ضرورت کی ہر شے اسے مہیا کردیتا تھا مگر رخسانہ کی آرزو تھی کہ شاکر محسوس کرنا سیکھے۔ بغیر فرمائش کیے وہ اس کے لیے کوئی تحفہ لا کردے۔ شاکر اسے اپنی زندگی میں اہمیت بھی دے صرف ضرورتاً شامل نہ رکھے۔

شاکر ان باتوں کو بڑی سطحی سی بات سمجھتا۔ وہ زندگی کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اسی لیے ایسی افسانوی باتوں سے چڑ جاتا تھا۔ رخسانہ نے اپنی زندگی ایک انتظار کے سے عالم میں گزاری تھی، شاکر کے رویے سے وہ رنجیدہ ہوجاتی۔

شروع شروع میں اس نے شاکر کو بدلنے کی کوشش بھی کی مگر شاکر کے پاس اس کی باتوں کو رد کرنے کی بہت سی دلیلیں پہلے سے موجود رہتی تھیں۔ شاکر کے پاس پیسوں کے جمع خرچ کے علاوہ بات کرنے کا کوئی موضوع نہ ہوتا تھا۔ بچی کی پیدائش کے بعد رخسانہ نے خود کو گھر کے کاموں میں ایسا جھوک دیا کہ خود کو بھلا ہی دیا تھا۔ مشتری بیگم رخسانہ سے محبت تو بہت کرتی تھیں مگر پہننے اوڑھنے، ملنے جلنے اور آنے جانے میں ان کی ہر وقت کی روک ٹوک اور پابندیوں نے اسے اور بددل کردیا تھا۔

ان باتوں نے رخسانہ کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا تھا کہ زندگی وہی ہے جو نظر آرہی ہے۔ اس نے بھی اپنے دل سے ان تمام باتوں کو بھلا دیا اور وہ اب اس بات کی آرزومند نہیں رہی تھی کہ شاکر اس کی محبت میں کوئی بلند بانگ دعوے کرے۔ محبت جس کی معنویت وہ سمجھنا چاہتی تھی، جسے حاصل کرنا چاہتی تھی اور متاع زندگی سمجھتی تھی وہ یہی سمجھ سکی کہ اس کی تلاش بے سود ہے۔ مگر جب بھی وہ فریدہ کو دیکھتی تو اس کی زندگی میں ایک ہلچل سی مچ جاتی۔ فریدہ کے ماں باپ امیر سے شادی پر کسی صورت راضی نہ تھے مگر فریدہ کی ضد کے آگے مجبور ہوگئے تھے۔

رخسانہ کی بچی کی رونے کی آوازیں اسے ماضی سے کھینچ لائیں۔ بچی کی آواز سن کر مشتری بیگم بھی دودھ کا گلاس لیے اس کے کمرے میں چلی آئیں اور رخسانہ کو دودھ کا گلاس دیتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ کر بولیں۔ ”دیکھو بھئی! ہم تو یہ جانتے ہیں کہ میاں بیوی کے جھگڑے ہر گھر میں ہوتے ہیں وہ خود ہی نمٹ لیں تو اچھا ہوتا ہے کسی تیسرے کو اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ بس تم بھی ان کے معاملے میں زیادہ نہ پڑو۔“

”مگر اماں اس بیچاری بچی بینش کا کیا بنے گا؟ ان دونوں کے جھگڑوں میں وہ تو بلاوجہ پس کے رہ جائے گی۔“

رخسانہ نے ایک دم تڑپ کر کہا۔

"اے ہے تو کون سا سگی اولاد ہے فریدہ کی بھتیجی ہے آخر کو...... جب چاہے فریدہ کا بھائی لے جائے اسے واپس اپنے...... ہمیں کیا سروکار......" مشتری بیگم نے بگڑ کر جواب دیا۔

"مگر اماں پالا تو اولاد کی طرح ہی ہے ناں، اسے ہے تو ایسی ہی محبت۔" رخسانہ نے کہنا چاہا۔

"لگتا ہے تمہاری عقل پر بھی پتھر پڑ گئے ہیں جب امیر کو جیل ہوگئی تھی اور فریدہ اکیلی رہ رہی تھی تو اس کے بھائی نے اپنی بچی کو اس کے پاس چھوڑ دیا تھا اور پھر بچی کے لیے پائی پیسا خرچ کرتا تھا راشن ڈلواتا تھا فریدہ نے کوئی احسان نہیں کیا بچی کو رکھ کر اب امیر جیل کاٹ کے آگیا ہے تو کاہے کی دوسراہٹ لے جاتا ہے تو لے جائے اپنی اولاد فریدہ کا کیا حق ہے بولنے کا۔" مشتری بیگم نے غصے سے کہا اور اٹھ کر چلی گئیں۔

رخسانہ بچی کو سلانے کے لیے اس کے پاس لیٹ گئی وہ بے بسی سے چھت کو گھورنے لگی۔ فریدہ کے پاس جانے کے لیے کوئی بہانہ تلاش کرنے لگی۔ اسے رہ رہ کر امیر پر غصہ آرہا تھا۔ اسے وہ دن یاد آنے لگے جب امیر جیل چلا گیا تھا اور فریدہ نہایت تنگدستی میں گزر بسر کررہی تھی کہ کب امیر واپس آئے گا اور اس کے حالات بھی بدلیں گے۔

مشتری بیگم کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ امیر کے باپ کی خیر پور میں زمینیں تھیں اس کی ماں مشتری بیگم کی دور کی رشتہ دار بھی تھیں۔ شادی کے سال بھر بعد ہی کسی نے خاندانی دشمنی میں امیر کے باپ کو قتل کردیا تھا رشتہ داروں نے امیر کی ماں کی دوسری شادی کروادی تھی مگر سوتیلے باپ نے پیسا دونوں ہاتھوں سے اس طرح لٹایا کہ امیر جس کا بچپن تو بڑے عیش میں گزرا تھا اس کے جوان ہونے تک فاقوں کی نوبت آگئی۔ اچھے دنوں میں امیر نے پڑھنے لکھنے میں کوئی دلچسپی نہ لی اور نہ کسی ہنر کو سیکھنے میں۔ آوارہ دوستوں کے ساتھ پہلے چھوٹی موٹی وارداتیں کرنے لگا پھر کبھی ایک پارٹی کے لیے کام کرنے لگا تو کبھی دوسری پارٹی کے لیے۔ ہیکڑی اور بے پروائی اس کے مزاج میں پہلے سے تھی۔ نتیجہ یہی ہوا کہ بدمعاشی ہی اس کا واحد ذریعہ آمدنی تھا اسی لیے مشتری بیگم امیر کی ہر برائی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں۔

فریدہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ اپنے محلے کے ایک اسکول میں ٹیچر تھی۔ روپوشی کے دنوں میں امیر اس کے گھر کے پڑوس میں اپنے ایک دوست کے گھر رہا کرتا تھا۔ محلے میں فریدہ کا باپ ساری زندگی دوبئی میں رہا تھا اس لیے مالی حیثیت ذرا مستحکم تھی۔ زندگی کی بہت سی ایسی آسائشیں میسر تھیں جو محلے کے کسی گھر میں نہ تھیں۔ فریدہ کے دو منزلہ مکان میں دکانیں بھی تھیں جن میں سے ایک دکان امیر کے دوست کی تھی۔ رنگ روپ میں بھی فریدہ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ امیر اس پر دل و جان نچھاور کرنے لگا۔ قد کاٹھ، چال ڈھال اور انداز میں امیر فریدہ کو کسی ہیرو سے کم نہیں لگتا تھا۔ محبت کی آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔

شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی فریدہ کو اندازہ ہوگیا کہ زندگی کی گاڑی اس ڈگر پر چلانا مشکل ہے۔ جب بھی امیر کے پاس پیسے آجاتے تو وہ خوب لاابالی پن سے اڑانے لگتا۔ پھر اکثر فریدہ قرض ادھار کرکے کسی نہ کسی طرح گزارا کرتی۔ امیر کب آئے گا، کب تک گھر میں رہے گا، کب چلا جائے گا اور کب تک نہیں آئے گا اسے کچھ پتا نہیں ہوتا تھا۔ فریدہ اپنے کمسن بچے دانش کے مستقبل کی طرف سے بھی فکر مند رہنے لگی۔

جیل اور مقدمہ بازی نے رہی سہی کسر اور پوری کردی ان حالات میں فریدہ کے بھائی ماجد نے اس کے اکیلے پن کو دیکھتے ہوئے اپنی آٹھ سالہ بچی بینش کو فریدہ کے پاس چھوڑ دیا اور اس کے نام پر راشن کے لیے کچھ نہ کچھ رقم بھی دے جایا کرتا تھا۔ فریدہ جانتی تھی کہ ماجد کی دوسری بیوی بینش کو اپنے پاس رکھنے پر تیار نہیں ہے... مگر جانتے بوجھتے بھی فریدہ اس بوجھ کو احسان سمجھنے لگی۔

کمرے کے دروازے پر آہٹ ہوئی، بچی کلبلانے لگی۔ رخسانہ نے بچی کو تھپکنا شروع کردیا۔ مشتری بیگم کرچھا ہاتھ میں لیے لوبان کی دھونی دینے آئیں اور ایک گلاس میں پانی دیتے ہوئے بولیں "یہ دم کیا ہوا پانی ہے...... پی لینا اور بچی کو بھی پلا دینا...... سوتے میں ڈر گئی تھی۔"

رخسانہ نے پانی لے کر رکھ دیا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ مشتری بیگم دو چار لمحے کھڑی رہی پھر بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں "شاکر کے آنے سے پہلے گھر کے کام نمٹا لینا۔ یہ فریدہ کے سوگ میں لیٹے لیٹے سارا دن غارت نہ کردینا۔"

رخسانہ بچی کے بھیگے ہوئے کپڑے لے کر غسل خانے میں چلی گئی۔

شام تک رخسانہ کو فریدہ کے گھر جانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ شاکر سے اس بارے میں کچھ کہنا سننا ہی بے کار

تھا۔ اسے لگتا تھا کہ شاکر نے اپنی ساری سمجھ بوجھ اپنی ماں کے پاس گروی رکھوا دی ہے۔

رات کو کھانا کھاتے ہوئے شاکر نے پوچھا۔ ”آج پھر امیر کے گھر میں کوئی مسئلہ ہوا تھا کیا؟ پڑوس والے حاجی صاحب بتا رہے تھے۔“

”اے اور نہیں تو کیا...... ایسا قتل فساد مچایا اس فریدہ کی بچی نے کہ توبہ...... سارا محلہ جمع ہو گیا تھا۔“ مشتری بیگم نے فریدہ سے دشمنی میں بات کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔

”عجیب آدمی ہے یہ بھی، کوئی اس سے محلے میں بات نہیں کرنا چاہتا، سب سے کہتا پھرتا ہے کہ اس نے اب سارے غلط دھندے چھوڑ دیے ہیں مگر پھر بھی کسی نہ کسی معاملے میں پڑا رہتا ہے۔“ شاکر نے نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔

”سارا قصور اس ناس پیٹی فریدہ کا ہے۔ اس نے امیر کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ ذرا سمجھ عقل ہو عورت میں تو برے سے برے آدمی کو اچھے میں بدل دے، جب جیل سے آیا تھا تو کیسا نمازی ہو گیا تھا سب برے کام چھوڑ دیے تھے مگر وہ...... تو اپنے بھائی کی محبت میں ایسی دیوانی ہوگی ہے کہ شوہر کی عزت ذرا دیر میں دو کوڑی کی کر دیتی ہے بھائی کے سامنے۔“ مشتری بیگم نے تلملا کر کہا۔

”کس کی طرف داری کر رہی ہیں آپ بھی، خاک بدلا تھا، وہ تو جیل میں کسی کے ساتھ مار پیٹ میں اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی علاج ولاج ٹھیک سے ہوا نہیں تھا کتنے عرصہ تو وہ اسٹک لے کر چلتا تھا۔ آ جا کہیں نہیں سکتا تھا تو نمازی بن گیا تھا بس......“ شاکر نے اماں کی باتوں سے چڑتے ہوئے کہا۔

”اے میں کہتی ہوں کوئی اس کی کہیں ملازمت لگوا دیتا تو اس سارے جھنجٹ سے جان چھوٹ جاتی۔ کہیں چوکیدار ہی لگوا دے کوئی اسے۔“ مشتری بیگم نے انداز بدلتے ہوئے بدستور حمایت جاری رکھی۔

”ارے ماں یاد نہیں کیا...... کتنی منت سماجت کر کے شہنشاہ بھائی نے اسے فیکٹری میں لگوا دیا تھا جب...... مگر ہوا کیا...... اس کا مزاج دیکھا ہے پتا نہیں کیا سمجھتا ہے خود کو۔ دو چار دن بعد ہی ذرا سی بات پر سپر وائزر کا سر پھاڑ دیا تھا کون اس کے منہ لگے گا۔“ شاکر نے منہ بنا کر کہا۔

مشتری بیگم شاکر کی بات سن کر خاموش ہو گئیں، تھوڑی دیر بعد شاکر نے مشتری بیگم کی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے رسان لہجے میں کہا۔ ”کرنا اس نے بیچ

ہے...... رات رات بھر دوستوں کے ساتھ تاش کھیلے گا، کبھی کسی کا مکان خالی کروالیا تو کبھی کسی کو دھمکا کر پیسے ہتھیا لیے......بس آپ اس کی فکر کرنا چھوڑ دیں۔''

مشتری بیگم اس پر کچھ نہ کہہ سکیں مگر جھٹ سے پلیٹ سرکا کے اٹھ کھڑی ہوئیں اور جاتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''ہم تو اب کسی سے کچھ نہیں کہتے، جو جی میں آئے کہو، جو جی میں آئے کرو۔''

دو دن بعد صبح ہی مشتری بیگم نے مرتبان سے شلجم کا اچار نکال کر ایک برتن میں بھرا اور کسی رشتہ دار کے ہاں چلی گئیں۔ رخسانہ نے موقع غنیمت جانتے ہوئے فوراً چادر اوڑھی، بچی کو گود میں اٹھایا اور گھر میں تالا لگا کر فریدہ کے گھر پہنچ گئی۔ فریدہ اداس بیٹھی ہوئی تھی۔ فریدہ پر نظر پڑتے ہی اسے ایسے لگا جیسے فریدہ کا سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ فریدہ نے اسے بتایا کہ دو دن ہو چکے ہیں جھگڑے کے بعد امیر اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ رخسانہ کو ایک دھکا سا لگا۔ فریدہ اسے تنہا ہی نہیں تہی داماں بھی لگ رہی تھی۔

چند لمحے تو رخسانہ کو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے پھر اس نے ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح لڑائی جھگڑا تو پہلے بھی ہوا ہے مگر اب یہ سب کچھ ایک دم کیسے۔''

''وہ ماجد بھائی ہیں ناں وہ آئے ہوئے تھے اور......''

فریدہ نے کچھ کہنا چاہا اس کی آواز رندھی ہوئی تھی مگر الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں وہ کچھ نہ کہہ سکی بس رخسانہ کے گلے لگ کر رونے لگی۔

رخسانہ نے اسے تسلی دی پانی پلایا۔ برابر کے کمرے سے بینش بھی پاس آ کر کھڑی ہو گئی رخسانہ نے اشارے سے بینش کو واپس جانے کو کہا پھر فریدہ کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم فکر نہ کرو اور......''

''نہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا رخسانہ...... امیر چلا گیا ہے ہمیشہ کے لیے۔'' فریدہ نے رخسانہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نفی میں سر ہلاتے ہوئے رو کر کہا۔

رخسانہ کے استفسار پر فریدہ نے اسے بتایا کہ دو دن پہلے جب ماجد آیا ہوا تھا تو اسی وقت امیر بھی گھر میں آ گیا ماجد کو امیر ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ دونوں میں تو تکار شروع ہوئی اور نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ ماجد تعلق ختم کر کے بینش کا ہاتھ پکڑ کر اسے لے جانے لگا تو فریدہ نے بیچ میں پڑ کے امیر کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔

رخسانہ کو غصہ تو بہت آیا مگر ان حالات میں وہ کچھ کہہ نہیں سکی تھی۔ اس نے فریدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو فریدہ! مرد کا تو نام ہی عورت کے لیے سب سے مضبوط سہارا ہوتا ہے۔''

فریدہ خاموش رہی۔

چند لمحوں بعد رخسانہ نے پھر سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم ہے امیر تمہیں وہ آسائشیں نہیں دے سکتا تھا جو دوسرے مرد اپنے بیوی بچوں کو دیتے ہیں مگر وہ تم سے محبت کرتا تھا۔ تمہیں کچھ تو اس بات کا خیال کرنا چاہیے تھا۔ بھائی بھتیجی کی محبت میں آ کر تمہیں اچانک اتنا جذباتی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

فریدہ کا اضطراب بڑھنے لگا اس نے انکار کرتے ہوئے سر کو زور سے جھٹکا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر الفاظ اس کے حلق میں پھنسنے لگے۔

''تم سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے فریدہ، تمہیں اس کی محبت کا کچھ تو مان رکھنا چاہیے تھا تم نے......'' رخسانہ نے کہنا چاہا۔

''نہیں...... میں امیر سے بہت محبت کرتی ہوں، بہت زیادہ......'' کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی فریدہ زور سے چیخنے لگی فریدہ ضبط نہ کر سکی اور اپنے دوپٹے سے منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رخسانہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے حیرت سے دیکھا اور فریدہ کو گلے لگا لیا۔

فریدہ کچھ دیر روتی رہی پھر سنبھل کر اس نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے امیر مجھے بہت زیادہ چاہتا ہے......''

رخسانہ نے پانی پلانا چاہا مگر فریدہ نے اشارے سے منع کر کے روتے ہوئے پھر کہنا شروع کیا۔ ''وہ کچھ اور نہیں کر سکتا...... اس کی انا اس کے ہر کام میں آڑے آ جاتی ہے...... تمہیں تو پتا ہے ناں کہ ماجد بھائی نے مجھے یہ چھت دی ہے اور وہ بینش کے خرچے کے لیے راشن بھی ڈلواتے ہیں۔ اس جھگڑے میں اگر وہ اپنی بیٹی کو لے جاتے تو ہمارے سر سے چھت بھی چلی جاتی اور روٹی بھی، امیر کی پریشانیاں اور بڑھ جاتیں وہ کچھ نہیں کر پاتا اور میں...... میں اس کی انا کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ میں اس کے پاس رہوں یا دور مگر وہ ویسا ہی رہے جیسا میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں، اسی کی محبت میں، میں نے یہ کیا کیونکہ...... میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں، بہت زیادہ!''

وی آئی پی

محترم معراج رسول
سلام تہنیت
لوگ کہتے ہیں کہ اربابِ اختیار وی آئی پی کلچر نافذ کرتے ہیں لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ ہم خود یعنی عوام کا وہ طبقہ اسے جھوٹی شان کے لیے اہمیت دیتا ہے۔ اب عدالت خان کا ہی واقعہ لے لیں۔ جھوٹی شان کی خاطر وی آئی پی کا انتظار کرتا رہا اور باپ کی میت پڑی رہی۔ عبرت کے لیے ہی سہی اسے شاملِ اشاعت ضرور کریں۔

محمد سلیم اختر
(راولپنڈی)

وہ اگست کی ایک گرم شام تھی۔ جب عدالت خان کے باپ کا انتقال ہوا۔ عدالت خان بلدیاتی الیکشن کے حوالے سے ہونے والی پارٹی کی میٹنگ میں ضلعی آفس گیا ہوا تھا۔ باپ کے انتقال کی خبر ملتے ہی وہ اسی رات لوٹ آیا۔ صبح صبح اس کے آبائی گاؤں سے اس کا چچا فیض عالم بھی اس کے گھر پہنچ گیا۔ باپ کے فوت ہو جانے کے غم کے ساتھ ساتھ یہ سوال اٹھا کہ عدالت کے باپ خانو کا جنازہ کہاں سے اٹھایا جائے اور اسے دفن کہاں کیا جائے۔

عدالت کے چچا کا اصرار تھا کہ میت آبائی گاؤں لے جائی جائے اور گاؤں ہی کے قبرستان میں دفن کیا جائے مگر عدالت کی رضامندی اس کی بیوی رضیہ کی رضامندی سے مشروط تھی جو جنازہ... کالونی کے پارک میں پڑھوا کر کالونی کے قبرستان میں ہی دفنانا چاہتی تھی۔

"دیکھو عدالت!" اس کا چچا اسے سمجھاتے ہوئے بولے۔ "ہماری ساری برادری وہاں ہی رہتی ہے۔ بھائی صاحب کی جان پہچان کے لوگ ان کے لنگوٹیے حکیم ولی داد، حاجی اسلم سبھی وہاں رہتے ہیں۔ تمہاری ماں کی وفات پر گاؤں والوں نے کس قدر تعاون کیا تھا۔ خوشیا بٹ کے بیٹوں کے الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ "ماں جی کی میت ایمبولینس میں نہیں جائے گی۔" اور وہ چلچلاتی دھوپ میں جنازہ کندھوں پر اٹھا کر قبرستان لے گئے تھے۔"

عدالت خان، فیض عالم کی باتیں سن کر کچھ دیر خاموش رہا اور پھر اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی بیوی رضیہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چل دی۔ "دیکھو ناں چچی جان! اب گاؤں میں کوئی کیسے واپس جاسکتا ہے؟ خیر سے عدالت کا اب ایک مقام ہے۔ نام ہے۔ پورے شہر میں اس کے دوست احباب اور پارٹی ورکر پھیلے ہوئے ہیں۔ کون جانا پسند کرے گا۔ گاؤں کی گندی گلیوں میں، جنازہ یہیں سے اٹھے گا۔ برادری والوں کو چاہت ہوگی تو خود پہنچ جائیں گے۔ اسی طرح جیسے آپ اور چچا جان آگئے ہیں۔"

☆......☆

عدالت کا گاؤں شہر کے قریب ہی تھا۔ اس کا تعلق کمہاروں کے خاندان سے تھا۔ اس کا باپ خانو اور چچا فیض عالم یہی کام کرتے تھے۔ ان کے مٹی کے بنے ہوئے برتنوں کی شہرت دور دور تک تھی مگر دالو (عدالت) کو اس کام سے نفرت تھی۔ وہ پکی پکائی کھانے کا عادی تھا۔ اس لیے باپ کا ہاتھ کم ہی بٹاتا تھا۔ بس آوارہ دوستوں کے ساتھ مل کر آوارہ گردی کرتا رہتا۔ اس کا باپ اس کی ان عادتوں سے تنگ تھا اور بہت کڑھتا تھا۔ دالو اب جوان ہوگیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ فوج میں بھرتی ہو جائے۔ مگر وہ ان پڑھ تھا۔ نوکری ملتی اس کے نصیب میں نہ تھی۔ اس کے نصیب میں مٹی کے برتن بنانا ہی لکھا تھا مگر وہ اس کام سے دور بھاگتا تھا۔ اس نے قد کاٹھ خوب نکالا تھا۔ اس کا شمار گاؤں کے گبرو جوانوں میں ہوتا تھا۔ رضیہ اس کی برادری کی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ دونوں کے گھر والوں کو بھی ان کی چاہت کا علم تھا اور وہ اس رشتہ پر رضامند بھی تھے مگر رضیہ کے والدین کی یہ شرط تھی کہ جب تک دالو کمانے نہ لگے۔ تب تک وہ رضیہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیں گے۔

ان دنوں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن ہو رہے تھے اور انتخابی مہم زور و شور سے جاری تھی۔ اس حلقے میں ایم این اے کا جلسہ ہونا تھا۔ پارٹی ورکر جلسہ کو کامیاب بنانے کے لیے علاقے کے لوگوں کو قائل کر رہے تھے۔ مخالف پارٹی کا امیدوار بھی کمزور نہ تھا۔ حلقے میں اس کا اثر و رسوخ بھی بہت تھا۔ دونوں امیدواروں کے جلسے کامیاب جا رہے تھے۔ جلسے میں موجود لوگوں کی تعداد ایک جیسی ہی لگتی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ کئی لوگ دونوں امیدواروں کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ اپنی خوشی سے جلسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ ان میں بیشتر لوگوں کو کرائے پر لایا جاتا ہے۔ وہ دونوں امیدوار بھی ایسا ہی کر رہے تھے، ان میں دالو بھی شامل تھا۔ اسے جلسے میں شرکت کے لیے پانچ سو روپے دیئے گئے تھے۔ دالو کی خوشی کی تو انتہا ہی نہ تھی۔ اسے مفت میں پانچ سو روپے مل گئے تھے۔ پارٹی ورکر نے دالو سے کہا کہ اگر وہ جلسے میں نعرے لگائے گا تو اسے مزید پانچ سو ملیں گے۔ دالو اس پر بھی راضی ہوگیا۔ پارٹی ورکر نے دالو کو دو تین نعرے زبانی یاد کرا دیئے تھے۔ جلسے کے دوران جب دالو نے نعرے لگائے۔ "ملک ارمان آوے ہی آوے۔"

"ملک ارمان زندہ باد۔" تو جلسے میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوگیا۔ کیونکہ ایک تو دالو کی آواز اتنی بلند تھی کہ اسپیکر کی بھی ضرورت نہ تھی اور اس پر اس کا نعرے لگانے کا انداز اس قدر بھرپور اور اثر انگیز تھا کہ بار بار دالو سے نعرے لگوانے کی فرمائش ہونے لگی۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ دالو ملک ارمان کے ہر جلسے کی ضرورت بن گیا۔ دالو کی جیب اب نوٹوں سے بھری رہنے لگی۔ ملک ارمان نے اسے پارٹی ورکر بنا دیا اور اس کو اپنی انتخابی مہم میں مستقل طور پر شامل کرلیا۔ دالو کی خوش قسمتی کہ ملک ارمان جیت گیا۔

دالو کے بھی دن پھر گئے۔ ملک ارمان نے دالو کو اپنے شہر والے دفتر میں بلوا لیا اور اس کو کچھ ذمہ داریاں

منصور حلاج کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے "ان الحق" (میں خدا ہوں) کہا تھا جس کی بنا پر انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ الفاظ ان کے اپنے نہیں تھے بلکہ حق تعالیٰ جل شانہ نے جن الفاظ سے خطاب فرمایا' انہی الفاظ کو انہوں نے دہرا دیا تھا۔

اس بات کی تصدیق اس واقعے سے ہوتی ہے کہ حضرت احمد جام رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک روز ایک بوڑھی عورت اپنے نابینا لڑکے کو لے کر آئی اور کہا کہ "آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ میرے بچے کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر دیجئے۔ آپ کی دعا سے اسے دوبارہ آنکھیں مل جائیں گی۔"

حضرت احمد جام نے انکار کر دیا۔ اسے سمجھاتے ہوئے بولے "یہ کام تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تھا کہ وہ اندھوں اور مبروصوں کو ٹھیک کر دیا کرتے تھے۔"

اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں فوراً تنبیہ کی گئی "کیسے عیسیٰ اور کیسے موسیٰ۔ سارے کام ہمارے حکم سے ہوتے ہیں۔" "مامی کنیم" جاؤ اور جا کر اس اندھے لڑکے کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرو۔"

حضرت احمد جام اس طرز تخاطب سے اتنے مسحور ہوئے کہ بار بار ان کے منہ سے یہی نکل رہا تھا "مامی کنیم. مامی کنیم" (سب کچھ ہم ہی کرتے ہیں) انہوں نے نابینا لڑکے کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور اگلے ہی لمحے اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔

بس جس طرح حضرت احمد جام علیہ الرحمہ کی زبان مبارک سے "مامی کنیم" ادا ہو رہا تھا' اسی طرح حضرت منصور رحمتہ اللہ علیہ نے بھی "انا الحق" کہا تھا لیکن لوگ سمجھ نہیں سکے۔

حکایات اولیاء از ضیاء تسنیم بلگرامی

سونپ دیں۔ اسے ماہانہ تنخواہ بھی ملنے لگی۔ گویا دالو کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا۔ اس کی مالی حالت بہتر ہو گئی اور رضیہ سے اس کی شادی بھی ہو گئی۔ پھر جب ملک ارمان کو کابینہ میں شامل کیا گیا اور وزیر بنایا گیا تو وہ دالو سے عدالت خان بن گیا۔ اس کے دن پھر گئے۔ اس نے ایک کالونی میں کرائے پر گھر لیا۔ رضیہ اور ماں باپ کو بھی شہر لے آیا۔ اب تو عدالت خان کے اطوار ہی بدل گئے۔ وہ اپنے رشتے داروں کو خاطر میں ہی نہ لاتا۔ رضیہ بھی اس کے ہی رنگ میں رنگ گئی تھی۔ دونوں میاں بیوی اپنے آپ کو اونچی سوسائٹی کے لوگوں میں شمار کرنے لگے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آج عدالت خان اپنے باپ کی میت کو گاؤں کے قبرستان کی بجائے شہر کے قبرستان میں دفن کرنا چاہتا تھا کیونکہ ان دونوں نے گاؤں والوں سے ہر تعلق ختم کر دیا تھا۔

☆......☆

گھر کے سامنے والے گراؤنڈ میں شامیانے لگنے شروع ہو گئے تھے۔ رضیہ نے صبح سویرے ہی بڑے کمرے اور ڈرائنگ روم کے پرانے پردے تبدیل کر دیئے تھے۔ نئی بیڈ شیٹس بھی بچھا دی تھیں۔ صوفوں اور تکیوں پر خوب صورت پھولدار کور چڑھا دیئے گئے۔ ڈرائنگ روم میں بڑے صوفوں اور آرام کرسی کے درمیان رکھی ہوئی میز پر عدالت خان کی ملک ارمان کے ساتھ اتری ہوئی تصویر سجا دی گئی۔

رضیہ بے چینی کے عالم میں بار بار پوچھتی۔ "عدالت! لوگ آئیں گے نا...... تمہیں یقین ہے نا عدالت۔"

"ہاں بھئی تمام دوستوں کو ٹیلی فون کر دیئے ہیں۔ اخبار میں بھی تصویر لگ چکی ہے۔"

عدالت! وہ جو کونے والے گھر میں مہتاب خان رہتے ہیں۔ ان کے والد کی وفات پر تو بہت سارے لوگ آئے تھے۔ گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگ گئی تھیں۔ کس شان سے جنازہ اٹھا تھا۔ کئی دنوں تک لوگوں کا آنا جانا لگا رہا تھا۔" رضیہ بولے جا رہی تھی اور عدالت کے ماتھے پر پسینے کی لکیریں پھیلنے لگی تھیں۔ عدالت وزیر بہبود آبادی ملک ارمان کے سیکریٹری سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ وزیر صاحب کا پرائیویٹ سیکریٹری نواز گھر سے دفتر کے لیے نکل چکا تھا اور اس کے دفتر کے سارے ٹیلی فون مصروف مل رہے تھے۔ نواز اور عدالت کی اچھی ہیلو ہائے تھی۔ نواز کا فون مل گیا۔

"نواز صاحب! کل سے۔"

"ہاں میں نے اخبار میں پڑھ لیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ

راجعون۔ میں تمہیں ٹیلی فون کرنے والا تھا۔ جنازہ کتنے بجے اٹھایا جائے گا؟"

"چار بجے، یہیں میرے ہاں سے۔ ایک بات ہے نواز دیکھو تم چاہو تو ایسا ہو سکتا ہے کیا تم وزیر ملک ارمان کو لاسکو گے؟ ان کی میری پارٹی کے لیے خدمات یاد ہوں گی۔ جنازے کا وقت آگے پیچھے ہو سکتا ہے۔ بس تم کسی طرح ان کو میرے ہاں ضرور لانا۔"

"ہاں ہاں میں کوشش کروں گا لیکن ابھی ان کی معروفیات کا پروگرام فائنل نہیں ہو پایا ہے۔ جوں ہی پروگرام مرتب ہوا میں تمہیں مطلع کردوں گا۔ تم یقین رکھو میری پوری کوشش ہوگی۔ وزیر صاحب آئیں گے۔" جوں ہی فون بند ہوا رضیہ، عدالت کا بازو تھام کر وزیر صاحب کی آمد کا پوچھنے لگی۔

"امید تو ہے۔"

"عدالت! میرا دل کہتا ہے جنازہ بڑے پروقار طریقے سے اٹھایا جائے گا۔" عدالت پھر ڈرائنگ روم کا ناقدانہ جائزہ لینے لگا۔ چھوٹی تپائی باہر نکال دی گئی۔ کمرے کی ترتیب میں قدرے ردوبدل کردیا گیا۔

"ہاں ناصر سنو۔" عدالت نے اپنے عم زاد سے کہا۔ "تمہیں تصویریں بنانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ وزیر صاحب دائیں جانب سے اس کمرے میں داخل ہوں گے اور اس بڑے صوفے پر براجمان ہوں گے اور میں میز کی بائیں جانب صوفے والی کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور سامنے چچا فیض عالم ہوں گے۔ تمہیں یہ سب کچھ کور کرنا ہوگا۔ دیکھو تصویر صاف اور واضح ہونی چاہیے۔ بڑی احتیاط اور نفاست سے کام کرنا ہوگا۔ نروس مت ہو جانا۔ یہ تصاویر اخبار کو بھی بھجوانی ہوں گی اور ہاں وزیر صاحب کی ملاقات کے دوران کوئی بچہ اندر داخل نہیں ہوگا۔"

☆......☆

ملنے والوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ عدالت کا ایک دوست قبر کی کھدائی کے سلسلے میں قبرستان گیا ہوا تھا چچا کا بیٹا رحیم داد کفن اور پھولوں کی چادر لینے گیا ہوا تھا۔ ناصر نے غسال سے بات کرلی تھی۔ شامیانے کے اندر دریاں بچھا دی گئی تھیں اور کرسیاں اطراف میں قرینے سے رکھ دی گئی تھیں۔ پارکنگ کے لیے خاصی جگہ تھی۔ لوگوں کا ہجوم زیادہ ہونے کی صورت میں چھوٹی گراؤنڈ میں بھی پارکنگ کرائی جاسکتی تھی۔ ماں کی وفات پر عدالت کو تلخ تجربہ ہو چکا تھا کہ

کئی جاننے والے محض گاؤں میں سڑک نہ ہونے کی وجہ سے جنازے میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ عدالت تمام انتظامات سے مطمئن تھا۔ اس کو رب نواز کے فون کا انتظار تھا تاکہ جنازہ اٹھائے جانے کے وقت کا اعلان کیا جاسکے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد نواز کا فون آگیا۔ "بھئی صاحب سے بات ہو چکی ہے۔ وہ آنا چاہتے ہیں مگر چار بجے ممکن نہ ہو سکے گا۔ چار بجے وزیر صاحب نے آرٹ کونسل میں ایک نمائش کا افتتاح کرنا ہے۔ پانچ بجے فشری کے ہڑتالی عملے سے مذاکرات ہیں اور ساڑھے پانچ بجے تک علاقے کے کونسلروں کے ساتھ ایک غیر رسمی ملاقات ہے۔ ساڑھے چھ بجے ہی آنا ممکن ہوگا۔"

"ٹھیک ہے نواز! جنازہ ساڑھے چھ بجے ہی اٹھایا جائے گا لیکن اب پروگرام فائنل رکھنا۔ تم تو سمجھتے ہو ناں۔ بڑی سبکی ہوگی۔"

کالونی کی مسجد سے عدالت کے والد کی وفات کا اعلان ہوا کہ جنازہ ان کی رہائش گاہ سے ساڑھے چھ بجے اٹھایا جائے گا۔

تمام کالونی میں بات پھیل گئی کہ وزیر بہبود آبادی ملک ارمان جنازے میں شرکت کے لیے آنے والے ہیں۔ دوستوں، رشتہ داروں کو ایک بار پھر تاکید کردی گئی کہ سبھی حضرات وقت پر آجائیں۔ نماز جنازہ ٹھیک ساڑھے چھ بجے پڑھا دی جائے گی۔

☆......☆

رضیہ کے چہرے پر اداسی کی پرچھائیاں مدھم تو نہ ہوئی تھیں مگر ذہنی دباؤ خاصا کم ہوگیا تھا۔ ایک سال قبل وہ اس کالونی میں منتقل ہوئے تھے۔ تو کسی نے بھی ان کو قابل توجہ نہیں جانا تھا۔ آس پاس رہنے والوں میں سے کوئی بھی تو ملنے نہ آیا تھا۔ عدالت اور رضیہ اپنے آپ کو الگ تھلگ ہی محسوس کرتے تھے۔ رضیہ اپنے پڑوسیوں سے ملنے جلنے کی بہت کوشش کر چکی تھی مگر کسی نے کبھی اس کو گھاس نہ ڈالی تھی کیونکہ وہاں اونچی سوسائٹی کے لوگ رہتے تھے۔ اپ گریڈوں کے لوگ۔ ان کے نزدیک عدالت اور رضیہ کی بھلا کیا حیثیت تھی۔ اس لیے رضیہ کا چہرہ اکثر اترا سا رہتا تھا۔

ساڑھے پانچ بجے کے قریب عدالت کے دوست آگئے تھے مگر ابھی تک شامیانے کے اندر خاصی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔

رحیم داد کا بیٹا کریم داد بھاگتا ہوا اندر آیا اور بولا۔

"چچا عدالت! وہ آگئے وہ آگئے۔"

"کون...... وزیر صاحب؟ وقت سے پہلے ہی، نواز ساتھ ہے ناں...... دیکھو ناصر کو بلاؤ اسے کہنا کیمرا بھی لیتا آئے۔"

"نہیں چچا! وہ دادا ابو کے دوست حاجی اسلم اور خوشیا بٹ ہیں۔"

حاجی اسلم اور خوشیا بٹ نے عدالت کو دیر تک گلے لگائے رکھا۔ تسلیاں دیں۔ خوشیاں بٹ تو عدالت کو دیکھ کر دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ "او عدالت پتر! یہ کیا ہو گیا ہے۔ تو نے تو ہمیں خبر ہی نہیں کی۔ یار خانو ہمارا بیلی تھا۔ لنگوٹیا تھا۔ ہم ایک ساتھ کھیلے ہیں۔ تیرے ابے کو کیا ہو گیا تھا او ساڈا بیلی چلا گیا۔ ساڈا اسنگی، بس ہن ساڈی واری رے۔" خوشیا پہلوان زور زور سے سر اور سینہ پیٹنے لگا۔

عدالت نے ناصر کے کان میں آہستگی سے کہا۔ "یار! اس بٹ کو ایک کونے میں بٹھا دو اور خدا کے لیے اسے چپ کراؤ۔ یہ کوئی چنگڑوں کا محلہ تو نہیں ہے۔ یہ نہ ہی آتا تو بہتر تھا۔"

☆......☆

میت کو غسل دے کر دالان میں رکھ دیا گیا۔ چچی زبیدہ پریشانی کے عالم میں اندر باہر ہو رہی تھیں۔ "رضیہ! مسئلہ کیا ہے؟ جنازہ کیوں نہیں اٹھایا جا رہا۔ بھئی کل شام کی موت ہے۔ پھر شام ہونے والی ہے۔ میت کا پیٹ بھی پھول رہا ہے اور حکم بھی یہی ہے کہ مُردے کو جلد از جلد دفنا دیا جائے۔"

چچا فیض عالم بھی بار بار کہہ رہے تھے۔ "جنازہ اٹھایا جائے۔ خاصی دیر ہو گئی ہے۔ سبھی لوگ آچکے ہیں۔ اب کس کا انتظار ہے اب گاؤں سے اور کوئی نہیں آئے گا۔"

"بس ایک وی آئی پی کو آنا ہے۔" رضیہ آہستہ سے بولی۔ "وزیر صاحب آنے والے ہیں۔"

مگر چھ بج چکے تھے۔ وزیر صاحب کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ انتظار کرتے کرتے سات بجے جنازے کو ساتھ کی گراؤنڈ میں لے جایا گیا۔

"حضرات! یہ سفر آخرت ہے۔ مٹی ہی ہماری منزل ہے اور مٹی ہی میں ہم سب کو جذب ہو جانا ہے۔ یہ دنیا فانی ہے۔ یہ دولت، یہ شہرت اور یہ رتبہ سب ناپائیدار ہیں۔ اللہ ہمیشہ رہنے والا اور رحم کرنے والا ہے سب تعریفیں اس عظیم ذات کے لیے ہیں۔ بس اس کی اطاعت کرو۔ اس کے آگے جھک جاؤ اور نیک عمل کرو۔"

امام کی آواز گونج رہی تھی۔ جماعت نماز کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ اتنے میں ہوٹر کی آواز سنائی دی۔ "مولوی صاحب! ٹھہریے۔" عدالت قطار سے باہر نکل آیا۔ ناصر بھی پیشوائی کے لیے بھاگا اور پھر واپس آکر خبر دی۔ "نہیں بھائی کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔ کوئی ٹریفک سارجنٹ تھا۔ وہ دوسری طرف نکل گیا ہے۔"

"جنازہ اٹھا لیا گیا۔ کلمۂ شہادت۔"

جنازے میں گاؤں کے بہت سے لوگ شامل تھے۔ رشتے دار، برادری والے بھی مگر کالونی میں سے کوئی بھی نہ آیا۔ خوشیا بٹ پہلوان کے بیٹوں نے جنازہ کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ خوشیا کے آنسو اب بھی خشک نہیں ہو رہے تھے۔ اس کے منہ سے ہلکی ہلکی سسکیاں نکل رہی تھیں۔

ابھی جنازہ چند قدم ہی چلا تھا کہ عدالت کے گھر سے کسی نے آواز دی۔ "نواز کا فون ہے۔"

عدالت بھاگ کر گھر آیا اور فون کان سے لگا لیا۔ نواز کہہ رہا تھا۔ "عدالت بھائی! میں معافی چاہتا ہوں۔ وزیر صاحب نہیں آسکتے۔ انہیں وزیر اعظم نے کال کر لیا ہے وہ اب شاید کسی دن تمہارے ہاں آئیں۔"

فون عدالت کے ہاتھوں سے گر گیا اور وہ بے سدھ ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "ان کو آنا چاہیے تھا کسی کو تو آنا چاہیے تھا۔ جنازے کے ساتھ ایک بھی وی آئی پی نہیں۔ ایک بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں نواز بھی نہیں۔"

"عدالت! حوصلہ کرو، ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ رب کو یہی منظور تھا۔ صبر کرو۔" رضیہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"کلمۂ شہادت...... کلمۂ شہادت۔" جنازہ چل پڑا تھا۔

عدالت لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا اور آہستہ آہستہ جنازے کے پیچھے چلنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے پاؤں پتھر ہوئے جا رہے ہوں اور کالونی کے گھروں کی کھڑکیوں سے قہقہے نکل رہے ہوں۔ خوشیا بٹ نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور عدالت کو دیکھ کر رک گیا۔ عدالت کی نظر خوشیا پر پڑی تو وہ جا کر اس کے گلے لگ گیا۔

"خوشیا چچا۔" عدالت بھیگی آواز میں بولا اور پھر وہ دونوں جنازے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ دانو کو حقیقی V.I.P مل گیا تھا۔

بزدل

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
میرا نام محمد یوسف ہے۔ پہلی بار سرگزشت کے لیے اپنی آپ بیتی بھیج رہا ہوں۔ میری روح میری جان شمسہ اب اس دنیا میں نہیں ہے لیکن اس کی یادیں میرا سرمایہ ہیں۔ اسی سرمایہ کو میں قارئین کے سامنے لانا چاہتا ہوں اُمید ہے میری کاوش پسند آئے گی۔

محمد یوسف
(جہلم)

میری عمر اس وقت سترہ سال تھی جب بابا کا انتقال ہوا۔ بابا کی تھوڑی بہت زمینیں تھیں جن پر کاشت کر کے وہ گزارا کرتے تھے۔ ہمارا مختصر سا خاندان تھا۔ بابا، میں اور میرا ایک بڑا بھائی احمد۔

احمد کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش تھا۔ وہ دوسروں کی زمینیں ٹھیکے پر لے کر کاشت کرتا تھا اور وہ ہم سے زیادہ خوش حال تھا۔ بابا کے انتقال کے بعد احمد خود ہی بابا کی زمینوں کا وارث بن بیٹھا۔ میں ان

دونوں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا اور رزلٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے بھائی نے مشورہ دیا کہ فرصت کے ان دنوں میں تم بھی کوئی کام کرلو۔ اس کے کہنے پر میں نے بھی کھیت مزدوری شروع کردی۔ بابا نے مجھے بہت ناز و نعم میں پالا تھا۔ انہیں خود تعلیم کا بہت شوق تھا۔ خود تو وہ تعلیم حاصل نہیں کر سکے تھے۔ انہوں نے اپنے اس خواب کو اپنے بچوں کے ذریعے پورا کرنا چاہا۔ احمد بھائی کو شروع ہی سے پڑھائی سے لگاؤ نہیں تھا۔ انہوں نے بہ مشکل تمام آٹھویں تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسکول چھوڑ دیا۔ ان کے برعکس میں پڑھنے لکھنے کا شوقین تھا اور بہت محنت سے پڑھتا تھا۔ اپنی اس محنت اور لگن کی وجہ سے ہی ہر کلاس میں اوّل پوزیشن حاصل کرتا تھا۔

اب کھیت مزدوری کی تو مجھے زندگی کا دوسرا رخ بھی نظر آیا۔ میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے اور سرخ و سفید رنگت جھلس کر تانبے کی طرح ہوگئی تھی۔

خدا خدا کر کے میرا نتیجہ آیا۔ میں نے حسبِ روایت پورے اسکول میں پہلی پوزیشن لی تھی۔ ہمارے گاؤں میں کوئی کالج نہیں تھا۔ اس کے لیے مجھے جہلم جانا پڑتا۔ مجھ سے پہلے بھی گاؤں کے کئی لڑکے جہلم کے کالج میں پڑھ رہے تھے۔ وہ سب کھاتے پیتے گھرانوں کے بچے تھے۔ مجھے اُمید تھی کہ احمد بھائی مجھے بھی جہلم بھیج دے گا۔ اصل مسئلہ صرف داخلہ فیس کا تھا۔ پھر تو مجھے حکومت کی طرف سے وظیفہ مل جاتا اور میرا گزارا ہو جاتا۔

میں نے جب احمد بھائی سے بات کی تو اس نے صاف انکار کردیا اور بولا۔ ”میرے پاس اتنے فالتو پیسے نہیں ہیں کہ میں تمہاری پڑھائی کے چونچلوں پر خرچ کروں۔ اب پڑھائی وڑھائی چھوڑو اور محنت مزدوری کر کے یا کہیں ملازمت کر کے میرا ہاتھ بٹاؤ۔“

مجھے اس کی بات سے بہت صدمہ ہوا۔ میں نے سوچ لیا کہ اب میں گاؤں میں نہیں رہوں گا۔

قدرت اللہ صاحب ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں اور اپنے گاؤں کا نام بھی روشن کروں۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ احمد بھائی نے مجھے شہر بھیجنے سے انکار کردیا ہے تو وہ غصے سے بولے۔ ”احمد کون ہوتا ہے تمہیں روکنے والا۔ تمہارے باپ کی زمین میں تمہارا بھی برابر کا حصہ ہے۔ میں کل احمد سے بات کروں گا۔“

دوسرے دن شام کو ہیڈ ماسٹر صاحب ہمارے گھر آگئے۔ پورا گاؤں ان کی عزت کرتا تھا۔ احمد بھائی نے انہیں بیٹھک میں بٹھایا اور ان کے لیے لسی لے آیا۔ پھر وہ بہت ادب سے بولا۔ ”جی ہیڈ ماسٹر صاحب!“

”برخوردار! تم میرے شاگرد رہ چکے ہو، تم میرے فرمانبردار شاگردوں میں سے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری بات نہیں ٹالو گے۔“

”آپ حکم کریں سر۔“ احمد بھائی نے کہا۔ ”میں ہمیشہ آپ کا شاگرد ہی کہلاؤں گا۔“

”تم نے یوسف کو کالج میں داخلہ لینے سے کیوں روکا ہے؟“ ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔

”میں تو چاہتا ہوں کہ وہ پڑھ لکھ کر کچھ بن جائے لیکن میرے حالات آپ سے تو ڈھکے چھپے نہیں ہیں اخراجات نے کمر توڑ رکھی ہے۔ چار چار بچوں کا ساتھ ہے۔ میں چاہتے ہوئے بھی یوسف کے لیے کچھ نہیں کرسکتا ہوں۔“

”بیٹا! رب نواز کی زمین پر یوسف کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا ہے۔“ ہیڈ ماسٹر صاحب نے تلخ لہجے میں کہا۔

”زمین!“ احمد بھائی نے ناگواری سے کہا۔ ”کون سی زمین ہیڈ ماسٹر صاحب! وہ زمین تو بابا نے بہت پہلے بیچ دی تھی۔ میں تو خود دوسروں کی زمینیں ٹھیکے پر لیتا ہوں۔“

”رب نواز نے زمین بیچ دی تھی؟“ ہیڈ ماسٹر صاحب نے حیرت سے کہا۔ ”رب نواز تو اپنی زمین بیچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ صاف صاف کہو کہ تم یوسف کو حصہ دینا نہیں چاہتے۔“

”جو سچ تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔ اب آپ چاہے جو بھی سمجھتے رہیں۔“ احمد بھائی نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو ٹکا سا جواب دے دیا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کے جانے کے بعد احمد بھائی مجھ پر چڑھ دوڑے۔ ”تجھے کیا ضرورت تھی ہیڈ ماسٹر صاحب سے بات کرنے کی۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ میں تجھے تیرا حصہ دے دوں گا لیکن اب میں تجھے ایک پائی بھی نہیں دوں گا۔“

ہیڈ ماسٹر صاحب سمیت گاؤں کے کئی لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ تم عدالت کے ذریعے اپنا حق وصول کرلو لیکن میں راضی نہ ہوا اور ایک دن چپکے سے گاؤں چھوڑ دیا۔

میری جیب میں صرف پانچ سو روپے تھے۔ وہ بھی میں نے اس لیے سنبھال کر رکھے تھے کہ کالج میں داخلے کے بعد مجھے ان کی ضرورت پڑے گی۔

میں جہلم میں بھی نہیں رکا اور لاہور آ گیا۔ میں وہاں کوئی ملازمت کرنا چاہتا تھا۔

میں نے لاہور کے بہت سے دفتروں میں درخواست دے دی۔ میں صرف میٹرک پاس تھا اور میٹرک پاس کو تو چپڑاسی کی ملازمت بھی نہیں ملتی۔ اب جو پانچ سو روپے لے کر آیا تھا وہ دو ہی دن میں ختم ہو گئے تھے۔ میں دن بھر ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہتا اور رات کو کسی پارک، کسی فٹ پاتھ یا دکان کے چبوترے پر پڑ کر سو جاتا۔

گاؤں سے چلتے وقت میں صرف کپڑوں کا ایک جوڑا ساتھ لایا تھا۔ وہ بالکل نئے کپڑے تھے اور میں نے کالج کے لیے بنائے تھے۔ میں اس پینٹ شرٹ کو اس لیے سنبھال سنبھال کر رکھتا رہا کہ ملازمت کے سلسلے میں مجھے کہیں انٹرویو کے لیے جانا پڑا تو یہ کپڑے کام آئیں گے۔

میں اس دن دو روز کے فاقے سے تھا۔ چلنا تو دور کی بات ہے مجھے تو کھڑے ہونے میں بھی نقاہت ہو رہی تھی۔

میں اس وقت ایک فٹ پاتھ پر بیٹھا تھا۔

وہ لاہور کا ایک مصروف علاقہ تھا۔ اردگرد بہت سی دکانیں تھیں کچھ فاصلے پر ایک بڑا شاپنگ مال بھی تھا جہاں مردوں سے زیادہ خواتین خریداری کر رہی تھیں۔

میں فٹ پاتھ پر بیٹھا حسرت سے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو ایک ٹھیلے پر مرغ چھولے اور پائے وغیرہ کھا رہے تھے۔

میرے نزدیک سے خوب صورت سی لڑکی گزری۔ وہ قیمتی لباس میں ملبوس تھی۔ اس نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے بیس کا نوٹ نکال کر میری طرف پھینک دیا۔

میں صدمے سے گنگ ہو گیا کہ رب نواز کے بیٹے یوسف کو لوگ بھکاری سمجھ رہے تھے۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر نوٹ اٹھایا اور نہ جانے کیسے میرے جسم میں اتنی طاقت آ گئی کہ میں تیزی سے کھڑا ہو گیا اور لڑکی کے پیچھے لپکا۔ "سنیں!" میں نے بہ مشکل تمام حلق سے آواز نکالی۔

لڑکی جاتے جاتے مڑی اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

"میں بھکاری نہیں ہوں محترمہ۔" میں نے ناگواری سے کہا۔ "یہ پیسے آپ کسی مستحق کو دے دیں۔" میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا۔ پھر نوٹ لیتے ہوئے بولی۔ "سوری، میں سمجھی کہ......"

"آپ اگر مجھے کہیں ملازمت دلا سکتی ہیں تو دلا دیں۔" میں نے کہا۔

"کچھ پڑھے ہوئے بھی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، میں میٹرک پاس ہوں۔" میں نے کہا۔ "تعلیم تو میری کوئی ابھی خاص نہیں ہے لیکن کسی ان پڑھ کے مقابلے میں تو بہت بہتر ہوں۔"

لڑکی چند لمحے کچھ سوچتی رہی۔ پھر اس نے پرس میں ہاتھ ڈال کر ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر مجھے دیا اور بولی۔ "یہ میرے ڈیڈی کا کارڈ ہے اس پر ہمارے گھر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر بھی لکھا ہوا ہے۔ تم آج شام کو گھر آ جانا۔ میں ڈیڈی سے تمہاری جاب کی بات کروں گی۔" یہ کہہ کر وہ لہراتی بل کھاتی آگے بڑھ گئی۔

اس وقت ایک عورت نے مجھ سے کہا۔ "مجھے سامان اٹھانے کے لیے مزدور کی ضرورت ہے۔ کیا تم......"

"جی بیگم صاحبہ! مجھے بتائیں سامان کہاں ہے۔" میں نے کہا۔ لڑکی کی باتوں سے میرے جسم میں ایک نئی توانائی آ گئی تھی۔

اس عورت نے شاپنگ مال میں اچھی خاصی شاپنگ کی تھی۔ میں نے اس کا سامان اٹھا کر ٹیکسی تک پہنچا دیا۔

اس نے پچاس روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ پیسے ملتے ہی سب سے پہلے میں کھانا کھانا چاہتا تھا۔ سامنے ہی ایک ٹھیلے پر مرغ چھولے اور نان رکھے ہوئے تھے۔

میں نے اس طرف بڑھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ مجھے کسی نے آواز دی۔ "سنو۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ باوقار سی ایک عورت تھی۔ اس کے جسم پر بہت قیمتی ساڑی تھی اور ہاتھ میں خاصا بیش قیمت پرس تھا۔

"ذرا میرا سامان گاڑی تک پہنچا دو۔"

میں نے اس کا سامان بھی گاڑی تک پہنچایا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "کتنے پیسے دوں؟"

"جو آپ مناسب سمجھیں وہ دے دیں۔" میں نے کہا۔

اس نے پرس میں ہاتھ ڈالا اور سو روپے کا ایک نوٹ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نوٹ لے کر تیزی سے مرغ چھولے والے کی

طرف بڑھ گیا کہ مبادا کوئی اور مجھے آواز دے کر بلا لے۔

میں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ پھر اس کے نزدیک ہی چائے کا ٹھیلا کھڑا تھا۔ میں نے وہاں سے چائے پی تو مجھے ایسا لگا جیسے مجھے ابھی ابھی زندگی ملی ہو۔ میں نے کچھ دیر آرام کیا۔ پھر مارکیٹ کی طرف چلا گیا۔ میں نے دو گھنٹے میں مزید ساڑھے تین سو روپے کما لیے۔

مزدوری سے فارغ ہو کر میں نزدیکی پارک کی بینچ پر جا بیٹھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکال لیے تاکہ انہیں گن سکوں۔ نوٹوں کے ساتھ میرے ہاتھ میں اس لڑکی کا دیا ہوا وزیٹنگ کارڈ بھی آ گیا۔ میں نے کارڈ پر سرسری سی ایک نظر ڈالی اور اچھل پڑا۔ وہ کسی لیفٹیننٹ کرنل ارشد جنجوعہ کا وزیٹنگ کارڈ تھا۔ اس میں ان کا پتا بھی تھا اور ٹیلی فون نمبر بھی۔ میں نے سوچا کرنل صاحب سے کل صبح ملاقات کروں گا۔

دوسری صبح میں ایک حمام میں نہایا۔ نئے کپڑے پہنے۔ کپڑے اگرچہ بہت قیمتی تو نہیں تھے لیکن بہرحال نئے تھے۔ میں نے اپنے جوتوں پر جمی ہوئی گرد صاف کی اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ کرنل صاحب کنٹونمنٹ کے علاقے میں رہتے تھے۔ میں پوچھتا پوچھتا چھاؤنی تک پہنچ گیا۔

میں نے سنتری کو بتایا کہ مجھے کرنل جنجوعہ صاحب سے ملنا ہے تو اس نے بہت مؤدب انداز میں کہا۔ ”سر! آپ نے کرنل صاحب کا بنگلا دیکھا ہے؟“ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”ٹھیک ہے میں ابھی آپ کو بھجوا دیتا ہوں۔“

صبح کا وقت تھا اس لیے کرنل صاحب گھر میں موجود نہیں تھے۔ مجھے اپنی حماقت پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے تو اس لڑکی کا نام بھی نہیں پوچھا تھا۔

”کرنل صاحب کب تک واپس آئیں گے؟“ میں نے ان کے اردلی سے پوچھا۔

”وہ کبھی کبھی دوپہر کو لنچ کرنے آتے ہیں۔ کبھی نہیں آتے۔“

”اچھا...... وہ...... بی بی صاحبہ ہیں؟“ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

اردلی نے مجھے مشکوک نظروں سے گھورا۔ پھر بولا۔ ”آپ شمسہ بی بی کی بات کر رہے ہیں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ رب جانے شمسہ اسی لڑکی کا نام تھا یا پھر وہ کوئی اور لڑکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اردلی لوٹ آیا اور بولا۔ ”صاحب اندر آ جائیں۔ شمسہ بی بی آ رہی ہیں۔“ اس نے مجھے برآمدے میں رکھے ہوئے صوفے پر بٹھا دیا۔

تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ سنائی دی اور شمسہ برآمدے میں داخل ہوئی۔ ہاں، اسی کا نام شمسہ تھا۔

”جی فرمایئے؟“ اس نے الجھے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا۔

”میڈم...... کل آپ سے ملاقات ہوئی تھی مارکیٹ میں آپ نے مجھے ملازمت دلانے کا وعدہ کیا تھا۔“

”اوہ، یہ تم ہو، تم تو پہچانے ہی نہیں جا رہے ہو۔“

مجھے خوشی ہوئی کہ نئے لباس نے میری شخصیت بدل کر رکھ دی تھی۔

”تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے بھجواتی ہوں۔ ڈیڈی آدھے گھنٹے میں آنے والے ہیں۔“

اس نے اپنے لیے بھی چائے منگوائی تھی اور وہیں برآمدے میں بیٹھ کر پی رہی تھی۔ اس نے میرا نام پوچھا۔ پھر گاؤں کا نام پوچھا اور بولی۔ ”یوسف تم ڈیڈی کو یہ مت بتانا کہ مجھے مارکیٹ میں ملے تھے۔ تم میری بہت عزیز دوست فرزانہ کے بھائی ہو اور......“

”شمسہ صاحبہ!“ میں نے ناگواری سے کہا۔ ”میں جھوٹ نہیں بولتا ہوں اس لیے اب بھی نہیں بولوں گا۔“

اس نے مجھے گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔

چند منٹ بعد برآمدے میں وردی میں ملبوس باوقار سا ایک شخص داخل ہوا۔ وہی کرنل جنجوعہ تھا۔

میں نے اسے سلام کیا۔ پھر خاموشی سے اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔

”ڈیڈی!“ لڑکی نے جلدی سے کہا۔ ”یہ یوسف ہیں میں نے کل ان کے بارے میں بتایا تھا نا؟“

کرنل صاحب نے اٹھ کر ایک مرتبہ پھر مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولے۔ ”یوسف تم آرمی جوائن کرو گے؟“

”یس سر۔“ میں نے بغیر سوچے سمجھے ہامی بھر لی۔

”شمسہ مجھے بتا چکی تھی کہ تمہیں جاب کی ضرورت ہے۔“

”سر! میں ہر طرح سے تیار ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

کرنل صاحب نے فون سے کسی کا نمبر ڈائل کیا اور دھیمے لہجے میں کچھ دیر بات کرنے کے بعد مجھ سے بولے۔ ”سلیکشن ہیڈ کوارٹر میں بریگیڈیئر طارق ملک صاحب ہوتے ہیں تم کل ہی ان سے مل لو۔ میں نے ان سے بات کر لی ہے۔ میرا حوالہ دے دینا۔“

”بہت شکریہ سر...... بہت شکریہ۔“ میں نے ممنونیت سے کہا۔

اس دوران میں شمسہ مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھتی رہی۔

دوسرے دن میں بریگیڈیئر طارق صاحب کے پاس چلا گیا۔ کرنل صاحب کا نام سن کر انہوں نے فوراً مجھے بلا لیا۔ اسی دن مجھے آرمی میں بھرتی کر لیا گیا۔ اس دن میں بہت خوش تھا۔

پاکستان آرمی جوائن کرنا تو میرا خواب تھا۔ اس دن میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

میں یہ خوش خبری سنانے کے لیے کرنل صاحب کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اصل میں خوش خبری تو صرف میرے لیے تھی۔ کرنل صاحب کے لیے تو یہ محض ایک اطلاع ہوتی لیکن انہیں اطلاع دینا تو ضروری تھا۔

میری توقع کے عین مطابق کرنل صاحب اس وقت موجود نہیں تھے۔ مجھے ان کے اردلی نے بتایا کہ وہ اس وقت آفس میں ہیں۔

”یہ گاڑی کس کی ہے؟“ میں نے پورچ میں کھڑی ہوئی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ گاڑی تو کپتان صاحب کی ہے۔“ اردلی نے جواب دیا۔

”کپتان صاحب؟“ میں نے پوچھا۔

”کپتان صاحب، کرنل صاحب کے بھتیجے ہیں اور آج کل ملتان میں ہوتے ہیں۔“ اردلی نے جواب دیا۔ اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود شمسہ کو اطلاع دینے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد اندر سے ایک نوجوان ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر نخوت تھی۔ اس نے تحقیر آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”کس سے ملنا ہے؟“

”مجھے شمسہ بی بی سے ملنا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ اس نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”شمسہ سے تمہیں کیا کام ہے؟“

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ شمسہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ میں نے اٹھ کر اسے سلام کیا۔

”بیٹھو۔“ وہ میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

”کون ہے یہ؟“ نوجوان نے شمسہ سے پوچھا۔

”میری ایک فرینڈ کا بھائی ہے۔“ شمسہ نے جواب دیا۔ پھر مجھ سے بولی۔ ”یہ کیپٹن محمود ہیں۔ میرے کزن۔ تم بتاؤ بریگیڈیئر صاحب سے ملاقات ہوئی؟“

”جی ہاں ان سے ملاقات بھی ہو گئی اور انہوں نے مجھے آرمی کے لیے سلیکٹ بھی کر لیا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں کل ٹریننگ کے لیے جا رہا ہوں۔“

”ارے یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔“ شمسہ نے کہا۔

کیپٹن محمود مسلسل مجھے گھور رہا تھا۔ شاید اسے میری آمد ناگوار گزری تھی۔

میں نے بھی وہاں زیادہ بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ”شمسہ بی بی مجھے اجازت دیجیے میں کرنل صاحب کو اطلاع دینے آیا تھا۔ آپ انہیں بتا دیجیے گا۔“

”بیٹھو! چائے پی کر جانا۔“ شمسہ نے کہا۔

”چائے کا تکلف مت کریں۔“ میں نے کہا۔ ”بس میری طرف سے کرنل صاحب کا شکریہ ادا کر دیجیے گا۔“ یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆

ٹریننگ کے بعد مجھے بلوچ رجمنٹ کی ایک بٹالین میں بھیج دیا گیا۔ وہ بٹالین ان دنوں کھاریاں میں تھی۔ میں بہت محنت سے اپنا کام کرتا تھا۔ صبح شام پی ٹی اور پریڈ اور شام کو باسکٹ بال کھیلنا میرے معمولات میں شامل تھا۔

وہاں رہ کر میری شخصیت ہی بدل گئی تھی۔ بٹالین کے تمام سپاہیوں میں سب سے نمایاں میں ہی تھا۔ میں اب وہ پہلے والا گاؤں کا سہا اور ڈرا ہوا یوسف نہیں تھا بلکہ پاکستان آرمی کا ایک چاق و چوبند با اعتماد سپاہی تھا۔ مجھے اچھے کپڑوں اور جوتوں کا شوق تھا۔ اسی لیے جب میں تیار ہو کر باہر نکلتا تھا تو لوگ مجھے سپاہی کے بجائے افسر سمجھتے تھے۔

مجھے یوں ہی بیٹھے بیٹھے ایک دن اپنے محسن کرنل جنجوعہ کا خیال آ گیا۔ میں نے سوچا اس ویک اینڈ پر چھٹی لے کر لاہور جاؤں گا اور کرنل صاحب سے ملاقات کروں گا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ توپ خانے کی بٹالین میں ا

ہیں۔ لاہور جانے سے پہلے مجھے خیال آیا کہ میں معلوم تو کرلوں کہ کرنل صاحب ابھی تک لاہور میں ہیں یا ان کا تبادلہ کسی اور شہر میں ہو چکا ہے؟ فوجی ایک ہی شہر میں کب رہتے ہیں۔

میں نے اپنے ہیڈ کوارٹر سے کرنل صاحب کے بارے میں معلوم کیا تو مجھے علم ہوا کہ کرنل صاحب اب راولپنڈی میں ہیں اور اب وہ بریگیڈیئر ہو چکے ہیں۔

میں نے ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست دی جو منظور ہو گئی۔ کھاریاں آئے ہوئے مجھے ایک سال ہو چکا تھا۔ میں نے اس دوران میں ایک دن کی چھٹی بھی نہیں لی تھی۔

"اگر تم اس ہفتے کے بجائے اگلے ہفتے جاؤ تو بہتر ہے۔" میرے کمپنی کمانڈر میجر اقبال نے کہا۔ "اس ہفتے تمہاری پروموشن ہونے والی ہے۔ تم لانس نائیک بننے والے ہو۔"

"اوکے سر!" میں نے جواب دیا۔

"یوسف!" میجر صاحب نے کہا۔ "تم نے تعلیم کیوں چھوڑ دی یہاں رہ کر تم پرائیویٹ طور پر بھی تو اپنی تعلیم جاری رکھ سکتے ہو۔"

"سر میں کوشش کروں گا کہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں۔" میں نے جواب دیا۔

"کوشش مت کرو بلکہ پڑھائی شروع کر دو۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔" میجر صاحب مسکرا کر بولے۔

مجھے بٹالین کی ایک رسمی تقریب میں لانس نائیک کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ اب میرے شانے پر ایک فیتے کا اضافہ ہو گیا۔

دوسرے ہفتے میں راولپنڈی پہنچا۔ اپنے ایک فوجی دوست کے ساتھ قیام کیا۔ وہ ٹریننگ میں میرے ساتھ تھا۔

شام کو میں تیار ہو کر جانے لگا تو میرے دوست زاہد نے پوچھا۔ "سرکار کہاں کی تیاری ہے اور تم اکیلے ہی اکیلے گھومنے جا رہے ہو؟"

"میں گھومنے نہیں جا رہا بلکہ بریگیڈیئر جنجوعہ سے ملاقات کرنے جا رہا ہوں۔"

"بریگیڈیئر جنجوعہ!" اس نے حیرت سے کہا۔ "کیا جنجوعہ صاحب تمہارے گاؤں کے ہیں؟" وہ مرعوب ہو کر بولا۔

"نہیں یار ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔

بریگیڈیئر صاحب کا بنگلا وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں پیدل ہی اس طرف روانہ ہو گیا۔

وہاں مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ راستے میں نظر آنے والا ہر فوجی جوان مجھے سیلوٹ کر رہا تھا۔ شاید وہ میرے لباس کی وجہ سے مجھے افسر سمجھ رہے تھے۔

ایک بٹالین کی کوارٹر گارڈ کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے وہاں موجود گارڈز نے باقاعدہ سلامی بھی دی۔ جو لوگ فوج میں ہیں وہ میری بات کا مطلب بہت آسانی سے سمجھ جائیں گے۔ کوارٹر گارڈ کے سامنے سے کوئی افسر گزرتا ہے تو اسے فوجی انداز میں سلامی دی جاتی ہے۔

میں بریگیڈیئر صاحب کے بنگلے کی طرف بڑھا تو آر پی (رجمنٹ پولیس) کے ایک حوالدار نے مجھے سیلوٹ کیا اور بولا۔ "سر کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

میں نے اسے بتایا کہ مجھے بریگیڈیئر صاحب سے ملنا ہے تو وہ ایک دم الرٹ ہو گیا اور بولا۔ "سر وہ جو سامنے والا بنگلا ہے بریگیڈیئر صاحب کا ہے۔"

بریگیڈیئر صاحب اس وقت گھر پر موجود نہیں تھے۔ میں نے گارڈ سے کہا کہ مجھے شمسہ بی بی سے ملنا ہے۔ میرا نام یوسف ہے اور میں کھاریاں سے آیا ہوں۔"

اس نے مجھے لان میں رکھی ہوئی ایک کرسی پر بٹھا دیا اور خود شمسہ کو اطلاع دینے کے لیے اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد شمسہ آ گئی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین ہو گئی تھی۔ اس کے سرخ و سفید اور پرکشش چہرے پر نظریں نہیں ٹک رہی تھیں۔ میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور سلام کیا۔

"او مائی گاڈ، یہ تم ہو؟" شمسہ خوشگوار حیرت سے بولی۔ "تم تو پہچانے ہی نہیں جا رہے ہو یوسف۔"

"کیا میرا چہرہ اتنا بگڑ گیا ہے؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"تم تو پہلے سے کہیں زیادہ ہینڈسم اور اسمارٹ ہو گئے ہو مجھے تو لگ ہی نہیں رہا ہے کہ تم آرمی میں سپاہی ہو۔"

"سپاہی نہیں میڈم!" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں اب لانس نائیک ہوں۔"

"ویری گڈ۔" وہ ہنس کر بولی۔

اس وقت اردلی چائے اور دیگر لوازمات لے آیا۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی شمسہ بی بی۔" میں نے کہا۔

"تکلف کیسا یوسف؟" شمسہ نے کہا۔ "تم اتنی دور سے ملنے آئے ہو...... اور...... یہ شمسہ بی بی کیا...... تم مجھے صرف شمسہ نہیں کہہ سکتے۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"آپ تو میری محسن ہیں۔ میں......"

"اور یہ آپ بھی نہیں چلے گا۔ میں تم سے عمر میں بڑی تو نہیں ہوں۔"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ گیٹ سے سیاہ رنگ کی ایک شاندار گاڑی پورچ میں آ کر رکی۔ اسے آرمی کا ایک باوردی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ پھر میں نے بریگیڈیئر صاحب کو گاڑی سے اترتے دیکھا۔ وہ اس وقت سوٹ میں ملبوس تھے۔ وہ شمسہ کو لان میں دیکھ کر سیدھے ہماری طرف آ گئے۔ میں نے کھڑے ہو کر انہیں فوجی انداز میں تعظیم دی۔ (جونیئر فوجی اگر وردی میں نہ ہو تو وہ سینئر کو صرف اٹینشن ہو کر سلام کر سکتا ہے) بریگیڈیئر صاحب نے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر بولے۔ "تم...... تم...... یوسف ہو؟"

"یس سر۔" میں نے جواب دیا۔ "میں آج کل کھاریاں میں ہوں۔ ایکس بلوچ رجمنٹ میں اور اب لانس نائیک ہوں۔"

"ویری گڈ۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولے۔ "تم تو بالکل پہچانے ہی نہیں جا رہے ہو۔ لانس نائیک سے زیادہ تم افسر لگ رہے ہو۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ "تم مزید تعلیم حاصل کیوں نہیں کرتے۔ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد تم آئی ایس ایس بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد کمیشن حاصل کر سکتے ہو۔"

"یس سر، میرے کمپنی کمانڈر میجر اقبال صاحب کا بھی یہی مشورہ ہے۔"

"تم یہاں اپنے کسی دوست یا رشتے دار سے ملنے آئے ہو؟" بریگیڈیئر صاحب نے پوچھا۔

"نہیں سر، یہاں میرا کوئی رشتے دار اور ایسا دوست نہیں ہے۔ جس سے ملنے میں خاص طور پر کھاریاں سے پنڈی آؤں۔" میں نے جواب دیا۔

"جب انہیں معلوم ہوا کہ میں صرف ان سے ملنے کی خاطر یہاں آیا ہوں تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم اپنا سامان لے کر یہیں آ جاؤ اور جب تک پنڈی میں ہو یہاں رہو۔"

ان کے انداز میں تحکم تھا۔ میرا سامان ہی کیا تھا، ایک بیگ تھا۔ وہ میں اٹھا لایا۔

میں ایک ہفتے کے لیے یہاں آیا تھا۔ اس ایک ہفتے میں شمسہ مجھ سے بہت بے تکلف ہو گئی۔ مجھے اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہتے کہتے رک جاتی ہے۔

میں وہاں سے چلنے لگا تو شمسہ نے اپنی کچھ کتابیں بھی مجھے دے دیں اور مجھ سے وعدہ لیا کہ میں انٹر کا امتحان ضرور دوں۔ بریگیڈیئر صاحب نے بھی کھاریاں کے بریگیڈ کمانڈر کے نام مجھے ایک خط دیا اور بولے کہ تم بریگیڈیئر ارشد سے ضرور مل لینا۔ وہ تمہاری بہت مدد کرے گا۔

میں کھاریاں واپس آیا تو دوبارہ اپنے معمولات میں مصروف ہو گیا۔ میں نے انٹر کرنے کے لیے پرائیویٹ طور پر داخلہ فارم بھی بھیج دیا اور امتحان کی تیاری کرنے لگا۔

مجھے پڑھنے کے لیے رات ہی کو وقت ملتا تھا۔ بیرک کی لائٹس نو بجے ہی بند کر دی جاتی تھیں۔ اس لیے ایک ٹیبل لیمپ لے آیا تاکہ دوسرے لوگوں کو تکلیف نہ ہو اس کے باوجود سی او صاحب کو شکایت کر دی گئی کہ یوسف ڈسپلن کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ میں نے سی او صاحب کو بتایا کہ میں امتحان کی تیاری کر رہا ہوں۔

"یہ تمہارا مسئلہ ہے جوان۔" سی او صاحب نے کہا۔ "آئندہ لائٹ آن مت کرنا۔"

اس موقع پر مجھے بریگیڈیئر ارشد صاحب کا خیال آیا۔ جنجوعہ صاحب نے ان کے نام مجھے جو خط دیا تھا وہ اب تک میرے پاس تھا۔

میں دوسرے ہی دن ان سے ملا۔ انہوں نے میرا ٹرانسفر بریگیڈیئر کوارٹر کر دیا اور مجھے چھوٹا ایک کمرا بھی الاٹ کر دیا۔

یہ بریگیڈیئر جنجوعہ صاحب کا مجھ پر دوسرا احسان تھا۔ میں بہت محنت اور لگن سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا اور اسی سال میں نے بہت اچھے نمبروں سے انٹر کا امتحان پاس کر لیا۔

میں پنڈی پہنچا تو مجھے اطلاع ملی کہ جنجوعہ صاحب ریٹائر ہو چکے ہیں اور اپنے گاؤں چلے گئے ہیں۔ وہ جہلم میں ایک چھوٹے سے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ وہاں ان کی کچھ زمین تھی۔

ان کا ایڈریس لے کر میں جہلم روانہ ہو گیا۔

بریگیڈیئر صاحب بہت خندہ پیشانی سے پیش آئے لیکن انہیں دیکھ کر مجھے دکھ سا ہوا تھا وہ ایک سال میں بہت

بوڑھے لگ رہے تھے۔ شمسہ لاہور کے ایک کالج میں پڑھ رہی تھی اور وہیں ہاسٹل میں رہتی تھی۔

"تم اب کمیشن کا امتحان ضرور دینا۔" جنجوعہ صاحب نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم اس امتحان میں پاس ہو کر کمیشن حاصل کرلو گے۔"

وہیں میری ملاقات ایک مرتبہ پھر کیپٹن محمود سے ہوئی۔ وہ اب میجر ہو چکا تھا۔ وہ جنجوعہ صاحب کے چھوٹے بھائی کا بیٹا تھا۔

اس نے بہت حقارت سے پوچھا۔ "اوئے تم یہاں بھی آگئے؟"

"سر، میں بریگیڈیئر صاحب سے ملنے آیا تھا۔" میں نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

"اب ان کا پیچھا چھوڑ دو۔ چاچا اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اب ان کی کوئی نہیں سنے گا۔"

"مجھے ان سے کوئی کام نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں صرف ان سے ملنے آیا تھا۔" یہ کہہ کر میں واپس آگیا۔

مجھے محمود کے رویے سے بہت تکلیف پہنچی تھی۔

میں نے کمیشن کے امتحان کے لیے درخواست دے دی۔ یونٹ کے کئی افراد نے مجھے سمجھایا کہ ہم جیسے چھوٹے فوجیوں کو بہت کم امتحان میں پاس کیا جاتا ہے۔ تم اگر تحریری امتحان پاس کر بھی لو گے تو تمہیں فائنل انٹرویو میں فیل کر دیا جائے گا۔

میں نے کمیشن کا تحریری امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ پھر تمام مراحل سے گزرنے کے بعد جب انٹرویو کا وقت آیا تو میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ انٹرویو بورڈ کے چیئرمین میجر جنرل صاحب بہت سخت آدمی ہیں۔

میں انٹرویو کے لیے کمرے میں داخل ہوا تو میجر جنرل صاحب کو دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ جنرل باجوہ صاحب تھے۔ یہ وہی بریگیڈیئر صاحب تھے جن کے پاس مجھے پہلی دفعہ جنجوعہ صاحب نے بھیجا تھا۔

ان کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے اور بولے۔ "جنجوعہ صاحب سے ملاقات ہوئی ہے؟"

"جی سر، میں پچھلے دنوں ان کے گاؤں گیا تھا۔" پھر انہوں نے دوبارہ رسمی سوالات کیے اور میرا انٹرویو ختم ہو گیا۔

کچھ دن بعد مجھے یہ خوش خبری ملی کہ میں سلیکٹ ہو چکا ہوں اور اب ٹریننگ کے لیے مجھے ملٹری اکیڈمی کاکول جانا ہے۔

اس دن گویا مجھے سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔ مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میں واقعی منتخب ہو چکا ہوں۔ مجھے مبارک باد دینے والے ساتھی مجھے ابھی سے سر کہہ رہے تھے۔

میں اس وقت کھاریاں ہی میں تھا لیکن ہیڈ کوارٹر نے مجھے اکیڈمی جانے کے لیے فارغ کر دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ایک چکر اپنے گاؤں کا لگا لوں لیکن پھر میں نے خوب سوچا کہ اب میرا وہاں کون ہے۔

مجھے اچانک شمسہ کا خیال آیا۔ جنجوعہ صاحب نے بتایا تھا کہ وہ لاہور کے کالج میں پڑھتی ہے اور ہاسٹل میں مقیم ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ کس کالج میں پڑھتی ہے۔ میں شام کو تیار ہو کر اس کے ہاسٹل پہنچ گیا۔ میں نے چوکیدار کو اپنا نام بتایا اور اس سے کہا کہ مس شمسہ جنجوعہ کو بلا دو۔

میں ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔ وہاں کئی دوسری لڑکیوں کے بھائی، باپ اور دوسرے رشتے دار بھی بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد شمسہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ روز بروز حسین ہوتی جارہی تھی یا پھر یہ میری حسن نظر کا کمال تھا۔

"یوسف صاحب کیسے ہیں آپ؟" اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"میں اچھا ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "آپ...... میرا مطلب ہے تم کیسی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جیسی بھی ہوں تمہارے سامنے ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم نے ایف اے کی تیاری شروع کر دی ہوگی؟"

"تیاری!" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں نے تو ایف اے کر بھی لیا۔ میں نے دونوں سال کا امتحان ایک ساتھ دیا تھا۔"

"واقعی؟" وہ خوشی سے چہکی۔ "تم واقعی بہت ذہین ہو۔"

"ایک اطلاع اور ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں اگلے ہفتے ملٹری اکیڈمی کاکول جارہا ہوں ٹریننگ کے لیے۔"

شمسہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ پھر وہ خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”یہ اطلاع نہیں میرے لیے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ اکیڈمی جاکر مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے یوسف۔“ اس نے جذباتی ہوکر کہا۔

”میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں شمسہ؟“ میں نے کہا۔ ”تم ہی نے تو میری زندگی بدلی ہے۔ تم میری محسن ہو۔“

”صرف محسن؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میں ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھنے لگا۔

وہ سرگوشی میں بولی۔ ”اصولاً تو مجھے یہ بات نہیں کہنا چاہیے لیکن تم میں تو اتنی جرأت ہے ہی نہیں...... میں تمہیں...... پسند کرنے لگی ہوں۔“

اس کے اس جملے سے میرے دل میں پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ میں بھی سرگوشی میں بولا۔ ”شمسہ...... میں نے تو...... پہلی ہی نظر میں تمہیں پسند کرلیا تھا لیکن...... اس خوف سے خاموش رہا کہ کہاں میں ایک غریب مزدور کہاں تم ایک......“

”بس زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ شمسہ ہنس کر بولی۔

”اچھا تم یہاں کا ٹیلی فون نمبر تو بتاؤ۔ میں وہاں سے تمہیں ٹیلی فون کرلیا کروں گا۔“ میں نے جیب سے ڈائری نکالتے ہوئے کہا۔ اس دور میں سیل فون کا کوئی دور نہیں تھا۔

شمسہ نے اپنا نمبر لکھوایا اور بولی۔ ”میں ہر ہفتے کی شام تمہارے ٹیلی فون کا انتظار کروں گی۔ تم......“ وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگئی۔ اس کی نظریں ایک طرف جمی ہوئی تھیں۔

میں نے گھوم کر دیکھا تو میرے ذہن کو بھی جھٹکا سا لگا تھا۔ وہاں میجر محمود کھڑا تھا۔

”تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟“ اس نے غصے سے پوچھا۔

وہاں موجود ہر شخص ہماری طرف دیکھنے لگا۔

”سر پلیز۔“ میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ باہر چلیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”کچھ شمسہ بی بی کی عزت ہی کا خیال کرلیں۔“

”دفع ہوجا یہاں سے۔“ وہ بھی آہستہ سے غرایا اور باہر میرا انتظار کر۔“ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں شمسہ کو خدا حافظ کہا اور باہر نکل آیا۔

باہر ایک فوجی جیپ کھڑی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہی جیپ میجر محمود کی ہے۔ میں اس کے پاس کھڑا ہو کر محمود کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ بہت غصے میں باہر نکلا اور مجھے دیکھ کر بولا۔ ''تو ابھی تک دفع نہیں ہوا؟''

''سر آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں باہر رک کر آپ کا انتظار کروں۔ میں اپنے سینئر کا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں سر۔''

''اب میں نے تجھے شمسہ کے آس پاس بھی دیکھا تو تیرا بہت برا حشر کروں گا۔ تو ابھی کھاریاں میں ہے ناں؟ میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ ناؤ گیٹ لاسٹ۔''

دل تو میرا چاہ رہا تھا کہ میں گھونسا مار کر اس کے دانت توڑ دوں، اس کا حلیہ بگاڑ دوں لیکن میں نے بہت مشکل سے ضبط کیا۔ میں اس کے ساتھ مار پیٹ کر کے اپنا مستقبل تاریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں خاموشی سے سر جھکا کر وہاں سے چلا آیا۔

دوسرے ہفتے میں پی ایم اے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اکیڈمی میں ہر ہفتے کی شام مجھے خیال آتا کہ میں شمسہ کو ٹیلی فون کروں لیکن میں چاہنے کے باوجود بھی ایسا نہیں کر سکا۔ ابھی میں زیر تربیت تھا۔ میجر محمود کو بھنک بھی مل جاتی تو وہ اب بھی میرا مستقبل تباہ کر سکتا تھا۔ میں اس دن کے انتظار میں تھا جب میں یہاں سے پاس آؤٹ ہو کر نکلوں گا۔ اس وقت میجر محمود میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔

دو سال کا عرصہ میں نے دل پر پتھر رکھ کر گزار دیا۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ میں پاسنگ آؤٹ کے بعد اکیڈمی سے سیکنڈ لیفٹیننٹ بن کر باہر نکلا۔ مجھے اپنی پرانی بٹالین اکیس بلوچ رجمنٹ میں بھیج دیا گیا۔ وہ اس وقت پشاور میں تھی۔

ڈیوٹی جوائن کرنے سے پہلے ہر افسر کو پندرہ دن کی چھٹی دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے مل لے۔ میرے والدین تھے نہیں ایک بھائی تھا لیکن میں اس کے لیے مر چکا تھا۔

میں نے سب سے پہلے میجر محمود کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ وہ ابھی لیفٹیننٹ کرنل تھا اور کراچی میں تھا۔

میں ایک دفعہ پھر شمسہ سے ملنے گرلز ہاسٹل پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اطلاع ملی کہ شمسہ ہاسٹل چھوڑ کر گاؤں جا چکی ہے۔ میں بھی گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں اس وقت وردی میں ملبوس تھا۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا تاکہ بریگیڈیئر صاحب مجھے دیکھ کر خوش ہو جائیں۔ ان سے زیادہ مجھے شمسہ کی خوشی عزیز تھی۔

میں تانگے سے اتر کر شمسہ کے گھر کی طرف بڑھا تو بری طرح چونکا تھا۔ اس کے گھر کے سامنے شامیانہ لگا ہوا تھا اور گاؤں کے لوگ وہاں بیٹھے قرآن خوانی میں مصروف تھے۔

میرا دل کسی انجانے خدشے سے بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں نے گاؤں کے ایک شخص کو بلا کر پوچھا۔ ''یہاں کیا ہوا ہے بھائی؟ کوئی......''

''کل رات بریگیڈیئر صاحب کی وفات ہو گئی ہے۔'' اس نے گویا میرے سر پر ہتھوڑا رسید کر دیا۔

میں بے اختیار شامیانے کی طرف بڑھا۔ جوتے اتارے اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

اچانک مجھے جنجوعہ صاحب کا پرانا ملازم فضل دین نظر آیا۔ اس کی نظر بھی مجھ پر پڑ گئی۔ وہ سیدھا میری طرف آیا۔ وہ ایک عرصے سے جنجوعہ صاحب کے ساتھ تھا۔ میں نے اسے پہلی دفعہ لاہور میں دیکھا تھا۔ پھر راولپنڈی میں، ریٹائرڈ ہونے کے بعد وہ شاید مستقل بریگیڈیئر صاحب کے ساتھ تھا۔ وہ خود بھی فوج میں رہ چکا تھا۔ اس لیے پہلے تو اس نے مجھے فوجی انداز میں تعظیم دی، پھر حیرت سے بولا۔ ''سر جی، آپ لیفٹیننٹ بن گئے؟''

''ہاں فضل دین۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن جس کی وجہ سے میں آج اس مقام پر ہوں، وہ تو بہت دور چلا گیا۔'' میرے آنسو بہنے لگے۔

''صبر کریں صاحب جی! آپ اتنے شیر جوان ہو کر رو رہے ہیں؟''

''شمسہ بی بی کہاں ہیں؟'' میں نے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''ان کے ساتھ تو بہت ظلم ہوا ہے سر جی۔'' فضل دین نے افسردگی سے کہا۔

''کیا ہوا انہیں؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''کرنل محمود صاحب ان کے ساتھ زبردستی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ شمسہ بی بی اس پر راضی نہیں ہیں۔ بریگیڈیئر صاحب نے بھی کرنل صاحب کو انکار کر دیا تھا۔ اب بریگیڈیئر صاحب تو رہے نہیں۔ کرنل محمود صاحب اب ان سے زبردستی شادی کریں گے۔''

"ایسے کیسے کرلیں گے۔" میں نے بھڑک کر کہا۔ "تم شمسہ سے کہو کہ وہ مجھے رات کو گاؤں کے باہر ملے۔ میں......"

اچانک فضل دین گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ کرنل محمود جیپ سے اتر رہا تھا۔ میں بھی اس کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ وہ آخر میرا اسٹیٹر تھا۔

کرنل محمود ٹینٹ میں داخل ہوا۔ اس کی نظر پہلے مجھ پر پڑی۔ پھر میرے شانے پر دمکتے ہوئے اسٹار پر۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں نے اسے زوردار انداز میں سیلوٹ کیا۔

وہ میرے نزدیک آکر بولا۔ "تمہیں یاد نہیں ہے کہ میں نے تم سے کیا کہا تھا؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے سر۔" میں نے جواب دیا۔ "گرلز ہوسٹل نہیں ہے اور میں یہاں پر بریگیڈیئر صاحب کی تعزیت کے لیے آیا ہوں۔"

"پتر! تو نے مجھے نہیں پہچانا؟" عقب سے ایک آواز آئی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ بوڑھا لیکن بارعب شخص تھا۔ اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ "میں تیرے صاحب کا چھوٹا بھائی ہوں۔" وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا اور بلک بلک کر رونے لگا۔ پھر وہ فضل دین سے بولا۔ "جا مہمان کے لیے لسی پانی کا بندوبست کر اور اسے اپنے ساتھ لے جا۔"

اس شخص کی وجہ سے میری جان محمود سے چھوٹ گئی۔

فضل دین نے بتایا کہ یہ کرنل صاحب کا باپ ہے۔ بریگیڈیئر صاحب سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ مجھے حویلی کے ایک کمرے میں لے گیا اور بولا۔ "آپ آرام کریں۔ میں آپ کے لیے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"تم شمسہ کو میرا پیغام ضرور پہنچا دینا۔" میں نے کہا۔

☆......☆

رات سرد اور تاریک تھی۔ میں گاؤں کے باہر قبرستان کے پاس شمسہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس جگہ کا انتخاب بھی فضل دین نے کیا تھا۔

اچانک اندھیرے سے ایک سایہ نمودار ہوا اور میرے سامنے آگیا۔ وہ شمسہ تھی۔

"شمسہ...... مجھے افسوس ہے کہ......"

"افسوس کرنے سے ڈیڈی واپس تو نہیں آجائیں گے۔" شمسہ سرد لہجے میں بولی۔ "تم انتہائی بزدل انسان ہو یوسف۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تمہیں محمود نے ایک دھمکی دی اور تم نے اس سے خوف زدہ ہو کر مجھے کبھی ٹیلی فون نہیں کیا۔ میں ہر ہفتے تمہارے ٹیلی فون کا انتظار کرتی تھی۔ تم کیسے فوجی ہو کہ ایک ہی دھمکی میں خوف زدہ ہو گئے؟"

"میں اپنی اس وعدہ خلافی پر شرمندہ ہوں شمسہ۔" میں نے کہا۔ "پلیز مجھے معاف کر دو۔"

"میں نے تو تمہیں ان ہی دنوں معاف کر دیا تھا جب تم نے وعدہ خلافی کی تھی۔" شمسہ نے کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ کرنل محمود تم سے زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے؟"

"تم نے ٹھیک سنا ہے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں اس کی نوبت نہیں آنے دوں گا شمسہ۔" میں نے کہا۔ "تم ابھی میرے ساتھ چلو۔ ہم کورٹ میں جا کر شادی کرلیں گے پھر......"

"شٹ اپ۔" شمسہ تلخ لہجے میں بولی۔ "میں اپنے مرے ہوئے باپ کی عزت نہیں اچھال سکتی۔ لوگ تو یہی کہیں گے کہ صفدر جنجوعہ کی بیٹی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ نہیں یوسف ایسا سوچنا بھی مت۔ ہاں اگر تم میں ہمت ہے تو مجھے باعزت طریقے سے بیاہ کر یہاں سے لے جاؤ۔ رہا محمود کا سوال تو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ چھ ماہ تک اس کی بات نہیں مانوں گی۔ میرا خیال ہے کہ یہ مہلت تمہارے لیے کافی ہے۔"

"پھر...... پھر...... اس کے بعد...... تم......"

"اس کے بعد کی فکر تم مت کرو۔ تمہارے پاس صرف چھ مہینے ہیں۔ اگر اس عرصے میں مجھے اپنا سکتے ہو تو اپنا لو۔ اس کے بعد میں تمہیں دکھاؤں گی کہ بزدل اور بہادر میں کیا فرق ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

میں بھی بوجھل دل لیے وہاں سے چلا آیا۔

میں نے پشاور جا کر اپنی ڈیوٹی جوائن کر لی لیکن مجھے دن رات شمسہ کا خیال رہتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں شمسہ کو کیسے اپناؤں۔ کبھی سوچتا تھا کہ محمود کو قتل کر دوں لیکن یہ اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ اسے قتل کرنے کے بعد بھی شمسہ مجھے مل تو نہیں سکتی تھی۔ مجھے یا تو پھانسی کی سزا ہوتی یا عمر قید کی۔ دونوں صورتوں میں شمسہ میری نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے بھی مشورہ کیا۔ ان سب کا وہی مشورہ تھا کہ میں گاؤں جا کر شمسہ کے چاچا سے بات

کروں۔ وہ بھائی سے محبت کرتا تھا تو یقیناً بھتیجی کو بھی چاہتا ہو گا۔ وہ شمسہ کی پسند کو نہیں ٹھکرائے گا۔

اس ادھیڑ بن میں پانچ مہینے گزر گئے اور چھٹا مہینا بھی گزر رہا تھا۔ شمسہ شاید درست کہتی تھی۔ میں واقعی بزدل تھا۔ مجھے اس بات کا خوف تھا کہ چاچا سرور نے بھی انکار کر دیا تو میں کیا کروں گا؟

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا میری بدحواسی بڑھتی جا رہی تھی۔ کیپٹن راشد سے میری بہت زیادہ دوستی تھی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ تم چل کر شمسہ کے چاچا سے بات کرو اس نے انکار کر دیا تو پھر دیکھیں گے کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔ چلو اب میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔

ان دنوں ہم دونوں اسکیم پر تھے۔ اس کے ختم ہونے میں چار روز باقی تھے۔ اس سے پہلے ہمیں چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔

چوتھے دن چھٹی لے کر ہم یونٹ جانے کے بجائے براہِ راست جہلم روانہ ہو گئے۔ وقت بہت کم تھا۔ چھ ماہ کی مدت پوری ہونے والی تھی۔

کیپٹن راشد نے مجھے دلاسا دیا کہ چھ ماہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک دو دن کی تاخیر سے شمسہ انکار کر دے گی۔ یہ کوئی فوجی آپریشن نہیں کہ وقت معینہ پر شروع ہو سکے۔

ہم فوجی جیپ میں وہاں پہنچے تھے۔ جنجوعہ صاحب کے گھر کے سامنے بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں دو تین فوجی جیپیں بھی تھیں۔

ہم دونوں اس وقت وردی کے بجائے سوٹ میں تھے۔

ہماری جیپ دیکھ کر حویلی کا ایک ملازم بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔ ”جلدی آ جائیں جی نکاح ہو رہا ہے۔“

”نکاح ہو رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں جی اپنے کرنل صاحب اور شمسہ بی بی کی شادی ہو رہی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

مجھے بہت زوردار چکر آیا لیکن کیپٹن راشد نے بڑھ کر مجھے سنبھال لیا۔

ہم وہیں سے واپسی کا ارادہ کر رہے تھے کہ شمسہ کے چاچا سرور کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ وہ تیزی سے ہماری طرف بڑھا اور بولا۔ ”تو نے آنے میں دیر کر دی پتر، نکاح تو ہو چکا۔ چل اب شادی میں تو شریک ہو جا۔“ وہ ہمیں اصرار کر کے اندر لے گیا۔

ہم دونوں بے دلی سے جا کر مہمانوں میں بیٹھ گئے۔

اچانک فضل دین کی نظر مجھ پر پڑی وہ دوڑا ہوا میرے پاس آیا اور بولا۔ ”آپ نے بہت دیر کر دی سر جی۔ شمسہ بی بی وعدے کی پکی ہیں۔ وہ پورے چھ مہینے تک شادی سے انکار کرتی رہیں۔ سرور صاحب انہیں مناتے رہے۔ ان سے پوچھتے رہے کہ اگر تجھے کوئی اور پسند ہے تو مجھے بتا میں تیری شادی اس سے کرا دوں گا۔ وہ خاموش رہتی تھیں لیکن بعد میں مجھ سے کہتی تھیں کہ فضل دین دیکھو تمہارا وہ بزدل صاحب پھر نہیں آیا۔ جب تک وہ خود نہیں آئے گا میں بھی چاچا جی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ اتنا کہہ کر فضل دین خاموش ہو گیا۔

”پھر...... وہ راضی کیسے ہو گئیں؟“ کیپٹن راشد نے پوچھا۔

”وہ تو ایک ایک وقت کا حساب رکھ رہی تھیں۔ کل رات کو چھ ماہ پورے ہو گئے تو انہوں نے سرور صاحب سے کہا کہ اب میں شادی کے لیے راضی ہوں۔ ممکن ہے شادی دو چار دن اور ٹل جاتی لیکن یہ شاید ان کا نصیب ہے کہ کرنل صاحب پرسوں ہی کراچی سے گاؤں پہنچے ہیں۔“

میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔

کرنل محمود دولہا بنا بیٹھا تھا وہ بہت طنزیہ انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔

اچانک اسے کسی رسم کے لیے عورتیں گھر کے اندر لے گئیں۔ میں نے سوچا کہ سرور چاچا سے کہہ کر ہم بھی یہاں سے نکلیں کہ اچانک یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ پھر اندر سے لوگوں کے چیخنے اور آہ و بکا کی آوازیں سنائی دیں۔ میری طرح کیپٹن راشد بھی بری طرح بوکھلا گیا تھا کہ ہوا کیا ہے۔

اس وقت فضل دین روتا ہوا باہر آیا اور بولا۔ ”سر جی! شمسہ بی بی نے کرنل صاحب کو گولی مار کے خود کو بھی گولی مار لی۔ ان دونوں نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔ میں نے انہیں آپ کے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس بزدل سے کہنا کہ...... وقت گزر چکا ہے۔ اب وہ میری بہادری دیکھے۔“

میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ شمسہ واقعی اپنے الفاظ کی دھنی تھی۔ اپنی محبت کے لیے اس نے جان دے دی اور میں نے کیا کیا؟ میں آج بھی زندہ ہوں اور نہ جانے کب تک زندہ رہوں گا۔

اسماء الحسنیٰ ۔ کامیابی کا راستہ

پیر شاہ محمد قادری

پیر شاہ محمد قادری ناجی ہاشمی گذشتہ 25 برسوں سے اسماء الحسنیٰ کے حوالے سے زندگی میں درپیش تمام مسائل اور پریشانیوں کے حل کے لئے اسماء الحسنیٰ کی تلقین کرتے ہیں اور آیات قرآنی کے ذریعے روحانی علاج کے حوالے سے دنیا بھر میں شہرت یافتہ ہیں۔ آپ کے پروگرام اسماء الحسنیٰ ۔ کامیابی کا راستہ کروڑوں ناظرین دیکھتے رہتے ہیں۔ آپ اپنے مسائل اور پریشانیوں میں براہِ راست ان سے بذریعہ خط اور ملاقات راہ نمائی لے سکتے ہیں۔

حمیدہ نعمان ۔ اسلام آباد

○ کبھی سوچا نہیں تھا کہ ایسی پریشانی سے دوچار ہو جاؤں گی کہ جس کے لئے مجھے اپنی عقل جواب دیتی محسوس ہوگی اس مرحلے پر آپ سے راہنمائی کی درخواست ہے مسئلہ کچھ یوں ہے کہ میرا نکاح آج سے چار سال قبل میرے ماموں زاد کے ساتھ ہوا تھا جو امریکہ سے ڈیڑھ سال قبل وہ آئے اور رخصتی ہو گئی مگر وہ ازدواجی زندگی سے معذور تھے۔ بہر حال بہت مشکل وقت تھا...... میں نے ان کا پردہ رکھنا چاہا مگر شاید میں اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتی ہوں مجھے ڈپریشن ہونے لگا ہے مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں اس صورت میں حال میں جدا نہیں ہو سکتے ان کی والدہ مجھ سے شدید محبت کرتی ہیں میں اپنے گھر میں ہی رہتی ہوں اور آہستہ آہستہ ڈپریشن کی مریض بنتی جا رہی ہوں میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہو جائے اور میں اس صورت حال سے نکل آؤں اس ضمن میں مجھے ذہنی سکون کے لئے کوئی اسم الہیٰ بتائیں اور میرے لئے کوئی ایسی لوح تجویز کر دیجئے کہ جس سے مجھے فیصلے کی قوت مل جائے آپ کا یہ مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت اور استقامت دے آپ اپنی والدہ کو یہ ساری صورت حال بتا دیجئے اس قسم کی صورت حال درپیش آنے پر شریعت کچھ شرائط کے ساتھ خلع کا حق دیتی ہے۔ "یا کریم یا سلام" ہر نماز کے 135 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کیجئے اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ ذہنی سکون اور ڈپریشن سے نجات کے لئے آپ کی فرمائش پر لوح اسم ذات ارسال کی جا رہی ہے دعاؤں کا شکریہ۔

میمونہ شفیق ۔ راولپنڈی

○ محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے میں اپنی بیٹی کے مسئلے کے سلسلے میں حاضر ہوں میری بیٹی کی عمر 28 سال ہو رہی ہے لیکن رشتے کا کوئی سبب نہیں بن رہا ہے بہت کوششیں کی ہیں لیکن کوئی بات نہیں بنتی ہے یہاں پر ایک مولوی صاحب سے پتا کرایا تو انہوں نے علاج تو کیا اور اس سے ایک دو رشتے آئے مگر بات نہیں بنی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کوئی ایسی دعا یا لوح دیدیں کہ جس سے میری بیٹی کی شادی کا مسئلہ حل ہو جائے اور وہ اپنے گھر میں آباد ہو جائے اس سے چار سال چھوٹی بیٹی کی منگنی طے ہو چکی ہے لڑکے والے بار بار شادی کا تقاضا کرتے ہیں مگر بڑی کا کوئی بندوبست ہو تو چھوٹی کو رخصت کریں بہت پریشان ہوں کوئی راہنمائی کیجئے۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھئے وہ بڑا ہی مسبب الاسباب ہے انشاء اللہ اچھا رشتہ ملے گا "یا کریم یا لطیف یا فتاح" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ بیٹی کی شادی کے لئے آپ کی فرمائش پر لوح تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔

گل رعنا ۔ جرمنی

○ محترم! اس خط کی غرض و غایت یہ ہے کہ میری بہن کی شادی کو چار سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت عطا نہیں ہوئی حالانکہ طبی اعتبار سے دونوں کو کوئی مسئلہ نہیں ہے مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ کی مصلحت کی وجہ سے یقیناً اس تاخیر کا کوئی بہتر سبب ہی ہوگا آپ سے اس ضمن میں روحانی علاج اور دعا کی درخواست ہے۔ جس طرح آپ نے میرے امیگریشن کے معاملے میں میری راہ نمائی کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس میں کامیابی عطا کی تھی اسی طرح

حصول دعا پھر حاضر ہیں۔ آپ کی محبت کرنے والی بیٹی۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ محبتوں کو قائم رکھے۔ اولاد کے لئے ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ "یاوارث یا مصور یا خالق" پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف آپ کی فرمائش پر اولاد کے لئے نقش علاج در عقیم ارسال کیا جارہا ہے۔

جبیں افضل۔ لندن یو کے

○ محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضر عطا فرمائے آپ جس طرح لوگوں کی دینی راہ نمائی کررہے ہیں اس کا اجر تو اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے ہم سب تو بس آپ کو دعاؤں کے نذرانے ہی بھیج سکتے ہیں میری بیٹی کا معاملہ ہے اس کو یہاں پر کوئی لڑکا پسند ہی نہیں آتا بلکہ یوں کہئے کہ وہ شادی کے نام سے الرجک ہوگئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک بار محبت میں ناکام ہو چکی ہے حالانکہ ہم نے اس کی مرضی پر سر جھکا دیا تھا مگر وہ لڑکا نہایت مطلب پرست نکلا۔ اس کا مقصد سوائے دولت کے کچھ نہیں تھا جب اس پر یہ حقیقت کھل گئی تو وہ اس سے متنفر ہوگئی اور اب اس نے سوچ لیا ہے کہ اب کبھی بھی شادی نہیں کرے گی۔ عمر بیتی جارہی ہے ہم اس کو سمجھا سمجھا کر تھک چکے ہیں مگر وہ نہیں مانتی۔ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں بے راہ روی ایک عام بات ہے برے وقت سے ڈر لگتا ہے آپ سے درخواست ہے کہ آپ شادی کے لئے کوئی اسم اور لوح تجویز فرمادیجئے تاکہ وہ ہنسی خوشی راضی ہوجائے۔ یہ آپ کا ایک ماں پر بے حد احسان ہوگا۔ آپ کی بہن۔

☆ عزیز بہن! دعاؤں کا شکریہ، اللہ تعالیٰ ہر بیٹی کو برے تجربے سے محفوظ اور مامون رکھے۔ (آمین) ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ "یالطیف یارافع یاحمید" پڑھ کر دعا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف شادی کے لئے آپ کی فرمائش پر لوح زہرہ ارسال کی جارہی ہے۔

شگفتہ حیدر۔ لاڑکانہ

○ محترم! میرے بیٹے کو بیرونِ ملک جانے کا بہت شوق ہے کئی بار متعدد جگہ اپلائی کرچکا ہے مگر بات نہیں بنتی ہے ذمہ داریاں کافی ہیں اور اگر یہ کام ہو جائے گا تو ہمارے قرض بھی ادا ہوجائیں گے اور بچیوں کی شادی کے معاملات بھی بے حد آسان ہوجائیں گے۔ یہاں کل آمدنی آٹھ ہزار سے زائد نہیں باوجود محنت کے معاشی ترقی میسر نہیں آتی ہے اس لئے ہمیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ اگر بیرونِ ملک ملازمت مل جائے تو ہمارے مسائل حل ہوجائیں گے آپ سے اس معاملے میں مدد و راہ نمائی کی ضرورت ہے۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ ہم سب کی تمام نیک اور جائز خواہشات پوری فرمائے۔ اور اپنے خزانۂ رحمت سے وافر طیب رزق عطا فرمائے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ "یارافع یاوہاب" پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 3 مرتبہ درود شریف۔ آپ کی فرمائش پر لوحِ تسخیر خاص برائے بیرونِ ملک سفر کے لئے ارسال کی جارہی ہے۔

سحرش بتول۔ ناروے

○ محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ (آمین) میرے ہاں اللہ کی رحمت سے چار بیٹیاں ہیں ہم ایک اور بے بی پلان کرنا چاہ رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ وہ اس مرتبہ ہمیں اولادِ نرینہ سے نوازے۔ بہنوں کو بھی بھائی کا بہت شوق ہے اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت نہایت فراوانی سے عطا کی ہے کمی تو بس یہی ہے۔ شاید اس لئے کہتے ہیں کہ انسان ناشکرا ہے طلب میں ہمیشہ ہاتھ بڑھائے رہتا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ ہماری آرزو کے لئے اللہ سے دعا کردیجئے اور کوئی روحانی علاج بھی تجویز کردیجئے آپ کے لئے دعاگو آپ کی بہن۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ حکیم و دانا قادر مطلق سے التجا ہے کہ وہ ہر والدین کی بیٹے کی آرزو پوری فرمائے (آمین) درحقیقت یہ بھی نکتہ قابلِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کی کوئی حد نہیں ہے ہمیشہ اس کے آگے دست طلب دراز رکھیں۔ کیونکہ وہ مانگنے والوں کو پسند کرتا ہے اور شکر گزاروں کو زیادہ نوازتا ہے "یاوارث یاقوی یامصور" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ اولادِ نرینہ کے لئے آپ کی فرمائش پر علاج در عقیم ارسال کیا جارہا ہے

یاسمین اسحاق۔ ٹھٹھہ سندھ

○ محترم! میرے والد کے انتقال کے ساتھ مسائل شروع ہوگئے ہیں ہماری اچھی خاصی جائیداد اور زرعی رقبہ ہے اور اسی وجہ سے مصیبتوں میں پڑ گئے ہیں۔ سگے بھائیوں اور بہنوں میں آپس میں جائیداد کی تقسیم کے لئے جھگڑے پڑ گئے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہم لوگ کیا کریں کس دعا سے اپنی محبتیں واپس لائیں اور سب دوبارہ سے ایک جیسے ہوجائیں آپ سے راہنمائی کی درخواست ہے۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ آپ سب کو محبت کی دولت عطا فرمائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ مال اور اولاد سے بندے کی آزمائش کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ آپ سب کے دلوں میں نرمی جگائے۔ (آمین) "یاسلام یاعزیز" ہر نماز کے بعد 131 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 3-3 مرتبہ درود شریف پڑھیں۔ خیر و برکت اور کامیابی کیلئے لوح تسخیر خاص ارسال ہے۔

راحیلہ منور۔ وہاڑی

○ محترم! میری شادی کو چار سال ہوگئے ہیں مجھ سے دو سال پہلے میری بہن کی منگنی ہوئی تھی لڑکا باہر تھا اس لئے انہوں نے ٹائم دو سال کا لے لیا اسی دوران میرے لئے ایک مناسب رشتہ آگیا اور یوں میری شادی میری باجی سے پہلے ہوگئی مگر اب چھ سال کا طویل عرصہ

گزر جانے کے باوجود وہ لوگ شادی میں ٹال مٹول کر رہے ہیں جبکہ لڑکا بھی واپس آگیا ہے اور یہاں آکر اس نے اپنا ایک بہت اچھا جنرل اسٹور کھول لیا ہے جس کی آمدنی بھی معقول ہے مگر اس کے باوجود وہ لوگ شادی کے معاملے میں نہ جانے کیوں دیر لگا رہے ہیں ایک مرتبہ ہم نے تنگ آکر منگنی توڑنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا مگر انہوں نے منت سماجت کر کے ابو کو منا لیا مگر اب پھر ایک سال گزر گیا ہے ان کی طرف سے خاموشی ہے ہمیں بتایئے کہ ہم کیا کریں باجی کہتی ہیں کہ وہ بدل گیا ہے نصیب ہے اب پھر ہو یا نہ ہو شادی یہیں ہونے دو۔ لوگ کیا کہیں گے؟ ہم لوگ سخت پریشانی میں مبتلا ہیں کہ کیا کریں آپ سے درخواست ہے کہ اس مسئلے کا روحانی حل بتائیں ہمیں بتائیں وظیفہ یا نقش جو بھی آپ مناسب سمجھیں عطا کر دیجئے تاکہ یہ مسئلہ بخیر و خوبی حل ہو جائے۔ اس کی وجہ سے باجی کی صحت بھی بہت گر گئی ہے والدین علیحدہ پریشان ہیں۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ رشتوں کو قائم رکھنے والا اور گھر آباد کرنے والا ہے آپ کی باجی کا گھر بھی انشاء اللہ ضرور بسے گا۔ ہر نماز کے بعد 124 مرتبہ "یالطیف یا جامع یا فتاح" پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ شادی کے لئے لوح زہرہ ارسال کی جارہی ہے حسب توفیق بروز جمعہ صدقہ دیا کیجئے۔ اسماء الحسنیٰ کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔

اقدس جبار۔ پشاور

○ محترم! میرے شوہر بات بات پر ناراض ہوتے ہیں گھر والوں سے ملنے نہیں دیتے اور بعض اوقات میرے والدین اور گھر والوں کے لئے اس قدر نازیبا گفتگو کرتے ہیں کہ بس کیا بتاؤں حالانکہ ان کی۔۔۔ ہر طرح سے خدمت کرتی ہوں۔ تمام سسرال والوں کا خیال رکھتی ہوں صبح نماز فجر سے اٹھتی ہوں تو بارہ بجے سے پہلے لیٹنا نصیب نہیں ہوتا سب کی خدمات کے باوجود کوئی خوش نہیں ہے ان کی بہنیں ایک، ایک ہفتہ آکر رہتی ہیں لیکن بہو کو اپنے گھر جانے کی اجازت نہیں ہے سوائے عید بقر عید کے دو چار گھنٹوں کے سوا سارا سال والدین سے ملاقات نہیں ہوتی کیا اس معاشرے میں بہوؤں کے کوئی حقوق نہیں؟ میرے شوہر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں مگر شاید ان کے دل میں بیوی کے بجائے ایک نوکرانی جیسی عزت اور احترام کی بھی مستحق نہیں؟ ملازمہ کو کم از کم ہفتے میں ایک چھٹی تو مل جاتی ہے اس کے لئے کوئی ایسا حل بتایئے کہ میری مشقتوں میں کمی آجائے اور سسرال والے مجھے ایک بہو کا مرتبہ دیں شاید میرا خط بہت سی بہوؤں کے لئے راہ نمائی کا باعث بن جائے آپ کی دعاؤں کی منتظر۔

☆ پیاری بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت، استقامت بخشے اور ہر بیٹی کو اچھی بہو بننے کا حوصلہ اور ہنر بخشے۔ (آمین) آپ ہر نماز کے بعد "یارافع یا حمید" ایک تسبیح پڑھ لیا کریں اول آخر 3 مرتبہ درود شریف

خیر و برکت اور بہتری کے لئے لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔

میمونہ اکرم۔ آزاد کشمیر

○ محترم! میری بیٹی کو عرصہ 2 سال سے بخار ہے ہر طرح کا علاج کروا چکے ہیں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہو رہا یہاں پر ایک صاحب کو دکھایا تو انہوں نے آسیب کا چکر بتایا ہے۔ ڈاکٹرز بھی کہتے ہیں کہ اس پر کوئی میڈیسن اثر نہیں کر رہی ہیں۔ آپ میری بیٹی کے متعلق استخارہ کر کے بتائیں کہ کیا مسئلہ ہے۔

☆ عزیز بہن! آپ کی بیٹی کو معدے کا انفیکشن ہے جس کی وجہ سے بخار نہیں ٹوٹ رہا۔ اس کا علاج کروایئے۔ لوح شفاء ارسال ہے۔

شہناز عبدالغفور۔ ملتان

○ میں فرسٹ ائیر کی طالبہ ہوں ہم چھ بہن بھائی ہیں پانچ بہنیں ایک بھائی ہے میرا تعلق غریب گھرانے سے ہے ہمارے والدین نے غربی کے باعث ہمیں میٹرک تک تعلیم دلوائی ہم دو بہنیں ایک اسپتال میں جاب کرتی ہیں بھائی ہمارا مزدوری کرتا ہے اور ابو ضعیف ہیں محترم ایک تو ہمارا کاروبار صحیح نہیں چل رہا دوسرے میری بہنوں کی شادی میں رکاوٹ ہے کوئی رشتہ آتا ہے ایک بار ہو کر جاتے ہیں دوبارہ نہیں آتے گھر کے حالات بہت زیادہ خراب ہیں ان حالات کی وجہ سے ہر وقت گھر میں جھگڑا رہتا ہے ہم بہنیں کما کر والدین اور اپنا پیٹ پال رہی ہیں بھائی کوئی مدد نہیں کرتا.............. بلکہ.......وہ ہر وقت لڑتا رہتا ہے ان حالات کی وجہ سے امی ہر وقت بیمار رہتی ہیں ہم دونوں بہنیں ہاتھ پاؤں بہت مارتی ہیں لیکن پھر بھی کچھ نہیں بنتا محترم آپ ہمیں کوئی ایسا وظیفہ یا لوح بتائیں جس سے ہمارا کاروبار صحیح ہو جائے اور بہنوں کی شادی کا بھی مسئلہ حل ہو جائے آپ کی مہربانی ہوگی۔

☆ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات پر مکمل بھروسہ رکھیں اس کی ذات مسبب الاسباب ہے انشاء اللہ آپ کے حالات پر ضرور رحم فرمائیں گے۔ آپ سب نماز باقاعدگی سے ادا کریں۔ ہر نماز کے بعد "یاوہابُ" بکثرت

پڑھیں۔لوح سبع ستارگان ارسال ہے۔

عندلیب۔ملتان

○ محترم! ہمارا جوتوں کا کارخانہ ہے الحمدللہ بہت اچھا چلتا رہا ہے لیکن آٹھ دس ماہ سے یوں لگ رہا ہے کہ جیسے ہر چیز الٹی ہورہی ہے کاریگر بھاگ رہے ہیں آرڈر کینسل ہورہے ہیں پے منٹس پھنس رہی ہیں خود میرے میاں کہتے ہیں کہ کام پر جانے کو دل ہی نہیں چاہتا ہے بخار علیحدہ رہنے لگا ہے۔ہمیں تو لوگ یہ بتاتے ہیں کہ کسی حاسد نے ہم پر جادو کروادیا ہے۔آپ سے درخواست ہے کہ اس صورت حال سے نکالنے کے لئے ہمیں کوئی اسم الٰہی تلقین کریں اور کوئی روحانی تحفہ عنایت کیجئے ہم بہت پریشان ہیں گیارہویں شریف میں شرکت کے لئے پانچ سو روپے کا منی آرڈر ارسال کررہی ہوں ہمارے لئے دعا بھی کیجئے گا گیارہویں شریف کے لئے ہماری جانب سے سوالاکھ مرتبہ کلمۂ طیبہ بھی شامل فرمالیجئے گا۔اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔

☆عزیز بہن! مصائب اور مشکلات سے گھبراتے نہیں جب جادو حسد کا شبہ ہونے لگے تو بکثرت آیت الکرسی اور معوذتین پڑھا کریں اللہ تعالیٰ اپنے کلام کی برکت سے ہر مسلمان کو بچانے والا ہے آپ ہر نماز کے بعد "یاسلام یاحفیظ یافتاح یاوہاب" 140 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔کاروباری خیروبرکت اور ترقی کے لئے لوح مشتری ارسال کی جارہی ہے حسب توفیق صدقہ دیا کیجئے گیارہویں شریف میں شرکت کا شکریہ۔اللہ تعالیٰ آپ سب پر اپنا فضل وکرم فرمائے۔(آمین)

چندا اکرم۔کراچی

○ محترم بھائی جان! آپ کا کالم پڑھ کر بے حد سہارا ملتا ہے میں بھی آج حاضر ہوگئی ہوں میرے شوہر کو ان کے کاروباری حریف نے ایک جھوٹے مقدمے میں پھنسادیا ہے اللہ کا شکر ہے کہ میرے شوہر نے کبھی بددیانتی نہیں کی مگر اس نے ایسا ہیر پھیر سے کام لیا کہ ہمارا ایک ملازم اس سے مل گیا اور اس نے ہمیں شدید نقصان پہنچایا ہے۔آپ ہمیں کوئی ایسی تعلیم دیں کہ جس سے اس جھوٹے مقدمے سے جان بھی چھوٹ جائے اور اس کے ساتھ ساتھ کاروباری نقصانات بھی نہ ہوں۔میرے میاں ان حالات سے اس قدر بددل ہوگئے ہیں کہ کہتے ہیں کہ جونہی مقدمات سے جان چھوٹی وہ ملک سے باہر جاکر قسمت آزمائی کریں گے۔بہت پریشانی ہے کوئی حل عنایت کریں۔

☆عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ سب کو استقامت عطا فرمائے (آمین) "یارحمٰن یاسلام یاحسیب یافتاح" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف، مقدمات کے جلد فیصلے اور خیروبرکت کیلئے فتح نامہ ارسال کیا جارہا ہے حسب توفیق صدقہ دیجئے گا۔